www.pklibrary.com
اپریل 2024
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
قیمت 200 روپے
بانی
معراج رسول

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ
یمنیٰ احمد

نائب مدیر
اطہر حسین

مارکیٹنگ و سرکولیشن منیجر
محمد شہزاد خان
0333-2256789

جلد 53 • شمارہ 04 اپریل 2024 • زرِ سالانہ 3000 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 200 روپے •

خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
کے صفحات پر
ایک نئے سلسلے کا آغاز
جنگل کا قانون نافذ کرنے والے انسانی تذلیل
کے مرتکب درندوں سے
ٹکرا جانے والوں کی خونی داستان
جنگل
اپریل 2024ء کے شمارے میں
امجد جاوید کے قلم سے

انشائیہ

جون ایلیا

بڑا خسارہ

راستی، راستائی اور راستیمی تلاش کرنے والوں کے لیے یہ ایک پُرآشوب زمانہ ہے۔ دلوں میں تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ دلیلوں پر درہمی کی افتاد پڑی ہے اور دانش پر دیوانگی کے دورے پڑ رہے ہیں۔ نیکی اور بدی اس طرح کبھی خلط ملط نہ ہوئی تھیں۔ ادھر یا اُدھر، جدھر بھی دیکھو، ایک ہی سا حال ہے۔ تیرہ درونی نے اپنی دستاویز درست کی ہے اور کج، کج رائی اور کج روی کا دستور جاری کیا گیا ہے۔ جو سمجھانے والے تھے، وہ اپنے افادات کی مجلسوں میں بُرائی بجھا رہے ہیں۔ بُرائی سوچی جارہی ہے اور بُرا چاہا جارہا ہے۔ خیال اور مقال کی فضا اس قدر زہرناک کبھی نہ ہوئی تھی۔ انسانی رشتے اتنے کمزور کبھی نہ پڑے تھے۔

ایک اور فتنہ برپا ہوا ہے، وہ ادھوری سچائیوں کا فتنہ ہے۔ اس نے انسانیت کی صورت بگاڑ کر رکھ دی ہے۔ ایک آنکھ، ایک کان، ایک ہاتھ اور ایک ٹانگ کی انسانیت زندگی کے حسن تناسب کا نادر نمونہ ٹھہری ہے۔ یہی وہ انسانیت ہے جس کے باعث اس دور میں ہماری تاریخ کے سب سے بدترین واقعات ظہور میں آئے ہیں۔ گمان گزرتا ہے کہ یہ انسانوں کی نہیں، نسناسوں کی دنیا ہے اور ہم سب نسناس ہیں۔ جسے دیکھو وہ غیر انسانی لہجے میں بولتا ہوا سنائی دیتا ہے۔

سماعتوں پر شیطانی شطحیات نے قبضہ جمالیا ہے۔ یہاں جو بھی کان دھر کر سن رہا ہے، وہ کانوں کے گناہوں کا مرتکب ہو رہا ہے۔ سوچا ہے کہ ایسے میں نیک سماعتیں اعتزال اختیار کریں۔ اپنی نیتوں کی نیکی پر سختی سے قائم رہو اور اس کی ہر حال میں حفاظت کرو کہ تمہارے پاس یہی ایک متاع باقی رہ گئی ہے اور یہی تمہاری سب سے قیمتی متاع بھی ہے۔

نفرتوں کی گرم بازاری اور محبتوں کی اس قحط سالی میں دکھی انسانیت کے دکھ اور بھی بڑھ گئے ہیں۔ اس بیمار کے تیمارداروں اور غم گساروں کی تعداد آہستہ آہستہ کم ہوتی جارہی ہے۔ اچھائی اور بُرائی میں ایک عجیب معاملت ہوئی ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اپنے ناموں کا آپس میں تبادلہ کرلیا ہے۔ اب ہر چیز اپنی ضد نظر آتی ہے۔ علم، جہل پر ریجھ گیا تھا اور جہل، علم کے خطاب پر بُری طرح لوٹ پوٹ تھا۔ سو دونوں ہی نے ایثار سے کام لیا۔

انسان کو اس دور میں وہ وہ منفعتیں حاصل ہوئی ہیں جن پر ہر دور کا انسان رشک کرے۔ پر اس کا خسارہ بھی اسی قدر شدید ہے اور وہ یہ کہ انسانوں کے اس انبوہ میں خود انسان ناپید ہو گیا ہے۔ جس مزاج اور جس قماش کی دنیا میں ہم رہتے ہیں، اس کا حال تو یہی ہے اور یہی ہونا بھی تھا۔ کوئلے کی کمائی کالک کے سوا اور کیا ہے؟ اندرائن کے پیڑ سے کیا کبھی انگور کے خوشے بھی توڑے گئے ہیں؟

عزیزانِ من...... السلام علیکم!

اپریل 2024ء کا شمارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ لیجیے جناب عیسوی سال کا چوتھا مہینا اور اسلامی سال کا نواں مہینا یعنی رمضان المبارک بھی آگیا اور اپنی رحمتوں، برکتوں سے بھرپور ساعتوں میں ان گنت کرم نوازیوں کے مواقع ہمیں میسر آگئے مگر...... کیا واقعی میسر آگئے...... اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو...... ہم ایسی عبادتیں کریں کہ اللہ ہم سے راضی ہوجائے۔ اپنی تمام رحمتوں کی بارشیں ہم پر کردے اور ہماری بخشش و مغفرت کی منزلیں آسان ہوجائیں۔ دنیاوی مسائل اپنی جگہ مگر آخرت کے تقاضے پورے کرنا بھی ہر مسلمان کا فرض ہے اور ہم ہیں کہ دنیا کی لذتوں میں گم ہوکر اپنے ان حقیقی فرائض کو تقریباً بھول چکے ہیں اور اسی غفلت کا نتیجہ ہے کہ ہم پر اتنی آفتیں اور مصیبتیں نازل ہورہی ہیں...... موسم تو بہت خوشگوار ہے اور روزے اس موسم کے کتنے آسان ہیں۔ اللہ کرے تمام مسلمانانِ عالم کو نہ صرف روزے رکھنے کی سعادت نصیب ہو بلکہ ہماری تمام عبادتوں اور دعاؤں کو قبولیت کا درجہ بھی بخش دے۔ الٰہی آمین۔ الیکشن تو ہو چکے اور ساتھ ہی سلیکشن کا ٹرکا بھی عروج پر رہا۔ اب جو بھی حکومت کرنے کا شوق پورا کرے خدا کرے کہ ساتھ ہی راج گدی کے تقاضے بھی انصاف کے ساتھ پورا کرنے کی خواہش اور کوشش بھی کرے۔ خاص طور پر اسٹریٹ کرائم کے نام پر جو قیمتی جانوں کا نقصان ہورہا ہے...... یہ پوری قوم کا غم ہے...... اور قوم کا غم اور قوم کا نقصان...... کیا حکومت اس طرف توجہ دینے کا فرض پورا کرے گی...... خدا کرے کہ ان کے دل نرم ہوجائیں اور اس ظلم سے عوام کو نجات دلانے کے لیے مثبت اقدامات کرے۔ انہی اچھی امیدوں کے ساتھ ذرا اپنی محفل کی جانب بھی قدم بڑھاتے ہیں۔

⊕ عبدالجبار رومی انصاری، قصور سے تشریف لا رہے ہیں۔ ”کملائے حسن کی آنکھوں میں تشنگی دیکھی ہے، بڑی مدت کے بعد ہم نے وارفتگی دیکھی ہے۔ جی ہاں، سسپنس سرورق مجھے تو کچھ ایسا ہی سمجھ آیا ہے اور اپنے الفاظ کے معانی میں چھپا مرتا انکل جون کا فشیان بھی بڑے پتے کی باتیں کرتا ہے۔ بس انہیں سمجھنا ذرا مشکل ہوتا ہے اور سچائی کا تجربہ ہوجائے تو فشیان کی ساری مصلحتیں بھی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ اداریے کی طرف بڑھتے ہیں۔ الیکشن سلیکشن تو ہو گیا مگر اب باؤلی کھچڑی پک رہی ہے جس میں ہر ایک اپنی دال بڑھانے اور گلانے کی کوششیں کر رہا ہے۔ دیکھو اب آگے چل کر کیا ہوتا ہے۔ بجلی و گیس کی قیمتیں تو ابھی سے بڑھانے کی نوید سنا دی ہے (سنا نہیں دی گئی...... بھائی صاحب! یہ عذاب عوام پر نازل کر دیا گیا ہے)۔ روبینہ اشعر کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ منجھا ہوا تبصرہ خوب رہا۔ جنید علی کا بھرپور تبصرے کے ساتھ کھوئے، بادام، پستے کے لوازمات خوب رہے اور سردی میں بھی رس ملائی کا پیالہ گمان میں رکھا۔ عمدہ تبصرہ جناب۔ محترمہ عبوق بخاری کی خوشگوار آمد نے تبصرے کا حسن بھی دوبالا کر دیا۔ آپ کے مطالعے اور لکھنے کا عمل آپ کی کہانیوں میں خوب نظر آتا ہے اور پھر آپ کی کہانی ”بات سنو“ کے پانچوں دوستوں نے آپس میں مل کر فضول قسم کے مسئلوں کو دل و دماغ سے نکال کر خودکشی سے بھی باز آگئے۔ کہانی بھی بہت اچھی لگی۔ سید محی الدین اشفاق کے الفاظ پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔ بہت عمدہ تبصرہ کیا، اچھا لگا۔ خیر مبارک۔ سیتا شاہ کا خوشگوار موڈ اور جاتی سردیوں کی دھوپ میں نہ گرمی تھی نہ سردی، احساس اچھا ہے اور دلچسپی سے کیا گیا تبصرہ بھی بہت عمدہ رہا۔ کچھ لوگ بڑے گہرے ہوتے ہیں، آسانی سے سمجھ نہیں آتے۔ اسی طرح ٹیچر جمیلہ نے بھی سراج الدین کو چپکے چپکے خوب انتظار کروایا۔ شہلا اور عابدہ نے بھی جمیلہ کو فورس کیا تب جاکر دونوں ایک ہوئے۔ سالوں سے پیاسے دو وجود ایک ہوئے مگر سراج کا بھرا پرا گھر، اس کے پہلے بیوی بچے اس کا گھر ہی چھوڑ گئے۔ ایک جوان عورت کے ہوتے ہوئے بھی سراج تنہا ہوگیا تھا مگر یہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ ہمارا معاشرہ ایسا ہے کہ سو طرح کی باتیں بنائی جاتی ہیں اور برا سمجھا جاتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے (انسان کو سب کچھ میسر نہیں ہوسکتا۔ یہ حقیقت قبول کرنا چاہیے۔ تشنگی سے ہی اللہ اور فانی زندگی کا ادراک ہوتا ہے۔ سراج کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا)۔ بہرحال عمدہ کہانی تھی۔ ”دل کی وہی تنہائی“ نے اسے پھر بھی تنہا ہی رکھا۔ دو لڑکیوں کے گرد گھومتی تاریخی کہانی ”خانۂ طلسمات“ بھی زبردست رہی۔ شہزادی حوریا نے اپنے ہوس پرست باپ کو قتل کر کے بادشاہت حاصل کی۔ جہاں عوام مردوں کی حکمرانی سے تنگ تھی، وہیں شہزادی حوریا نے بھی عوام کی ترجمان بن کر مردوں کی حکمرانی ختم کردی اور اپنے بعد شہزادی ولنقیہ کو فرمانروا مقرر کر دیا۔ آخر میں محبت سے انکار کرتی حوریا معدانوس کی بنائی مورتی دیکھ کر محبت کی تاب نہ لاتے ہوئے خود بھی موت سے دوچار ہوگئی۔ اے آر راجپوت کی کہانی زبردست رہی۔ ملک صفدر حیات کی ”خاطر داری“ کو نوٹ کے دو حصوں سے چھپانے کی کوشش کی گئی مگر جہاں چودھری سوالا آنے درست فرماتے وہیں ملک صاحب بتیس آنے درست فرما کر مجرم کو حوالات کی ہٹری پر ڈال دیتے ہیں۔ چودھری حفیظ نے بہو عروج کی ناجائز اولاد کا سن کر عروج، اس کے بھائی اور تانگے والے کو قتل کروایا، دوسری طرف شیر گڑھ میں سلیم کو مروا دیا اور پھر پوسٹ مارٹم رپورٹ اور ملک صاحب کی تفتیش نے جلد ہی اپنے سامنے بیٹھے مجرم کو دھر لیا۔ حسام بٹ کی تحریر زبردست رہی۔ علی اصغر کی ”بھائی بند“ بھی خوب رہی۔ بھی دوست فلاسفر کی اولاد ثابت ہوئے۔ کنزئی ٹرسٹ ہی...... بھوئی سیلون ملازم شہزادے کے بابا امریکا سے بزنس ٹور مکمل کرآئیں تو انہیں آپ کے ہاں بھیجوں گا۔ بلال کی یقین دہانی تو درمیان میں ہی رہ گئی۔ ادھر کنزئی وقار

کی دلہن بن گئی اور پھر بلال نے اپنا آپ دکھا دیا کہ شاید کنزیٰ اس کی ہو جائے مگر جب جھوٹ کا بہروپ اترا تو بلال کہیں کا نہ رہا۔ ''دوراہا'' مختصر مگر عمدہ کہانی رہی۔ برف زاروں میں اس دفعہ سہراب بے بس ہی رہا اور اس کے دشمن خود بخود ہی ختم ہوتے چلے گئے البتہ جیکی اور البرٹ رمنڈو کا ابھی پتا نہیں وہ کہاں چلے گئے۔ میورخ کے گھر کے قریب پُرکشش حسینہ نے جنگ باز کا دل دھڑکا دیا ہے۔ اب پُرکشش حسینہ اور اجنبی کا تعارف اگلی قسط میں ہی پتا چلے گا۔ بھٹی صاحب کی کہانی تو ایک دم زبردست جا رہی ہے۔ انڈین فوجی کو مارنے کا بدلہ اس کی آرمی نے کبیر، گل وش اور ان کی ماں کو گولیاں مار کر لیا۔ کشمیر میں ایسی ظلم کی داستانیں عام ہیں۔ مشرا کے ساتھیوں نے حاجی شیر خان اور اس کی بیوی کو بھی شہید کر دیا۔ پری وش نے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔ دھما کا خیز ''شہ زور'' میں ان کی محبتیں دیکھو کیا رنگ لاتی ہیں۔ عادل اور ماہ بانو، مراد اور ثانیہ کی صورت میں یروشلم پہنچے اور انہوں نے بھی مقدس سرزمین بیت المقدس سے عقیدت سے بھرپور معلومات شیئر کیں جنہیں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ یوں اسما قادری کی ''شہ زور'' بکھرے پلاٹ کے ساتھ سرپٹ جاری ہے۔ دل روحانیت کا منبع ہے اور باطنی پرندہ پاکیزگی چاہ کر پرواز کی خواہش رکھتا ہے اور ایسے پرندوں کی پرواز وہیں ہوتی ہے جہاں کے ولی اللہ کو دوست رکھتے ہیں اور جنہیں اللہ دوست رکھتا ہے وہ ولی کامل ہوتے ہیں اور پھر کائنات کے سربستہ راز بھی ان کی نگاہ میں ہوتے ہیں۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی خواجہ حسین ناگوریؒ کے واقعات پر ایمان افروز تحریر بے حد اچھی لگی۔ محفل شعر و سخن سے ناہید یوسف، روبینہ کوثر، نور حسین اور مسکان ایاز کے شعر اچھے لگے۔ ادارہ و قارئین اور سبھی لکھنے والوں کے لیے ڈھیروں دعائیں ہیں۔ خوش رہیں، خوشیاں بانٹیں۔ (آپ کے لاجواب تبصرے کا بھی بے حد شکریہ)۔''

✽ روبینہ اشعر، کراچی سے۔ ''مارچ کا شمارہ انتخابی گہما گہمی کے دوران جلدی مل گیا۔ چہرے اور ہاتھوں پر جھریوں کے ساتھ سادہ سا ٹائٹل کچھ خاص نہیں لگا۔ فہرست پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے جون ایلیا کے انشائیہ پر پہنچے جہاں ان کے ہمزاد شیان نے ان سے تین باتیں کہیں جن کا جون ایلیا نے تفصیلی جواب دیا۔ خطوط کی محفل میں پہنچے تو خوشی کی انتہا نہ رہی کیونکہ ماہ دولت کرسی صدارت پر براجمان نظر آئیں۔ خطوط کی محفل میں جنید علی کچھ الگ انداز سے مٹھائی کی پوری دکان سجائے بیٹھے نظر آئے مگر ہماری پسندیدہ مٹھائی ''گلاب جامن'' کا کہیں ذکر نظر نہیں آیا۔ بہرحال بہت شاندار تبصرہ تھا۔ عیوق بخاری کی محفل میں آمد خوشگوار رہی۔ دیگر شرکا میں سید محی الدین اشفاق، عبدالجبار رومی انصاری، بینا شاہ کے تبصرے بھی جاندار رہے۔ رسالے کے ابتدا میں ہی اے آر راجپوت کی تاریخی کہانی ''خانۂ طلسمات'' شاندار تحریر رہی۔ محبت کے جذبے کو تسلیم نہ کرنے والی شہزادی حوریا کو جب معدانوس کے خاموش عشق کی انتہا کا علم ہوا تو دل میں پیدا ہونے والی خلش نے اس سے جینے کی خواہش ہی چھین لی اور ضمیر پر کسی کی محبت کا قرض لے کر جینا اسے بھی گوارا نہ ہوا، ویل ڈن۔ عائشہ نصیر کی تحریر ''بدفطرت'' بھی خوب رہی۔ راوک نے ثریا کو دھوکا دینے کی کوشش کی اور لیزی سے اپنے تعلقات استوار کرنا چاہے مگر لیزی خود اپنے ہی پھیلائے جال میں پھنس گئی۔ عیوق بخاری کی ''بات سنو'' اچھی لگی۔ چار نوجوان زندگی کے نشیب و فراز سے گھبرا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے چلے تھے لیکن الفریڈ نے اپنے عمل سے بتایا کہ زندگی اتنی حقیر شے نہیں کہ اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا جائے۔ شاطر مجرموں اور ملک صاحب کے درمیان معرکہ آرائی حسام بٹ کی ''خاطرداری'' میں پڑھنے کو ملی۔ نفیسہ سعید کی کہانی ''آزادی'' بھی اچھی رہی۔ صائمہ دانش کی ''گمشدہ'' بھی خوب رہی۔ نیل نے اپنی بیوی کیرن کی بے وفائی پر اسے قتل کر دیا۔ افتخار حسین جعفری کی تحریر ''گھر کا بھیدی'' میں اپنے ہی وطن کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے والوں کا عبرت اثر انجام پڑھنے کو ملا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی ''جنگ باز'' نئے کرداروں کے اضافے، دلچسپ واقعات اور اپنے سسپنس کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ عائزہ احمد کی ''چشم سیاہ'' دلچسپ کہانی تھی۔ مرتضیٰ نے پریسہ کو موت کے گھاٹ اتارا اور پریسہ کی بہن فاطمہ نے اپنی بہن کے قاتل سے خوب بدلہ لیا۔ احمد سلیم سلیمی کی تحریر ''دل کی وہی تنہائی'' بہت عمدہ تحریر تھی۔ سراج میاں بڑھاپے میں عشق کر بیٹھے اور جمیلہ خاتون کو پانے میں تو کامیاب ہو گئے مگر اپنی پہلی بیوی اور بچوں سے محروم ہو گئے۔ ویل ڈن۔ محفل شعر و سخن میں ناہید یوسف کا شعر ہمارے ملک کی حالت زار کو بیان کرتا ہوا اچھا لگا۔''

✽ سید محی الدین اشفاق کی آمد فتح پور، لیہ سے۔ ''سب سے پہلے ادارہ، رائٹرز، قارئین اور پاکستانیوں سمیت پورے عالم اسلام کو ماہ مقدس کی مبارک۔ ہوشربا مہنگائی کر کے مالی منافع سمیٹنے کا سوچنے والے ذرا اس بات پر غور کریں۔ خدا جس ماہ دسترخوان وسیع کر دیتا ہے، رزق بڑھا دیتا ہے، اس ماہ میں چند نادان اپنے ہی کلمہ گو روزہ دار بھائیوں کے لیے کھجور، پھل، اناج، سبزی کھانا دشوار کر دیتے ہیں اور پھر ہم کہتے ہیں ہماری دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں۔ دراصل ہماری اپنی کوتاہیاں، گناہ، حقوق العباد کا خیال نہ کرنا، مادی خواہشات کی تکمیل میں دوسروں کا گلا گھونٹنا مختلف پریشانیاں اور وبائیں بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ خدا تو رحیم ہے ہی، اگر اپنے انداز و اطوار درست کر لیں گے تو اس کے کرم کی بارشیں ہر تکلیف و درد کو دھو ڈالیں گی۔ روبینہ اشعر صاحبہ کو مبارک، کرسی صدارت پر بڑا اچھا تبصرہ لیے براجمان تھیں۔ جنید علی، واہ واہ! یعنی آپ نے طے کر لیا ہے کہ ہر بار دل جیتنا ہے اور وہ بھی نئے انداز سے۔ ملتانی سوہن حلوے سمیت مدینۃ الاولیا کی ساری مٹھاس آپ نے بڑے دلکش طریقے سے خط میں سمو دی۔ بڑا ''لذیذ'' تبصرہ تھا، خوش رہیں۔ عیوق بخاری خوش آمدید۔ آپ کی خوبصورت امید کے جلد پورا ہونے کی دعا کرتے ہیں۔ اس بار بھی آپ نے ''بات سنو'' جیسی سبق دیتی تحریر لکھ کر کمال کر دیا ہے۔ تحریر سب کو پڑھنے کے ساتھ دوسروں کو بھی اسے پڑھنے کی ترغیب دینی چاہیے تاکہ بے حسی کے خاتمے اور رشتوں میں قربت کا کام ہو سکے۔ عبدالجبار رومی انصاری اور بینا شاہ کا تبصرہ بھی خوب رہا۔ احمد سلیم سلیمی کی ''دل کی وہی تنہائی'' بہت اچھی تحریر تھی۔ نئے راستے پر چلنے والے کا انجام بہت اچھا لگا کہ وہ اپنی مرضی کر کے بھی بے کل رہا۔ صائمہ

دانش کی ''گمشدہ''، خلیل انجم کی ''دوراہا'' اور عائشہ نصیر کی ''بدفطرت'' دلچسپ تحریریں تھیں۔ پشاور سے بھیجا گیا نور حسین کا شعر بہت اچھا لگا۔ باقی رسالہ بھی مجموعی طور پر اچھا ہے بلکہ بہت اچھا ہے۔''

☸ سیدہ روبینہ شاہین روبی کا شوق تھل، سادہتھ پنجاب سے۔ ''سوچا اپنے پسندیدہ ادارے کے ڈائجسٹ میں پہلی بار خط لکھنے کا خوبصورت اعزاز حاصل کرلوں۔ روبینہ اشعر جو میری ہم نام بھی ہیں، کو کرسیِ صدارت پر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ جنید علی اپنے تبصرے کے ساتھ ہمیشہ کی طرح بڑے بھرپور انداز میں نظر آئے۔ سسپنس ڈائجسٹ کی رائٹر عیوق بخاری کی پہلی آمد واقعی خوشگوار رہی۔ تبصرے میں بارش، بادل، دھلا سورج اور خوبصورت امید کے الفاظ بہت اچھے لگے۔ سید محی الدین اشفاق، عبدالجبار رومی انصاری اور سیتا شاہ کے تبصرے حسبِ معمول بہت اچھے رہے۔ اے آر راجپوت کی ''خانۂ طلسمات'' نے ماضی کا ایک قصہ سنایا۔ عیوق بخاری کی ''بات سنو'' معاشرے کو ایک اہم پہلو کی جانب توجہ دلائی، بہت پسند آئی۔ الفریڈ نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کرنے والوں کا فیصلہ بدل دیا اور آخر میں اپنے بارے میں انکشاف کرکے چونکا دیا۔ احمد سلیم سلیمی کی ''دل کی وہی تنہائی'' میں راستے، رشتے بدلنے والے کو ملنے والی بے چینی بہت اچھی لگی۔ خلیل انجم کی ''دوراہا''، صائمہ دانش کی ''گمشدہ'' عمدہ تحریریں تھیں۔ شاہد نسیم بدین والے کا شعر پسند آیا۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ اہلِ وطن اور امتِ مسلمہ کو رمضان کی مبارک۔ اللہ اس ماہِ مقدس کی برکتیں، رحمتیں سمیٹنے کی توفیق دے، آمین۔''

☸ ملتان سے سسپنس کے مستقل قاری و تبصرہ نگار جنید علی رقم طراز ہیں۔ ''رسائل خاص کر سسپنس ایک ایسا پلیٹ فام ہے جہاں آکر ہمیں فرحت بخش احساس ہوتا ہے۔ ایک عزت و احترام کا رشتہ ایک طویل عرصے سے استوار ہے۔ دعا ہے رسائل کا یہ خوبصورت سلسلہ ایسے ہی چلتا رہے اور وقت کے ساتھ مزید ترقی کی راہ پر گامزن رہے (آمین)۔ خیر، مارچ کا سرورق سسپنس کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ خاص کر بیک پر جو سائے یا پُرسکون روحیں ہوا میں معلق ہیں یہ سرورق کی دلکشی میں ہمیشہ سے اضافہ کرتی آئی ہیں۔ ایک خاص بات جو بہت پسند ہے کہ تحریریں تو اچھی ہوتی ہی ہیں مگر یہ جو تحریروں کی ڈسکرپشنز اور کیپشنز ہر بار اتنے دلکش اور عرق ریزی سے لکھے ہوتے ہیں کہ اکثر اوقات مجھے کہانی سے زیادہ یہ دونوں پسند آجاتے ہیں جنہیں پڑھ کر کہانی کو پڑھنے کے تجسس میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے (ارے..... آپ نے تو یہ بڑی الگ سی بات کہہ دی..... اس کا مطلب ہے کہ آپ واقعی رسالے پر بھرپور توجہ دیتے ہو)۔ جون ایلیا کا ''انشائیہ'' ان گنت مسائل اور ان کا حل بتا کر دریا کو کوزے میں بند کر دیتا ہے۔ ذرا آگے صفحے پر پہنچے تو جاسوسی سسپنس کی ابھرتی ہوئی مصنفہ عیوق بخاری کی آمدِ محفل کا لطف دوبالا کر رہی تھی۔ روبینہ اشعر پوری شان سے کرسیِ صدارت پر متمکن تھیں اور مختصر مگر جامع تبصرہ لکھا۔ محی الدین اشفاق بھائی کو پڑھ کر محی الدین صاحب یاد آجاتے ہیں۔ ڈی جی خان کی نمائندگی کرتیں سیتا شاہ کی سسپنس سے وابستگی پر بھی خوشی ہوتی ہے جو تاخیر سے ملنے پر بھی چاہے مختصر پڑھ کر مگر تبصرہ ضرور کرتی ہیں۔ ملک وحید، انجم فاروق ساحلی اور آذین رضوان کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ خلیل جبار کی مختصر تحریر ''دوراہا'' اصلاحی تحریر تھی جس میں بے ست جاتی کنزیٰ کا کردار نوعمر دوشیزاؤں کے لیے نصیحت تھا جو محض جذباتیت کا شکار ہوجاتی ہیں۔ عائزہ احمد سسپنس میں اچھا اضافہ ہیں اور قلم میں روانی بھی ہے۔ افتخار جعفری نئے مصنف لگتے ہیں مگر پہلی تحریر ''گھر کا بھیدی'' ہی کافی سنسنی خیز و دلچسپ رہی۔ ڈینی کی پیشہ ورانہ کارکردگی عروج پر تھی جس نے نہ صرف معاملات کو اپنی ہوشیاری سے ہینڈل کیا۔ اعتبار ہو تو انسان سب فتح کرسکتا ہے مگر جب ٹوٹ جائے تو انسان بھی اندر سے ٹوٹ جاتا ہے جیسے ''گمشدہ'' تحریر میں نیل کے ساتھ ہوا جو کیرن کی بے وفائی کی تاب نہ لاسکا۔ مختصر مگر بہتر تحریر رہی۔ ''بھائی بند'' تحریر کا اختتام کافی حیران کن تھا۔ یوں خود کو کافی پہنچی ہوئی شے سمجھ رہا تھا اور دوسروں کو اچھے سے لوٹ رہا تھا مگر آخر میں اپنے دوست اکمل کے ہاتھوں خود اچھے سے منہ کی کھانی پڑی۔ پنجرہ چاہے سونے کا ہو مگر قید واقعی قید ہوتی ہے۔ پیٹر یانگ اور اس کے بیٹے نے غلاموں کے ساتھ کس قدر سفاکیت کا برتاؤ کیا مگر خود آخر میں اپنے پورے خاندان کے ساتھ نیست و نابود ہوا۔ اسپارک نے منفرد انداز میں لکھی گئی تحریر ''آزادی'' میں اپنی عقل مندی سے خود سمیت سب کو قید سے نجات دلائی مگر اپنی بیوی کو نہیں بچا سکا۔ عیوق بخاری کی ''کاوش'' نہ صرف دلچسپ بلکہ بہت ہی مثبت و تعمیری سوچ دیتی تحریر تھی جس کا انداز اور پلاٹ عمدہ رہا۔ الفریڈ نے چاروں کو خودکشی سے اپنی زبردست تدبیر سے بچایا اور خود کا مسئلہ بھی حل ہوگیا۔ بہت خوب۔ عائشہ نصیر کا نام ہی کافی ہے جو ترجمہ تحریریں لکھنے میں ماہر ہیں۔ لیزی جس نے معصومیت کا نقاب خود پر اچھے سے چڑھایا ہوا تھا مگر ٹریسا نے ''بدفطرت'' لیزی کا کام تمام کیا اور راوک کو لائن پر پھر سے لے آئی۔ سسپنس کی عدالت میں اس بار تو بھرپور انداز میں مرزا صاحب نے ایک اور سنسنی خیز داستان پیش کی۔ حفیظ اللہ نے تین جانوں کا ایک ساتھ قتل کروایا۔ اے آر راجپوت کا بھی نام ہی کافی ہے۔ تاریخ کے سنہری اوراق سے ایک اور منفرد اور دلکش انداز میں لکھی گئی داستان ''خانۂ طلسمات'' پورے شمارے میں چھائی رہی۔ حوریا کو آخر میں محبت کا احساس ہو ہی گیا وہیں کچھ دولت و ہوس کے نشے میں مدہوش انسان اپنے انجام کو پہنچے۔ آخری صفحات پر طویل کہانی میں طوالت سی محسوس ہوئی اور کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ سراج الدین کی خواہش پوری ہو بھی گئی مگر وہی دل اور تنہائی ساتھ رہی۔ اسما قادری مبارک باد کی مستحق ہیں کہ تحریر اتنی طویل ہے مگر مجال ہے جو ذرا سی بھی بوریت ہو اور ہر قسط ہی شاندار ہوتی ہے اور یہ بہت بڑی بات ہوتی ہے کہ اتنی عرق ریزی سے لکھنا، وہیں طوالت کے ساتھ ساتھ دلچسپی برقرار رکھنا۔ اسما صاحبہ نے موقع کی مناسبت سے یعنی جو فلسطین کے حالات ہیں، ان پر بھی لکھنے کی کوشش کی ہے اور اپنی تعمیری سوچ دینے میں کامیاب رہی ہیں۔ سسپنس کے ''جنگ باز'' کی دلیرانہ کارروائیاں

عروج پر ہے، وہیں ہر قسط میں دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور سہراب کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ ’’ذکر صالحین‘‘ جو اللہ کے نیک لوگوں کی ایمان افروز داستانوں پر مشتمل سسپنس کا ایک خوبصورت سلسلہ ہے اس بار ’’حسین ناگوری‘‘ پر پُرفکر مضمون شامل رہا۔ اشعار کی محفل بھی ہر بار کی طرح خوب سجی۔ پہلا شعر ناہید یوسف کا وطن عزیز کی حالت پر لکھا گیا تھا، وہیں اگرچہ تمام ہی معیاری تھے مگر چند ایک یعنی صابر شاہ، محمد نواز، ثمینہ اشرف اور ساجدہ مریم کے اشعار زیادہ پسند آئے۔ چلیں اگلے ماہ ایک الگ انداز میں آپ سے ملتے ہیں (ہوں...... اس کا مطلب ہے آپ روپ بدلنے کے ماہر ہو)۔‘‘

⊕ سیتا شاہ، ڈیرہ غازی خان سے خط لکھ رہی ہیں۔ ’’رمضان المبارک کے بابرکت مہینے کا آغاز ہو رہا ہے۔ تمام ساتھیوں کو ماہ مقدس کی ڈھیروں مبارک باد۔ سسپنس اس بار بھی قدرے تاخیر سے ملا۔ ٹائٹل گرل کی سادگی کو سراہ کر آگے بڑھے اور جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا اور پھر خطوط کی محفل کا رخ کیا۔ روبینہ اشعر نے بہترین تبصرہ لکھا، کرسی صدارت کی مبارک باد۔ جنید علی نے ملتان سے نہایت شیریں تبصرہ کیا۔ عیوق بخاری نے خطوط کی محفل میں انٹری دی۔ بہت اچھا لگا۔ ان کی کہانیاں تو پڑھتے ہی ہیں، خط پڑھ کر اور بھی اچھا لگا۔ سید محی الدین اشفاق اور عبدالجبار رومی انصاری بھی بہترین تبصروں کے ساتھ محفل میں شریک تھے۔ کہانیوں میں عائزہ احمد کی ’’چشم سیاہ‘‘ زبردست تحریر تھی۔ ’’گمشدہ‘‘ تحریر صائمہ دانش کی اچھی لگی۔ بےچاری اولیو یا غم زدہ نیل کو زندگی کے دھارے میں شامل کرتے کرتے اسی کے ہاتھوں خود زندگی ہار گئی۔ علی امجد کی تحریر ’’بھائی بند‘‘ شاندار تحریر تھی۔ برے کام کا نتیجہ بھی برا ہی ہوتا ہے۔ ’’آزادی‘‘ تحریر نفیسہ سعید، مختصر سی اور بہترین تحریر تھی۔ برے لوگوں کی رسی دراز ہوتی ہے۔ انسانوں کو جانوروں سے بھی بدتر سمجھنے والے، انہیں قیدی بنا کر رکھنے والے انہیں جانتے تھے کہ پنجرے میں قید ہونے والے آزادی حاصل کرنے کے لیے کتنے طاقتور ہو سکتے ہیں۔ اسپارک نے نہ صرف پامیلا کا انتقام لیا بلکہ آئندہ کے لیے بہت سے معصوموں کو پیٹر یانک کا غلام بننے سے بچا لیا۔ عیوق بخاری کی تحریر ’’بات سنو‘‘ شاندار تحریر تھی۔ ’’جنگ باز‘‘ بھی اچھی رہی۔ عائشہ نصیر کی تحریر ’’بدفطرت‘‘ اور ملک صفدر حیات کی تحریر ’’خاطر داری‘‘ بہترین تحریریں تھیں۔ کچھ تحاریر ابھی پڑھنا باقی ہیں۔ محفل شعر و سخن میں سب کے انتخاب اچھے تھے۔ خاص طور پر روبینہ کوثر، محمد رفیق اور ساجدہ مریم کے انتخاب تو لاجواب تھے۔‘‘

⊕ محمد ظفر اللہ ضیا، کمالیہ سے فرما رہے ہیں۔ ’’دل میں خلوص و وفا کی شمع جلائے آپ کی بزم کے دروازے پر دستک دے رہا ہوں (خوش آمدید۔ بہت دیر کی مہرباں آتے آتے)۔ ایک طویل عرصے کے بعد ایک دوست کے توسط سے سسپنس صاحب سے شرف ملاقات حاصل ہوئی۔ بہت کمزور اور بدلا بدلا سا لگا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طویل عرصے کے دوران ہم خود بہت بدل گئے ہیں۔ بال سفید، نظر کمزور اور چہرے پر جھریاں سی پڑ گئی ہیں مگر سسپنس تو لگتا ہے کہ مہنگائی کی وجہ سے کمزور ہو گیا ہے (بہت خوب...... یہ مہنگائی کا ہی اثر ہے)۔ بہرکیف، مارچ کا شمارہ خوبصورت سرورق کے ساتھ ملا۔ ٹائٹل کی حسینہ دوپٹا سر پر لیے ایک معنی خیز مسکراہٹ چہرے پر سجائے ہوئے ہے۔ شاید نئی حکومت کی آمد نے اسے ملک اور قوم کی بہتری کے حالات کی کوئی جھلک دکھائی ہو۔ جون ایلیا کا انشائیہ اپنے دامن میں عمدہ سبق لیے ہوئے ہے۔ کرسی صدارت پر روبینہ اشعر آف کراچی براجمان نظر آئیں۔ عیوق بخاری اور سیتا شاہ کے تبصرے اگرچہ مختصر تھے مگر دل کو بھلے لگے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے صائمہ دانش کی ’’گمشدہ‘‘ پڑھی۔ کیرن پر ترس آیا کہ وہ اپنے بھانجے نیل کے لیے خوشیاں تلاش کرنے کی کوشش میں نیل جیسے ذہنی مریض کے ہاتھوں اپنی جان گنوا بیٹھی۔ باقی کہانیوں میں خلیل انجم کی ’’دوراہا‘‘ اور عیوق بخاری کی ’’بات سنو‘‘ متاثر کن تحریریں تھیں۔ محفل شعر و سخن میں سوائے چند اشعار کے باقی سب معیاری تھے۔ ہو سکے تو خطوط کے صفحات میں اضافہ فرمائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ قارئین کی رائے سے ہمیں آگاہی حاصل ہو سکے (اصل مسئلہ صفحات کی کمی کا ہی تو ہے جناب...... لیکن یہ اطمینان رکھیے کہ آپ کی آرا ہم تک پہنچ جاتی ہیں)۔‘‘

⊕ ملک وحید کا خط کراچی سے۔ ’’مارچ کا شمارہ حسب توقع جلد ہی مل گیا۔ ٹائٹل اور فہرست پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے جون ایلیا کے ’’انشائیہ‘‘ سے مستفید ہوئے۔ خطوط کی محفل میں اپنی موجودگی نہ پا کر مایوسی ہوئی (مگر آپ کا خط نہیں ملا)۔ جنید علی کا تبصرہ جاندار رہا۔ دیگر حاضرین میں روبینہ اشعر، عیوق بخاری، سید محی الدین اشفاق، عبدالجبار رومی انصاری، سیتا شاہ کے تبصرے بھی خوب تھے۔ کہانیوں میں اے آر راجپوت کی تاریخی کہانی ’’خانۂ طلسمات‘‘ اچھی لگی۔ نفیسہ سعید کی کہانی ’’آزادی‘‘ عمدہ تحریر تھی۔ علی امجد کی تحریر ’’بھائی بند‘‘ خوب رہی۔ عائشہ نصیر کی تحریر ’’بدفطرت‘‘ پسند آئی۔ عیوق بخاری کی کہانی ’’بات سنو‘‘ عمدہ تحریر تھی۔ ملک صفدر حیات کی ’’خاطر داری‘‘ اچھی رہی۔ صائمہ دانش کی ’’گمشدہ‘‘ بھی زبردست تحریر تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی ’’جنگ باز‘‘ تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ افتخار حسین جعفری کی تحریر ’’گھر کا بھیدی‘‘ پسند آئی۔ عائزہ احمد کی ’’چشم سیاہ‘‘ اچھی لگی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر ’’خواجہ حسین ناگوریؒ‘‘ خوب رہی۔ خلیل انجم کی تحریر ’’دوراہا‘‘ پسند آئی۔ احمد سلیم سلیمی کی کہانی ’’دل کی وہی تنہائی‘‘ زبردست رہی۔ مجموعی طور پر مارچ کا شمارہ اچھا رہا (آپ کا تبصرہ...... پسند آنے...... اچھا لگنے کی تکرار کے ساتھ ہمیں بھی پسند آیا)۔‘‘

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

اظہر علی خان، کوئٹہ۔ سنبل احمد، لاہور۔ راحیل علی، کراچی۔ ریاض الدین، میرپور خاص۔ نظام الدین، کراچی۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

عشقِ نارسا

اے آر راجپوت

یہ کائنات عجائبات سے بھری پڑی ہے... قدم قدم پر راز پوشیدہ ہیں... ہر منظر میں حیرت اور اِک سحر چھپا ہے... اسی طرح ہر انسان کا مزاج... ہمت... عزم وحوصلہ اور مختلف صفات ہر ایک سے جدا ہیں... اللہ نے کسی کو ظاہری حُسن سے نوازا ہے تو کسی کو اعلیٰ اخلاق سے... اور جہاں کسی کو جسمانی کمزوری دی تو وہاں عزم اور حوصلے کی دولت بے تحاشا لٹادی... یہی حال اس اعلیٰ ظرف اور بلند حوصلہ بچے کا بھی تھا جسے قدرت نے دونوں بازوؤں کی محتاجی دے کر مقدر میں اتنی شہرت اور عزت لکھ دی کہ اس نے صحت مند انسانوں کے مقابلے میں ایسے کارنامے انجام دیے کہ ایک دنیا حیران رہ گئی اور تاریخ نے اس کے کارناموں کو اپنے دامن میں دل کھول کر جگہ دی... اس ادھورے انسان کے دل میں عشق کا مکمل جہان آباد تھا مگر اس مقام پر اس کا حوصلہ جواب دے گیا اور بس... اسی جگہ سے محبوب نے وہ قدم بوسی کی کہ دنیا کو حیران کرنے والا خود حیران رہ گیا... کیونکہ... یہ کائنات عجائبات سے بھری پڑی ہے اور قدم قدم پر انوکھے راز پوشیدہ ہیں۔

گھر چھوٹا سہی مگر بہت خوب صورت ہے اور خاندان بھی مختصر...... کل تین نفوس پر مشتمل، جن میں مسٹر فراتھمن، مسز فراتھمن اور ننھا کارل۔

اگرچہ بظاہر مکینِ قلیل پر مشتمل اس چھوٹے سے خاندان کی زندگی محبت اور سکون سے آراستہ نظر آتی ہے لیکن اس وقت طعام خانے کا بہ زبانِ خامشی کچھ کہتا ہوا سناٹا کسی خاص بات کی غمازی کررہا تھا۔

مسز فراتھمن کی آنکھوں میں آنسو تھے اور مسٹر فراتھمن ضبط وتحمل کا مجسمہ بنے اپنے ایک سالہ بیٹے کارل کو دیکھ رہے تھے جس کا چہرہ کشادہ اور روشن تھا۔ آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی، چھوٹے چھوٹے خم دار بال، صحت مند۔ یہ بچہ ان کی واحد اولاد تھی مگر یہ پیدائشی طور پر دونوں بازوؤں سے محروم تھا۔

اس بچے کو پہلی بار دیکھ کر مسٹر فراتھمن کے دل پر کیا گزری، اس کا اظہار انہوں نے آج تک نہیں کیا لیکن وہ فیصلہ کرچکے تھے کہ کارل کو معذور نہ ہونے دیں گے اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ عزیز واقرباء اور دوست احباب اگر اس بچے سے ہمدردی کرتے تو فراتھمن مشتعل ہوجاتے۔ انہیں ایسی ہمدردی سے چڑ تھی۔

اس وقت بھی مسز فراتھمن کی آنکھوں میں اشک دیکھ کر وہ جھنجلا گئے۔ دراصل آج ایک سالہ کارل پہلی بار اپنے پیروں پر گھسٹتا ہوا طعام خانے میں آیا تھا اور بازوؤں کا سہارا نہ ہونے کے باوجود کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

اگرچہ اس سعی حاصل میں وہ پہلی بار بری طرح گر پڑا تھا جس پر ماں نے تڑپ کر اسے سنبھالا دینے کی کوشش کی تو ان کے شوہر نے سختی سے بیوی کو جھڑک دیا۔

”کولن! خبردار، اسے چھونا بھی مت۔ اسے بار بار گرنے اور خود ہی اٹھنے دیا جائے۔“

یوں دوسری اور تیسری بار پھسلنے، گرنے کے بعد آخر کارل آج کرسی پر بیٹھ ہی گیا تھا۔

اس کے اچک اچک کر بیٹھنے اور مسلسل چوٹ لگنے کے تصور سے ماں کا دل بھر آیا تھا۔ یوں اس نے شاکی نگاہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا بھی جس کا مفہوم سمجھتے ہوئے مسٹر فراتھمن دھیمی آواز میں بولا۔

”جان! میں تمہارے احساسات کو سمجھتا ہوں۔ تم ایک ماں ہو اور ماں سب سے زیادہ اپنے بچے کو پیار کرتی ہے مگر پلیز، کارل کو ایسی محبت نہ دو کہ وہ تباہ ہوجائے۔ اسے اپنی مدد آپ کرنے دو۔“

یہ سنتے ہی مسز فراتھمن کی آنکھوں میں رکے ہوئے آنسو رخساروں پر ڈھلک آئے۔ نہ جانے اپنے غیر معمولی خوب صورت بچے کی بے بسی پر رحم آیا یا کیا...... لیکن ابھی وہ کسی جذبے کا اظہار نہ کرپائی تھی کہ مسٹر مراتھمن نے گرج کر کہا۔

”مجھے آنسوؤں سے نفرت ہے۔ یہ بزدلی اور بے بسی کے اظہار کے سوا کچھ نہیں۔ میں کہے دیتا ہوں کہ کارل کو ہمدردی اور فضول چاہت کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے صرف آگے بڑھنے کا موقع دو اور کچھ نہیں۔ تمہاری غلط محبت اسے تباہ کردے گی اور میں چاہتا ہوں وہ بڑا آدمی بنے۔ مکمل انسانوں کی طرح نام پیدا کرے کیونکہ وہ بہرحال ایک مکمل انسان ہے۔“

مسز فراتھمن نے اپنے اشک پونچھے۔ ایک نظر ننھے کارل کو دیکھا جو دونوں بازوؤں سے محروم تھا پھر شوہر کو دیکھا۔ وہ بولا۔

”کیا تم سمجھتی ہو کہ ہمارا بیٹا مکمل انسان نہیں ہے؟ دیکھو، اس کا سر بڑا اور خوب صورت ہے۔ چہرہ حسین، ٹانگیں صحت مند اور رانیں مضبوط ہیں۔“

ننھا کارل ماں باپ کی یہ گفتگو بڑی معصومانہ حیرت سے سن رہا تھا جسے وہ شاید سمجھ تو نہیں پارہا تھا مگر یہ باتیں اس کے دل میں اتر رہی تھیں۔

تھوڑی دیر ماں باپ کو تکنے کے بعد اس نے اپنے ننھے منے پیر ہلانا شروع کردیے۔ مسٹر فراتھمن نے اسے بغور دیکھا پھر بولے۔

”ہمارے بیٹے کو بھوک لگ رہی ہے؟“

کارل نے انہیں یوں دیکھا جیسے وہ اس بات کے معنی سمجھ گیا ہے مگر سردست جواب نہیں دے سکتا۔

مسز فراتھمن نے ہاتھ بڑھا کر ڈونگا اٹھایا اور ایک پیالے میں شوربا نکال کر کارل کے سامنے رکھتے ہوئے تاکیدی پیار بھرے انداز میں کہا۔

”کھاؤ کارل! آج تمہیں خود کھانا ہے۔“

کارل نے ماں کی جانب دیکھا مگر وہ خود مجبور تھی۔ شوہر کا حکم تھا کہ معذور بچے کی مدد نہ کی جائے۔ لہٰذا چند لمحے انتظار کے بعد کارل نے بھوک سے مجبور ہوکر اپنا پاؤں اٹھایا اور پیر کی انگلیاں شوربے میں ڈبودیں۔

اگرچہ بازوؤں سے محروم اس کمسن بچے کے لیے خود کھانا، کھانا مشکل ترین امر تھی مگر باپ کے حکم نے مجبور کردیا تھا۔ بہرکیف، اس نے پیٹ بھرنے کے لیے نئے انداز سے کھانے کی کوشش کی اور پہلی بار بڑی دقت سے پھر قدرے

آسانی سے وہ پیروں کی انگلیوں سے شوربا چاٹنے لگا۔
اس طرح کھانے سے اس کا منہ بری طرح سالن میں لتھڑ گیا مگر اسے محسوس ہوا کہ وہ یہ سب کر سکتا ہے۔ حقیقت یہی تھی کہ ننھے کارل کو یہ ''مشغلہ'' بڑا دلچسپ اور لذت آمیز لگا۔ یہی نہیں، اس وقت اسے زندگی میں پہلی بار ایک عجیب سی طمانیت اور اعتماد کا احساس ہوا۔
یوں آہستہ آہستہ کھانے کی رفتار میں تیزی آتی گئی۔ تھوڑی دیر بعد مسز فراتھمن نے عقیدت سے شوہر کی طرف دیکھا اور بولی۔
''اگر آپ اجازت دیں تو میں کارل کا منہ صاف کردوں؟''
''ہرگز نہیں۔'' مسٹر فراتھمن نے ٹھوس اور مسکت لہجے میں کہا۔ ''اسے بالکل نہ چھیڑو اور وہی کرنے دو اسے جو یہ چاہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں یہ اپنے بازوؤں کی کمی اپنے پیروں سے پوری کرے اور یقیناً یہ ہوسکتا ہے۔''
اس دن کے بعد سے کارل ہر روز طعام خانے میں آنے لگا۔ اب کرسی پر بیٹھنے کے لیے اسے بار بار کوشش نہیں کرنی پڑتی تھی بلکہ اس نے جلد ہی ایک جست کی خود ترغیبی ترغیب لے کر بیٹھنا سیکھ لیا تھا۔
بعدہ وقت کے ساتھ ساتھ اسے سمجھ آتی گئی۔ وہ بولنے اور سمجھنے لگا۔ جب اس کے رشتے دار اس بچے کو دیکھ کر افسردہ ہوتے تو مسز فراتھمن ناگواری سے کہتے۔
''جناب! اپنی ہمدردی اپنے پاس رکھیے کیونکہ ہمدردی مجبوروں سے کی جاتی ہے۔ میرا بچہ مجبور نہیں ہے۔ لہٰذا ہمدردی نہ کریں۔''
کبھی وہ سنتا، اس کا باپ اس کی ماں سے کہہ رہا ہے۔
''پیاری! تم جانتی ہو جب ہمارے خدا نے دنیا کے پہلے انسان کو بنایا تو اسے سب سے بڑی چیز کیا عطا کی تھی؟''
مسز فراتھمن ذہن پر زور ڈالتی رہی، سوچتی رہی مگر جواب نہ دے پائی۔ تب ہی مسٹر فراتھمن سمجھانے کے انداز میں کہتے۔
''ہمارے خدا نے دنیا کے اولین انسان کو عقل عطا کی تھی جو اس کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے۔ بس سمجھ لو کہ جس کے پاس عقل ہے، وہ کامل انسان ہے۔ اگر خدا انسانوں کو بازو نہ دیتا تو وہ دنیا میں آکر اپنی عقل کے سہارے بازوؤں کے بغیر بھی کامیاب زندگی کے عادی ہوجاتے۔ اگر خدا انہیں ٹانگیں نہ دیتا تب بھی وہ جینے کا ڈھب سیکھ لیتے۔ ہاتھ پیروں کی موجودگی تو ذہانت کی کمی کو پورا نہیں کرسکتی مگر عقل ہر عضو کی کمی کو پورا کرنے کا راستہ سجھا دیتی ہے اور خدا کی یہ سب سے بڑی نعمت کارل کے پاس ہے۔''
مسز فراتھمن کی آنکھیں بے اختیار بھیگنے لگیں۔ مسٹر فراتھمن سمجھ گئے اور بولے۔ ''پیاری! کیا یہ آنسو تمہارے......''
''نن......نہیں۔ یہ خوشی کے آنسو ہیں۔'' وہ ایک دم بولی۔
''بہت خوب پیاری! مجھے تم سے یہی امید تھی۔''
لیکن کبھی مسز فراتھمن کو لگتا شاید اس کا شوہر پتھر دل ہے مگر ایک رات مطالعہ گاہ میں اس نے اپنے شوہر کو دیوار پر لگی ایک تصویر کے سامنے کھڑے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں میں چرٹ دبا ہوا تھا۔ پشت اس کی طرف تھی۔ تصویر ایک کھیلتے ہوئے بچے کی تھی جو پوری طرح صحت مند تھا۔ مسز فراتھمن نے اپنا رخ بدلا مگر اس سے زیادہ بدل نہ پائی کیونکہ اس نے اپنے شوہر کا سرخ پڑتا چہرہ تاڑ لیا تھا۔ یہی نہیں، ایک رخ سے اس کی ایک آنکھ بھی دیکھی جو بھیگی ہوئی تھی۔ وہ لرز گئی۔
اس کا شوہر بھی اندر ہی اندر ایک غم مسلسل میں تھا مگر ظاہر نہیں کرتا تھا۔ اس نے بھی اپنے شوہر کے اس درد کی ''لاج'' رکھ لی اور خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔ وہ جان گئی تھی کہ وہ یہ درد اس پر اور کم از کم کارل میں ہرگز منتقل کرنے کا خواہاں نہ تھا۔
یوں کارل یہ باتیں سن سن کر سمجھ دار ہوتا گیا۔ کبھی کبھی وہ ماں سے پوچھتا۔
''ماما! آپ مجھے موزے اور جوتے کیوں نہیں پہناتیں؟ گلی کے سب بچے موزے اور جوتے پہنتے ہیں۔''
ماں کہتی۔ ''پیارے کارل! تمہارے پاپ کا حکم ہے کہ تم موزے اور جوتے نہیں پہنو گے کیونکہ تمہیں اپنے بازوؤں کا کام پیروں سے کرنا ہے۔''
''کیوں پیاری ماما! مجھے سب کام پیروں سے کیوں کرنے ہیں؟'' کارل دریافت کرتا۔
''بس، تمہارے پاپا کہتے ہیں کہ ہمارا بیٹا پیروں سے کام کرکے بڑا آدمی بنے گا۔'' مسز فراتھمن اسے سمجھاتی مگر کارل یہ بات صحیح طور پر سمجھ نہ پاتا۔
ایک دن اس نے مسٹر فراتھمن سے دریافت کیا۔
''پاپا! ماما کہتی ہیں کہ میں پیروں سے کام کرکے بڑا آدمی بنوں گا۔ کیا یہ سچ ہے؟''
''ہاں، میرے بیٹے!'' باپ نے اسے پیار سے تھپتھپایا۔ ''تمہاری ماں نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ تم کھیلو گے، پڑھو گے، لکھو گے، کھاؤ پیو گے، نہاؤ گے، اپنے کپڑے تبدیل کرو گے۔ الغرض اپنا ہر کام اپنے پیروں سے اور......

''کیا باجا بھی پیروں سے بجاؤں گا؟'' کارل نے ایک دم سوال کیا تو مسٹر فرانتھن اس کی بات سن کر ایک غور سے اس کی طرف دیکھنے لگے پھر بولے۔

''کیا تمہیں باجا بجانے کا شوق ہے؟''

''ہاں۔'' کارل نے اطمینان سے کہا۔ ''میں باجا ضرور بجاؤں گا۔''

''اچھا۔'' فرانتھن نے محبت سے اسے بھینچا۔ ''ہم تمہیں باجا لا دیں گے۔''

یہ سن کر کارل نے خوشی کا اظہار عجیب انداز سے کیا۔ اس کے پھولے پھولے رخسار سرخ ہو گئے، آنکھیں چمک گئیں اور اس نے اپنا سر فرانتھن کے گھٹنے پر رکھ دیا۔

مسٹر فرانتھن بری طرح متاثر ہوئے۔ انہوں نے کارل کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا اور اس شب سوتے سوتے کارل کو محسوس ہوا کہ کوئی اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہا ہے۔

''کارل! تم پیروں سے کام کر کے بڑے آدمی بنو گے۔''

''تم بڑے آدمی بن سکتے ہو۔''

''تم نام پیدا کرو گے۔''

''تمہیں دنیا یاد رکھے گی۔''

اور پھر یہ سرگوشیاں وہ ہر شب نیند میں سننے لگا۔ دن بھر بھی سرگوشیاں اس کے ذہن میں گردش کرتی رہتیں۔ غرضیکہ یہ سرگوشیاں اس کی رازداں بن گئیں۔ وقت گزرتا رہا۔ نئے نئے واقعات ظہور میں آتے اور لوگوں کو چونکاتے رہے۔ پہلی مرتبہ اسے دیکھنے والے ٹھٹک جاتے۔ ہمدردی اور رحم سے دیکھتے مگر پھر وہ انہیں اپنی ذہین باتوں اور جرأت مندانہ حرکتوں سے حیران کر دیتا پھر یہ حیرانی محبت میں اور محبت فخر میں بدل جاتی۔

غرضیکہ وقت اپنے دامن میں بے شمار واقعات سمیٹے گزرتا رہا اور کارل اپنا مقام آپ بناتا رہا۔ وہ گھر سے باہر نکلتا، بچوں سے ملتا، ان کے کھیلوں میں شریک ہوتا اور جس پارٹی کی طرف ہوتا، اس کی ذہانت کے سبب وہ پارٹی شکست نہ کھاتی۔

ایک وقت آیا کہ گلی میں کھیلنے والا ہر بچہ اسے اپنا پارٹنر بنانے کی خواہش ظاہر کرنے لگا۔ یوں دوستیاں بڑھتی گئیں۔ وہ کھیلنا، لڑنا اور ملنا جلنا سیکھتا گیا۔

جو کام دوسرے بچے اپنے بازوؤں سے کرتے، وہ اپنے پیروں سے کرتا کیونکہ ذہن کا استعمال کرنے کا طریقہ اس نے سیکھ لیا تھا اور ذہن پر صرف ایک جملہ چھا گیا تھا۔

''تم پیروں سے کام کر کے بڑے آدمی بنو گے۔''

لہٰذا اسے کوئی مشکل، مشکل نہ لگتی۔

☆☆☆

اس کے گھر کے سامنے ایک عمارت تعمیر ہو رہی تھی۔ مزدور سیڑھی کے ذریعے چونا، مٹی اور پتھر اوپر پہنچا رہے تھے۔ کارل بھی دیگر بچوں کے ہمراہ انہیں اترتے چڑھتے دیکھتا رہا۔ سب ہی بچے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے اور رائے زنی کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی اور تمام مزدور اپنا اپنا کام سمیٹ کر اپنے ٹھکانوں کو چلے گئے اور زیر تعمیر عمارت میں صرف سیڑھی رہ گئی۔ بچوں کے ہاتھ گویا ایک دلچسپ کھیل آ گیا۔

سب بچے کے بعد دیگرے سیڑھی پر چڑھنے لگے مگر یہ کمسن بچے ایک ایک دو دو ڈنڈے چڑھنے کے بعد خوفزدہ ہو کر اتر آتے اور اگر کوئی اوپر چڑھنا چاہتا بھی تو گر جاتا۔

اس وقت کارل دور کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ یہ کھیل اس کے لیے بھی دلچسپ تھا۔ جب سب بچے ہمت آزما چکے تو کسی نے از راہ ہمدردی کہا۔

''کارل! تم تو سیڑھی نہیں چڑھ سکتے نا؟''

کارل کی فطرت اپنے باپ کی طرح تھی۔ یہ ہمدردی اسے گراں گزری۔ اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''میں سیڑھی چڑھ سکتا ہوں بلکہ اتر بھی سکتا ہوں۔''

سب بچے حیرانی سے اسے تکنے لگے۔ کارل سیڑھی کے پاس گیا اور پہلے ڈنڈے پر بیٹھ گیا اور پھر کھڑا ہو گیا، پھر وہ دوسرے ڈنڈے پر بیٹھ گیا اور تیسرے سے پشت ٹیک کر کھڑا ہو گیا اور اس کے بعد تیسرے پر بیٹھ گیا۔

اس طرح وہ ہر ڈنڈے پر بیٹھ کر اوپر والے کے سہارے کھڑا ہوتا اور اوپر چڑھتا رہا۔ اس وقت کامیابی کی خوشی سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ تمام بچے حیرت و مسرت سے اسے تکتے ہوئے تالیاں بجا رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ سیڑھی کے آخری ڈنڈے پر جا بیٹھا۔

اس شام گلی کے ہر گھر میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ بغیر بازوؤں والا کارل کس طرح سیڑھی چڑھ گیا۔ دوسرے بچوں کی طرح وہ نہ گرا اور نہ اس کے کوئی چوٹ آئی اور جس وقت اس کی ہمت و ذہانت گلی کے ہر گھر کا موضوع بنی ہوئی تھی اس وقت مسٹر فرانتھن اسے سینے سے لگائے محبت سے کہہ رہے تھے۔

''پیارے کارل! یہ زندگی ایک سیڑھی کے مانند ہے۔ ایک کے بعد دوسرا مرحلہ اور دوسرے کے بعد تیسرا۔

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

یاد رکھو، اس کا ہر مرحلہ تمہیں اسی طرح گزارنا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ تمہیں تمام عمر سیڑھی چڑھنا ہے۔"

کارل کے بچپن کا یہ واقعہ اپنی نوعیت کا عجیب واقعہ تھا جس نے لوگوں کو حیران کردیا تھا پھر کارل کا ذہن وسیع ہوتا گیا۔ اس کے مشاغل بدلتے گئے۔ اس کے تجربات میں اضافہ ہوتا رہا۔

ایک دن وہ گھر سے نکلا تو گھر کے سامنے والے اسکول میں گھنٹا بج رہا تھا اور بچے تیزی سے وہاں جمع ہو رہے تھے۔ یہ سب بچے اس کے ساتھی نہ تھے لہٰذا کارل نے سوچا کہ کیوں نہ ان بچوں سے بھی دوستی کی جائے جو اسکول میں پڑھتے ہیں اور عمر میں اس سے قدرے بڑے ہیں۔

لہٰذا یہ سوچ کر وہ اسکول پہنچ گیا۔ اس وقت دعا ہو رہی تھی۔ دعا کے الفاظ اسے بہت پسند آئے۔ جب دعا ختم کر کے طلبا اپنی اپنی کلاسوں میں گئے تو وہ بھی ایک کلاس میں گھس گیا۔ اس وقت سب نے اسے چونک کر دیکھا۔ کسی نے کہا۔

"ارے، یہ تو وہی ہے جو سیڑھی پر چڑھ گیا تھا۔"

کوئی بولا۔ "اس کے بازو نہیں ہیں، بے چارے کے۔"

کسی نے پوچھا۔ "تم سب کام کیسے کرتے ہو کارل؟"

"اپنے پیروں سے۔" کارل نے جواب دیا۔ "میں پیروں سے کام کر کے بڑا آدمی بنوں گا۔"

اس وقت کئی بچے ہنس دیے مگر معلم فلپس نے کہا۔

"بچو! سبق سنو اور کارل تم بھی بیٹھ جاؤ اور سبق سنو۔"

فلپس درس دیتا رہا اور کارل بغور سنتا رہا۔ اس کے کان استاد کی آواز پر تھے مگر نظریں سب بچوں کے ہاتھوں پر جو ایک ہاتھ سے سلیٹ تھامے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں چاک لیے لکھنے میں مصروف تھے۔

یہ دن کارل کو نئی سوچیں اور نیا حوصلہ دے گیا۔ دوسرے دن جب وہ اس کلاس میں آیا تو سلیٹ اور چاک اس کے تھیلے میں بھی تھا۔ یہ تھیلا اس نے گردن میں ڈالا ہوا تھا۔ جب درس کا آغاز ہوا تو سب بچے اسے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

وہ ایک پیر سے سلیٹ سنبھالے، دوسرے پیر کی انگلیوں اور انگوٹھے میں چاک لیے لکھنے کی کوشش کر رہا تھا پھر انہوں نے دیکھا کہ آہستہ آہستہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گیا یہاں تک کہ کلاس ختم ہونے تک وہ بلیک بورڈ پر لکھے ہوئے حروف کو بڑی خوب صورتی سے اپنی سلیٹ پر نقل کر رہا تھا اور اس کا خط بھی بڑا خوشنما تھا۔ یہ خبر اسکول سے گھر گھر پہنچ گئی اور استاد فلپس نے مسٹر فراتھمن سے خود سفارش کرتے ہوئے کہا۔

"جناب! ننھے کارل کو اسکول میں داخل کرا دیجیے۔"

"مگر وہ ابھی صرف چھ برس کا ہے۔" فراتھمن نے کہا۔ "کیا یہ عمر اسکول کے لیے کم نہیں ہے؟" (اس زمانے میں اتنی عمر کے بچوں کو اسکول داخل نہیں کرایا جاتا تھا۔ اس وقت نرسری، کنڈر کلاس یا کے جی ون قسم کی کلاسز نہیں ہوا کرتی تھیں)۔

استاد فلپس جواب میں مسٹر فراتھمن سے بولے۔

"بے شک عمر کم ہے لیکن کارل عام بچہ نہیں ہے۔ ذہنی لحاظ سے وہ دوسرے بچوں سے بہت آگے ہے اور پھر میری خواہش ہے کہ وہ میرے ہی اسکول میں پڑھے۔ آپ کا بچہ قابلِ فخر ہے۔"

دوسرے دن کارل کو اسکول میں داخل کر دیا گیا۔

کارل بہت خوش تھا۔ پیروں کی انگلیوں اور انگوٹھے کی مدد سے لکھنا اس کے لیے بڑا دلچسپ مشغلہ تھا۔ ہر روز نئے نئے حروف لکھنا، انہیں سیکھنا، پڑھنا اور آگے بڑھنے کی جدوجہد کرنا کارل کو بہت اچھا لگتا تھا۔

ایک دن مسٹر فراتھمن نے اپنی بیوی کارلا سے کہا۔

"جان! ہمارا بیٹا زندگی کی ایک سیڑھی چڑھ گیا ہے۔"

اور کارلا یعنی مسز فراتھمن مسکرا دیں لیکن یہ ایک ایسی مسکراہٹ تھی جس میں ہنوز دکھ شامل تھا مگر مسٹر فراتھمن فخر سے ہنس رہے تھے۔

کارل اپنے اسکول کا ہونہار طالب علم بنتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے سب کام خود کرنے کی عادت ڈال رہا تھا۔ وہ سب کچھ جو دوسرے لوگ ہاتھوں سے انجام دیتے، وہ پیروں سے کرتا تھا۔ اگرچہ ہر کام اس جیسے معذور بچے کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا۔ کپڑے اتارنا، پہننا، غسل کرنا، دانت صاف کرنا، پتلون اور جیکٹ کے بٹن لگانا، کنگھا کرنا اور جوتے پالش کرنا وغیرہ۔ یہ تمام کام دوسرے بچوں کے لیے بڑے آسان تھے مگر ان کی تکمیل کے لیے کارل کا عضو عضو ٹوٹ جاتا تھا لیکن کارل یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ یہ سب کچھ پیروں سے کرے گا۔

لہٰذا وہ کوشش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ماہر ہو گیا۔ وہ پیروں کے انگوٹھوں کو جسم کے ہر حصے تک لے جاتا، ہر ہلکی اور بھاری چیز انگوٹھوں سے سنبھال لیتا۔ جب وہ اپنے کام آسانی سے خود کرنے لگا تو اسے بڑی طمانیت محسوس ہوئی اور اس نے خود سے کہا:

’’کارل! آج تم زندگی کی دوسری سیڑھی چڑھ گئے ہو۔‘‘ پھر وہ خود ہی ہنس دیا۔ ایک ایسی ہنسی جس میں گزرے لمحوں کی یادیں شامل تھیں۔ افسردگی بھی، فخر بھی اور حسین توقعات بھی۔

☆☆☆

سہ پہر کا وقت تھا۔ شام بھی دور تھی مگر آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ وقت کے حسن اور موسم کی رنگینی سے بے نیاز دس سالہ کارل ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے وائلن رکھا تھا جسے دیکھتے ہوئے تصور ہی تصور میں وہ اس محفل میں پہنچا ہوا تھا جہاں چند دن قبل مسٹر فریڈرک نے آرکسٹرا پر ایک خوب صورت دُھن سنائی تھی جس نے دس سالہ کارل کو مست کر دیا تھا۔ اس لمحے اس کا دل چاہا تھا کہ وہ بھی ایسی ہی دھن تیار کرے۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ موسیقی نے اس کے جذبات کے تاروں کو چھیڑ دیا ہے۔

یوں اس دعوت سے واپس آکر وہ مسلسل اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے موسیقی سے لگاؤ تو ہمیشہ سے ہی تھا مگر اب یہ دیرینہ خواہش اس طرح جاگی تھی کہ وہ بے قابو ہو گیا تھا اور جب اگلے دن مسٹر فریڈرک اس کے گھر آئے تو اس نے ان سے کہا۔

’’انکل! میں خود ساز بجانا چاہتا ہوں۔‘‘

اس کی بات سن کر مسٹر فریڈرک نے چونک کر اسے اور پھر اس کے والدین کو دیکھا۔ اس وقت مسز فرانتھن افسردہ ہو گئیں مگر مسٹر فرانتھن نے پیار سے کہا۔

’’کارل! تم ضرور اپنی خواہش پوری کرو اور میں سمجھتا ہوں تم ساز بجا لو گے۔‘‘

یہ سن کر مسٹر فریڈرک نے کچھ عجیب سے لہجے میں کہا۔

’’مسٹر فرانتھن! صرف ہاتھوں کی انگلیاں ہی تاروں کو چھیڑ کر اپنی نازک حرکات سے ان میں آواز کا جادو جگا سکتی ہیں۔ اس کے بغیر یہ ناممکن ہے۔‘‘

’’مسٹر فریڈرک!‘‘ فرانتھن نے ایک دم مشتعل ہو کر کہا۔ ’’میرے بیٹے کارل کے لیے کوئی کام ناممکن نہیں ہے۔ آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ میرا بیٹا غیر معمولی ذہن رکھتا ہے اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے سب سے بڑی چیز ذہن ہے...... صرف ذہن۔‘‘

’’اوہ، معاف کرنا مسٹر فرانتھن!‘‘ فریڈرک نے معذرتی انداز میں کہا۔ ’’میں بھول گیا تھا کہ تم کارل کے لیے حد درجہ حساس ہو۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ موسیقی کا علم خاصا مشکل اور ساز بجانا وقت طلب کام ہے۔‘‘

’’انکل!‘‘ کارل نے ایک دم سوال کیا۔ ’’آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا کہ بازوؤں سے محروم انسان کے لیے ساز بجانا ناممکن ہے۔‘‘

اس سوال پر مسٹر فریڈرک اور مسز فرانتھن نے تردد آمیز انداز میں اسے دیکھا۔ تب ہی وہ خود بولا۔

’’کیا میں نے اپنی دس سالہ زندگی میں کئی مشکل اور ناممکن کام سرانجام دے کر یہ ثابت نہیں کر دیا کہ میں ہر مشکل پر قابو پا سکتا ہوں۔‘‘

’’بے شک۔‘‘ مسٹر فریڈرک نے کھلے دل سے تعریف کی۔ ’’ہم نے تمہاری لکھی ہوئی تحریریں دیکھی ہیں جو اس عمر کا کوئی بچہ نہیں لکھ سکتا۔ تمہارا خط خوشنما اور تحریر پُراثر ہے۔ ہم نے تمہیں بٹن لگاتے ہوئے دیکھا ہے اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تم غیر معمولی انسان ہو گے۔‘‘

’’اور کچھ عرصے بعد آپ یہ بھی سن لیں گے کہ کارل نے موسیقی کے فن میں مہارت حاصل کر لی ہے۔‘‘ کارل نے جلدی سے کہا۔

’’ہمیں یقین ہے۔‘‘ مسٹر فرانتھن نے فخر سے اپنے لختِ جگر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’ہمارا بیٹا بڑے آدمیوں کی تاریخ میں اپنے نام کا اضافہ کرے گا اور یاد رکھنا، صرف دو چیزیں انسان کو بڑے آدمیوں کی صف میں لاتی ہیں۔ عشق میں ناکامی اور کمتری کا احساس...... اور کمتری کا احساس کسی کمی کے باعث ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا میں اس انسان کے لیے جو کسی نمایاں خامی کا شکار ہو، یہ پیش گوئی کر سکتا ہوں کہ وہ اگر ذرا سی محنت کرے تو نارمل انسانوں سے زیادہ کامیاب ثابت ہو سکتا ہے۔‘‘

جب مسٹر فریڈرک قائل ہو کر چلے گئے تب مسٹر فرانتھن نے اس سے کہا۔

’’کارل بیٹے! جو بات تم نے انکل سے کہی ہے اس کا عملی ثبوت بھی پیش کرنا۔ یاد رکھو، سب سے قوی انسان وہ ہے جو اپنے الفاظ پر قائم رہے اور سب سے کمزور وہ ہے جو اپنی بات سے پھر جائے کیونکہ انسان کی پستی و بلندی کی پہچان اس کے الفاظ اور اس کے عمل سے ہوتی ہے۔ جن لوگوں کے عمل اور قول میں تضاد ہوتا ہے وہ کبھی بڑے آدمی نہیں بن سکتے۔‘‘

’’پیارے پاپا!‘‘ کارل نے اطمینان سے جواب میں کہا۔ ’’میں اپنی بات سچ کر دکھاؤں گا۔ کچھ عرصے بعد دنیا مجھے موسیقار کہے گی۔‘‘

اسی دن سے وائلن اس کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ وہ

اسے سامنے رکھ کر اس کا مطالعہ کرتا رہتا۔ آج اس کی یہی کیفیت تھی۔ بہت غور و فکر کے بعد اس کے ذہن میں نہ جانے کیسی بجلی چمکی کہ گھر میں عجیب و غریب آوازیں گونجنے لگیں۔

”ارے یہ کیسی چیخ و پکار ہے؟“ کوئی بولا۔

”دیکھو تو یہ خونخوار آوازیں کیسی ہیں؟“

چند لمحوں بعد سب نے دیکھا کہ عقبی چمن کے ایک گوشے میں معذور کارل اپنے پیروں کی انگلیوں سے وائلن کو چھو رہا تھا جس کے نتیجے میں یہ بے ہنگم آواز فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ اس وقت وہ بڑا مسرور تھا جیسے مدتوں کی خواہش پوری ہو گئی ہو۔

اس دن تو وہ صحیح طور پر وائلن نہ بجا سکا مگر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ پیروں کی انگلیوں کو ہاتھوں کی انگلیوں کی طرح استعمال کر سکتا ہے اور اچھا موسیقار بن سکتا ہے۔

پھر یہ اس کا مشغل بن گیا۔ موسیقی پر کتابیں پڑھنا، خوب صورت تحریریں لکھنا اور ساز بجانا ہی اس کا کام تھا۔ وہ اپنے پیروں کی انگلیوں اور انگوٹھوں کو اپنی مرضی کے مطابق اس طرح مصروف کرتا کہ جس تار کو چاہتا وہی حرکت کرتا اور جس انگلی کو چاہتا وہی کام کرتی۔

یوں پیروں کی انگلیوں کی نازک اور لطیف حرکات سے بے جان تاروں میں خوش آہنگ آوازیں پیدا کرنا بڑا ہی مشکل کام تھا مگر کارل اس فن میں مہارت حاصل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ لہٰذا وہ محنت کرتا رہا۔ اس نے وائلن پر کئی ترانوں کی پریکٹس کی، کئی دھنیں بجائیں۔ یوں چھ برس کا عرصہ گزر گیا۔

اثنائے راہ...... ساز بجانے اور علم حاصل کرنے کے علاوہ اس نے کئی کام اور بھی سیکھے۔ مثلاً انگوٹھوں کی مدد سے اب وہ شیو بنا لیتا۔ نیچی سائیکل پر بیٹھ کر علاقے کا چکر لگا لیتا اور سب سے انوکھا کام جو اس نے کیا، وہ تیرنا تھا۔ یہ واقعہ اس کی زندگی کا بڑا عجیب واقعہ تھا۔

گرمیوں کی شاموں میں بل کھاتی نہر کے کنارے چند گھنٹے گزارنا اور تیرتے ہوئے لڑکے، لڑکیوں کو دیکھنا اسے بے حد پسند تھا۔ یہ نہر اس کے گھر سے زیادہ دور نہ تھی۔

ایک شام وہ نہر کے کنارے کھڑا تھا اور اس کے ساتھی چارلس اور ویلز حسب عادت تیر رہے تھے۔ لڑکیاں کچھ تیر چکی تھیں، کچھ اس موڈ میں تھیں کہ ایک دم کارل نے کہا۔

”دوستو! کیا تم مجھے تیرتا ہوا دیکھنا پسند کرو گے؟“

”ضرور۔“ چارلس نے سر نکالتے ہوئے جواب دیا۔ ”مگر کارل! تمہیں احتیاط رکھنی چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ ذہن بہت بڑی قوت ہے مگر دوست! بازوؤں کے بغیر تیرنا ناممکن ہے۔“

”اوہ، میرے دوست!“ کارل نے اپنے باپ کی طرح چڑتے ہوئے کہا۔

”میرے سامنے ممکن اور ناممکن کی بات مت کیا کرو۔ میں ناممکن کے معنی سے ہی ناآشنا ہوں۔“ کہتے ہوئے وہ پانی میں کود گیا۔

چارلس اور ویلز اس منظر کو دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ لڑکیوں کی تو چیخیں نکل گئیں۔ سب کے لیے یہ منظر بڑا دہشت ناک تھا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ حواس باختہ اسے تکتے رہے۔ جب ذرا عقل ٹھکانے آئی تو انہوں نے دیکھا کہ کارل اپنے سینے اور پیروں پر زور ڈال کر پانی کو کاٹنے کی شدید جدوجہد کر رہا ہے۔

ویلز نے چلا کر کہا۔

”کارل! کیا تم ہماری مدد کی ضرورت محسوس کر رہے ہو؟“

”نہیں۔“ کارل نے زور سے کہا۔ ”میں نے آج تک کسی کی مدد کی ضرورت محسوس نہیں کی اور مجھے یقین ہے کہ میں کبھی محسوس بھی نہیں کروں گا۔“

”مگر تمہارا سانس پھول رہا ہے۔“ اس بار چارلس نے کہا۔ ”کیا تم کنارے تک آ جاؤ گے؟“

اس بار کارل نے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ وہ اپنا سر اونچا رکھ کر سینے کی پوری قوت سے پانی کو کاٹ رہا تھا اور اس کی دونوں ٹانگیں پانی کو پیچھے دھکیل رہی تھیں۔

اس کا توازن بار بار بگڑ رہا تھا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اس کا وجود متوازن ہو گیا۔ سینہ آگے بڑھنے کے لیے راستہ بناتے اور ٹانگیں پانی کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہوتی گئیں۔

کنارے پر موجود لوگوں نے اندازہ کر لیا کہ اس کا توازن قائم ہو گیا ہے۔ کافی دیر بعد وہ اپنے جسم کی تمام طاقت کو استعمال کر کے بیچ نہر سے کنارے پر لوٹ آیا اور پیروں کے انگوٹھوں کو جما کر خشکی پر چڑھ گیا مگر آج اس کے پھیپھڑوں میں پانی بھر گیا تھا اور وہ بری طرح کھانس رہا تھا۔ اب وہ ہر طرف سے ساتھیوں کے اعتراضات سن رہا تھا۔

چارلس نے کہا۔

”کارل! میں نے تمہیں اسی لیے روکا تھا کہ کہیں تم پر کھانسی کا حملہ نہ ہو جائے۔ مجھے بھی پہلی بار یونہی کھانسی اٹھی تھی۔“

”دوست!“ ویلز بولا۔ ”تیرنا تو اچھے اچھوں کے بس کی بات نہیں ہے اور تم تو بہرحال بازوؤں سے محروم ہو۔“

”دیکھو آئندہ یہ حماقت نہ کرنا۔“ کہتے ہوئے جیک نے اس کی پیٹھ پر ہلکے سے دھپ جمائی۔

"کارل! جب تم پانی میں کودے تو مجھے یقین تھا کہ تم واپس نہ آؤ گے۔" ایک لڑکی بولی۔

"لیکن کچھ بھی ہو، ہم گھبرا گئے تھے مگر کارل نہیں گھبرایا۔" جیک نے مسکرا کر کہا۔

"کارل!" لڑکی نے سنجیدگی سے کہا۔ "اگر تم مرجاتے تو یقیناً ہم ایک اچھے دوست سے محروم ہوجاتے۔"

کارل یہ باتیں سن کر ہنس دیا۔ اس ہنسی میں افسردگی بھی تھی اور یقین بھی۔

بہرکیف، اس نے کھانسی پر قابو پاتے ہوئے ان سب سے کہا۔

"گواہ رہنا میرے دوستو! پانی میں میرا یہ پہلا دن تھا۔"

☆☆☆

اس دن کے بعد وہ اکثر نہر میں کودنے لگا۔ وہ شدید جدوجہد اور پیروں پر زور ڈال کر اپنا توازن تندرست لڑکوں کی طرح برقرار رکھنے کی کوشش میں کامیاب ہوتا گیا۔ اس سعی حاصل کار میں اگرچہ وہ تھکا بھی، لڑکھڑایا بھی، اس کے پھیپھڑوں میں پانی بھی بھرا، اسے کھانسی نے بھی نڈھال کیا مگر اس نے اپنی ذہنی قوت سے ہر کمزوری کو شکست دے دی اور اپنے بے پناہ اعتماد سے سب کو ہرا دیا اور لوگوں پر ثابت کردیا کہ ذہن سب سے بڑی قوت اور عقل سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ جس انسان کے پاس یہ نعمت ہو وہ کسی عضو سے محروم ہونے کے باوجود بھی محروم نہیں ہوتا۔

اکثر شام میں وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ تیرنے جاتا۔ اس کی موجودگی میں سب کے انداز میں عقیدت ہوتی اور غیر موجودگی میں وہ خاص موضوع بن جاتا۔

چارلس کہتا۔

"کارل کا سینہ پانی کے بہاؤ کو کاٹ کر آگے بڑھنے کا راستہ بنانے کے لیے غیر معمولی قوت رکھتا ہے۔"

"نہیں دوست!" ویلز رائے دیتا۔ "دراصل اس کے پیر تیزی سے پانی کو پیچھے دھکیلتے ہیں۔ اس طرح آگے راستہ نکل آتا ہے۔"

"اس نے ہر کام کے لیے پیروں کی انگلیوں اور انگوٹھوں کو مضبوط کرلیا ہے اور اب وہ ہر کام انہی سے لیتا ہے ورنہ تیرنا تو ایسے انسان کے لیے ناممکن بات ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہو، یہ بڑے حوصلے اور اعتماد کی بات ہے۔"

یہ چھ برس اور بیت چلے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ فنِ موسیقی کی باقاعدہ تربیت لے گا اور مختلف علوم حاصل کرے گا۔ مسٹر فرانتھن اس سے پوری طرح متفق تھے۔

لہٰذا حتمی فیصلے کے بعد سولہ سالہ کارل کو بڑے تزک واحتشام کے ساتھ کنزرویٹری بھیجا گیا۔

کنزرویٹری (موسیقی کی یورپی درس گاہ) میں فنِ موسیقی، موسیقی کے بارے میں نظریات کے علاوہ گانے کی تربیت اور جمالیات وتاریخ کا علم بھی پڑھایا جاتا تھا۔

یہاں پر کارل کا پہلا دن بڑا عجیب تھا۔ مسٹر امینول اپنی کرسی پر براجمان تھے اور خوب صورت کارل ان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی آمد کی غرض اور جنون کی حد تک موسیقی کے شوق کو دیکھ کر مسٹر امینول نے سوال کیا۔

"نوجوان کارل! تم موسیقی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"جناب!" کارل نے ادب سے کہا۔ "اس فن کے شائق کی حیثیت سے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ موسیقار کے سامنے قوتِ تخیل کی بدولت تمام بے جان، بے حس اشیا میں جان آجاتی ہے۔ زمین، آسمان، چاند، ستارے، دریا، شور مچاتی لہریں، ڈوبتی شام اور ابھرتی صبح ان سب اشیا کا ظاہر گویائی بن جاتا ہے۔ موسیقار کا تخیل اور اس کے لطیف محسوسات اس کی سماعت بن جاتے ہیں اور پھر جو کام دوسرا نہیں کرسکتا، وہ ایک موسیقار کرلیتا ہے۔ وہ بے جان تاروں میں جذبوں کی روح پھونک کر سننے والے کو مسحور کردیتا ہے۔ محترم استاد! بظاہر موسیقی کا مقصد طبیعت کا انبساط سمجھا جاتا ہے لیکن میری نظر میں موسیقی پر اس سے بڑا ظلم اور کوئی نہیں کہ اسے صرف ہنگامہ آرائی اور انبساط کے لیے استعمال کیا جائے۔ یہ خیال پیشہ ور موسیقار کرسکتے ہیں مگر ایک سچا فنکار نہیں کیونکہ ایک موسیقار کی انگلیاں بظاہر بے جان تاروں سے لطیف آوازوں کا ہنگم پیدا کرتی ہیں مگر دراصل وہ انسانی جذبات کو چھیڑ دیتی ہیں۔ اس لیے ہم بھی موسیقی کے ذریعے اپنے جذبات کو پہچانتے ہیں۔"

مسٹر امینول سیدھے ہوکر بیٹھ گئے تھے اور حیرت سے اس معذور نوجوان کی بات سن رہے تھے۔ آج تک یہاں آنے والے کسی طالبِ علم نے اس قابلیت کا مظاہرہ نہ کیا تھا۔

امینول نے کہا۔

"مسٹر کارل! میں آپ کے حسین ذہن کی تعریف کے بغیر نہیں رہ سکتا اور چونکہ آپ ایک باحوصلہ اور ذہین نوجوان ہیں لہٰذا میں براہِ راست وہ سوال کرنے کی جراُت کروں گا جو عام حالات میں کرنا نہیں چاہیے۔ کیا میں ذاتی قسم کا وہ سوال پوچھ لوں؟"

''آپ مجھ سے ہر قسم کا سوال کر سکتے ہیں۔'' کارل نے بڑے اعتماد اور وقار سے کہا۔

''آپ دونوں بازوؤں سے محروم ہیں۔ ایسی حالت میں موسیقی سے لگاؤ اور چیز ہے مگر کنزرویٹری کا طالب علم بن کر مہارت حاصل کرنا اور یہاں سے واپس جا کر اس فن کی حفاظت کرنا اور چیز ہے۔ کیا آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کامیاب ہو جائیں گے؟''

''میں اگر دعویٰ کروں کہ مستقبل کے مؤرخین کنزرویٹری کا ذکر صرف اس لیے کریں گے کہ یہاں کارل اتھمن نے تربیت لی تھی تو بھی میری ذات کے ساتھ انصاف نہ ہوگا۔ میں کیا کر سکتا ہوں، یہ زبانی نہیں بلکہ عمل سے قائل کرنا چاہتا ہوں اور عمل کے لیے آپ مجھے موقع دیجیے۔''

مسٹر امینول پھر چونک گئے۔ انہیں محسوس ہوا کہ کارل کی آنکھیں تسخیر کر لینے کی پوری قوت رکھتی ہیں۔

انہوں نے کہا۔

''نوجوان! میں تمہیں یہاں داخل کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں جبکہ تمہاری ظاہری حالت افسوسناک ہے۔ کاش خدا تمہیں بازو عطا کر دیتا۔''

''اس وقت میں صرف ایک ایسا آدمی ہوتا جو چند برس علم حاصل کر کے روزگار کی فکر میں ہوتا اور کروڑوں آدمیوں کی طرح بیوی بچوں کے ساتھ عام زندگی گزار دیتا۔ مسٹر امینول! خدا بے انصاف نہیں ہے۔ جس طرح خوب صورت بوتلوں میں شراب ہوتی ہے اور معمولی سستی بوتلوں میں ہمارے امراض کی دوا۔ اسی طرح کبھی کبھی ٹوٹے پھوٹے جسموں میں کامل ذہن اور خوب صورت روح موجود ہوتی ہے مگر انسانوں کی نظر باطن تک نہیں پہنچتی بلکہ ہمارے ظاہر سے ٹکرا کر لوٹ جاتی ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ انسان ادھورا ہے حالانکہ کبھی کبھی وہی ادھورا انسان دوسروں کی تکمیل کا باعث بن جاتا ہے۔''

''نوجوان کارل! مسٹر فرا اتھمن کے قابلِ فخر بیٹے! تم نے ہمیں قائل کر دیا۔ ہم تمہارے خوب صورت ذہن کو سلام کرتے ہیں۔'' کہتے ہوئے امینول جذباتی ہو کر کھڑے ہو گئے۔

اس کے بعد کارل نے یہاں علم و فن کا باقاعدہ درس لینا شروع کر دیا۔ یہ زمانہ اس کے لیے بہترین زمانہ تھا۔ اس باہمت فنکار نے شب و روز محنت کر کے اپنے فن کو کمال تک پہنچا دیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں اور استادوں کو فن کے صحیح معنی سمجھا دیے۔

یہاں اس نے فنِ موسیقی کے علاوہ دیگر علوم کا بھی مطالعہ کیا۔ یہاں تک کہ چار سال کے قلیل عرصے میں وہ علمی، ادبی، اخلاقی اور فنی لحاظ سے ایک کامل انسان بن گیا۔

جب وہ اس عظیم درس گاہ سے فارغ التحصیل ہو کر لوٹا تو لوگ اسے ایک بڑے موسیقار اور چوٹی کے فنکار کے نام سے جانتے تھے۔

''کارل اتھمن موسیقار!''

''بغیر بازوؤں والا موسیقار۔''

''معذور موسیقار۔''

☆☆☆

مارچ 1968ء کی وہ شام بڑی خوب صورت تھی۔ شہر کا میوزک ہال روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ اس ہال میں موسیقی کے پروگرام ہوتے تھے اور کبھی رقص و سرود کی محفلیں جمتی تھیں۔ کبھی بڑے بڑے فنکار یہاں جمع ہوتے، کبھی خوش گلو، خوش شکل اور خوش اندام رقاصائیں تماش بینوں کو اپنے فن سے مست کر دیتی تھیں اور کبھی کبھی یہاں اعلیٰ قسم کے اسٹیج ڈرامے پیش کیے جاتے۔ غرضیکہ یہ ہال اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا لیکن آج یہاں ایک نوعمر موسیقار کارل اتھمن آنے والا تھا۔ کنزرویٹری سے موسیقی کی بہترین تربیت لینے کے بعد وہ پہلی بار اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والا تھا۔

اس وقت اکثر افراد اس بات سے واقف ہو چکے تھے کہ کارل بغیر بازوؤں کا انسان ہے جو اپنی ہمت سے ایک بڑا فنکار بن گیا ہے مگر ان میں سے چند ہی ایسے تھے جنہوں نے اسے دیکھا تھا۔

یوں بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو دل کی گہرائیوں سے یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ بغیر بازوؤں والا نوجوان ایک اچھا تیراک، ایک بہترین موسیقار اور ایک حوصلہ مند انسان ہو سکتا ہے۔

کچھ لڑکیاں یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھیں کہ کارل اتھمن اپنے پیر کی انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے بہترین لکھ سکتا ہے۔ غرضیکہ ہال میں کئی ٹولیاں بنی ہوئی تھیں اور موضوعِ سخن وہی تھا۔

اس درمیان میں ایک انجان لڑکی نے دوسری سے دریافت کیا۔

''انتولی! میں نے سنا ہے کہ کارل اتھمن آرکسٹرا پر کئی خوب صورت دھنیں تیار کر چکا ہے؟''

''ہاں، میں نے بھی یہی سنا ہے۔'' انتولی بولی۔ ''اور خواتین کی اکثریت اس سے ناواقف ہے کہ وہ کسی سے ملتا

ہی نہیں۔“

”آج ہم اس سے ملنے اور گفتگو کرنے کا فیصلہ کر کے آئے ہیں۔“ کئی لڑکیوں نے کہا۔ باقی خواتین ان کی تائید کرنے لگیں۔

ہال میں موجود مردوں کی محفل بھی اسی ذکر سے آراستہ تھی۔ جو اسے جانتے تھے وہ اپنی معلومات کا اظہار کر رہے تھے۔ جنہیں علم نہ تھا وہ بے یقینی کے انداز میں سن رہے تھے۔ ان میں اکثریت اس کے مداحوں کی تھی۔

اس درمیان میں کسی نے کہا۔

”کارل اتھمن وہی بیس سالہ لڑکا ہے نا جو پیدائشی دونوں بازوؤں سے محروم ہے؟“

”ہاں، مگر اس نے اپنے علم کی ابتدا جس اسکول سے کی تھی، وہاں میں بھی پڑھتا تھا۔“ کسی نے کہا۔

”سنا ہے اس معذور انسان کا سینہ متعدد علوم کا خزانہ ہے؟“

”واقعی یہ بہت بڑا کمال ہے کہ بازوؤں سے محروم شخص اتنا بڑا موسیقار بن گیا ہے۔“

”ہاں، جب آرکسٹرا بجاتا ہے تو مست کر دیتا ہے۔“

”آج موسیقی کی دنیا میں کوئی کارل اتھمن کا ثانی نہیں ہے۔ وہ بے پناہ صلاحیتوں کا مالک ہے۔“

اس کے مداح جوش و خروش سے اس کی تعریفیں کر رہے تھے اور ہال میں ایسے بھی لوگ تھے جو ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔

”دیکھے اور ملے بغیر کیسے یقین کر لیا جائے کہ کوئی شخص ایسا ہو سکتا ہے۔“

”میں یقین نہیں کرتا کہ بازوؤں کے بغیر کوئی انسان تیر سکتا ہے۔ ہاتھوں کے بجائے پیروں سے کوئی انسان ساز بجا سکتا ہے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں۔“

”ارے بھئی شعبدہ بازی کا زمانہ ہے۔ پیچھے کسی موسیقار کو بٹھا لیتا ہوگا اور آگے خود بیٹھ جاتا ہوگا۔ اس طرح دنیا کو اپنا دیوانہ بنا لیا ہے۔“

”اونہہ، دنیا کا کیا ہے۔ جسے عزت، شہرت اور دولت ملتی ہے، اسی کے گن گانے لگتی ہے۔ اس میں ہر خوبی پیدا کر دیتی ہے۔ یہ دور ہی صرف دولت کا ہے۔ شہرت اور دولت ہر عیب اور ہر برائی پر پردہ ڈال دیتی ہے۔“

غرضیکہ ہال میں موجود ہر شخص اسے موضوع بنائے بے چینی سے اس کا منتظر و مشتاق تھا۔ ان کے سامنے اسٹیج تھا جس پر پردوں کے عقب میں وہ ہستی بیٹھی ہوئی تھی جس میں غیر معمولی صلاحیتیں تھیں اور اس نے انہیں اجاگر کرنے کے لیے اس عجیب و غریب میدان میں قدم رکھا تھا جہاں ہاتھوں کے سہارے سفر کیا جاتا ہے مگر وہ ہاتھوں سے محروم تھا۔ اس کے باوجود اس نے اس ناقابلِ عبور میدان کو اس طرح طے کر لیا تھا کہ آج اس کے ملک میں اس کے مقابلے کا کوئی دوسرا نہ تھا۔ لوگ کہہ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد تالیوں کی گونج میں اسٹیج کا پردہ اٹھا۔ تندرست و توانا جسم، دراز قد اور خوب صورت، روشن چہرے کا مالک کارل اتھمن ایک کرسی پر براجمان تھا۔

اس کے بغیر بازوؤں کے کندھے سیدھے تھے۔ اس کا بڑا سر ذہانت اور سرداری کی غمازی کر رہا تھا۔ آنکھیں کشادہ اور علم کی شاہد تھیں۔ ابھی دیکھنے والے اسے دیکھ ہی رہے تھے کہ آرکسٹرا کی سریلی دھن نے ان سب کی توجہ بٹا دی اور تھوڑی ہی دیر میں سب مست ہو گئے۔

وقت گزرتا رہا مگر کسی کو نہ وقت گزرنے کا احساس ہوا نہ اپنے وجود کا۔ ایک بیس سالہ نوجوان نے انہیں مسحور کر رکھا تھا۔ یہ پروگرام کئی گھنٹے جاری رہا۔

دیکھنے والے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ اس خوب صورت معذور نوجوان نے اپنے پیروں کی مدد سے آرکسٹرا پر کئی دھنیں پیش کیں جو اس نے خود ہی تیار کی تھیں۔

جو لوگ یہ بات ماننے کو تیار نہ تھے کہ دنیا کا معذور کارل پیروں کی انگلیوں سے ساز بجاتا ہے، اب وہ سب اس کی عظمت پر ایمان لے آئے تھے۔ جن لوگوں نے سنا تھا کہ کارل بغیر بازوؤں کے بہترین تیرتا ہے اور جو یہ سن کر بے یقینی سے ہنس دیتے تھے آج کہہ رہے تھے۔

”یقیناً وہ ہاتھوں کے سہارے کے بغیر سب کچھ کر سکتا ہے۔“

”وہ تیر سکتا ہے۔“

”وہ سائیکل سنبھال لیتا ہے۔“

”وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ جاتا ہے۔“

”وہ اپنا ہر کام صحت مند لوگوں کی طرح کر سکتا ہے۔“

”جب وہ موسیقی میں اس قدر مہارت حاصل کر سکتا ہے تو پھر سب کچھ کر سکتا ہے۔“

لوگ مست ہو کر اس کے گن گا رہے تھے۔ یہاں تک کہ رات ہوئی اور پروگرام کا وقت ختم ہو گیا۔ اس سے قبل کہ اسٹیج کا پردہ گرایا جاتا، تماش بین اسٹیج کو گھیر چکے تھے۔ صرف اس لیے کہ کارل کو قریب سے دیکھ سکیں، کارل سے ہم کلام ہو سکیں، اس سے مصافحہ (چھو) کر سکیں۔

کارل نے ان سب کو سلام کیا۔ ہاتھ کے بجائے پیر سے...... پھر نوجوانوں کی ٹولی نے اسے گھیر لیا۔ کوئی اس کے

ساتھ تصویر کھنچوانا چاہتا تھا، کوئی آٹو گراف لینے کے لیے قریب آ گیا تھا۔ کارل سر جھکائے اپنے پاؤں کی انگلیوں سے ان کی کاپیوں پر لکھتا رہا پھر اچانک ایک گلابی چھوٹی کاپی کے صفحے پر خوش نما لکھی ہوئی ایک سطر نے اسے چونکا دیا۔

''اے عظیم فنکار! میں تجھے سلام کرتی ہوں...... کہ پیر کی انگلیوں سے فن کو نوازا ہے۔ تو موسیقی کی دنیا کا بادشاہ بے مثال ہے...... (انتولی بچنا)۔''

کارل نے چونک کر سر اٹھایا تو جیسے اس کا دل دھڑکنا بند ہو گیا۔ یہ سطر لکھنے والی انتولی خوب صورت تحریر سے زیادہ حسین تھی۔ اس کا قد موزوں اور جسم لچکیلا تھا۔ چہرہ گلابی، آنکھیں چمکتی ہوئی اور لب یاقوتی تھے۔ وہ بڑی ہی معصوم اور بڑی ہی تروتازہ تھی۔

کارل نے دیکھا تو ایک گنگناتی ہوئی آواز اس کے کانوں سے گزر کر دل میں اتر گئی۔ اس نے صفحے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''مسٹر کارل! تعارف کرانے کا اس سے خوب صورت ذریعہ کوئی اور نہ تھا۔ کیا پھر ملاقات کا شرف بخشیں گے؟''

کارل نے اپنا کارڈ اسے دے دیا مگر دل پر قابو پانے میں اسے خاصی دقت پیش آئی۔ ایک عظیم موسیقار ہونے کے باوصف وہ خود کو اتنی حسین لڑکی کی محبت کے قابل نہ سمجھتا تھا۔ کچھ بھی تھا، وہ بازوؤں سے تو بہرحال محروم تھا۔

☆☆☆

اس رات وہ دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ ایک تصویر اس کے ذہن کے پردے پر بار بار ابھرتی اور اس کے دل میں ہلچل مچا جاتی۔ ایک مترنم آواز اس کے کانوں میں رس گھول جاتی اور وہ ایک عجیب مسرت بخش بے چینی میں مبتلا ہو جاتا پھر وہ آنکھیں کھول کر ادھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ اس کا دل اس سے پوچھتا۔

''کارل! تمھیں کیا ہو گیا ہے؟''

مگر اس سوال کا اسے کوئی جواب نہ ملتا۔ یہ اس کی بیس سالہ زندگی کا پہلا واقعہ تھا کہ کسی نے چپ چاپ دل کے دروازے پر دستک دی اور پٹ کھل گئے، پھر دستک دینے والا خاموشی سے فاتحانہ انداز سے اس قلعے میں داخل ہو گیا اور یہ پٹ ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے۔

اب نہ جانے والا باہر آ سکتا تھا اور نہ کسی اور کے داخل ہونے کی گنجائش تھی۔ وہ دھیمی دھیمی صدائیں سن رہا تھا۔ دل کے گوشے گوشے سے ایک ہی آواز آ رہی تھی۔

''انتولی...... انتولی...... انتولی۔''

کارل سب سنتا اور کروٹیں بدلتا رہا۔ یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔

اس صبح بظاہر اس نے معمول کے مطابق سب کام کیے۔ اپنے انگوٹھوں کی مدد سے شیو بنایا، غسل کیا، ڈھیلا ڈھالا سفید لباس پہنا اور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ کر مطالعے میں مصروف ہوگیا۔

ان مشاغل سے فارغ ہونے کے بعد وہ ناشتا کیا کرتا تھا اور اس میں ابھی دیر تھی۔ لہٰذا مطالعے کے لیے یہ بہترین وقت تھا۔ تاریخ کی ایک ضخیم کتاب میز پر رکھی تھی اور وہ پڑھنے میں محو تھا کہ ایک دم قدموں کی چاپ نے اسے چونکا دیا۔ اس نے دیکھا، خادم سامنے کھڑا تھا۔

”جناب! ایک خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“

کارل نے حیران آنکھوں سے دیکھا۔ ابھی وہ کچھ کہہ نہ پایا تھا کہ خادم نے اسے خوب صورت نام کا کارڈ پیش کردیا جس نے تمام شب کارل کے دل پر دستک دی تھی۔ ایک ساعت کے لیے کارل کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ یوں جیسے کائنات گردش کرگئی ہو۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ چکر کھا گیا ہے مگر دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گیا۔ اس نے کارڈ پر نظر ڈالی۔

”انٹولی......!“

اس نے سنجیدگی سے خادم کو حکم دیا۔ ”معزز خاتون کو اندر لے آؤ۔“

خادم واپس لوٹ گیا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر اس کے باوجود اس کی کیفیت ہمیشہ سے جداگانہ تھی۔ دل کی دھڑکن معمول سے زیادہ تیز تھی۔ اتنی کہ وہ اس آواز کو خود سن رہا تھا۔ رگوں میں خون تیزی سے دوڑتا محسوس ہورہا تھا۔ اس احساس سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

بظاہر وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے نیم وا آنکھوں سے اس سمت دیکھ رہا تھا جدھر سے انٹولی آنے والی تھی مگر اس کا دل عجیب سا سوال کررہا تھا۔

”کارل! تم جس نے ہر ناممکن کو ممکن کر دکھایا، کیا انٹولی کا پیار جیت سکو گے؟“

اور یہ سوال پردۂ ذہن پر پھیلتا چلا گیا اور کئی سوالوں کو جنم دے گیا۔

”کیا انٹولی جیسی حسین لڑکی کسی ایسے معذور سے محبت کرسکتی ہے؟“

”نہیں۔“

”اگر بے بازوؤں کا مرد اس سے اظہارِ عشق کرے تو کیا وہ سنے گی؟ قبول کرے گی؟“

”نہیں۔“

”کارل! کیا تمہیں اپنے جذبات کا اظہار کردینا چاہیے؟“

”نہیں۔“

”کیا تم جو ایک لمحے میں عشق کے سب مدارج طے کرچکے ہو، اسے بھول جاؤ گے؟“

”نہیں۔“

عقل سوال و جواب میں مصروف رہی، حقیقت کے انداز میں ہر بات کا تجزیہ کرتی رہی اور کارل اتھن حواس باختہ ہر حقیقت کو تسلیم کرتا رہا۔ عقل نے آخری سوال پوچھا۔

”کارل اتھن! اب تم کیا کرو گے؟“

تب ہی کارل نے خرد کی تمام صلاحیتوں کے ساتھ فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

”یہ ٹھیک ہے کہ انٹولی ہماری پہلی اور آخری پسند ہے مگر ہم کبھی اس پر اپنے جذبات کا اظہار نہ ہونے دیں گے۔ ہم نے اس سے محبت کی ہے اور محبت کے یہ معنی تو نہیں کہ ہم اپنے نامکمل وجود کو اس پر مسلط کرکے اسے دنیا کی نظروں میں تماشا بنادیں۔ ہم کچھ بھی بن گئے ہیں لیکن ہمیں یہ بھولنا نہیں چاہیے کہ ہم بازوؤں سے بہرحال محروم ہیں۔ حقیقت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم کرلیں کہ ہم کسی طور بھی انٹولی کے قابل نہیں ہیں لہٰذا اس بات کا اظہار کبھی نہ ہوگا۔“

”ہمارا عشق راز رہے گا۔“

”ہماری چاہت شہرت نہ پائے گی۔“

”ہمارے جذبات الفاظ میں ڈھل کر کبھی انٹولی کی سماعت تک نہیں پہنچیں گے۔“

دیدہ ہوش جب کھلا ، دیکھا
ہر طرف پھر وہی خلا سا تھا
وہی میں تھا وہی طلب دل کی
وہی عشق نارسا سا تھا

دوسرے ہی لمحے قدموں کی مدھم مدھم آواز نے اسے چونکا دیا۔ انٹولی مسکراتے ہوئے اس کی طرف آرہی تھی۔ ان دونوں نے بڑے احترام اور خلوص سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

انٹولی مترنم آواز میں بولی۔

”صبح بخیر، مسٹر کارل!“

”صبح بخیر معزز خاتون!“

کارل نہ جانے نسوانیت کے احترام میں یا رعب حسن سے کھڑا ہوگیا۔ انٹولی کے سنہری بال کس کر بندھے ہوئے تھے۔ اس کی فراک سفید تھی۔ آج وہ پہلے سے زیادہ

حسین نظر آرہی تھی۔

کارل نے کھوئے کھوئے انداز میں اسے خوش آمدید کہا اور بیٹھنے کا اشارہ کر کے اس کے بیٹھنے کے بعد خود بھی اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

اب وہ آمنے سامنے تھے۔

صبح کی روشنی انتولی کو مزید حسن بخش رہی تھی۔ لبوں پر دل آویز تبسم تھا اور ذہین آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ اس نے کہا۔

''مسٹر کارل! میرا یوں بے وقت آجانا شاید آپ کو محسوس ہوا ہوگا؟''

''نہیں۔'' کارل نے کہا۔ ''میری مصروفیات اور زندگی ایسی نہیں ہے کہ مجھے کسی کی آمد شاق گزرے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اپنے احباب کا آنا مجھے اچھا لگتا ہے لیکن میں اس وقت آپ کی تشریف آوری کا مقصد جاننا چاہوں گا؟''

''میں صبح کی سیر کے لیے خوب صورت جگہوں پر جاتی ہوں۔ آج میں نے یہاں کا قصد کیا۔ سوچا آپ کو مبارک باد دیتی چلوں۔''

''مبارک باد......؟'' کارل نے حیران ہو کر دیکھا۔ ''کس بات کی؟''

''آپ کے پروگرام کی کامیابی کی۔'' انتولی نے سادگی سے کہا۔ ''آپ ملک کے سب سے بڑے موسیقار بن گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے اب دیگر ممالک بھی آپ کو دعوت دیں گے۔''

''اوہو۔'' کارل غیر ارادی طور پر ہنس دیا پھر بولا۔ ''مس انتولی! اس قدر حوصلہ افزائی کا شکریہ۔''

مگر ایک دم اسے محسوس ہوا کہ انتولی شاید جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ مبارک باد دینے نہیں آئی بلکہ کھنچی چلی آئی ہے۔ فوراً ہی خرد نے اسے ٹوکا۔

''کارل! ابھی تھوڑی دیر قبل تم نے عہد کیا تھا کہ اپنے جذبات کا اظہار بھی نہ ہونے دو گے۔'' وہ سنبھل گیا اور سنجیدگی سے بولا۔

''مس انتولی! آپ نے اپنا تعارف ادھورا کرایا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہی ہے کہ مجھے علم نہیں کہ آپ کے مشاغل کیا ہیں، آپ کہاں رہتی ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔''

''میں کسی ایک جگہ کم ہی قیام کرتی ہوں۔'' انتولی بولی۔ ''کبھی تھیٹر میں گاتی ہوں، کبھی رقص کرتی ہوں اور جن جن شہروں میں ہماری کمپنی جاتی ہے، میں اس کے ساتھ جاتی ہوں اور وغیرہ وغیرہ میں کوئی چیز نہیں ہے۔''

اس جملے پر دونوں کھلکھلا کر ہنس دیے۔ کارل مذاق کے انداز میں بولا۔ ''وہ بھی ہو جائے گا۔''

انتولی مسکرادی۔ چٹکتی کلیوں جیسا تبسم۔ کارل نے رخ موڑ لیا۔ بظاہر وہ خادم کو بلا رہا تھا مگر دراصل انتولی کی مسحور کن مسکراہٹ نے اسے جھنجوڑ دیا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے کوئی خاص معنی ہیں۔ یہ محفل دیر تک جمی رہی۔ دونوں نے مختلف موضوعات پر گفتگو کی۔

کارل نے اپنی حسین مہمان کی خوب خاطر تواضع کی اور پھر انتولی دوبارہ ملنے کی خواہش کا اظہار کر کے رخصت ہوگئی۔

اس دن کارل نے دیر تک وائلن پر کئی سریلی دھنیں بجائیں اور ہر بار اسے محسوس ہوا کہ اس کی انگلیاں بے جان تاروں کو نہیں، اپنے ہی جذبات کو چھیڑ رہی ہیں۔ خوشی اور دکھ کی ملی جلی کیفیت نے آج طبیعت کو عجب رنگ بخشا تھا۔ اس دن کارل گھر سے باہر نہ جاسکا۔ اسے محسوس ہوا اسے اب کوئی بے قراری نہیں، کوئی خواہش نہیں۔

پھر ان کی اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ کبھی وہ سیر کے لیے پُرفضا مقامات کی طرف نکل جاتے اور کبھی تنہائیوں میں وہ مختلف موضوعات پر طویل گفتگو کرتے اور کبھی وہ اس تھیٹر میں جاتا جہاں انتولی گیت گاتی یا رقص کرتی۔

کارل بے پناہ چاہت کے باوجود اپنے فیصلے پر قائم تھا۔ اس نے انتولی سے کچھ نہ کہنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔

ایک شام دریا کے کنارے نوجوان لڑکے لڑکیوں کی ٹولیاں چہل قدمی میں مصروف تھیں۔ کچھ تیر رہے تھے، کچھ تیرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ ڈھلتے آفتاب کی سنہری کرنیں آبادی سے دور اس خطے پر اپنی روشنی نثار کر رہی تھیں جہاں صرف شام کو من چلے قسم کے جوان تفریح کی غرض سے اس لیے جمع ہوتے تھے کہ ادھر دریا خطرناک نہ تھا۔

یکایک ایک نسوانی چیخ کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ سرخ فراک اور سنہری بالوں والی وہ لڑکی جو تیرنا نہ جانتی تھی، پانی میں گر گئی تھی۔ دونوں کناروں پر شور برپا تھا مگر سب اتنے بدحواس تھے کہ اس ڈوبتی ہوئی لڑکی کو بچانے کے لیے پانی میں کوئی نہیں کودا۔

لڑکی جان بچانے کے لیے بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ اچانک کسی کے پانی میں کودنے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں بعد سب نے دیکھا، کارل اس لڑکی کو کنارے کی طرف لا رہا تھا۔

ایک کمال تھا۔ انسانی عزم وہمت کی اس سے بڑی

مثال کوئی پیش نہ کرسکتا تھا۔ جن لوگوں نے اس منظر کو دیکھا، وہ حیرت زدہ ہو گئے۔ جنہوں نے سنا، انہیں یقین نہ آیا مگر یہ حقیقت تھی کہ کارل نے اپنے گھٹنوں، اپنے پیروں اور اپنے سر کی مدد سے ڈوبنے والی ایک لڑکی کو بچالیا تھا اور یہ لڑکی تھی...... انتولی۔

☆☆☆

ایک روز کارل نے انتولی کے ساتھ ایک خوبرو اور ہینڈسم سے نوجوان کو دیکھا۔ کارل اس وقت حسبِ سابق اس سے ملنے اس کے تھیٹر چلا آیا تھا۔ اس نے دیکھا وہ دونوں ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں کررہے تھے۔

جانے کیوں کارل نے انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا لہٰذا وہ ابھی انتولی سے ملے بغیر یونہی واپس لوٹنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک جانے کس خیال کے تحت وہ قدرے فاصلے پر ہی اپنی جگہ پر بیٹھا بڑے غور سے انہیں تکتا رہا۔

کارل اب اس خوب صورت نوجوان کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے شاید پہچاننے کی کوشش کررہا تھا۔ تب ہی وہ چونک پڑا۔ وہ نیشان بڈ تھا۔ اس کے اسکول کے نصابی استاد مسٹر گیز بڈ کا اکلوتا بیٹا۔ اسے یہ بھی یاد آگیا کہ نیشان تو اس کا کلاس فیلو بھی رہ چکا ہے۔ اس کے دل میں ایک خیال جاگا۔

اب اس نے واپس پلٹ جانے کا اپنا ارادہ بالکل ہی بدل ڈالا تھا۔ اس کے دل میں اشتیاق جاگا کہ وہ نیشان سے ایک بار ملے ضرور۔ اسے حیرت تھی کہ نیشان اب تک تھا کہاں؟ کیا وہ اس کی غیر معمولی شہرت سے آگاہ نہیں ہے؟

تب ہی کچھ سوچ کر کارل نے اپنا رخ ایک خاص زاویے سے آگے بڑھایا کہ نوجوان نیشان سے گفتگو میں محو ہونے کے باوجود انتولی کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ اس نے ایک دلنواز سی مسکراہٹ کے ساتھ دور ہی سے اپنا ایک ہاتھ ہلادیا۔ کارل نے بھی مسکرا کر اپنے سر کو ہولے سے اثباتی جنبش دے ڈالی۔

وہ ان دونوں کے قریب جا پہنچا۔ تب تک انتولی اس کی جانب اپنی انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے نیشان بڈ کو کچھ بتاتی بھی جارہی تھی۔ کارل جان گیا تھا کہ وہ اسے کیا بتارہی ہوگی۔ یوں اب نیشان بھی بڑے غور اور حیرت اور عجیب سے انداز میں اسے تکنے لگا تھا۔

ان کے قریب پہنچتے تک کارل نے نیشان کو متحیرانہ انداز میں انتولی سے یہ کہتے بھی سنا۔

''اوہ...... انتولی! تو یہ ہے وہ شخص جس کی شہرت میں نے ڈبلن میں بھی سن رکھی تھی۔''

''ہیلو، نیشان بڈ! تم نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔'' کارل نے ان کے قریب آتے ہی اس سے کہا۔ نیشان واقعی اسے نہیں پہچانا تھا۔ وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا پھر خوش اخلاقی سے جواب میں بولا۔

''نہیں...... لیکن آپ کا غائبانہ تعارف لوگوں اور اخبارات کے علاوہ بالکل ابھی ابھی انتولی کی زبانی سن چکا ہوں۔'' وہ بہت اختصار سے بولا۔ کارل کو اس کا یہ لب ولہجہ پسند آیا۔ مسکرا کر کہا۔

''لیکن میں تمہیں پہچان رہا ہوں۔ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو تم...... مسٹر گیز بڈ کے بیٹے ہو جسے ہم کلاس میں سن آف بک کے نام سے چھیڑا کرتے تھے۔''

تب ہی کارل نے ہی نہیں بلکہ انتولی نے بھی دیکھا کہ نیشان کو ایک دم اپنے ماضی کا وہ پرانا دور یاد آگیا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے سر تھامنے کے انداز میں رکھتے ہوئے بولا۔

''او مائی گاڈ! میں بھی کس قدر بھلکڑ اور کمزور یادداشت کا انسان واقع ہوا ہوں۔ بہت خوشی ہوئی کارل تم سے مل کر۔'' کہتے ہوئے اس نے قدرے جھک کر باقاعدہ کارل سے معانقہ بھی کر ڈالا۔ اس نے اپنے دونوں بازو پھیلائے۔

اس کے بعد سے ان تینوں میں دوستی گہری ہو چلی۔ اب انتولی کے ساتھ نیشان بھی ہونے لگا تھا۔ کارل نے انہی ایام کے دوران محسوس کرنا شروع کردیا تھا کہ نیشان کے قریب ہونے کا بہانہ انتولی تھی۔ بالفاظ دیگر وہ انتولی میں دلچسپی لیے ہوئے تھا اور انتولی......!

بظاہر تو یہی نظر آتا تھا کہ انتولی بھی نیشان میں دلچسپی لیے ہوئے تھی۔ اب یہ ''دلچسپی'' کس نوعیت کی تھی، وہ پردے میں تھا لیکن نیشان کی طرف سے ''نوعیت'' ظاہر ہو چلی تھی کہ وہ انتولی کو اسی نگاہ سے دیکھے ہوئے تھا جس نگاہ کو کارل نے سب سے ہی نہیں بلکہ انتولی سے بھی مخفی رکھا ہوا تھا۔

گزرتے وقت کے ساتھ اور نیشان بڈ کے درمیان میں آجانے سے جہاں کارل کے دل کو ایک دھچکا سا لگا تھا، وہیں اندر ہی اندر کسی کو اس نے یہ کہتے بھی سنا۔

''کارل! خوش ہو جاؤ۔ نیشان بڈ، انتولی کے لیے برا تو نہیں۔ یہی تو تم چاہتے تھے نا۔ دیکھو، تم خود ہی تو کہتے ہو کہ بغیر بازوؤں والے ہم سفر سے انتولی کو کیا ملے گا؟ صرف شہرت، دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ یہاں جیتے جاگتے

جذبات سے بھرے دو انسانوں کی زندگیوں کا معاملہ ہے۔ کوئی تکمیل راگ نہیں ہے۔ زندگی تکمیل ہونے کے لیے انسان کو بھی جسمانی طور پر تکمیل ہونا چاہیے۔ تب ہی اصل لطف آتا ہے۔

''کارل! تم انتولی سے بے شک خاموش اور یکطرفہ محبت کیے ہوئے ہو تو کوئی عار نہیں مگر اس کی بھلائی میں کیا سوچتے ہو، یہ محبت کی اعلیٰ معراج کہی جاسکتی ہے۔ اپنی جگہ انتولی کے سامنے ایک جسمانی طور پر مکمل، خوبرو، ہینڈسم اور صحت مند انسان نیشان کو رکھ کے دیکھو...... اب کیا کہتے ہو؟ ٹھیک ہے نا۔ یہی تو تم چاہتے ہو۔''

''ہاں۔'' کارل کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ 'حقیقت، حقیقت ہی ہوتی ہے۔ میری شہرت افسانوی ہے۔ آج ہے، کل نہیں لیکن نیشان...... وہ میرا رقیب اپنی جگہ مگر ایک نظر سے وہ میرا محسن بھی ہے۔ جاؤ، نیشان! لے جاؤ انتولی کو...... دور لے جاؤ مجھ سے...... میں بس اپنی دنیا میں خوش اور مگن رہنا چاہتا ہوں۔ میں خود غرض نہیں کہ اپنی محبت کو اپنے ساتھ ہی سولی پر لٹکا دوں۔'

یہ سب سوچ کر کارل کو کچھ سکون ملا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ انتولی کے نیشان کے بارے میں کیا خیالات اور رائے تھی۔ نیشان کے بارے میں تو کارل کو اور اک یوں بھی ہوا تھا کہ اڑتے اڑتے یاروں نے خبر پھیلادی تھی کہ بہت جلد نیشان بڈ اور انتولی ایک ہونے والے ہیں۔

کارل کو جہاں یہ سن کر دھچکا لگا تھا وہیں اسے ایک گونہ سکون ملا تھا۔ وہ ان دنوں عجیب ہی کیفیات سے گزر رہا تھا۔ ایک ہی ذات سے خوشی بھی منسلک تھی اور غم بھی وابستہ تھا۔ ایک رخ اور تھا، محبت کا اور دوسرا اور......

بہرکیف، کارل اپنی بھی تسلی مقصود چاہتا تھا۔ پہلے پہل جب اس نے نیشان بڈ اور انتولی کو ایک دوسرے کے قریب آتے محسوس کیا تو خود کو ان سے پرے کر لیا تھا، بالکل غیر محسوس انداز میں تاکہ اصل بات جو دبی ہوئی ہے، وہ کھل کر ظاہر ہو جائے۔

یوں بات ظاہر ہو بھی گئی تھی مگر پوری طرح عیاں نہ ہو پائی۔ اس کی مصلحتاً دوری کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ دونوں اس کے گھر آنے لگے۔ عقدہ کھلا کہ اس ''آمد'' میں بھی نیشان کا دخل کم اور انتولی کا زیادہ ہوتا۔

کارل کے پاس آج دنیا کی ہر نعمت موجود تھی۔ اسے کوئی کمی نہ تھی۔ کمی تو فقط ایک ہی تھی اور وہ تھی انتولی۔ اسی کمی کو وہ سب سے بڑی کمی سمجھتا تھا مگر کبھی اس کا زبان سے اقرار نہیں کیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب انتولی اس کے دولت کدے پر آتی تو اسے ایسا لگتا جیسے اسے دنیا کی ہر نعمت مل گئی ہو۔ اس کے بغیر سب کتنا ادھورا ادھورا سا ہوتا۔

''کارل! تم بہت کم آنے لگے ہو ہماری طرف؟ کیا ریاضت زیادہ کرنے لگے ہو؟'' اسے سوچوں میں گم پاکر انتولی نے مترنم آواز میں اسے چونکا دیا۔

''ہاں، شاید ایسا ہی کچھ ہے۔'' اسے کوئی جواب نہ بن پڑا تو اس نے گومگو کے سے انداز میں گول مول جواب دیا۔

''تب انتولی! شاید ہم یہاں آکر مسٹر کارل کی ریاضت میں مخل ہوتے ہیں۔ ہمیں آئندہ احتیاط کرنا چاہیے۔'' نیشان نے ایک دم کہا۔ انتولی خاموش نگاہوں سے کارل کا چہرہ تکنے لگی۔ کارل کو نیشان کا یہ کہنا ایسا ہی لگا جیسے نیشان بڈ اس کے بارے میں انتولی سے یہ کہنا چاہتا ہو۔

''انتولی! یہاں آنے کی ضرورت ہی کیا ہے بھلا؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' کارل نے ایک دم کہا۔ ''میری ریاضت تو چلتی رہتی ہے۔ اچھا ہوتا ہے تم دونوں آجاتے ہو۔''

پھر دونوں ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ کارل کے اس وقت پورے احساسات جاگے ہوئے تھے۔ اس نے صاف محسوس کر لیا تھا کہ نیشان کا یہاں جی نہیں لگ رہا تھا اور یہ کہ وہ محض انتولی کی ادھر دلچسپی کی وجہ سے یہاں بیٹھے رہنے پر مجبور ہے۔ بالآخر وہی ہوا۔

نیشان نے اجازت چاہی، وہ بھی انتولی سے پوچھے بغیر جبکہ انتولی ابھی تھوڑی دیر اور یہاں رکے رہنے پر مصر تھی مگر نیشان کی بیزاری بھانپ کر کارل نے ان دونوں کو نہایت اخلاق کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔

انتولی چلی گئی۔ کارل کو یکا یک ایسا لگا جیسے انتولی کے ساتھ اس کا سب کچھ چلا گیا ہو اور وہ اپنے محل نما گھر میں نہیں بلکہ کسی تپتے ریگستان میں تنہا بیٹھا رہ گیا ہو۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح گم صم سی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ چونکا اس وقت جب اس کی ملازمہ مسز کپری نے اسے ڈنر کی اطلاع دی۔

''نہیں، ابھی میرا جی نہیں چاہ رہا۔'' اس نے کہا۔ ''مسز کپری! آپ ایسا کریں، مجھے کافی لا دیں لیکن یہاں نہیں، میرے کمرے میں۔'' کہتا ہوا وہ ایک دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

یہ اس سے اگلے دن کا ذکر تھا۔ کارل گھر پر ہی رہا۔ اس کا آج باہر نکلنے کو جی نہیں چاہا۔ وہ گھر پر ریاضت کرتا رہا لیکن زیادہ کرنے کو بھی جی نہ لگا۔ وہ چھوڑ کر اس نے کتاب

سنبھال لی۔ صفحے پر الفاظ کی جگہ کسی کی شبیہ ابھرنے لگی۔
یہ انتولی کی تصویر تھی...... خیالی۔ اس نے کتاب بند کردی۔ دوبارہ اس نے موسیقی میں پناہ تلاش کی۔ وہ تیز تیز پیانو اور دیگر ساز...... بجانے لگا۔ اس کی تیزی اور اس غیر معمولی شور کو سن کر مسز کیری کو تشویش ہوئی۔ وہ دوڑی ہوئی اس کے مخصوص کمرے میں داخل ہوگئی۔ کیا دیکھتی ہے، کارل پر جیسے کوئی جنون، کوئی جوش طاری ہے۔ موسیقی کے آلات زور زور سے بجاتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہوا جارہا تھا۔ مسز کیری نے جلدی سے بڑھ کر اسے سنبھالا دیا تو دنگ رہ گئی۔ کارل کا جسم تیز بخار میں بری طرح تپ رہا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر نے آکر اسے دوا دی اور آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ مسز کیری اس کی جانب سے فکر مند تھیں۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کی خاتون تھیں اور بہت مخلص بھی۔ کارل کا وہ ہر ممکن طریقے سے خیال رکھنے کی کوشش کرتیں۔ وہ اسے بیٹوں کی طرح سمجھتی تھیں۔ کارل بھی اسے اپنے گھر کی بزرگ خاتون کا درجہ دیتا تھا۔

مسز کیری پہلے اسے ”مسٹر کارل“ کہہ کر مخاطب کرتی تھی لیکن پھر اس نے کارل کو ”مائی سن“ کہنا شروع کردیا تھا۔

”مائی سن! اس شام تمہیں اچانک کیا ہوگیا تھا؟ میں تو ڈر ہی گئی تھی۔“ اس نے پوچھ لیا۔

”غصہ آرہا تھا مجھے۔“ کارل نے ہولے سے جواب دیا۔

”غصہ...... کیسا غصہ اور کس پر؟“ مسز کیری نے حیران ہوکر پوچھا۔

”اپنے آپ پر...... یا پھر شاید اپنی قسمت پر۔“ کارل نے کہا۔ مسز کیری غور سے اس کا چہرہ تکنے لگیں پھر بولیں۔

”دونوں پر ہی غصہ کرنا بیکار ہے مائی سن!“

”تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا مسز کیری کہ میں بھی بیکار ہوں۔“ کارل پژمردگی سی مسکراہٹ تلے بولا۔ مسز کیری کو اچانک اپنی غلطی کا احساس ہوا، ایک دم بولیں۔

”نو مائی سن! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ تم بھلا بیکار کیسے ہو سکتے ہو۔ ایک دنیا تمہاری معترف ہے۔ تمہارے گن گاتی ہے۔“

”لیکن تقدیر شاید مجھ پر ہنستی ہے۔“ وہ تلخ سی مسکراہٹ سے بولا۔

”ہرگز نہیں، یہ محض تمہاری خام خیالی ہے۔“

”مجھے بہلاوا مت دو مسز کیری!“

”میں سچ بول رہی ہوں۔ تم نے ایک دنیا مسخر کررکھی ہے۔“

”لیکن...... لیکن میں اپنے آپ کو مسخر نہیں کرپایا۔“

”کیا میں آپ کو باہر سیر کے لیے لے جاؤں؟“ مسز کیری نے فوراً موضوع بدلا۔

دراصل مسز کیری نے جب ڈاکٹر جارج میسن کو رخصت کرتے وقت تشویش سے کارل کی اس اچانک کیفیت کے بارے میں استفسار کیا تھا تو اس نے ہولے سے کہا تھا۔

”مسز کیری! کارل کا خیال رکھنا پہلے سے بھی زیادہ ضروری ہوگیا ہے۔“ ڈاکٹر میسن کی بات پر مسز کیری نے الجھن آمیز نگاہوں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ ڈاکٹر میسن ساٹھ سالہ ایک ریٹائرڈ ڈاکٹر تھا۔ اپنے گھر پر ہی پریکٹس کرتا تھا۔ اس نے نفسیات بھی پڑھ رکھی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر آگے بولا۔

”کچھ لوگ جب شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جاتے ہیں تو میں نے انہیں اپنی ذات میں تنہا ہوتے دیکھا ہے۔ کارل بھی شاید اسی تنہائی سے گزر رہا ہے۔“

”میں سمجھ گئی، ڈاکٹر!“ مسز کیری بولی۔ ”میرا خیال ہے مجھے کارل کو شادی کرنے کا مشورہ دے دینا چاہیے۔“

”میرے کہنے کا مطلب تو یہی تھا لیکن......“ ڈاکٹر رکا۔

”لیکن کیا؟“

”لگتا کچھ ایسا ہی ہے کہ کارل کی تنہائی کا معاملہ کچھ اور ہے۔ تم اس کے ساتھ رہتی ہو۔ ذرا یہ جانچنے کی کوشش کرو کہ کیا یہ کسی کو پسند تو نہیں کرتا اور کیا اس لڑکی نے اس سے شادی سے انکار تو نہیں کردیا۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو کارل......“ تشویش آمیز انداز میں ڈاکٹر میسن نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور بیگ اٹھائے چلا گیا۔

☆☆☆

کارل نے نیشان بڈ کی وجہ سے انتولی کے تھیٹر میں بھی آنا جانا کم کردیا تھا حالانکہ اس سے پہلے وہ اکثر و بیشتر چلا جاتا تھا اور انتولی بھی اس کی آمد پر خوشی کا اظہار کرتی تھی۔ تاہم جب کئی بار ایسا ہونے لگا کہ کارل وہاں جاتا تو نیشان بھی وہاں ہوتا۔ ایک بار تو نیشان کو انتولی کے ہمراہ دیکھ کر وہ انتولی سے ملے بغیر ہی واپس چلا آیا۔ اس کے بعد سے ہی اس نے وہاں آنا جانا بہت کم کردیا۔ پھر یوں ہوا کہ انتولی نے کارل کے ہاں آنا جانا شروع کردیا۔ بات پھر وہی ہوتی کہ اس کے ہمراہ نیشان بھی ہوتا۔

اس روز مسز کیری نے اسے بتایا کہ انتولی ملنے آئی ہے۔ وہ نومبر کی ایک سرد شام تھی۔ باہر ہلکی برف باری ہورہی تھی۔

"نیشان بھی ساتھ ہوگا؟" اس نے پوچھ لیا حالانکہ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے ایسا سوال پوچھا تھا۔

"نہیں، مائی سن! وہ اکیلی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم نے اسے بٹھا تو دیا ہے نا؟"

"لو، وہ ادھر ہی آگئی۔" مسز کیری کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا کیونکہ دروازے پر انتولی کھڑی کسی گڑیا کی طرح مسکراتی ہوئی کارل کو دکھائی دی۔ کارل کے تاریک وجود میں قندیلیں روشن ہونے لگیں۔ اسی لہجے میں مسکرا کر انتولی سے بولا۔

"ارے، میں تو خود ہی وہاں آرہا تھا۔"

"تو میں کیا یہاں نہیں بیٹھ سکتی؟" وہ مترنم ہنسی کے ساتھ بولی۔ کارل کو یوں لگا جیسے دور کسی پہاڑی چرچ میں سنکھ گونجا ہو، جیسے کوئی خوش الحان پرندہ مدھر باں ہو۔

"بیٹھ سکتی ہو، کیوں نہیں۔ آؤ، پلیز!" کارل اسی طرح پورے دل سے مسکرا کر بولا۔ انتولی اس کی چیئر کے قریب سامنے والی کرسی پر براجمان ہوگئی۔ اس نے گلابی فراک نما لمبا پھول دار اسکرٹ پہن رکھا تھا اور اس پر سمور اوڑھ رکھی تھی۔ پیروں میں دیدہ زیب سینڈل تھے۔

"باہر تو شاید برف پڑ رہی ہے اور تم ان پیارے اور نازک سینڈل میں......" کہتے ہوئے کارل نے جملہ ادھورا چھوڑا۔ اس کی نظریں انتولی کی سبک اندام پنڈلیوں اور پیروں پر تھیں۔

"میں مسز کوپر کی ویگن (دو گھوڑوں کی چوبی ڈبا نما بگھی) میں آئی ہوں۔"

"اچھی بات ہے...... اور سناؤ، کیسی ہو؟ آج نیشان نہیں آیا تمہارے ساتھ؟" کارل نے پوچھا۔

"اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔" انتولی نے دھیرے سے جواب میں کہا۔

"اوہو، کیا ہوا اسے؟ ڈاکٹر کو دکھا دیتا۔" کارل کے لہجے میں تشویش تھی۔ تاہم اس کا دل اندر سے مسوس بھی ہوا۔ وہ تو یہی سمجھا تھا کہ انتولی کا آج اس سے ملنے کے لیے شاید اکیلے ہی دل کیا تھا مگر نہیں، یہ انتولی کی مجبوری تھی، اس کی مرضی نہیں۔ پھر بھی دماغ نے اسے ٹوکا۔ "یہ اچھا ہے، ایسا ہی رہنے دو کارل!"

کارل نے دل کو سنبھال لیا۔ دونوں کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس درمیان میں مسز کیری نے ان کے آگے کچھ کھانے پینے کی اشیا بھی سرو کیں اور ڈاکٹر جارج میسن کی ہدایت کے مطابق اس نے کچھ "غور" بھی کرنا شروع کر دیا تھا۔

انتولی چلی گئی۔ کارل کو یوں لگا جیسے اس کے محل میں خزاں اتر آئی ہو۔ وہ کافی دیر تک گم صم سی کیفیت میں بیٹھا رہا اور پھر جب اس پر ایک خاص کیفیت طاری ہونے لگی تو وہ اپنے موسیقی کے کمرے میں جانے لگا تو مسز کیری جو کافی دیر سے اسے "پرکھتی" نگاہوں سے تکے جا رہی تھیں، اس کے آگے آگئیں۔

"کیا بات ہے مسز کیری! مجھ سے کوئی کام ہے؟" کارل نے رک کر پوچھا۔

"مائی سن! کیا کبھی تمہارا مجھ سے باتیں کرنے کو دل نہیں کرتا؟" وہ ممتا بھری محبت سے بولیں۔

"کیوں نہیں مسز کیری! بیٹھ جاؤ میرے سامنے۔" کہتے ہوئے کارل نے اپنی چیئر گھما دی۔ مسز کیری اس کے دائیں جانب بیٹھ گئیں۔ باہر برف باری رک چکی تھی۔ سرد ہواؤں نے جیسے بین کرنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے تھے اور چند ایک سے ہٹے ہوئے تھے۔ بند اور شفاف شیشوں کے پار گرتی ہوئی برف کا منظر عجیب اداس اور تنہا تنہا سا محسوس ہوتا تھا۔

"انتولی تمہیں اچھی لگتی ہے؟" مسز کیری نے پوچھا۔

"ہاں۔" کارل نے اثباتی جواب دیا۔

"انتولی اچھی لڑکی ہے۔ مجھے بھی پسند ہے۔ کیا تم نے کبھی اسے اپنا ہم سفر بنانے کا نہیں سوچا؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"صرف میری پسند سے کیا ہوتا ہے؟"

مسز کیری اس کی بات کا مطلب سمجھ گئیں، بولیں۔

"کیا خبر وہ بھی تم سے محبت کرتی ہو۔ تم اسے پرپوز تو کر کے دیکھو۔ اسے انگوٹھی پیش کر دو اور دوزانو ہو جاؤ۔"

"مسز کیری! میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔" کارل نے بات بدل ڈالی۔ مسز کیری چپ ہو رہیں۔ کارل اپنے موسیقی والے کمرے میں جانے کے بجائے آرام گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

اگلے دن عجیب بات ہوئی۔ دیوار گیر گھنٹے نے رات کے نو بجائے۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ نیشان تھا...... تنہا۔ کارل سے ملنے آیا تھا۔ کارل کو اسے تنہا اور اس وقت اپنے ہاں دیکھ کر کچھ حیرت ہوئی۔ اس نے بہرحال اس کا پرتپاک استقبال کیا۔

"انتولی بتا رہی تھی تمہاری کل کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ کیا ہوا تھا؟" کارل نے ازراہ ہمدردی پوچھا۔

"جسمانی طبیعت تو ٹھیک تھی مگر......" نیشان کچھ کہتے کہتے رکا۔ اس کا لہجہ کارل کو عجیب لگا، بولا۔

"مگر کیا؟"

"بس، دل اداس تھا۔"

کارل حیران ہوا۔ نیشان کو اس نے پہلے کبھی اس طرح سنجیدہ ہوتے نہیں دیکھا تھا۔

"خیریت، طبیعت کیوں اداس تھی؟" کارل نے پوچھا۔ نیشان چپ خلا میں گھورتا رہا پھر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ بولا وہ اب بھی نہیں تھا۔ کارل بھی نظروں میں حیرت لیے اسے تکتا رہا۔ بالآخر نیشان نے کہا۔

"کارل! مجھ سے کچھ مت چھپانا۔ کیا تم انتولی سے محبت کرتے ہو؟"

کارل کے لیے نیشان کی طرف سے یہ ایک بہت اچانک اور ذاتی سوال تھا۔ وہ گڑبڑا سا گیا لیکن پھر سنبھل کر بولا۔

"یہ تم نے کیوں پوچھا؟"

"میری بات کا جواب دو۔" نیشان سپاٹ لہجے میں بولا۔ اب یہ کارل کو بھی ذرا تلخ گوارا ہوا لیکن اپنے فطری تحمل سے بولا۔

"دیکھو بڈ! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تمہارا کیا مسئلہ ہے؟" جواب میں نیشان بڈ نے ایک بلند شگاف قہقہہ لگایا۔ کارل کو حیرت ہوئی۔

"لیکن میں تم سے اپنی بات نہیں چھپاؤں گا۔" نیشان بولا۔ "میں انتولی سے محبت کرتا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔" کارل نے کہا۔ نیشان کچھ دیر سوچتی نظروں سے کارل کا چہرہ تکتا رہا پھر پوچھا۔

"کیا تم نے اپنی محبت کا کبھی انتولی سے اقرار کیا؟"

مگر کارل چپ رہا۔ نیشان دوبارہ ہنسا اور کارل کی خاموشی کا ادراک کرتے ہوئے بولا۔

"مگر میں نے انتولی سے اپنی محبت کا اظہار کر ڈالا ہے۔"

"ہم......" کارل کے منہ سے نکلا پھر بولا۔ "تو...... انتولی نے تمہیں اس کا کیا جواب دیا؟" یہ پوچھتے ہوئے کارل کا لہجہ تھوڑا اٹکتا رہا۔

نیشان بھویں اچکا کر کارل کے چہرے کو غور سے تکتا رہا پھر بولا۔

"ابھی تو کچھ نہیں بولی لیکن......" وہ خاموش ہو رہا۔

"لیکن کیا؟" کارل کے لہجے سے بے چینی ہویدا تھی

پھر اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا اور یہ جھینپ مٹانے کی خاطر اس نے مسز کیری کو پکارا۔

"مسز کیری! نیشان کے لیے کچھ لاؤ۔"

"نہیں، میں چلوں گا۔" نیشان انکار کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ کارل کو وہ آج کچھ پریشان سا لگا۔ وہ اسے خاموشی سے تکتا رہا۔

"کارل!" اس نے ہولے سے پکارا۔

"ہاں؟"

"میرا خیال ہے، انتولی تم سے محبت کرتی ہے۔"

نیشان جیسے کارل کو انتولی کا پیغام دے کر چلتا بنا۔ وہ کچھ مایوس مایوس سا تھا۔ کارل کے اندر بیک وقت عجیب سی ہلچل اور مسرت کا طوفان سا اٹھنے لگا۔ نیشان چلا گیا تو مسز کیری مسکراتی ہوئی کارل کے قریب آ کر بیٹھ گئیں۔ اس نے ان کی باتیں سن لی تھیں۔ ساتھ ہی وہ دل ہی دل میں ڈاکٹر میسن کی مشکور ہوئیں کیونکہ وہ اب کارل کا "مسئلہ" بھانپ چکی تھیں۔

وہ کافی دیر تک پہلی بار کارل سے انتولی کے بارے میں گفتگو کرتی رہیں۔

☆☆☆

اس شب ان دونوں میں سے کوئی نہ سو سکا۔ کارل کو بار بار نیشان کے الفاظ یاد آتے رہے اور دوسری جانب انتولی سوچ رہی تھی۔

"کارل کیسا مرد ہے۔ اسے کوئی مجبوری، کوئی رکاوٹ اور کوئی طاقت زیر نہیں کر سکتی۔"

جبکہ کارل کی بے چینی اسے مسلسل بے کل کیے دے رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا۔

"انتولی کیسی لڑکی ہے جس کا قرب ایک نئی زندگی کا احساس دلاتا ہے۔ پانی کے بہاؤ سے گھبرا کر جب وہ اس کے سینے سے چمٹ گئی تھی تو اس کے پورے وجود میں ایک برقی لہر دوڑ گئی تھی۔"

دونوں ایک دوسرے کے لیے سوچتے رہے اور دونوں کے قرب کی خبر شہر میں پھیلتی گئی۔

اسی دوران قربت کے کچھ اور سامان پیدا ہو گئے۔ انتولی نے ایک گیت گایا جس کی دھن کارل نے تیار کی تھی۔ وہ گیت ان دونوں کی کامیابی کا بہترین سبب بن گیا۔

ایک دن انتولی نے کہا۔

"کارل! تم نے خود کو زندہ و جاوید کر دیا ہے۔"

اس کی بات پر کارل ہنسا۔ وہ کیسے بتاتا کہ اس کے

جذبات کیا ہیں، جن کا اثر اس کے فن پر غالب ہے۔ اب بھی وہ اپنے فیصلے پر قائم تھا۔

انتولی خوب صورت اور مسحور کن آواز کی مالک تھی۔ ایک معذور انسان کا اس کو پیشکش کرنا خود غرضی کے سوا کچھ نہ تھا اور کارل خود غرض نہ تھا۔ لہٰذا وہ محبت جو اس کی رگ رگ میں خون کے مانند گردش کر رہی تھی، جس کے بغیر اب زندہ رہنے کا تصور بھی بے معنی تھا۔

غرضیکہ انتولی اب بھی کارل کے دل میں راز ہی بنی رہی۔ نہ اس نے کچھ کہا اور نہ انتولی نے کچھ سنا اور ان کی جدائی کا زمانہ آ گیا۔

کارل کو مختلف ممالک میں اپنے فن کے مظاہرے کے لیے جانا تھا۔ اس شام وہ دونوں آخری بار ملے۔

کارل نے کہا۔

''انتولی! تم مدتوں میری اچھی دوست رہیں، تمہارے ساتھ گزارا ہوا وقت مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔''

''تو کیا اب ہم کبھی نہ ملیں گے؟'' انتولی نے ایک دم سے سوال کیا۔

''مستقبل کے لیے ہم کوئی بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے۔ کامیابی کا راز یہی ہے کہ ہم مستقبل کے بارے میں نہیں، صرف حال کے بارے میں سوچیں اور حال یہ ہے کہ تمہیں جگہ جگہ تھیٹر میں گانا ہے اور مجھے ملک ملک اپنے فن کا مظاہرہ کرنا ہے۔ لہٰذا اب ہم جدا ہو رہے ہیں۔''

''مجھے بھی یہ زمانہ ہمیشہ یاد رہے گا۔'' انتولی نے دکھ سے کہا۔ ''لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم پھر ملیں گے...... ضرور ملیں گے۔''

دونوں مسکرا دیے۔ اس مسکراہٹ میں آرزوئیں بھی تھیں اور غموں کا عکس بھی۔

☆☆☆

کارل اتھن نے ایک موسیقار کی حیثیت سے اپنے دورے کا آغاز کیا۔ شروع شروع میں ہر جگہ لوگوں نے بے یقینی کے انداز میں اس کا ذکر سنا پھر طرح طرح سے اسے آزمایا اور آخر قائل ہو گئے۔

سب سے پہلے روسی خواتین نے اسے باقاعدہ دعوت دی جسے اس نے صرف اس لیے قبول کرلیا کہ ان خواتین کی اکثریت اس کے فن کو ماننے سے انکار کر رہی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ کوئی موسیقار پیروں کی انگلیوں سے دھنیں تیار نہیں کر سکتا۔ کارل نے ان کی دعوت قبول کی اور اس وقت تک اپنے فن کا مظاہرہ کرتا رہا جب تک ان سب نے باری باری اس کی عظمت کا اعتراف نہ کرلیا۔

یہاں اس نے موسیقی کے موضوع پر ایک بڑی سیر حاصل اور پُراثر تقریر بھی کی۔ اس نے کہا۔

''معزز سامعین! آپ سب میرے لیے باعثِ احترام ہیں۔ جن کا یہ خیال ہے کہ پیروں کی انگلیوں سے دھن تیار نہیں ہو سکتی، ان سے میں صرف یہی کہوں گا کہ کوئی بھی ساز بجانا ایک لطیف فن ہے جنہیں عام طور پر انگلیوں کی نازک حرکت سے پیدا کیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انگلیاں اور بے جان تار تو صرف آوازیں پیدا کرتے ہیں، اصل چیز تو تخیل ہے جس کی بدولت کائنات کا ذرہ ذرہ ہمارے سامنے جاندار بن کر آتا ہے اور ہم ان چیزوں کو دیکھ لیتے ہیں، سمجھ لیتے ہیں جن تک عام انسانوں کی نظر نہیں پہنچ سکتی اور پھر ہمارے وہ لطیف احساسات کام کرتے ہیں جن سے کام لے کر ہم سننے والوں کے جذبات برانگیختہ کر دیتے ہیں۔

''احبابِ گرامی قدر! ایک موسیقار اندرونی جذبات و احساسات کی نیرنگیوں کا تجربہ رکھتا ہے، انہیں جھنجوڑنے میں ماہر ہوتا ہے اور موسیقی کے شائقین اس کے ذریعے خود کو سمجھتے ہیں۔ ایک عام انسان خارجی واقعات و زندگی پر نظر

ملکہ کے جادوئی دیس میں مقیم تایا سلطان نے اپنی اکلوتی بیٹی ماریہ سے میرا رشتہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ سنہری سنہری ماریہ بالکل کسی میم کی طرح سوہنی ہی۔ خاندان بھر میں سب میری خوش بختی پر انگشت بدنداں اور جوان حسد سے ساڑہ سیاہ۔ فون پر میرا ماریہ سے نکاح ہوا اور کاغذات بنتے ہی میں اپنی خوابوں کی سرزمین پر جا اترا۔

یہاں آ کر یہ تلخ حقیقت کھلی کہ صرف گورے راج کا ہی نہیں بلکہ میرے مقدر کا خورشید بھی غروب ہو چکا ہے۔ تایا کو داماد نہیں بلکہ بیگار پر مزدور چاہیے تھا۔ ایسا بندہ بے دام و درم جوان کی اتھری بیٹی کی بدتمیزی نہ صرف برداشت کرے بلکہ اس کا پن چنگ بیگ بھی ہو۔ ساتھ ہی ایک کل وقتی غلام جوان کے ڈھابے کو رواں رکھنے والا متحرک پرزہ بھی۔

صرف گردن بدلی ہے غلامی ابھی بھی مروجہ۔

(تحریر: شاہین کمال، کلگری، کینیڈا)

رکھتا ہے مگر موسیقی کا آغاز اندرونی جذبات و احساسات کو چھیڑنے سے ہوتا ہے۔ جہاں تخیل و جذبات کام کرتے ہوں، وہاں کسی ظاہری عضو کی کمی یا زیادتی تن پر اثر پذیر نہیں ہوسکتی۔"

لوگوں نے اس مختصر سی تقریر کو بہت پسند کیا۔ موسیقاروں کے گروہ کا خیال تھا کہ آج تک کسی موسیقار نے موسیقی کو اس رنگ میں پیش کرکے اپنے فن کا لوہا نہیں منوایا مگر یہ کارل انھن تھا جو جہاں جارہا تھا، موسیقی کے دن کو پیروں سے نواز کر دنیا کے سامنے نیا انداز دے رہا تھا۔

انہی دنوں اسے ایک اور موسیقی کے پروگرام میں مدعو کیا گیا۔ یہ پروگرام سینٹ پیٹرز برگ میں ہوا۔ اس کے اختتام پر بہت سے لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ حسب دستور کچھ نے اس کے آٹوگراف لیے۔ کچھ نے اپنے ساتھ تصویریں کھنچوائیں اور کچھ خواتین نے پھول اور روپے برسائے۔

جب وہ تھک کر تنہا گوشے میں آیا تو چند افسروں نے اسے پکڑ لیا۔ ایک روسی پولیس افسر بولا۔

"مسٹر کارل! تم شخص دھوکا دیتے ہو۔ تمہارے عقب میں پردے کے پیچھے کوئی اور موسیقار وائلن بجاتا ہے اور تم آگے رکھے ہوئے وائلن پر پیر رکھ کر بیٹھ جاتے ہو۔"

کارل کو ان کی بات سن کر غصہ نہیں آیا بلکہ اس نے بڑے تحمل اور اخلاق سے اس افسر کو مخاطب کیا اور بولا۔

"مسٹر! آپ کی یہ بات مجھے بے حوصلہ یا مایوس نہیں بلکہ مجھے ایک نیا اور انوکھا حوصلہ عطا کر رہی ہے۔ یعنی لوگ بذاتِ خود دھوکا کھا رہے ہیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرا فن سچا ہے۔ وہ دھوکا نہیں۔"

"میں نہیں سمجھا۔" روسی افسر کو اس کی بظاہر دقیق مگر آسان گفتگو سمجھ نہ آئی۔ کارل بولا۔

"مسٹر! کیا آپ میرے کمرے تک چلنے کی تکلیف گوارا کریں گے؟"

"ہاں، کیوں نہیں۔" افسر بولا۔ "میں آپ کے فراڈ کا بھانڈا پھوڑنے کے لیے سب جگہ جاسکتا ہوں۔"

"تو پھر چلیے۔" کارل نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

ذرا دیر بعد بدگمان اور تنگ دل افسر اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ کارل کے سامنے بیٹھا تھا اور کارل اس کے بالکل سامنے وائلن بجا رہا تھا۔ اس کے پیروں کی انگلیاں بڑی مہارت سے تاروں کو چھو رہی تھیں اور مدھر آواز پیدا کرکے سننے والوں کو مست کیے دے رہی تھیں۔

اس وقت ان سب کی آنکھیں تعجب کا اظہار کررہی تھیں پھر وہ کھسیانے ہوگئے مگر کارل نے شکست دینے کے بعد انہیں لعن طعن نہیں کیا بلکہ دوستانہ انداز میں بولا۔

"میرے روسی دوستو! اگر اب آپ یہ یقین کرچکے ہوں کہ ویانا کا یہ موسیقار پیروں کی انگلیوں سے وائلن خود بجا رہا ہے تو میں آپ کی خدمت میں آپ کا ترانہ پیش کروں؟"

روسی پولیس افسر شرمندہ ہوگیا مگر فوراً ہی بولا۔

"نوجوان کارل انھن! ہم نے دل سے تمہاری عظمت کا اعتراف کرلیا ہے۔ تم وہ قابلِ فخر انسان ہو کہ تم پر ہر ملک اور ہر قوم کے انسان کو ناز کرنا چاہیے۔"

"شکریہ۔" کارل نے ہنس کر کہا اور وہ دیر تک روسی ترانہ بجا کر ان روسیوں کو متعجب کرتا رہا۔

☆☆☆

اس رات اس نے جی بھر کر وائلن بجایا۔ جب بھی وہ کسی پروگرام میں غیر معمولی کامیابی حاصل کرتا، اس رات اسی طرح مصروف رہتا۔ اس وقت اس کے پیروں کی انگلیاں سازوں پر ہوتیں مگر تصور ایک ہی صورت کا طواف کرتا۔ بھورے بال، چمکتے چہرے اور سرخ فراک والی ایک لڑکی جو تھیٹر میں گایا کرتی تھی اور کارل نے پہلی اور آخری بار اسے دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا مگر اظہارِ عشق نہ کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ وہ اس کی یاد سینے میں چھپائے آگے بڑھتا گیا۔

اس نے انگلستان، امریکا اور کیوبا کے دورے کیے۔ ہر جگہ اس کے لیے باقاعدہ موسیقی کی محفلیں سجائی گئیں جہاں اس نے اپنے فن کا مظاہرہ کرکے زبردست داد وصول کی، بے پناہ دولت کمائی اور غیر معمولی شہرت حاصل کی جو ابھی تک کسی اور فنکار کو نہ ملی تھی۔

یوں اس نے وہ مقام حاصل کیا جو آج تک کسی موسیقار کو نہ ملا تھا لیکن اسے ہر جگہ اسی جدوجہد کا مظاہرہ کرنا پڑا جس سے بار بار گزر کر اس نے خود کو منوایا تھا۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ اس کے فن کے قدردانوں نے اسے مدعو کیا اور کبھی اس عظیم انسان کی اولوالعزمی کو تسلیم نہ کرنے والے لوگوں نے اسے آزمایا لیکن بالآخر وہ ہر جگہ کامیاب ہوا۔ یہاں تک کہ دورہ کرتے ہوئے وہ آسٹریلیا کے شہر پراگ جا پہنچا۔ اب اسے یہاں اپنے فن کا مظاہرہ کرنا تھا۔ سیکڑوں لوگ اردگرد کے علاقوں سے یہاں جمع ہوئے تھے۔ اس وقت اسے گھر سے نکلے ہوئے تقریباً پانچ برس گزر چکے تھے اور وہ ایک تندرست و توانا، خوبصورت پچیس سالہ مرد تھا اور اس نے اس عمر میں بے پناہ دولت اور شہرت حاصل کرلی تھی۔

پراگ پہنچنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ اس

ہنگامہ خیزی سے جلد ہی نکل کر کسی پُرسکون گوشے میں پہنچ جائے گا جہاں تنہائی ہوگی، انتولی کا حسین تصور ہوگا اور اس کے ساز ہوں گے۔ یہ خواہش شدت اختیار کرتی جارہی تھی۔ انتولی سے اظہارِ عشق نہ کرکے اس نے عظمت و خودداری کا ثبوت دیا تھا مگر حقیقت یہی تھی کہ اس تمام عرصے میں ہنگاموں اور تنہائیوں کے کسی لمحے میں بھی وہ اسے فراموش نہ کرسکا تھا۔

اس دن پراگ میں موسیقی کی ایک بڑی محفل جمی۔ کارل نے پھر اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر اسے طرح طرح سے آزمایا گیا اور لوگ اس کے قائل ہوگئے اور شو ختم ہونے کے بعد بہت سے لوگ اس کے گرد جمع ہوگئے تاکہ اس سے ہم کلام ہوں، اس کے ساتھ تصویریں کھنچوا سکیں۔

کارل ان سب سے ملتا اور اپنے اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کرتا رہا پھر فرصت ملتے ہی ایک الگ تھلگ گوشے میں پہنچ گیا۔

یہ اس کی عادت تھی کہ ہنگاموں سے نمٹ کر جب وہ سکون کی جگہ پاتا تو تھوڑی دیر کے لیے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنی آنکھیں بند کرلیتا اور دماغ کے سب دریچے کھول دیتا۔ ہر دریچے سے داخل ہونے والی ایک ہی ہستی ہوتی...... بھورے بال، چمکتا چہرہ اور سرخ فراک...... تب وہ دھیرے سے مسکرا دیتا جیسے سب تھکن دور ہوگئی ہو۔

اس وقت بھی وہ آنکھیں بند کیے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے اسے تصور ہی تصور میں تک رہا تھا اور اس کا دکھا ہوا دل اس سے کہہ رہا تھا۔

''کارل! کیا عمر بھر انتولی کو علم نہ ہوگا کہ ایک عظیم موسیقار اس سے محبت کرتا ہے؟''

''ہاں، دوست!'' کارل نے دل کو سمجھایا۔ ''اسی میں عافیت ہے...... ورنہ تم تو جانتے ہو عمر بھر کسی سے نہ ہارنے والا کارل، انتولی کی زبان سے انکار کا جملہ سن کر زندہ نہ رہے گا۔ ابھی یہ صبر تو ہے کہ اسے خبر ہی نہیں۔''

''زندگی کیسے گزارو گے؟'' دل نے وار کیا۔

''اس کے تصور میں گم ہوکر، اس کی یادوں کو آباد کرکے۔'' عقل نے راہ سجھائی۔

کارل دھیرے سے مسکرا دیا۔ دل و دماغ کی یہ جنگ بھی اسے عجیب لگتی تھی۔ وہ بظاہر مسکراتا رہتا تھا مگر شب بھر سو نہ سکتا تھا۔ اس وقت بھی وہ بے چین و بے قرار سا اپنے خیالوں میں الجھا ہوا تھا کہ ایک مترنم آواز نے اسے چونکا دیا۔

''ہیلو...... کارل!''

کارل نے آواز کو پہچانا اور گردن موڑ کر دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ پہلی نظر میں سمجھا کہ انتولی کی تصوراتی شکل ہے جو مجسم ہوکر سامنے آئی ہے مگر انتولی کی کھنکھناتی ہوئی ہنسی، اٹھلاتی ہوئی چال اور فاتحانہ تبسم نے باور کرا دیا کہ یہ وہی ہے جس کے لیے وہ ہر لمحہ سوچتا ہے۔

وہ اس کے قریب آگئی تو کارل پوری طرح ہوش میں آگیا اور بولا۔

''ہیلو...... انتولی! تم یہاں کب آئیں؟''

''جناب! میں ان دنوں پراگ آئی ہوئی ہوں اور گزشتہ شب میں نے تھیٹر میں گیت گایا تھا۔ میں آپ کے پروگرام میں بھی موجود تھی مگر آپ نے دیکھا ہی نہیں۔''

''اوہو، اچھا۔'' کہتے ہوئے کارل نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''مجھے علم نہ ہوسکا۔''

''آپ کو ہماری موجودگی کا بھی علم نہ ہوسکا اور ہم آپ کی غیر موجودگی میں بھی پل پل کی خبریں رکھتے ہیں۔'' انتولی نے اٹھلائے سے لہجے میں کہا۔

کارل ایک دم سے چونک گیا مگر سنبھل کر بولا۔

''ذرہ نوازی ہے آپ کی۔ اچھا سناؤ، اتنے برس کیا کرتی رہیں؟''

اس سوال پر انتولی نے اسے بغور دیکھا۔ چند لمحے اسی انداز میں تکتی رہی پھر بڑے عزم سے بولی۔

''کارل! اس تمام عرصے میں، میں ایک ہی بات محسوس کرتی رہی ہوں...... سنو گے؟''

''بتاؤ۔'' کارل نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ کہ تمہارے بغیر رہ نہ سکوں گی۔'' انتولی نے ایک ہی جملے میں سب کچھ کہہ دیا۔

کارل ایک دم ہڑبڑا کر کھڑا ہوگیا۔

''انتولی......!'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

''ہاں، کارل!'' انتولی بھی کھڑی ہوگئی۔ ''میں نے تمہیں پہلی بار دیکھ کر ہی یہ فیصلہ کرلیا تھا۔''

''نہیں انتولی!'' کارل نے الجھے سے انداز میں کہا۔ ''تمہارا فیصلہ غلط ہے۔''

''مگر کیوں؟'' انتولی کی آواز بھاری ہوگئی۔ ''کیا تم کسی اور سے......''

''نہیں۔'' کارل نے جلدی سے کہا۔ ''تمہارے سوا کسی سے نہیں۔''

"تو پھر......؟" انتولی بات پوری نہ کر سکی۔

"انتولی!" کارل نے حسب عادت سچ بولا۔ "تم ایک خوبصورت لڑکی ہو اور کارل دونوں بازوؤں سے محروم ہے۔ محبت کے لیے کسی ایسے شخص کا انتخاب کرو جو تمہیں سینے سے لگا سکے۔"

"تم مجھے سینے سے نہیں لگا سکتے تو کیا ہے، میں خود تمہارے سینے سے لگ جاتی ہوں۔"

انتولی نے بڑے اعتماد سے کہا اور آگے بڑھ کر کارل کے سینے سے لگ گئی۔ کارل کا دل تیزی سے دھڑکا مگر قرب کی یہ لذت عجیب تھی۔ اسے وہ دن یاد آگیا جب اس نے ڈوبتی ہوئی لڑکی کو بچایا تھا۔ اس دن بھی وہ خود ہی اس سے لپٹ گئی تھی اور آج بھی اس کا انداز ویسا ہی والہانہ پن کا اظہار کررہا تھا۔ گداز جسم کا ٹکراؤ کارل کو بے خود کیے دے رہا تھا۔

انتولی اسے اپنی سڈول اور مرمریں بانہوں کے گھیرے میں لیے کھڑی تھی۔ اس نے ایک نظر اس دیوانی لڑکی کو دیکھا جو برسوں سے اس کی تنہا یادوں کو آباد کیے ہوئے تھی، جو اس کی متاع حیات تھی مگر اس نے محبت کا ایک جملہ بھی اس سے نہ کہا تھا لیکن آج کچھ نہ کہنا ظلم تھا۔

کل بھی اسے محسوس ہوا کہ اپنے عشق کو وہ کسی لفظ، کسی جملے، حتیٰ کہ طویل تقریر میں بھی نہیں سمو سکتا۔ تب ہی وہ جھکا اور اپنا خوبصورت چہرہ اس کے بالوں سے رگڑنے لگا۔ اظہارِ عشق کا یہ طریقہ بڑا والہانہ تھا جس سے مسحور ہو کر انتولی نے اپنا چہرہ اونچا کیا، اس کی مست مست آنکھوں میں جھانکا اور سرگوشی کی۔

"کارل!"

"انتولی!"

کارل نے جذبات سے مرتعش لہجے میں کہا۔

اسی وقت ان دونوں کو محسوس ہوا کہ اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہی...... اب کچھ بتانے کی طلب نہیں رہی، اب کچھ باور کرانے کی چاہ نہ رہی کہ جذبات اور محسوسات کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔

یہ زبان فسوں کار تھی جس نے کوئی طلب، کوئی چاہ اظہار کی رہنے ہی نہ دی۔

کچھ دن بعد پراگ کا سب سے اہم موضوع یہ تھا کہ کارل جیسے عظیم موسیقار اور بلند حوصلہ انسان نے تھیٹر کی گانے والی خوبصورت لڑکی انتولی سے شادی کرلی ہے۔

☆☆☆

اب بہت سا وقت گزر گیا۔ صبح و شام کا چکر بھی ہنوز جاری ہے۔ یہاں تک کہ دو سال گزر گئے۔ اس دن سانولی شام شب کی سیاہی میں گھلتی جارہی تھی۔ ایک مختصر سا گھر ہے، بڑا ہی روشن جو صرف تین نفوس پر مشتمل ہے۔ مسٹر کارل اتھمن، مسز کارل اتھمن اور ایک ننھا سا وجود۔

یوں لگتا ہے جیسے وقت نے نہ جانے آگے جست لی ہے یا پھر کئی برس پیچھے زقند لگائی ہے۔

ملک کا نامور موسیقار طعام خانے میں بیٹھا ہوا ہے۔

اس کی نظر اپنے ایک سالہ تندرست صحت مند بچے پر ہے جو آج پہلی بار خود گھسٹ کر طعام خانے میں آگیا تھا اور کرسی پر چڑھنے کی کوشش میں نیچے گر پڑا تھا۔ تب ہی نہ جانے ذہن کے کس گوشے میں ایک یاد ابھری...... اور...... مدتوں قبل کی ایک سرگوشی کانوں میں اتر گئی۔

"جان، پلیز! کارل کو ایسی محبت نہ دو کہ وہ تباہ ہوجائے۔ اسے اپنی مدد آپ کرنے دو۔"

کارل اتھمن چونکتا ہے، پھر اس عظیم موسیقار کا سر عقیدت سے جھک گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ جس بات کو وہ اس وقت نہ سمجھا تھا، اسے اب سمجھ گیا ہے اور لاشعور میں چھپی ہوئی اسی سرگوشی نے عمر بھر اس کی راہنمائی کی، اسے راستہ دکھایا اور اسے بام عروج تک لے گئی۔

اس نے ایک گہری ہنکاری بھری اور سر اٹھا کر دیکھا کہ انتولی اپنے گرے ہوئے بچے کو اٹھانے کے لیے تیزی سے اٹھ رہی تھی مگر اس سے قبل کہ وہ اسے سنبھالا دیتی، کارل نے نرم مگر ٹھوس سی مسکت آواز میں کہا۔

"انتولی میری جان! اسے خود اٹھنے کا موقع دو۔ سہارے کی عادت اسے نہ ڈالو ورنہ یہ تباہ ہوجائے گا۔"

انتولی نے شاکی سے انداز میں اسے دیکھا مگر اس وقت وہ بغور اپنے اس ننھے بچے کو دیکھ رہا تھا جو صحیح سلامت اور تندرست تھا اور اب تک کسی طرف سے سہارا نہ پاکر خود اٹھتے ہوئے کرسی تک پہنچنے کی کوشش کررہا تھا اور جب وہ اپنے ہاتھ پیروں کی پوری قوت صرف کر کے کسی کی مدد کے بغیر کرسی پر چڑھ گیا تب کارل نے بڑے دلفریب تبسم کے ساتھ اسے دیکھا۔

آج اس مسکراہٹ میں نہ دکھ تھا نہ آرزو بلکہ طمانیت تھی، فخر تھا جیسے آج سیڑھی کے تمام قدمچے طے کر کے وہ بلند ترین مقام پر پہنچ گیا ہو۔

ماخذات: تھومس ایلڈرچ

بیل کریک، مشی گن، ریاست ہائے متحدہ امریکا میں 1990ء کا موسم بہار تھا۔ شہر کی جانی پہچانی شخصیت 34 سالہ ڈایان نیوٹن طلوع آفتاب کے وقت مقررہ سے بیدار ہوئی اور تازہ دم ہوکر کام پر جانے کی تیاری کرنے لگی۔ وہ مقامی ٹی وی اسٹیشن WUHQ میں ایک مقبول اینکر تھی۔ ڈایان آبادی سے دور ایک پر فضا مقام پر دو منزلہ فارم ہاؤس میں رہتی تھی البتہ مارننگ شو

کے لیے اسے بہت صبح اٹھنا ہوتا تھا۔ اس روز بھی وہ تیاری کر کے اپنا بریف کیس ڈھونڈ رہی تھی کہ اس کے شوہر بریڈ نے نچلی منزل میں واقع باورچی خانے سے آواز دی کہ ناشتا بس پانچ منٹ میں تیار ہے۔ وہ اپنے دوسرے بچے سے امید سے تھی اور وجہ بھی شاید یہی تھی کہ اسے آج کل بہت زیادہ بھوک لگتی تھی۔ جوتے پہن کر وہ احتیاط کے ساتھ زینہ اتری جہاں اس کی پہلی

بیوی کے کاندھوں پر راج کرنے والے ایک شوہر کا خوفناک روپ

نااہلی اور کاہلی کسی بھی انسان کو پستی میں گرا سکتی ہے... اسے بھی گرادیا... اگرچہ ان خامیوں پر قابو پایا جاسکتا تھا مگر... اس کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا... کیونکہ جس عیش پرستی کا وہ شکار ہو چکا تھا... اس میں محنت کا دور دور تک گزر نہ تھا مگر... اچانک ایک دن وہ تماشا ہوا کہ ٹی وی پر مشہور شو کرنے والی میزبان اپنے ہی ایک عقیدت مند کے ہاتھوں زندگی کی بازی ہار گئی...

عقیدت مند

شاہد لطیف

بیٹی دوسالہ مولی اپنی اونچی کرسی پر ناشتے کے لیے منتظر تھی۔ تینوں نے ناشتا کیا پھر ڈایان، مولی کی پیشانی پر پیار کرکے باہر کی جانب چل دی۔ اس کا 43 سالہ شوہر بریڈ تقریباً روزانہ ہی سب کے لیے ناشتا تیار کرتا تھا۔ وہ ویسٹرن مشی گن یونیورسٹی میں شعبۂ کرمنل جسٹس میں جزوقتی اسسٹنٹ پروفیسر تھا۔ بریڈ اپنے بے تکلف دوستوں سے اکثر کہتا کہ اس کا اصل کام اپنی بیوی اور بچی کی دیکھ بھال ہے اور یہ بات بہت حد تک ٹھیک بھی تھی کیونکہ ہفتے کے زیادہ دن ڈایان کو گھر آتے ہوئے خاصی دیر ہوجاتی لہٰذا بریڈ کو ہی بیٹی کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی۔ اسی لیے وہ یونیورسٹی میں جزوقتی کام کرتا تھا۔ اس کے بعض دوست اسے ”مسٹر ڈایان“ کہہ کر پکارتے لیکن بریڈ ایسی باتوں کو ہنس کر ٹال دیتا۔

ڈایان گھر سے نکلی تو صبح کے ٹھیک پانچ بج رہے تھے۔ اپنی بالکل نئی ویگن ائر جیپ چلاتے ہوئے اس نے اپنے فارم ہاؤس اور اس کے پیچھے جنگل پر ایک نظر ڈالی۔ دوسروں کے برعکس انہوں نے اپنی زمین پر کسی قسم کی کوئی کھیتی باڑی نہیں کی تھی۔ ڈایان سوچنے لگی کہ جلد ہی وہ موسم کی سبزیاں لگائے گی۔ اس نے اطراف کو جی بھر کے دیکھا اور بہت مسرور ہوئی۔ یہی تو اس کی جنت تھی۔ اپنے میل باکس پر پہنچ کر اس نے بڑی سڑک پر چڑھنے سے پہلے دونوں جانب دیکھا اور پھر دائیں جانب چل دی۔ ٹی وی اسٹیشن پہنچنے تک اس کے خیالات کا تانا بانا اپنا خاندان اور آنے والا بچہ رہا۔ بچے کی پیدائش کو ابھی کئی مہینے باقی تھے اور ڈایان کو بہت سے کام انجام دینے تھے۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ اپنی میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے ایک مصروف دن تھا۔ جب ڈایان اپنے دفتر میں داخل ہوئی تو حسبِ معمول اسے اپنا اسکرپٹ دیکھنا اور اپنا مارننگ شو شروع کرنا تھا پھر اس کے بعد اسے اور اس کے اسٹاف کو اگلے روز کے پروگرام کی تیاری کرنا تھی۔ وہ بہت محنت سے کام کرتی اور اپنی ٹیم سے بھی ایسی ہی توقع رکھتی تھی جس سے کبھی کبھار کچھ لوگ چڑ بھی جاتے۔ البتہ ٹی وی دیکھنے والے ناظرین اسے بہت پسند کرتے تھے۔ ڈایان کو مقامی تقریبات اور فنڈ ریزنگ میں بلایا جاتا۔ یوں گھر اور گھر سے باہر ہر ایک جگہ ڈایان کی آؤ بھگت تھی لیکن جلد ہی کچھ ایسا ہوا کہ سب ہی کچھ الٹ پلٹ گیا اور اس کی زندگی بدل کر رہ گئی۔

یہ ایک فون کال کی وجہ سے شروع ہوا۔ ایک روز وہ اپنے دفتر میں اسکرپٹ پر کام کررہی تھی کہ دفعتاً فون کی گھنٹی بجی۔ واضح ہو کہ یہ 1990ء کی دہائی کا ذکر ہے جب کالر آئی ڈی یا موبائل فون بہت زیادہ عام نہیں تھا۔ اس کے دفتر میں صرف لینڈ لائن تھی۔ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس نے فون اٹھالیا کیونکہ اکثر اس کے ساتھی، ”ذرائع“ وغیرہ فون کرتے ہی رہتے تھے مگر آج کال کرنے والا ان میں سے کوئی نہیں تھا بلکہ وہ ڈایان کا عقیدت مند اور پرستار تھا۔ ڈایان نے کالر سے اس کا نام نہیں پوچھا۔ وہ کسی مرد کی آواز تھی جو اندازاً تیس برس کا لگتا تھا۔ وہ ڈایان کا پرستار تھا جو اس کے پروگرام سے متاثر ہوکر اب ٹی وی اسٹیشن پر کام کرنے کا خواہش مند تھا اور ڈایان سے مشورہ مانگ رہا تھا کہ ٹی وی میں آنے کا کیا طریقہ ہے؟ ڈایان نے سوچا آخر اس شخص کے پاس اس کا فون نمبر کیسے آیا؟ اس نے باوقار طریقے سے اسے بتایا کہ وہ مقامی کمیونٹی کالج کے شعبۂ ابلاغ میں داخلہ لے بلکہ اس نے بعض مخصوص مضامین بھی تجویز کیے۔ کالر نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ڈایان نے پیشہ ورانہ انداز میں اس کی کامیابی کی دعا کی اور اس خیال کے ساتھ فون رکھا کہ اب شاید وہ کبھی اس شخص کی آواز نہیں سنے گی لیکن ایسا قطعاً نہیں ہوا۔

پھر اس شخص کے فون باقاعدگی سے آنے لگے۔ کبھی تو ہفتے میں تین مرتبہ۔ ڈایان کے پاس کالر آئی ڈی نہیں تھی پھر اسے تمام کالز سننا بھی پڑتی تھیں۔ گوکہ وہ ان کالز سے پریشان تھی لیکن اس نے اپنا پیشہ ورانہ انداز ہمیشہ برقرار رکھا۔ یہ شخص گفتگو میں شعبۂ ابلاغ اور اس کے مضامین کے انتخاب تک ہی محدود رہتا۔ جوں جوں اس شخص کی کالز بڑھتی گئیں، توں توں ڈایان کو اندازہ ہوا کہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ اسے یقین ہوگیا کہ اس شخص کو صحافت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ یہ تو فون کرنے کا ایک بہانہ ہے۔ ویسے کالر نے کبھی بدتمیزی یا دھمکی آمیز انداز میں بات نہیں کی تھی پھر بھی اس کا انداز عجیب تھا۔ الفاظ واضح سننے میں نہیں آتے تھے۔ یوں لگتا جیسے نیند یا نشے میں ہو۔

بالآخر ڈایان کو خطرہ محسوس ہونے لگا۔ ہوتا بھی کیوں نا؟ مشہور شخصیات کے پیچھے کچھ لوگ ویسے ہی ہاتھ دھوکر پڑ جاتے ہیں۔ ان باتوں کو اخبارات میں بھی مختلف انداز میں جگہ ملتی۔ بعض نامور لوگوں کے تو گھروں میں بھی ان کے نام نہاد عقیدت مند زبردستی داخل ہوگئے۔ سال بھر پہلے لاس اینجلس، کیلی فورنیا میں کسی عقیدت مند نے ایک نوجوان ٹیلی ویژن اداکارہ کو اسی کی دہلیز پر گولی مار کر قتل کردیا تھا۔ ٹی وی اور فلمی شخصیات جہاں جاتی ہیں، لوگ ان کا پیچھا کرنا شروع کردیتے ہیں۔ اب ڈایان کو اس سلسلے میں کچھ کرنا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ کرنا کیا ہے۔

☆☆☆

1990ء کی دہائی میں ریاست ہائے متحدہ امریکا میں "اینٹی اسٹاکنگ لاء" (کسی کا پیچھا کرنے کی دفعات) نافذ العمل نہیں تھا پھر اس زمانے میں نہ پولیس، نہ ہی ماہر نفسیات کسی حتمی نتیجے پر پہنچے کہ پیچھا کرنے والوں سے سختی کے ساتھ نمٹا جائے یا انہیں نظر انداز کر دیا جائے۔ ڈایان بھی اب اپنے اس عقیدت مند پرستار سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس نے اس سلسلے میں قریبی رفقاء سے مشورہ کرنا شروع کر دیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ کسی نے کہا کہ اس سے نرم لہجے میں بات جاری رکھی جائے کیونکہ مشتعل ہو کر وہ نہ جانے کیا اقدام کر ڈالے۔ کسی نے کہا کہ وہ دوٹوک انداز میں کالر کو کہہ دے کہ بس اب کافی ہو گیا...... لیکن ڈایان بخوبی جانتی تھی کہ ان دونوں آراء میں سقم ہے۔

ویسے تو وہ دفتر اور ٹی وی کے معاملات دفتر اور اسٹیشن تک ہی محدود رکھتی تھی لیکن اب اس نے اپنے شوہر کو اعتماد میں لے کر ساری رام کہانی سنا ڈالی اور پوچھا کہ کیا کیا جائے؟ بریڈ نہ صرف یہ کہ اس کا شوہر اور یونیورسٹی میں کرمنل جسٹس میں جزوقتی پروفیسر تھا بلکہ وہ یونیورسٹی میں پڑھانے سے پہلے ایک پولیس افسر بھی رہ چکا تھا۔ بریڈ نے تمام ماجرا سننے کے بعد ڈایان کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے دفتر میں اس شخص کی ٹیلی فونک رسائی موقوف کر دے۔ اس سلسلے میں استقبالیہ اور ٹیلی فون ایکسچینج میں ایسا انتظام کر لیا جائے کہ باہر سے جو بھی کال آئے، استقبالیہ سے ہو کر ڈایان تک پہنچے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح اس شخص کی رسائی ناممکن ہو جائے گی۔ اسی بات کو ڈایان نے WUHQ ٹی وی اسٹیشن کی انتظامیہ کے سامنے رکھا اور یوں ایک منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ اب کوئی بھی کال پہلے استقبالیہ میں جاتی، وہاں سے صرف وہی کالز ڈایان تک پہنچتیں جو ضروری ہوتیں۔ اس شخص کی کال ڈایان کی عدم دستیابی یا مصروفیت کا کہہ کر آگے نہیں بھیجی جاتی۔ کچھ ہفتوں تک یہ نظام بہت موثر رہا۔

☆☆☆

وہ موسم گرما کا آخر تھا۔ ڈایان اپنے دفتر میں کسی اسکرپٹ پر کام کر رہی تھی کہ اس کی میز پر رکھے لینڈ لائن فون پر گھنٹی بجی۔ اس نے پہلی ہی گھنٹی پر ریسیور کان سے لگایا۔ اس نے بغیر کال کرنے والے کی بات سنے، پیشہ ورانہ طریقے سے گفتگو شروع کی کہ میں ڈایان بات کر رہی ہوں...... جواب میں جو آواز آئی، مارے خوف کے اس کے ہاتھ سے ریسیور گرتے گرتے بچا۔ آخر کار اس روز یہ دفاعی نظام بھی ناکام ہو گیا۔

"ہیلو ڈایان!" وہی شناسا سا آواز ابھری۔ خوف کے مارے ڈایان کی گھگی بندھ گئی۔

کالر نے کہا کہ ڈایان اسے اچھی لگتی ہے اور وہ اس سے کہیں باہر ملنا چاہتا ہے اور پھر اس بات پر اصرار کیا کہ وہ اس کے ساتھ دوپہر کا کھانا کسی اچھے ریسٹورنٹ میں کھانا چاہتا ہے۔

چیخ تو دور کی بات، وہ آواز تک نہ نکال سکی۔ گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بمشکل اس نے کہا۔ "شکریہ...... مگر فی الوقت مصروفیت کی وجہ سے یہ ممکن نہیں۔" فون بند کر کے وہ زور زور سے رونے لگی۔ نیوز روم میں بیٹھے تمام افراد اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔

اس رات جب ڈایان گھر لوٹی تو شوہر کو یہ بات بتائی۔ بریڈ بہت پیچ پا ہوا کہ یہ کال آخر استقبالیہ پر روکی کیوں نہیں گئی؟ اس نے فوراً WUHQ ٹی وی اسٹیشن کی انتظامیہ سے رابطہ کیا۔ وہاں شفٹ کے تمام افراد بشمول استقبالیہ والے اس بات پر حیران تھے کہ یہ کال آخر ڈایان تک پہنچی کیونکر؟

بریڈ کو یقین دلایا گیا کہ اس معاملے کی باقاعدہ تفتیش کی جائے گی اور ایسا نظام وضع کیا جائے گا کہ آئندہ اس قسم کا کوئی واقعہ رونما نہ ہونے پائے۔

اب بھی عقیدت مند اور پرستار کی کال آتی لیکن ڈایان کو منتقل نہ کی جاتی۔ یوں بتدریج کالز کی تعداد گھٹتی چلی گئی اور چند ماہ بعد یہ آنا ہی بند ہو گئیں اور وہ بھی انہیں بھول کر مصروف ہو گئی۔ اس کے لیے سب سے زیادہ اہم آنے والے بچے کا انتظام کرنا تھا۔ گزشتہ سال بھر سے ڈایان سوچ رہی تھی کہ اب وہ WUHQ ٹی وی اسٹیشن پر مارننگ شو کے پروگرام بند کر دے گی۔ اس کا ذکر بریڈ سے بھی کر چکی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کم از کم سال چھ مہینے وہ گھر پر رہ کر دیکھے اور اگر سب اچھا ہوا تو یہ کام مستقل چھوڑ دے گی۔ پھر اب تو نئے مہمان کی آمد آمد تھی۔ وہ دوست احباب، رشتے داروں اور ٹی وی اسٹیشن پر بھی برملا کہہ چکی تھی کہ زچگی کے بعد وہ سال بھر کام نہیں کرے گی۔ وہ سب سے کہتی پھرتی کہ بچے کی پیدائش کے بعد وہ کم از کم سال بھر گھر پر رہ کر دونوں بچوں کی پرورش کرے گی اور اس کا شوہر بریڈ یونیورسٹی میں مستقل کام کرے گا۔ اب کی مرتبہ ایک دفعہ پھر 1990ء کی خزاں 30 اکتوبر کو اس کا منصوبہ خاک میں ملتا نظر آیا۔

☆☆☆

اس روز بریڈ نے ڈایان سے کہا کہ وہ یونیورسٹی میں مصروف ہے اور گھر آنے میں دیر ہو جائے گی اس لیے ڈایان اپنے مقررہ وقت سے پہلے ٹی وی اسٹیشن سے گھر آگئی۔ ایسا کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ یہ پہلے بھی ہوتا رہا تھا۔ اسے خود بھی اپنی بیٹی کے پاس وقت گزارنا بہت اچھا لگتا تھا لیکن اب کی دفعہ بات کچھ مختلف تھی کیونکہ ڈایان اب آٹھویں ماہ میں تھی۔ اس پر مستزاد ڈایان ایک بہت اہم منصوبے پر کام کر رہی تھی۔ اس روز اپنی شفٹ ختم کرنے کے بعد ڈایان اپنی بیٹی مولی کے ڈے کیئر مرکز پر پہنچی اور اسے لے کر گھر کی جانب چلی۔ راستے میں مولی تو کار کی پچھلی سیٹ پر سوگئی۔ ادھر خود اس کا جسم دکھ رہا تھا۔ وہ اتنی تھک چکی تھی کہ جیپ سے اتر کر اپنے فارم ہاؤس کے میل باکس سے ڈاک نکالنے کے بجائے بیٹھے بیٹھے محض ہاتھ بڑھا کر ڈاک نکال کر اپنی گود میں رکھ لی اور باری باری انہیں سرسری دیکھنے لگی۔ ڈاک میں ایک خط ممتاز نظر آیا۔ بظاہر تو وہ ایک سفید عام سا لفافہ تھا لیکن جو چیز اسے ممتاز کرتی تھی، وہ یہ تھی کہ اس پر کوئی ڈاک ٹکٹ تھا، نہ کوئی مہر اور نہ ہی کوئی ایڈریس اور نہ وہ لفافہ بند تھا۔ اس نے لفافے سے خط نکالا پھر جو کچھ پڑھا، اس نے فوراً ہی اسے خوفزدہ کر دیا۔ وہ محض ایک سطری جملہ تھا لیکن ہاتھ سے تحریر نہیں کیا گیا تھا بلکہ ہر حرف کسی رسالے سے کاٹ کر سادہ کاغذ پر اسکاچ ٹیپ سے چپکا کر عبارت کا روپ دیا گیا تھا۔ فلموں میں تاوان لینے کے لیے استعمال ہونے والے مناظر کی طرح۔ وہ جملہ یوں تھا۔

”تمہیں میرے ساتھ لنچ پر جانا چاہیے تھا۔“ ڈایان فوراً سمجھ گئی کہ یہ اس کے عقیدت مند پرستار کی جانب سے ہے۔ یقیناً یہ میرا گھر جان گیا ہے جب ہی تو خود آ کر میرے میل باکس میں یہ لفافہ ڈال گیا۔ یہ تو خطرے کا الارم تھا۔ ممکن ہے وہ شخص اب بھی کہیں اس کے انتظار میں نزدیک ہی موجود ہو۔ اس خیال کے آتے ہی ڈایان اپنی تھکاوٹ، جسم کی دکھن، سوتی ہوئی بچی، سب کچھ بھول کر بری طرح چلائی اور گاڑی کو خطرناک طریقے سے موڑا اور پوری رفتار سے اپنے فارم ہاؤس سے بڑی سڑک کی جانب بڑھ گئی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ اپنی دوست سنڈی کے گھر موجود تھی۔

ڈایان کی حالت دیکھ کر سنڈی پریشان ہوگئی۔ وہ دونوں WUHQ ٹی وی اسٹیشن پر کام کرتی تھیں اسی لیے وہ مشورے کے لیے سب سے پہلے یہیں آئی۔ یہ سنڈی ہی تھی جس سے ڈایان نے اپنے عقیدت مند کی فون کال کا سب سے پہلے ذکر کیا تھا۔ اب کی مرتبہ بھی ڈایان نے وہ ایک سطری خط سنڈی کو دکھایا۔ اسے دیکھتے ہی اس نے پولیس بلوانے کا مشورہ دیا۔

پولیس کچھ ہی دیر میں سنڈی کے ہاں آگئی اور ڈایان کے ساتھ اس کے فارم ہاؤس گئی۔ گھر اور پورے فارم کی خوب اچھی طرح تسلی کر کے کہا کہ یہاں کوئی بھی نہیں۔ پھر بھی اب ڈایان وہاں اکیلی نہیں رہنا چاہتی تھی لہٰذا پولیس اسے واپس سنڈی کے گھر چھوڑ گئی۔ ڈایان نے یہ تمام ماجرا بریڈ کو فون پر بتا دیا۔ وہ یونیورسٹی سے سیدھا سنڈی کے گھر آیا۔

ادھر WUHQ ٹی وی اسٹیشن میں آنے جانے والوں پر کڑی نظر رکھی جانے لگی اور ہر قسم کی ڈاک کو استقبالیہ پر ہی وصول کیا جانے لگا۔ بریڈ نے اپنے فارم ہاؤس والے گھر میں حرکت سے باخبر کرنے والا حفاظتی نظام لگوالیا مگر ان تمام اقدامات کے باوجود ڈایان مطمئن نہ ہوسکی۔ اسے اس بات کا پختہ یقین تھا کہ اس کا عقیدت مند پرستار اسے دیکھ رہا ہے۔

خوف کے بادل یہاں تک بڑھے کہ ڈایان نے ٹی وی اسٹیشن جانے کے علاوہ گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ وہ بہ امر مجبوری کہیں جاتی۔ بریڈ نے ایک نظام ترتیب دیا ہوا تھا۔ وہ یہ کہ جب وہ کہیں اکیلے باہر ہوتی تو واپس گھر آنے سے پہلے بریڈ کو آنے کا بتاتی اور بریڈ اس کے آنے سے پہلے فارم ہاؤس کے دروازے پر ہوتا لیکن جب موسم بہت سرد ہوتا اور باہر کھڑا ہونا محال ہوتا تو ایسے میں بریڈ اوپر کے کمرے میں ایک مخصوص لائٹ آن کر دیتا جو دور سے نظر آتی تھی۔ یہ اشارہ ہوتا کہ بریڈ گھر پر ہے اور وہ بحفاظت گھر میں داخل ہوسکتی ہے۔ جب بریڈ گھر پر نہیں ہوتا تو اس کا متبادل یہ ہوتا کہ ڈایان اپنے پڑوسی کو فون کرتی اور وہ اپنے گھر کے باہر کھڑا ہو جاتا اور ڈایان اطمینان سے اپنے گھر میں داخل ہو جاتی۔ اگر کبھی پڑوسی کو آنے میں دیر ہو جاتی تو وہ اپنی جیپ میں بیٹھی انتظار کرتی مگر یہ سب کچھ ڈایان کو قطعاً اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

☆☆☆

یہ وہ پس منظر تھا جب نومبر 1990ء میں ڈایان کے ہاں دوسری بچی پیدا ہوئی۔ تب اس نے WUHQ ٹی وی اسٹیشن انتظامیہ سے بات کر لی کہ کچھ عرصے بعد وہ یہاں کام نہیں کرے گی۔ اس کا زیادہ تر وقت اپنے عزیزوں، اپنی ماں اور بہن سے روزانہ لمبی لمبی گفتگو میں گزرتا۔ ایسی ہی بات چیت میں ڈایان اپنی خواہش کا ذکر کرتی کہ وہ اب مستقل ٹی وی اسٹیشن میں اپنا مقبول پروگرام مارننگ شو ختم کر کے گھر گرہستی تک ہی محدود ہونا چاہتی ہے۔ اس کی بہن

کبھی کہ قیدیوں والی زندگی چھوڑ کر اب باہر بھی گھوما پھرا کرو۔ لہٰذا وہ ڈیٹرائٹ شہر میں اپنی ماں کے پاس آنے جانے لگی۔ یہ ریاست مشی گن کا ہی ایک بڑا شہر اور ڈایان کے علاقے بیل کریک سے سڑک کے ذریعے دو گھنٹے کا سفر تھا۔ یوں دوسرے بچے کی پیدائش کے بعد سے 1991ء کے اوائل میں وہ ہر دوسرے ہفتے باقاعدگی سے جمعرات کو ٹی وی اسٹیشن میں اپنا کام ختم کر کے دونوں بچوں کے ساتھ ڈیٹرائٹ جاتی اور سنیچر کی شام واپس آجاتی پھر 9 فروری 1991ء کو اس قدردان کی پہلی کال کے ٹھیک نو ماہ بعد ڈایان دونوں بچوں کے ساتھ اپنی ماں کے ہاں سے شام تقریباً چار بجے واپس اپنے گھر جانے کے لیے نکلی۔ جب وہ بڑی سڑک سے اپنے فارم ہاؤس والی سڑک پر مڑی تو شام کا سورج غروب ہوا چاہتا تھا۔ شام کے چھ بجنے والے تھے اور خود اس کا بھی سورج ڈوبنے والا تھا۔

جیسے ہی میل باکس اس کی نظروں کے سامنے آیا، اس کے پورے وجود نے جھرجھری لی۔ آج اس پراسرار ایک سطری خط کو موصول ہوئے تین ماہ ہونے کو تھے۔ محض اس میل باکس کو دیکھ کر ہی وہ خوفزدہ ہو گئی لیکن جونہی وہ مزید آگے گئی تو اپنے گھر میں دوسری منزل پر اسے کمرے میں مخصوص علامتی روشنی نظر آئی۔ گویا بریڈ گھر میں موجود تھا اور سب کچھ ٹھیک تھا۔ وہ گھر کے مزید قریب ہوئی۔ دروازے پر اس کا شوہر کھڑا دکھائی نہیں دیا۔ اس کی چھٹی حس نے اشارہ دیا کہ سب ٹھیک نہیں لہٰذا وہ جیپ سے نہیں اتری۔

ڈایان کے کار پورچ میں داخل ہونے کے اندازاً تیس منٹ بعد مقامی پولیس اسٹیشن کو ایک کال موصول ہوئی۔ یہ بریڈ تھا جس سے شدتِ جذبات میں ٹھیک سے بات بھی نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ بمشکل ہی جملوں میں ادا ہو سکا۔ اس نے بتایا کہ اس کی بیوی گھر کے پورچ میں اپنی جیپ کے پاس بے حس و حرکت پڑی ہے اور منہ سے خون بہہ رہا ہے۔ دس منٹ سے کم وقت میں پولیس آگئی۔ بریڈ بے چینی سے جیپ کے پاس روتا ہوا ٹہل رہا تھا۔ ڈایان جیپ سے نیچے پورچ میں خون میں لت پت گری ہوئی تھی۔ دو سالہ مولی اور چند ماہ کی دوسری بیٹی جیپ کی پچھلی نشست پر اپنی اپنی حفاظتی سیٹوں پر سراسیمہ حالت میں روئے جا رہی تھیں۔ بریڈ نے اپنے روتے ہوئے بچوں کو جیپ سے اس لیے نہیں نکالا تھا کیونکہ بریڈ بھی پہلے پولیس افسر رہ چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جیپ کا دروازہ کھولنے سے موقع جرم متاثر ہو سکتا ہے۔

آنے والے پولیس افسران نے جیپ کے دروازے کے قریب ڈایان کو قریب سے دیکھ کر فوراً اندازہ لگا لیا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی...... جلد ہی انہیں ممکنہ وجہِ موت بھی معلوم ہو گئی۔ اس کے جسم پر گولیوں کے دو نشان تھے۔ ایک سینے اور دوسرا کمر پر۔ بعد میں ہونے والے پوسٹ مارٹم سے علم ہوا کہ سینے پر لگنے والی گولی ڈایان کی موت کا موجب بنی۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا کہ اس گولی نے اندرونی اعضا کو بری طرح نقصان پہنچایا کہ محض تین منٹ میں ڈایان کی زندگی کا سورج غروب ہو گیا۔

جب پولیس موقعِ واردات پر پہنچی اور پولیس افسر نے لاش کو چھوا تو بے ساختہ مزید پولیس فورس منگوا لی۔ اس کا کہنا تھا کہ لاش ابھی گرم ہے لہٰذا امکان ہے کہ قاتل کہیں نزدیک ہی چھپا ہو۔ پولیس نے دو گھنٹے تک ڈایان کی جیپ اور اس کے قریب اشیا پر انگلیوں کے نشانات لیے۔ دور نزدیک، آس پاس کا تمام علاقہ ممکنہ سراغ کے لیے چھان مارا۔ اسی دوران بریڈ اور ڈایان کے پڑوسیوں سے بھی سوال جواب ہوئے کہ کوئی غیر معمولی سرگرمی تو دیکھنے میں نہیں آئی؟ پولیس فورس کا کھوجی کتا بھی منگوایا گیا۔ اس نے بو پائی اور فوراً گھر کے پیچھے جنگل کی جانب دوڑا۔ راستے میں کیچڑ، جھاڑیاں اور ایک چھوٹی سی ندی بھی آئی۔ یہاں وہ کتا تھوڑی دیر رکا اور اپنی تھوتھنی اوپر کر کے فضا کو سونگھا پھر کچھ فاصلہ رکھ کر سونگھتا ہوا واپس اسی جگہ آگیا جہاں ڈایان کی جیپ کے پاس پولیس اور علاقے کے لوگ کھڑے تھے۔

☆☆☆

جس شام ڈایان کا قتل ہوا اور پولیس کا کھوجی کتا جنگل کی جانب بو پا کر بھاگا اور پھر وہاں سے واپس جائے واردات پر آیا تھا تو دراصل وہاں موجود پولیس اور دیکھنے والوں میں قاتل بھی موجود تھا۔ پکڑے جانے کے بعد ڈایان کے قاتل نے اعترافِ جرم نہیں کیا۔ پولیس کے پاس بھی معلومات نہیں تھیں کہ ڈایان کے آخری لمحات میں کیا ہوا۔ تفتیش کرنے والوں نے بعض شواہد اور پڑوسیوں سے تفصیلی بات چیت کی مدد سے جو اندازہ لگایا وہ کچھ یوں تھا۔

ڈایان کے ڈیٹرائٹ سے واپس گھر آنے سے گھنٹا بھر پہلے ڈایان کا قاتل فارم ہاؤس میں داخل ہوا۔ اسے ڈایان اور بریڈ کے وضع کردہ مخصوص حفاظتی لائٹ کے انتظام کا علم تھا۔ قاتل اسی نظام کو استعمال کر کے ڈایان کو جال میں پھنسانا چاہتا تھا۔ اوپر کے کمرے کی بتی روشن کر کے وہ ان کے فارم ہاؤس والی ملکیتی زمین کی حدود کے انتہائی کونے میں ایک پرانے

گودام میں داخل ہوگیا۔ یہ گودام ان کے گھر کے سامنے اور کار پورچ میں جانے والے راستے کے بائیں جانب واقع تھا۔ اس گودام میں روشنی کا کوئی انتظام موجود نہیں تھا لیکن قاتل کو کوئی فکر نہیں تھی کیونکہ وہ یہاں پہلے بھی کئی ایک مرتبہ آچکا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اندھیرے میں بھی اس گودام میں آنے جانے کی مشق کر چکا تھا جب وہ دونوں گھر پر نہ ہوتے۔ گودام میں ایک ٹریکٹر اور کچھ مشینی اوزار موجود تھے۔ البتہ گھر والوں کا کتا ضرور ٹہل رہا تھا جس نے اس کو دیکھا لیکن پھر آگے چل دیا۔ گودام کے ساتھ ہی درختوں پر ایک مچان بنی ہوئی تھی جس پر چڑھنے کی سیڑھی بھی موجود تھی۔ قاتل اطمینان سے سیڑھی چڑھ کر مچان پر آگیا۔ مچان کے عین سامنے گھر کا ڈرائیو وے، کار پورچ اور وہ مقام نظر آرہا تھا جہاں ڈایان اپنی جیپ کھڑی کیا کرتی تھی۔ یہ مقام مچان سے 70 فٹ کے فاصلے پر تھا۔

قاتل نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ اب تک تو ڈایان کو یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ قاتل نے مچان میں چھپائی ہوئی اعشاریہ 22 کیلیبر کی رائفل نکال کر لوڈ کی اور مچان کے فرش پر پیٹ کے بل لیٹ کر پوزیشن میں آگیا۔

تقریباً بیس منٹ بعد اس کو بڑی سڑک پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ اس نے رائفل سیدھی کر کے اس پر لگی دوربین پر آنکھ جمالی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ڈایان نظر آگئی۔ ڈرائیو وے سے لے کر کار پورچ تک وہ رائفل پر لگی دوربین کی مدد سے مسلسل نشانے پر رہی۔ اس وقت قاتل کو ویگن ائر جیپ کے پہیوں کی بھی آواز سنائی دینے لگی۔ اس نے رائفل کے ٹریگر پر انگلی رکھ لی۔ ڈایان نے حسب معمول گھر کے دروازے کے قریب جیپ کھڑی کی اور ہیڈ لائٹ آف کر کے چابی سے جیپ کا انجن آف کر دیا۔ اس نے پسنجر سیٹ سے اپنا بیگ اور کچھ چیزیں اکٹھا کیں۔ ادھر ڈایان دروازہ کھول کر باہر آنے کو نکلی، ادھر قاتل نے اسے نشانے پر لے لیا۔ ڈایان کے جنونی عقیدت مند اور اب اس کے ہونے والے قاتل کو مہینوں بعد یہ موقع ملا تھا۔ اس نے اپنی پہلی ٹیلی فون کال سے لے کر ایک سطری خط تک کے تمام واقعات ذہن میں دہراتے ہوئے نشانہ لیا اور رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔ گولی سیدھی ڈایان کے سینے میں لگی۔ وہ جھٹکا کھا کر کمر کے بل زمین پر گری۔ قاتل بھی فوراً رائفل ہاتھ میں لیے مچان سے اترا اور دوڑتا ہوا ڈایان کے قریب پہنچ گیا۔ اب تک تو سب ہی کچھ عین حسب منصوبہ ہی ہو رہا تھا لیکن یہ کیا...... قاتل کو وہ نظر آیا جس کی اسے بالکل بھی امید نہیں تھی۔

ڈایان کی دونوں بیٹیاں جیپ کی پچھلی نشست پر اپنی اپنی سیٹ پر حفاظتی بیلٹ کے ساتھ براجمان تھیں۔ قاتل جھنجلا کر رہ گیا۔ وہ بے ساختہ بول اٹھا کہ یہ یہاں کیا کر رہی ہیں؟ انہیں تو پروگرام کے مطابق ڈایان نے اپنی ماں کے پاس ڈیٹرائٹ میں چھوڑ کر آنا تھا۔ یہ پولیس کی تفتیش سے بھی ثابت ہوا کہ طے تو یوں ہی ہوا تھا لیکن ڈایان نے آخری لمحے اپنا ارادہ تبدیل کر لیا تھا کیونکہ ان میں سے ایک بیٹی کی طبیعت کچھ خراب ہوگئی اور ڈایان نے بہتر سمجھا کہ وہ دونوں بچیوں کو اپنے ساتھ ہی لے جائے۔

ڈایان کے قاتل کے لیے ان بچیوں کی موجودگی نے بہت مشکل پیدا کر دی تھی۔ قاتل کا تو یہ منصوبہ تھا کہ قتل کے بعد پہلے سے منتخب کردہ محفوظ مقام پر جا کر اپنی رائفل کو ٹھکانے لگائے اور پھر ڈایان کی لاش ملنے سے پہلے موقع واردات سے اپنی عدم موجودگی ثابت کرنے کے لیے پہلے سے طے شدہ مقام پر چلا جائے۔ اب اچانک افتاد یہ آن پڑی کہ ریاست مشی گن کی اس قدر خون منجمد کر دینے والی ٹھنڈ میں بند انجن اور بغیر ہیٹر کے کھڑی جیپ میں ان بچیوں کا کیا بنے گا؟ وہ تو شدید سردی میں ٹھٹھر کر مر جائیں گی۔ پھر منصوبے میں تو محض ڈایان ہی کو قتل کرنا مقصود تھا، کسی اور کو نہیں۔ لہٰذا بہ امر مجبوری قاتل کو اپنا منصوبہ تبدیل کرنا پڑا۔

سب سے پہلے تو وہ بچیوں سے دور رہ کر جھکا اور ڈایان کے قریب آکر اس پر رائفل سے ایک اور گولی چلا دی تا کہ یقینی طور پر اس کی موت واقع ہو جائے پھر وہ تیزی سے گھر کے پیچھے جنگل کی جانب دوڑ گیا۔ یہاں ایک محفوظ مقام پر رائفل کو ٹھکانے لگایا اور پھرتی کے ساتھ واپس جائے واردات پر پہنچ گیا۔ جیپ کے قریب آکر پچھلی نشست پر بیٹھی بچیوں کو ہاتھ ہلا کر ہیلو ہائے کیا اور کہا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا اور تھوڑی دیر میں تمہارے پاپا بھی آجائیں گے۔

پولیس کو بریڈ کا فون موصول ہوا۔ گھبراہٹ اور پریشانی میں اس نے کہا کہ وہ گھر کے پیچھے واک پر گیا تھا۔ جب واپس آیا تو گھر کے کار پورچ میں اس کی بیوی بے حس و حرکت گری ہوئی تھی۔

☆☆☆

بریڈ نے جب پہلی دفعہ ڈایان کو دیکھا، وہ تب سے اس کا دیوانہ ہوگیا تھا۔ وہ ایک زندہ دل اور بہت ہی اعلیٰ حوصلہ تھی۔ ایسا کوئی بھی مرد و زن اس سے پہلے بریڈ کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ ڈایان کا خواب تھا کہ وہ اپنے علاقے بیٹل کریک، مشی گن کے مقامی ٹی وی اسٹیشن WUHQ کی

مقبول اینکر ہے۔ بریڈ نے اس خواب کو تعبیر دینے میں کوئی کسر اٹھانہیں رکھی۔ اس نے گھر کے دیگر کام انجام دیے جیسے ناشتا، کھانا بنانا، کپڑے دھونا اور استری کرنا، گھر کا سامان لانا، بچوں کا خیال رکھنا وغیرہ۔ یہ نظام بہترین چل رہا تھا کہ ایک دن ڈایان نے اس سے کہا کہ وہ ٹی وی اسٹیشن میں کام چھوڑنے کا سوچ رہی ہے اور اب محض گھر پر رہ کر بچوں کی پرورش کرے گی۔ گوکہ باقاعدہ تحریری طور پر اس نے ٹی وی اسٹیشن انتظامیہ کو نہیں بتایا تھا لیکن یہ بات ڈایان کے خاندان اور ملنے جلنے والے اور WUHQ والے بھی بخوبی جانتے تھے کہ جلد یا بدیر ڈایان یہ مارننگ شو پروگرام چھوڑ دے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈایان کے اس اقدام کے بعد گھر چلانے کے اخراجات کی تمام تر ذمے داری بریڈ پر ہی آجائے گی جو ابھی تک جز وقتی ہی کام کر رہا تھا۔

بریڈ مستقل کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ڈایان سے ہمدردی دکھاتے ہوئے مارننگ شو کا پروگرام نہ چھوڑنے کا مشورہ دیا۔ اس کی خاص و عام میں بڑھتی مقبولیت، شہرت اور پیسوں کا ذکر کیا کہ یہ پروگرام چھوڑ کر یہ سب ہاتھ سے چلا جائے گا لیکن ڈایان مستقل گھر پر رہ کر محض بچوں کی پرورش کرنے کے ارادے پر ہی قائم رہی۔

مستقل کام کرنے کے بجائے اس نے ڈایان کو ہی راستے سے ہٹانے کا سوچ لیا۔ ایک سابق پولیس افسر اور کرمنل جسٹس کے شعبے میں اسسٹنٹ پروفیسر ہونے کے ناتے اسے پختہ یقین تھا کہ وہ ایک کامل اور ناقابل شکست منصوبہ بنا کر کامیاب ہو جائے گا۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ جب بھی کسی عورت کا قتل ہوتا ہے تو عام طور پر اس کے ساتھی کو ہی سب سے پہلے مشتبہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے بریڈ کو اپنے اوپر سے توجہ ہٹانے کے لیے ایک اور ٹھوس قسم کے مشتبہ شخص کی ضرورت تھی۔ اسی پس منظر میں بریڈ نے ڈایان کے ایک عقیدت مند پرستار کی صورت پیدا کی۔ ڈایان کے قتل سے دس ماہ قبل بریڈ نے ٹی وی اسٹیشن میں فون کرنا شروع کیے۔ اس نے آواز اور لہجہ بدل کر بات کی تاکہ ڈایان اور مقامی ٹی وی اسٹیشن WUHQ کا دیگر عملہ اسے پہچان نہ سکے۔ پانچ ماہ کے عرصے میں بیٹل کریک، مشی گن کے رہنے والوں اور ٹی وی اسٹیشن کو ڈایان کے اس پاگل عقیدت مند کے بارے میں معلومات حاصل ہو گئیں۔ اب ہالووین کے تہوار (31 اکتوبر) سے ایک روز قبل تھرتھلی مچانے کے لیے ڈایان کو کامیابی کے ساتھ رسالوں سے حروف کاٹ کر ایک سطری خط بھی پہنچا دیا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسا خط مزید سنسنی پھیلانے کا موجب بن سکتا ہے اور اس خط نے توتوقع سے بھی زیادہ دہشت پھیلا دی۔ اس سے ہر خاص و عام ڈایان کے اس پرستار سے بخوبی واقف ہو گیا۔ مقامی پولیس بھی سرگرمی کے ساتھ اس شخص کی تلاش میں لگ گئی۔ اسی لیے بریڈ نے بھی سوچا کہ لوہا گرم ہے اور یہی وقت ہے ضرب لگانے کا۔ لوگ ڈایان کے اس دیوانے عقیدت مند کو قاتل سمجھنے میں دیر نہیں لگائیں گے لیکن ڈایان کے عین وقت پر تبدیل شدہ اکیلے گھر آنے کے پروگرام نے رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ اب بغیر بیٹر کے جیپ میں دو بچوں کو چھوڑ کر اپنے منصوبے کو حسب منشا عمل کرنے میں شدید مشکل پیش آ گئی۔ وقت بالکل بھی نہیں تھا۔ اسے فوراً سے پیشتر کوئی قابل قبول کہانی گھڑنا تھی جو اس نے گھڑلی کہ وہ گھر سے باہر ٹہلنے نکلا اور جب وہ ٹہلتا ہوا گھر کے سامنے پہنچا تو اس کے سامنے وہ بھیانک منظر تھا۔ اس نے وقت ضائع کیے بغیر پولیس کو فون کر دیا۔

لیکن بریڈ کی اس بات میں وزن محسوس نہیں ہوا کیونکہ ابتدائی تفتیش سے ہی پولیس کو علم ہو چکا تھا کہ بریڈ کو ڈایان کے گھر واپس آنے کے وقت کا قطعی علم تھا۔ ڈایان کی ماں نے خود فون پر بریڈ کو بتایا تھا کہ وہ فلاں وقت ڈیٹرائٹ سے نکلی تھی پھر جو نظام بریڈ اور ڈایان نے وضع کیا تھا، اس کا ڈایان کی ماں کو بھی علم تھا کہ جب ڈایان گھر پہنچے گی تو وہاں بریڈ اس کا منتظر ہوگا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ٹھیک ڈایان کے گھر واپس آنے کے وقت ہی بریڈ کیوں گھر کے پیچھے جنگل میں ٹہلنے نکلا؟ پھر بریڈ کے ایک پڑوسی نے بریڈ کو اعشاریہ 22 کی رائفل بھی لے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ بعد میں پولیس کو یہ رائفل گھر کے پچھواڑے جنگل میں ایک ندی سے دستیاب ہوئی۔ کھوجی کتا بھی یہاں تک آیا تھا۔ پولیس کو گھر کے سامنے گودام کے پاس مچان کے قریب رائفل کی گولی کا ایک خول بھی ملا۔

☆☆☆

1992ء کے دسمبر کی 13 تاریخ کو بریڈ کو اپنی بیوی ڈایان کے قتل کا مجرم ٹھہرا دیا گیا اور ضمانت پر رہائی کے امکان کے بغیر عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔ اس نے کبھی بھی اس قتل پر کسی قسم کا کوئی پچھتاوا ظاہر نہیں کیا۔ ڈایان کو ڈیٹرائٹ کے اس قبرستان میں دفن کیا گیا جہاں اس کے خاندان کے دیگر افراد بھی مدفون تھے۔ اس کی قبر کے کتبے پر تحریر تھا۔ ''ماں، بیٹی اور بہن''۔ وہ ایک بیوی بھی تھی لیکن اس کے گھر والوں نے لفظ بیوی کتبے پر نہیں لکھوایا۔

⌘⌘⌘

زندگی پیار کا دیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پرعزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگ جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا.. پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ واردات قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

گذشتہ اقساط کا خلاصہ
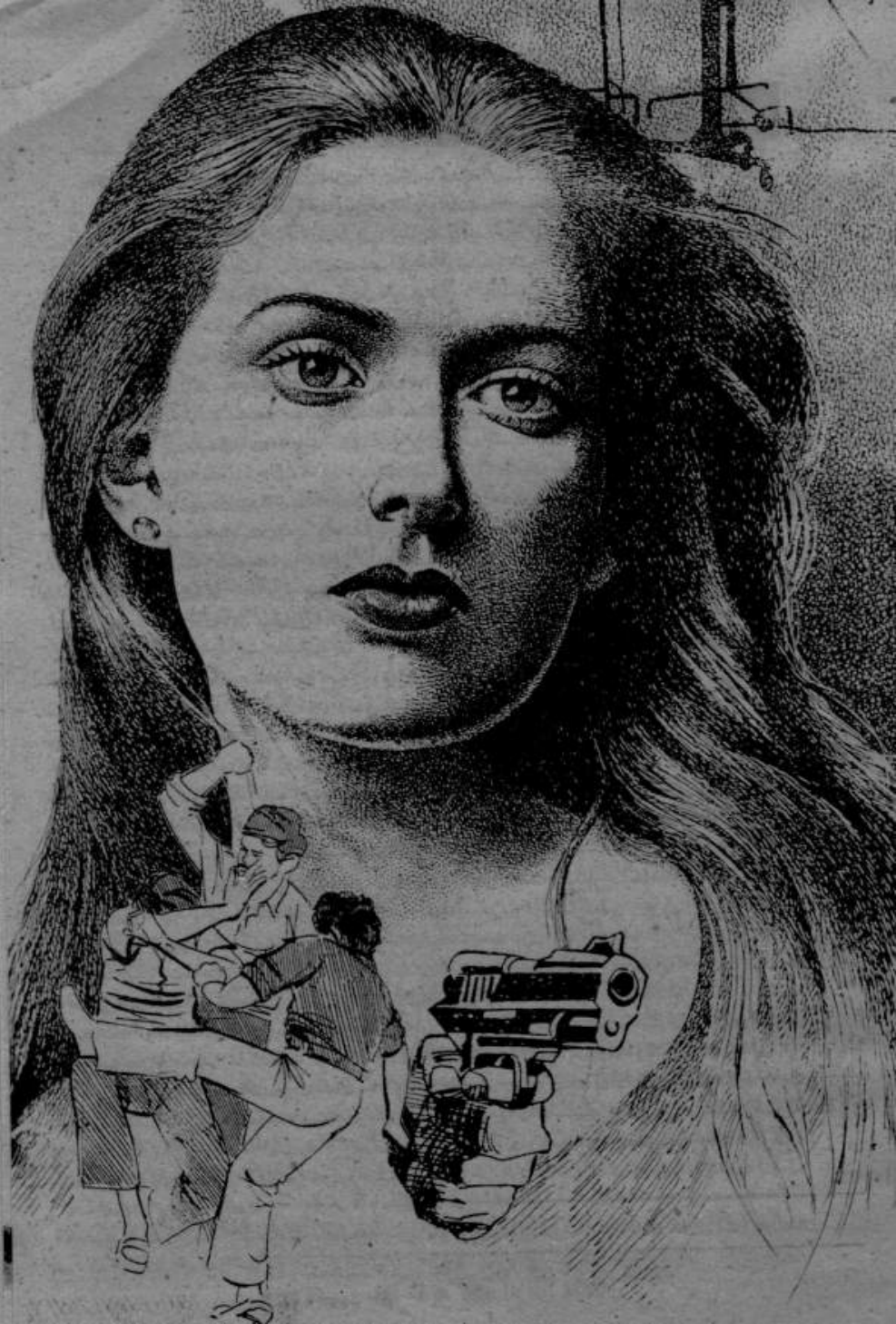
معاذ ایک ذہین لیکن جنون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آرہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشریٰ نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ بشریٰ ماس کمیونی کیشن کی طالب ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشریٰ کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹوگرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہوجانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بُری طرح زدوکوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد و پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔

معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کیمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشریٰ کی نظر میں آجاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیرقانونی ہونے کے سلسلے میں بشریٰ تحقیق کر رہی تھی۔ بشریٰ کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشریٰ کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشریٰ انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشریٰ کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہوجاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات کے نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشریٰ بھی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہوجاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے ہپناٹائز کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔

عالم شاہ اور اس کا نوکر سرمد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہوجاتا ہے۔ ادھر بشریٰ دبئی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یاتریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا تہ خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ عالم شاہ، بگل اور سرمد انڈیا روانہ ہوجاتے ہیں۔ ائرپورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرمد کو لے جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے۔ تاہم وہاں مار اماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ بنگلے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ ایک مشن میں زخمی ہوجاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کٹیا میں لے جاتا ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہوجاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرمد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھر لیے جاتے ہیں اور "را" کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ بشریٰ باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے بگل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ علینہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے۔ علینہ پاکستان میں ثوبیہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے

مصیبت بن جاتا ہے۔ ثوبیہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علینہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوا نامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے نجل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ''را'' کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرمد کو دیوا کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوا گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ پولیس دیوا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوا اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدرآباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ وہ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کرا لیتے ہیں۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جارو نامی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے ''را'' کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جارو اور معاذ، نجل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں۔ ادھر سونیا معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جارو وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرمد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر لالہ، وقاص، علینہ و دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گُگو کا باڈی گارڈ بنتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس بنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو چینی جھکشو طبی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ نجل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک وید دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے۔ باذل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہو جاتا ہے۔ باذل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ ادھر لالہ عیسیٰ، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کرواتا ہے اور موی اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ معاذ دشمنوں کے کیمپ پر حملہ کر کے وہاں قبضہ کر لیتا ہے۔ موی اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم مار دھاڑ کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ بیجنگ پہنچ جاتا ہے اور وہاں کے کرتا دھرتاؤں سے بات کر کے پاکستان پہنچنے کی اجازت چاہتا ہے۔ ادھر موی اور نیلی کو پولیس گھیر لیتی ہے اور فائرنگ میں موی مارا جاتا ہے۔ وہ اعظم کو لے جاتے ہیں اور نیلی زخمی حالت میں ان کے قبضے میں آ جاتی ہے۔ معاذ اور وکی وغیرہ پاکستان پہنچ جاتے ہیں اور اعظم کی بازیابی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ ادھر باذل، لالہ کی قید سے بھاگ جاتا ہے۔ معاذ، ڈی ایس پی ظہیر کے بنگلے پر دھاوا بولتا ہے اور ڈی ایس پی کو قابو کرنے کے بعد اس سے معلومات لیتا ہے۔ وہ لوگ ظہیر خان کو لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ باذل قید سے نکل کر مہناز کے پاس پہنچتا ہے اور اسے تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ نیلی قید میں موجود ظہیر کو ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ بشریٰ قبرستان جاتی ہے۔ وہاں اس کی دوست ملتی ہے۔ بشریٰ اپنی دوست کے ساتھ جا رہی ہوتی ہے کہ باذل کے آدمی اسے اغوا کر لیتے ہیں۔ ادھر معاذ سارے معاملوں کو جلد حل کرنے کے لیے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے مگر اس کے خیر خواہ اسے میڈم ایکس کے شکنجے سے نکال لیتے ہیں اور اعظم کو بھی بازیاب کر لیتے ہیں۔ زن ہوا اسے اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور وہاں کرنل سکندر بخت سے ملاقات ہوتی ہے۔ معاذ انہیں دشمنوں کے خلاف کارروائی کرنے کا کہتا ہے۔ باذل، بشریٰ کو لے کر انڈر گراؤنڈ ہو جاتا ہے۔ ادھر وقاص باذل کا پتا چلانے کے لیے ایک کال گرل بیبی کے گھر کارروائی کر کے باذل کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہے۔ وہاں وکی کے ساتھی اور کوئی اور گروپ حملہ کر دیتے ہیں۔ وکی زخمی ہو جاتا ہے۔ ادھر باذل، عرفان اللہ کو گولی مار دیتا ہے اور خود بھی شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ باذل کے ساتھی اسے ایک اسپتال کے آگے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہیں وکی اور بشریٰ بھی داخل ہوتے ہیں۔ معاذ باذل کو پہچان کر اسے بھی وہیں ایڈمٹ کرا دیتا ہے۔ عرفان اللہ جاں بحق ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ اور ان کی اہلیہ نجل کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ عالم، نیلی اور اعظم بھی وہیں ہوتے ہیں۔ نجل اسپتال میں زیرِ علاج ہوتی ہے۔ باذل کو معذوری کی حالت میں ایک چوک پر پھینک دیا جاتا ہے۔ معاذ، وقاص کے ساتھ علینہ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اسے اگلے مشن پر جانا ہوتا ہے۔ سونیا قانون کی قید سے بھاگ نکلتی ہے۔ نجل کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ یوآن سنگ، اینڈریو کے ذریعے نجل کے آپریشن کی تجویز دیتا ہے۔ عالم نہ چاہتے ہوئے بھی راضی ہو جاتا ہے۔ نجل کا آپریشن کامیاب رہتا ہے تاہم اس کا ایک ہاتھ اور نچلا دھڑ ناکارہ ہو جاتا ہے۔ ادھر معاذ کشمیر پہنچ جاتا ہے۔ ایک کشمیری لڑکی کی مدد کرنے کی پاداش میں بھارتی سپاہی اسے گرفتار کرنے بنجاسن کی دکان پر ریڈ کرتے ہیں۔ تاہم بنجاسن کی وجہ سے اس پر سختی نہیں کرتے اور پوچھ گچھ کے بعد اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر نجل کو خبر ملتی ہے کہ اس کی بہن کا تیجے کا آپریشن ہے۔ وہ وطن جانے کے لیے فلائٹ میں ہوتے ہیں تاہم وہ بے چینی سے وطن واپسی کی منتظر ہوتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

صداقت شاہ اپنی بیوی اور عالم و تجل وغیرہ کے ہمراہ وطن واپسی کے لیے فلائٹ میں تھے۔ تجل کو بہن کے آپریشن کے وقت اسپتال پہنچنے کی جلدی تھی۔ عالم شاہ اسے مطمئن کر رہا تھا۔

''بس ہم دس منٹ میں پہنچنے والے ہیں۔ ائرپورٹ سے اسپتال پہنچنے میں لگ بھگ آدھا گھنٹا مزید لگ جائے گا پھر ہم مومل کے پاس ہوں گے۔'' مومل کو طبیعت کی خرابی کے باعث کب کا گاؤں سے شہر منتقل کیا جا چکا تھا۔ وہ شہر کے ایک بڑے اسپتال میں داخل تھی جہاں اس کے سارے ضروری ٹیسٹ ہو چکے تھے اور آپریشن کے لیے بس ان لوگوں کی واپسی کا انتظار تھا۔ یہ واپسی کتنی مشکل سے انجام پائی تھی، اس سے تجل کو کوئی غرض نہیں تھی۔ حالات کے تحت ان کے واپسی کے فیصلے کو قبول تو کر لیا گیا تھا لیکن دونوں طرف ہی بہت سے خدشات تھے۔ دونوں طرف کے ذمے داران کو فکر تھی کہ خفیہ طور پر چین پہنچنے والے ان سارے لوگوں کے بارے میں کسی کو کوئی ثبوت مل گیا تو سب سے پہلے بھارت ہنگامہ کھڑا کرے گا اور ان کے لیے عالمی برادری کا سامنا کرنا مشکل ہو جائے گا۔ بھارت کے پاس بہر حال ثبوت تھے کہ عالم شاہ اور سرمد دہشت گردی کے الزام میں گرفتار ہو کر ان کی قید میں تھے اور اپنے مددگاروں کے ذریعے اس قید سے فرار ہو گئے تھے۔ فرار کے بعد بھی ان کے کھاتے میں کئی جرائم ڈالے گئے تھے۔ اس لیے بھارت کے پاس پورا پورا موقع تھا کہ عالم اور سرمد کے منظر عام پر آتے ہی عالمی عدالت میں ان کی حوالگی کا مقدمہ دائر کر دے۔ اس مسئلے سے بچنے کے لیے فی الحال تو یہی انتظام کیا گیا تھا کہ عالم اور سرمد کے حلیوں میں خاطر خواہ تبدیلی کر دی گئی تھی۔ انہیں غور سے دیکھنے پر بھی آسانی سے پہچاننا ممکن نہیں تھا لیکن کچھ معلوم نہیں تھا کہ دشمن کہاں کہاں گھات لگائے بیٹھا ہے اس لیے خدشات کسی طور ختم نہیں ہو رہے تھے۔

عالم کے سامنے یہ پروپوزل بھی رکھا گیا تھا کہ وہ فیملی کو جانے دے اور خود اپنے ملازم سرمد کے ساتھ وہیں رک جائے لیکن جب سب گھر والے واپس جا رہے تھے تو وہ کیسے رک سکتا تھا۔ اچھا برا جو بھی پیش آتا، وہ سب کے ساتھ بھگتنے کے لیے تیار تھا اور یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ خطرے کے منہ میں پیر رکھتا اور سرمد پیچھے رہ جاتا۔ وہ عالم کے پسینے پر اپنا خون بہانے والا بندہ تھا۔ وہ کسی صورت اسے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ عالم نے بھی اس کے ساتھ زبردستی نہیں کی تھی۔ آخر اس کا بھی خاندان اور کچھ رشتے تھے پاکستان میں جن سے جدائی کی وہ شکایت نہیں کرتا تھا لیکن اپنوں کی یاد آتا تو ایک فطری بات تھی۔

''سیٹ بیلٹ بندھوا لو تجل!'' پائلٹ منزل مقصود پر پہنچنے کی اطلاع دیتے ہوئے مسافروں سے اپنی سیٹ بیلٹس باندھنے کی درخواست کر رہا تھا لیکن زیر لب کچھ پڑھتی تجل متوجہ نہیں ہوئی تھی۔ عالم نے اس کی یہ غائب دماغی دیکھی تو خود اس کام پر کمربستہ ہو گیا۔ یوں بھی تجل کا ایک ہاتھ ابھی تک صحیح سے حرکت کرنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ دواؤں اور فزیو تھراپی سے فرق تو پڑا تھا لیکن ڈاکٹرز نے واضح کر دیا تھا کہ ایک دم سے کچھ نہیں ہونے والا۔ آہستہ آہستہ ہی فرق پڑتا ہے لیکن اب وہ علاج درمیان میں ادھورا چھوڑ کر پاکستان آ گئی تھی۔

''تم اماں اور بابا سائیں کے ساتھ جاؤ، میں تجل کو لے کر آتا ہوں۔'' جہاز کے لینڈ کرنے کے بعد مسافروں نے اترنا شروع کیا تو عالم نے سرمد سے کہا۔ تجل اپنی معذوری کے باعث عام مسافروں میں شامل نہیں ہو سکتی تھی۔

''جو حکم سائیں!'' سرمد نے حسب عادت اس کے آگے سر جھکایا اور تعمیل حکم کے لیے قدم اٹھائے۔

''ایکسکیوز می سر!'' ابھی وہ درمیان میں ہی تھا کہ ائرہوسٹس تیز تیز چلتی ہوئی اس کے قریب آئی اور اسے مخاطب کیا۔

''آپ کو اور مسٹر مائیکل کو رکنا ہو گا۔'' (سرمد اور عالم اپنے اصل ناموں سے سفر نہیں کر رہے تھے اور سفری کاغذات میں ان کے فرضی نام درج تھے)۔

''واٹ ڈو یو مین؟'' سرمد نے قدرے تیز لہجے میں پوچھا۔

''آپ دونوں کو پلین سے اترنے کی اجازت نہیں ہے۔'' ائرہوسٹس نے اپنی پیشہ ورانہ تربیت کے مطابق ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت دی۔

''لیکن کیوں؟'' ان سب کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ سارے مسافر جہاز سے اتر چکے تھے اور صرف وہی لوگ وہاں رہ گئے تھے۔

☆☆☆

''بابا، اماں...... بچاؤ...... بچاؤ'' چیخوں سے پورا گھر گونج رہا تھا۔ اس کا لکڑیاں کاٹتا ہاتھ رکا اور پھر وہ کلہاڑی پھینک کر تیزی سے اندر کی طرف بڑھا۔ اندر کا منظر کسی بھی صاحب دل کو تڑپانے کے لیے کافی تھا۔ نوعمر بہرام، زرینہ بی بی کے سینے سے لگا بری طرح کانپ رہا تھا اور وہ اپنے کمزور بازوؤں سے اسے جکڑے دلاسا دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"صبر کر میرے بچے، صبر کر۔" زرینہ بی بی آنکھوں میں نمی لیے اسے ہولے ہولے تھپک رہی تھیں۔

"خون ہے...... خون ہے۔ ہر جگہ خون ہے۔ ابا...... ابا...... ابا کے سینے سے خون نکل رہا ہے۔ اماں...... وہ دیکھو، اماں بھی گولی کھا کر گر گئی ہیں۔" وہ جیسے اس سارے منظر کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا تھا اور اس وقت کی تکلیف اب بھی اس کے وجود میں اتری اس کے جسم میں کھچاؤ پیدا کر رہی تھی۔

"بھول جا میرے بچے، بھول جا سب کچھ۔" زرینہ بی بی کے اپنے آنسوؤں میں روانی آ گئی تھی اور وہ اسے زور سے اپنے سینے میں بھینچے گویا اس منظر اور اس کی تکلیف سے بچانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"آپا...... آپا رک جاؤ، مت کرو آپا، خدا کے لیے مت کودو۔" وہ اپنے موجودہ مقام پر موجود ہی نہیں تھا۔ اسے نہ زرینہ بی بی کی آواز سنائی دے رہی تھی، نہ ان کی آغوش کی گرمی کو محسوس کر پا رہا تھا۔ وہ اس تاریک اور ویران باغ میں کھڑا تھا جہاں اس نے اپنی آنکھوں سے قیامت دیکھی تھی اور اس قیامت کے زیر اثر اس کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا اور کانپتے کانپتے جسم کو جھٹکے لگنے لگے تھے۔

"بہرام، بہرام...... میرے بچے!" زرینہ بی بی اسے سنبھالنے میں نڈھال ہونے لگیں۔ اس ساری صورت حال کو ہونٹ بھینچے دیکھتا معاذ پہلے ہی انجکشن تیار کرنا شروع کر چکا تھا۔

"اسے بستر پر لٹا کر مضبوطی سے پکڑ لیں بی بی!" انجکشن تیار کر کے اس نے زرینہ سے کہا اور خود بھی ان کی مدد کرنے لگا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ بہرام کو انجکشن لگانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ انجکشن کے اثر کرنے تک زرینہ بی بی مسلسل بہرام کے بالوں کو سہلاتی رہیں اور معاذ آہستہ آہستہ اس کے اکڑے ہوئے ہاتھ پیروں کو دباتا رہا۔ کچھ دیر میں وہ پرسکون ہو کر گہری نیند میں ڈوب گیا تو ان دونوں نے اپنے ہاتھ پیچھے ہٹا لیے۔ معاذ نے اسے سینے تک چادر اوڑھا دی۔

"خدا جانے یہ معصوم کب اور کیسے خود پر گزرنے والی اس قیامت کو بھول پائے گا۔" زرینہ بی بی اپنی آنکھیں پونچھتی ہوئی غمزدہ لہجے میں بڑبڑائیں۔

"ایک آدھ دن دیکھتے ہیں۔ اگر اس کی حالت میں فرق نہ آیا تو پھر باقاعدہ کسی نفسیاتی معالج سے اس کا علاج کروانا پڑے گا۔" معاذ کے چہرے پر بھی غم و غصہ طاری تھا۔ جب سے بہرام یہاں آیا تھا، اس کی یہی حالت تھی۔ دواؤں کے زیر اثر کچھ گھنٹوں کے لیے سوتا تھا، جاگنے کے بعد تھوڑی دیر اس کی حالت بہتر رہتی تھی۔ اس عرصے میں زرینہ بی بی اسے کوشش کر کے تھوڑا بہت کھلا پلا دیتی تھیں۔ وہ گم صم سی کیفیت میں لیٹا بیٹھا تھوڑی دیر تو سکون سے رہتا تھا پھر بتدریج اس کی حالت بگڑنے لگتی تھی اور گزرے واقعات ذہن میں آنے پر اس کا خود پر سے کنٹرول ختم ہونے لگتا تھا۔ اس قسم کی ایمرجنسی کے لیے ڈاکٹر نے سکون آور انجکشن لکھ کر دے رکھا تھا۔ اس کی رائے تھی کہ آہستہ آہستہ بچہ شاک سے باہر آ جائے گا اور حقیقت کو قبول کر کے نارمل ہونے لگے گا لیکن ابھی تک کوئی بہتری نظر نہیں آئی تھی اور وہ اسی حالت میں تھا جس حالت میں باغ کا رکھوالا اسے یہاں پہنچا گیا تھا۔ رکھوالے نے ہی انہیں اس رات کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کیا تھا۔

جس رات یہ ظلم توڑا گیا، وہ اپنی کوٹھری میں سو گیا تھا لیکن گاڑیوں کی آوازوں نے اسے نیند سے جگا دیا۔ جاگنے پر وہ صورت حال معلوم کرنے باہر نکلا تو اس وقت تک کھیل شروع ہو چکا تھا۔ درختوں کے پیچھے چھپا بہرام اس کی نظروں میں آ گیا اور وہ خود بھی اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ اس کی وہاں موجودگی ہی بہرام کی زندگی بچانے کا سبب بنی۔ جب پہلی بار گولیاں چلیں تو بہرام کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ اللہ کی مہربانی سے گولیوں کی گونج میں وہ پہلی چیخ کسی نے نہیں سنی۔ اس کے بعد رکھوالے نے بہرام کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی ساری چیخوں کو گھونٹ دیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو بھارتی درندے اسے بھی ڈھونڈ نکالتے۔ جب انہوں نے حاجی شیر خان اور اس کی بیوی کو گولیاں ماریں تو رکھوالا بہرام کو زبردستی کھینچتا ہوا وہاں سے دور لے گیا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اگر اسے اپنی اور اس بچے کی زندگیاں بچانی ہیں تو اس باغ سے دور جانا ہوگا۔ سوئے اتفاق مرکزی دروازے سے ہٹ کر باغ سے باہر جانے کا جو ایک دوسرا راستہ تھا، اس کے راستے میں وہ کنواں پڑتا تھا جس میں چھلانگ لگا کر پری وش نے اپنی عزت بچانے کا فیصلہ کیا تھا۔ تعاقب کرتے بھارتی درندوں اور بہن کے کنوئیں میں کودنے کے منظر کو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ایک کے بعد ایک پہنچنے والے صدمے کے اثر سے بے ہوش ہو گیا۔ رکھوالا اسے کندھے پر لاد کر بمشکل...... باغ سے باہر نکلا۔ وہ باغ سے نکل کر تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ باغ میں آگ بھڑک اٹھی۔ انسانی خون سے ہولی کھیلنے والے ان درندوں کی انتقام کی پیاس اتنا خون بہا کر بھی نہیں بجھی تھی سو

انہوں نے باغ کو آگ لگا کر اپنا دل ٹھنڈا کرنے کا یہ انتظام کیا تھا۔
رکھوالا، کبیر کا پرانا ملازم تھا۔ اس کا کبیر کے ساتھ کئی بار حاجی شیر خان کے گھر آنا جانا بھی ہوا تھا۔ وہ ان کے رشتے داروں اور تعلق داروں سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے اس نے بہرام کو سیدھا آغا گل کے گھر پہنچا دیا۔ بہرام جب سے وہاں آیا تھا، اس کی حالت خراب تھی۔ صدمے نے اس کا خود پر سے کنٹرول ختم کر دیا تھا۔ اسے وقفے وقفے سے دورے پڑ رہے تھے جس پر قابو پانے کے لیے اسے انجکشن لگانا پڑتا تھا۔
"تم اس کے پاس بیٹھو، میں ذرا باورچی خانے کا تھوڑا کام نمٹا لوں۔" بہرام سکون سے سو گیا تو زرینہ بی بی کہتی ہوئی وہاں سے اٹھ گئیں۔ وہ وہاں بیٹھا دکھ سے بہرام کو دیکھتا رہا۔ اپنوں کو کھونے اور بچھڑنے کا دکھ اس نے اپنی جان پر سہا تھا اس لیے محسوس کر سکتا تھا کہ یہ بچہ کس کرب سے گزرا ہوگا۔ بہرام کا کرب اس کے دل کو جلا رہا تھا۔ ایک آگ سی تھی جو بھڑک بھڑک کر اسے ظالموں کو نیست و نابود کرنے پر اکسا رہی تھی۔
"کن سوچوں میں گم ہو؟" آغا گل باہر سے آئے تو اس کی خاموشی کو محسوس کر کے پوچھا۔
"بہرام کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔ اس بچے کا دکھ مجھے چین نہیں لینے دے رہا۔ حاجی شیر خان کے خاندان پر جو ظلم توڑا گیا ہے، اس نے میرے سینے میں آگ بھڑکا دی ہے۔ دل چاہ رہا ہے ایسا کرنے والے ایک ایک ظالم کو جہنم واصل کر دوں۔" اس نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا۔
"یوں صدی کے اس عرصے میں اس جیسی اتنی ظلم کی داستانیں رقم ہوئی ہیں کہ ہمیں تو گنتی بھی یاد نہیں۔" آغا گل کی بے نور آنکھیں بظاہر خشک تھیں لیکن ان خشک آنکھوں کے پیچھے غم کا جو سمندر موجزن تھا، اسے کوئی بھی صاحبِ دل دیکھ سکتا تھا۔
"کچھ معلوم ہوا کہ کون تھے وہ لوگ؟"
"ہاں۔" انہوں نے ایک سرد آہ بھری۔
"تھے تو وہ انڈین آرمی کے سورما ہی لیکن پیش پیش پری وش کے ہاتھوں مرنے والے سپاہی نریندر کا بھائی مہندر تھا۔ اس نے اپنے بھائی کی موت کا انتقام لینے کے لیے پورے خاندان کو نیست و نابود کر ڈالا۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں وہ اس بچے کی جان کے درپے بھی نہ ہو جائے۔" ان کا اشارہ بہرام کی طرف تھا۔

"میں اسے اس لائق ہی نہیں رہنے دوں گا۔ آپ بس مجھے اس کے متعلق ضروری معلومات فراہم کر دیں۔" اس نے تیز لہجے میں آغا گل سے مطالبہ کیا۔
"نہیں، نہیں۔ تم ان معاملات میں نہ پڑو۔ تمہیں خود کو بالکل کلیئر رکھنا ہے تاکہ اپنے اصل مقصد کو حاصل کر سکو۔ اگر تم یہاں کے معاملات میں الجھ گئے تو اپنے معاملات کیسے دیکھو گے؟" انہوں نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔
"یہ بھی میرا ہی معاملہ ہے آغا جان! مجھے احساس ہے کہ جو کچھ ہوا، اس میں کہیں نہ کہیں میری ذات انوالو تھی۔ اگر اس روز میں دعوت میں چلا جاتا تو شاید وہ سب نہ ہوتا جو ہوا۔" وہ مجرم نہیں تھا لیکن خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا۔
"شاید نصیب میں یہی لکھا تھا۔" آغا گل نے ایک سرد آہ بھری۔
"ہر ظلم کو نصیب کا لکھا سمجھ کر قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ظلم ہوا ہے تو ظالم کو اس کا حساب بھی دینا پڑے گا۔"
"لیکن تم......"
"لیکن ویکن کچھ نہیں آغا جان! میں کوئی آپ لوگوں سے الگ نہیں ہوں۔ ہم نے تو پاکستان میں رہتے ہوئے بھی ہمیشہ آپ لوگوں کا دکھ اپنے دل میں محسوس کیا ہے اور اب جبکہ میں یہاں ہوں اور یہ سب میری نظروں کے سامنے ہوا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ میں محض خاموش تماشائی بنا رہوں۔" اس نے انہیں بات مکمل نہیں کرنے دی۔
"اچھا تم تھوڑا صبر کرو پھر میں کوئی انتظام کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" انہیں بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے ارادے میں پختہ ہے اس لیے مزید سمجھانے بجھانے کی کوشش ترک کر کے وعدہ کر لیا۔

☆☆☆

"کیا ہمیں گرفتار کیا جا رہا ہے؟" عالم شاہ نے تحمل کے ساتھ ائر ہوسٹس سے سوال کیا۔
"آئی ڈونٹ نو۔" اس نے شانے اچکائے پھر دلاسا دینے والے انداز میں بولی۔
"میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس وقت یہاں میری جگہ کوئی پولیس مین کھڑا ہوتا۔"
"شی از رائٹ۔ ہم آپ کو گرفتار کرنے نہیں آئے بلکہ ہم آپ کو اپنی حفاظتی تحویل میں لے رہے ہیں۔" اچانک ہی وہاں سادہ لباس والے چلے آئے۔
"اس کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟" عالم شاہ یہ سن کر چونکا۔

''تفصیلات میں آپ کو بعد میں بتاتا ہوں۔ فی الحال آپ سے جیسا کہا جارہا ہے، ویسا ہی کریں۔'' اس شخص نے آنکھوں سے ائرہوسٹس کی طرف غیر محسوس سا اشارہ کیا۔

''اوکے۔ جیسے آپ کی مرضی۔'' اس نے سمجھ کر فوراً ہتھیار ڈال دیے پھر نجل کی طرف جھک کر بولا۔

''تم اماں اور بابا سائیں کے ساتھ اسپتال پہنچو۔ میں اور سرمد بھی یہ معاملہ نمٹا کر وہاں پہنچتے ہیں۔''

''لیکن......'' نجل کو اس کا حکم ماننے میں تامل تھا۔

''کوئی لیکن ویکن نہیں۔ جو کہا ہے، وہی کرو۔'' عالم نے اسے ٹوکا اور نیلی کی طرف رخ موڑ کر اس سے مخاطب ہوا۔

''آپ کو ان لوگوں کے ساتھ ساتھ ہی رہنا ہے۔ آپ کی موجودگی سے مجھے ذرا بے فکری رہے گی۔''

''آپ اطمینان رکھیں۔ میں خیال رکھوں گی۔'' نیلی نے تسلی دی۔

''آپ جائیں اماں سائیں! یہاں کوئی فکرمندی کی بات نہیں ہے۔'' اسے خود کو خاموشی سے تکتی ماں کو بھی تسلی دینا پڑی۔ آہستہ آہستہ سب جہاز سے اترتے چلے گئے۔ صداقت شاہ نے جاتے جاتے اس کا شانہ تھپک کر ایک خاموش تسلی دی۔

''آپ ہمارے ساتھ آیئے۔'' سب کے رخصت ہوجانے کے بعد سادہ لباس والے عالم اور سرمد سے مخاطب ہوئے تو وہ ان کے پیچھے چل پڑے۔ وہ دونوں انہیں عام راستے سے ہٹ کر دوسرے راستے سے، بہت تیزی سے ائرپورٹ کی عمارت سے باہر لے آئے اور رنگین شیشوں والی ایک گاڑی میں بٹھا کر کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔

''ہمیں کہاں لے جایا جارہا ہے؟''

''یہ تو آپ کو پہنچ کر ہی پتا چلے گا۔'' وہ مسکرا کر عالم کے سوال کو ٹال گیا۔

''ہمارا تعاقب ہو رہا ہے سر!'' اچانک ہی ڈرائیور نے اطلاع دی۔

''میں دیکھ چکا ہوں۔'' ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان سادہ لباس شخص نے بیک ویو مرر پر نظریں جمائے جمائے اسے جواب دیا۔

''بڑی جلدی کھیل شروع ہوگیا۔'' سادہ لباس والا جو عالم اور سرمد کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھا تھا، اس نے طنزیہ لہجے میں تبصرہ کیا۔

''داد دو دشمنوں کے جاسوسی کے نظام کو۔ ہم انہیں عام راستے کے بجائے اسپیشل ایگزٹ سے نکال کر لائے ہیں تب بھی وہ ہمارے پیچھے ہیں۔'' اس کے ساتھی نے بھی تائیدی تبصرہ کیا اور پھر اپنے فون پر مصروف ہوگیا۔ اس کے جو الفاظ ان کے کانوں میں پڑے، اس سے اندازہ ہوا کہ وہ اپنی ٹیم کو کال کر رہا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی نوٹس کرلیا کہ گاڑی اب مصروف سڑکوں کو چھوڑ کر ان راستوں کی طرف جارہی ہے جو عموماً سنسان پڑے ہوتے ہیں۔ جیسے ہی ان راستوں پر سفر شروع ہوا، تعاقب کار گاڑی.. نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

''وہ سمجھ گئے ہیں کہ ہم ان کے تعاقب سے واقف ہوگئے ہیں۔'' گاڑی کے غائب ہونے پر ان کے ساتھ پچھلی نشست پر براجمان شخص نے تبصرہ کیا۔

''برا ہوا، میں تو انہیں گھیرنے کا پلان بنا رہا تھا۔'' آگے والے کی طرف سے افسوس کا اظہار ہوا۔

''چھوڑو، ویسے بھی وہ کوئی کرائے کے ٹٹو ہوں گے۔ ہمارے اصل دشمن اتنے چالاک ہیں کہ جہاں پکڑے جانے کا خدشہ ہو، وہاں بھی خود سامنے نہیں آتے۔'' ان لوگوں کے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ عالم ا[illegible] رمد درمیان میں دخل دیے بغیر بس خاموشی سے [illegible] لات کا تجزیہ کرنے پر اکتفا کر رہے تھے [illegible] دن تھا کہ وہ آتے کے ساتھ ایسے معاملات میں [illegible] مر گیا تھا کہ موسل کی تیمارداری تو دور کی بات، ایک جھلک دیکھنے سے بھی محروم رہا تھا۔

''میرے خیال میں اب سیدھے راستے پر لے لو۔'' آس پاس سب ٹھیک دیکھ کر ابھی ڈرائیور کو یہ ہدایت دی ہی گئی تھی کہ ایک کوسٹر ان کے دائیں جانب سے آندھی طوفان کی طرح برآمد ہوئی۔ گاڑی میں تیز میوزک لگا ہوا تھا اور عجیب و غریب حلیے والے لڑکے کھڑکیوں سے آدھے آدھے باہر نکلے الٹی سیدھی حرکتیں کر رہے تھے۔ کوئی زور زور سے گا رہا تھا تو کوئی بلاوجہ ہی وحشیانہ قہقہے لگا رہا تھا۔ ایک صاحبزادے رنگ برنگے بلبلے بنا کر فضا میں اڑانے کا شوق پورا کر رہے تھے تو ایک کو چلتی گاڑی میں پتنگ بازی کا شوق چرایا تھا۔

''کالج کے لونڈے۔'' ان لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرائیور نے ہنس کر تبصرہ کیا۔

''یہ ہمارے مستقبل کے معمار ہیں جنہوں نے اپنے ہی نقشے بگاڑ رکھے ہیں۔'' پچھلی نشست والے کی طرف سے ناگواری کا اظہار ہوا۔ واقعی ان لڑکوں کے حلیے کسی سنجیدہ مزاج شخص کے لیے قابلِ برداشت نہیں ہوسکتے تھے۔ کسی نے اپنی لمبی زلفوں کو بے شمار مینڈھیاں باندھ کر رنگ برنگے بینڈز سے جکڑ رکھا تھا، کسی کے چہرے پر رنگ

ملے ہوئے تھے، کسی کے بال اتنے رنگوں میں رنگے تھے کہ شمار مشکل تھا۔ کوئی ملنگ کا روپ دھارے گلے میں موٹے موٹے منکوں کے ہار پہنے ہوئے تھا۔

"جانے دو یار! ان کی موج مستی کی عمر ہے۔ تھوڑا وقت گزرے گا تو سنجیدہ ہو کر ذمے داریاں سنبھال لیں گے۔" آگے والے نے نئی نسل کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔ عالم ان کی آپس کی گفتگو سنتا اپنی گاڑی سے کچھ فاصلے پر چلتی کوسٹر اور اس میں سوار نوجوانوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے بارے میں کسی بھی طرح کی رائے سے بے نیاز اپنی موج میں مست تھے۔ شاید ان کا شہر سے باہر کسی تفریحی مقام پر پکنک منانے کا پروگرام تھا اور وہ راستے میں کھیل تماشے کرتے ہوئے جا رہے تھے۔

"اللہ کرے یہ ذمے داریاں سنبھالنے کے اہل ہو جائیں ورنہ اس ملک کا اللہ ہی حافظ ہے۔ خیر، انہیں جانے دو ان کے راستے، ہم چلتے ہیں اپنے راستے پر۔" عالم کے ساتھ بیٹھے شخص نے اپنے ساتھی کو جواب دیا اور ڈرائیور نے اس کا اشارہ پا کر گاڑی کا رخ بدل لیا۔ ابھی گاڑی بائیں جانب والے ذیلی راستے پر مڑی ہی تھی کہ عالم کی نظر بلبلے بناتے لڑکے کی طرف اٹھی۔ وہ صحیح سے نہیں دیکھ سکا لیکن اس نے محسوس کیا کہ لڑکے کے ہاتھ میں بلبلے بنانے کے لیے استعمال ہونے والے مڑے ہوئے تار کی جگہ کچھ اور موجود ہے۔ اس "کچھ اور" کا تجزیہ ہو پاتا، اس سے پہلے ہی ایک کان پھاڑ دھماکے کے ساتھ ان کی گاڑی بری طرح لہرائی۔

"اوہ شٹ! ٹائر برسٹ ہو گیا۔" ڈرائیور نے تبصرہ کیا۔ اس نے جس ذیلی راستے پر گاڑی ڈالی تھی، وہ ہموار نہیں تھا اس لیے اسے یہی گمان گزرا تھا کہ ٹائر کسی سخت نکیلی شے کی زد میں آ گیا ہے۔

"در فتنے منہ۔" ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے شخص نے ناگواری کا اظہار کیا۔ وہ ٹائر برسٹ ہونے کو ایک اتفاقی حادثہ سمجھ رہے تھے لیکن عالم کی نظریں کوسٹر پر جمی ہوئی تھیں۔ اصولاً اسے اپنے راستے پر سیدھے نکل جانا چاہیے تھا لیکن ان کی گاڑی کے مڑتے ہی وہ رک گئی تھی اور اب اس طرف ہی آ رہی تھی۔

"وہ دیکھو۔" اس نے اپنے ساتھ بیٹھے شخص کو اس طرف متوجہ کیا۔ اس شخص نے چونک کر گردن موڑی اور بے ساختہ ہی چیختے ہوئے اپنی گن لوڈ کی۔ اس کے ساتھی بھی چوکنے ہو گئے لیکن اس اثنا میں کوسٹر ان کے سروں پر پہنچ چکی تھی اور اس میں موجود لڑکے چھلانگیں لگا کر نیچے آ رہے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں خطرناک ہتھیار دکھائی دے رہے تھے اور اب ان کی چال ڈھال میں کہیں سے بھی لاابالی "کالج کے لونڈوں" کا رنگ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"ہتھیار پھینک دو ورنہ ہم اس گاڑی کو ہی تمہارا قبرستان بنا دیں گے۔" کوسٹر کے اندر سے کسی نے چیخ کر حکم دیا۔ آواز کی سمت دیکھنے پر انہیں ایک کھڑکی سے جھانکتی مشین گن کی خوفناک جھلک دکھائی دے گئی۔ بظاہر وہ اپنی گنوں سے کوسٹر سے اترتے لڑکوں کو نشانہ بنا سکتے تھے لیکن یہ حقیقت بالکل عیاں تھی کہ مشین گن کا ایک برسٹ ہی گاڑی سمیت ان سب کو چھلنی کر کے رکھ دے گا۔

"کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟" فوری طور پر ہتھیار ڈال دینے میں توہین تھی اس لیے سوال اٹھایا گیا۔

"ہتھیار پھینکو اور گاڑی سے باہر آؤ۔ تمہارے پاس ہم سے سوال جواب کی کوئی گنجائش نہیں۔" سخت اور سرد لہجے میں جواب دیا گیا اور ساتھ ہی ان کی گاڑی کی دائیں جانب ایک برسٹ مارا گیا جس کے نتیجے میں کئی پتھر اور بہت سی دھول اڑی۔ کچھ پتھر ان کی گاڑی سے بھی آ کر ٹکرائے۔

"ان کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔" آگے والی سیٹ پر براجمان شخص نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔ وہ خطرہ سر پر دیکھتے ہی اپنی بیک اپ ٹیم کو لوکیشن اور مدد کا پیغام بھیج چکا تھا لیکن بہت زیادہ پرامید نہیں تھا کیونکہ تعاقب کار گاڑی کے غائب ہوتے ہی اس نے انہیں اپنے محفوظ ہونے کا پیغام بھیجنے کے ساتھ اس گاڑی کو ٹریس کرنے کی ذمے داری سونپ دی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ ٹریفک کے ازدحام میں اس گاڑی کو تلاش کرتی اس کی ٹیم کو اس ویرانے تک آنے میں جتنا وقت لگے گا، اگلے اپنی کارروائی مکمل کر چکے ہوں گے۔

"اگر میرے تین گننے تک تم لوگ گاڑی سے باہر نہیں آئے تو پھر اپنی موت کے ذمے دار تم سب خود ہو گے۔" دوسری طرف سے انہیں سوچنے سمجھنے کی مہلت نہیں دی جا رہی تھی۔

"ایک، دو......" گنتی شروع ہوئی۔ تین بولنے سے پہلے ہی وہ سب گاڑی ان لاک کر کے ایک ایک کر کے باہر آنے لگے۔ اندر بیٹھے رہنے میں یقینی موت تھی جبکہ باہر آنے میں زندگی کی کچھ نہ کچھ امید رکھی جا سکتی تھی کہ اگر اگلوں کا مقصد مارنا ہی ہوتا تو وہ اتنا انتظار نہیں کرتے۔

"تم دونوں اس طرف آ جاؤ۔" ان کے ہتھیار پھینک کر باہر نکلتے ہی ہتھیار بردار لڑکوں نے انہیں گھیر لیا تھا اور

اب رنگ برنگے بالوں والا عالم اور سرمد کی طرف اشارہ کر کے انہیں حکم دے رہا تھا۔ ان دونوں کو چاروناچار اس کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ جیسے ہی وہ اپنے باقی تین ساتھیوں سے الگ ہو کر ایک طرف ہوئے، فضا گولیوں کی آواز سے گونج اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے تین صحت مند اور توانا وجود اپنے خون میں نہائے خاک میں لوٹنے لگے۔

''کوسٹر میں بیٹھو۔'' تین زندگیوں کا چراغ گل کرنے والے اپنی کارروائی سے بے نیاز ان دونوں کو حکم دینے لگے۔

''یہ..... یہ کیا کیا تم نے؟'' عالم شاہ نے حکم کی تعمیل کرنے کے بجائے غصے سے پوچھا۔ وہ جوان کو تحفظ دینے کے لیے ائرپورٹ سے سیدھا نکال لائے تھے، اب خود نہیں رہے تھے تو یہ اس کے لیے ایک بڑا شاک تھا۔

''ہماری راہ میں آنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ سیدھی طرح گاڑی میں بیٹھو ورنہ تمہارا حشر اس سے بھی زیادہ برا ہوگا۔'' رنگین بالوں والے نے سخت لہجے میں جواب دیا اور ساتھ ہی عالم کو دھکا دینے کی بھی کوشش کی۔

''ہاتھ مت لگانا سائیں کو، میں تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا۔'' سرمد کی وفاداری اس کی یہ جسارت کہاں برداشت کرسکتی تھی۔

''چل تو پہلے تجھے ہی دیکھ لیتے ہیں۔'' وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ سرمد پر پل پڑا۔

عالم شاہ اپنے جاں نثار کے ساتھ یہ سلوک کیسے برداشت کرسکتا تھا۔ وہ بھی اس لڑائی میں کود پڑا۔

''بس!'' اچانک ہی ایک دھاڑتی ہوئی آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی اور خودکار ہتھیاروں کی نالیں ماتھے سے آلگیں۔

''بیٹھو گاڑی میں۔'' یہ حکم دینے والا وہ تھا جس کو عالم راستے میں بیلچے بنا کر ہوا برد کرتا دیکھتا رہا تھا لیکن اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ اس نے پہلے جو دھاڑ سنی تھی وہ اس لڑکے کی نہیں تھی۔ بہرحال اس وقت وہ اپنے مقابلین کو کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے کوسٹر میں سوار ہوگیا۔ سرمد بھی باچھوں سے بہتے خون کو آستین سے صاف کرتا ہوا اس کے پیچھے کوچ میں چڑھ گیا۔ کوچ کی پچھلی نشستوں پر ایک شخص مشین گن کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا لیکن چہرے پر منڈھے نقاب کی وجہ سے وہ اسے پہچاننے سے قاصر تھا۔

''ان دونوں کے کپڑے اتروا کر باہر پھینک دو۔'' نقاب پوش نے حکم صادر کیا۔ اس کی آواز سنتے ہی انہیں اندازہ ہوگیا کہ یہ وہی ہے جس کی دھاڑ انہوں نے سنی تھی۔

''سنا نہیں، کپڑے اتارو۔'' حکم ملتے ہی دو لڑکے ہتھیار تان کر ان کے سر پر سوار ہوگئے۔ یہ ایک ہتک آمیز حکم تھا جس کی تعمیل کے خیال سے عالم شاہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ اس کی سرمد پر نظر اٹھی تو وہ بھی لڑنے مرنے پر آمادہ دکھائی دیا۔ سرمد کی اس کیفیت نے اسے اپنا دماغ ٹھنڈا رکھنے پر اکسایا۔ اگر وہ ذرا سی بھی مزاحمت کرتا تو سرمد اس کی خاطر ایک بار پھر ان لوگوں سے بھڑ جاتا اور یہ تو بالکل واضح تھا کہ وہ دونوں مل کر موجودہ صورت حال میں ان لوگوں سے مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔ سرمد جو پہلے ہی اچھی خاصی مار کھا چکا تھا، مزاحمت پر مزید پٹتا۔ سرمد کے خیال نے اسے اپنا دماغ ٹھنڈا کرلینے پر مجبور کردیا اور خود ہی بٹن کھول کر اپنی قمیص اتاردی۔ اسے ایسا کرتے دیکھ کر سرمد کو بھی عمل کرنا پڑا۔ ایک ایک کرکے سوائے زیر جامہ کے، ان کے سارے کپڑے اتروا لیے گئے۔ پیروں میں جوتے بھی نہیں چھوڑے گئے۔ اس دوران کوسٹر وہاں رکی نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنا سفر شروع کردیا تھا۔

''ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دو اور ان کے کپڑے ادھر لے آؤ۔'' پیچھے سے ایک اور حکم جاری کیا گیا اور اس حکم کی بھی سابقہ احکامات کی طرح سرعت سے تعمیل ہوئی۔ اندھوں کی طرح کوچ کی الگ الگ نشستوں پر بیٹھے ہوئے عالم شاہ اور سرمد کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ کوچ کس سمت جارہی ہے یا کوچ کے اندر کیا کارروائی جاری ہے۔

''یہ کپڑے، جوتے اور باقی سامان اٹھا کر باہر پھینک دو۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہی آواز گونجی جو احکامات صادر کرتی تھی۔ شاید ان لوگوں کو خدشہ تھا کہ کپڑوں یا جوتوں میں کچھ ایسا چھپایا گیا ہوگا جس سے ان کی لوکیشن معلوم کی جاسکے۔ اس لیے یہ ساری کارروائی کی تھی۔ اس کارروائی کے بعد کافی دیر خاموشی چھائی رہی۔ انہیں صرف یہ اندازہ ہورہا تھا کہ کوچ مسلسل سفر میں ہے۔ آخرکار یہ سفر بھی ختم ہوا اور کوچ ایک جھٹکے سے رک گئی۔

''نیچے اترو۔'' کسی نے عالم کے کندھے پر ٹھوکا دے کر سخت لہجے میں کہا اور پھر ہاتھ پکڑ کر کھڑا بھی کردیا۔ وہ اسی شخص کے سہارے کوچ سے نیچے اترا۔ یقیناً سرمد کے ساتھ بھی یہی کارروائی ہوئی تھی۔ اس موقع پر انہیں لباس پہنائے گئے پھر چلنے کا حکم ملا۔

''بیٹھو۔'' چند قدم چلنے کے بعد اسے آہستہ سے ایک جانب دھکیلا گیا۔ وہ ایک بار پھر ان لوگوں کی راہنمائی میں ان کی بتائی ہوئی جگہ پر بیٹھ گیا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا

کہ انہیں کسی دوسری گاڑی میں منتقل کیا جا رہا ہے اور یہ گاڑی کوئی لگژری کار ہے۔ گاڑی نے سفر شروع کیا تو اس کی آرام دہ نشستوں، بے آواز انجن اور بغیر جھٹکے کے ہموار ڈرائیو نے اندازے کی تصدیق کر دی۔ اس بار سفر آرام دہ لیکن طویل تھا۔

☆☆☆

''ہاں بھئی ہیرو! کیا حال ہے؟ آج تو بڑی کٹ شٹ میں دکھائی دے رہے ہو۔'' اس نے کھانے کی ٹرے سمیت بہرام کے قریب بیٹھتے ہوئے اسے ہلکے پھلکے لہجے میں مخاطب کیا۔ وہ کچھ دیر قبل ہی سو کر اٹھا تھا اور زرینہ بی بی نے اسے نہلا دھلا کر صاف ستھرا لباس پہنانے کے ساتھ ساتھ اس کے بال وغیرہ بھی سنوار دیے تھے اس لیے اس کی حالت کافی بہتر محسوس ہو رہی تھی۔

''یہ سب بی بی نے کیا ہے۔ میرے لیے یہ نئے کپڑے بھی انہوں نے ہی منگوائے ہیں۔'' بہرام نے شرمائے ہوئے لہجے میں اسے جواب دیا۔

''بی بی نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ آئندہ بھی اسی طرح ہیرو بن کر رہنا۔ کپڑوں، جوتوں وغیرہ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ مزید بھی آجائیں گے۔'' اس نے نرمی سے بہرام کو جواب دیا۔ اس وقت بہرام جو کپڑے پہنا ہوا تھا، ان کے علاوہ بھی وہ اس کے لیے چند جوڑے خرید کر لایا تھا۔ اس بے چارے بچے کا کل سامان تو گھر اور باغ کے ساتھ جل کر خاکستر ہو گیا تھا اس لیے اس کے استعمال کی ہر چیز نئی خریدنا ناگزیر تھا۔

''آپ بہت اچھے ہیں۔ کاش دنیا میں سب لوگ آپ جیسے ہوتے۔'' بہرام نے خواہش ظاہر کی لیکن معاذ اپنی تعریف پر خوش ہونے کے بجائے اس کے لہجے کی حسرت و یاس کو محسوس کر کے دکھی ہو گیا۔ چھوٹی عمر کے بڑے دکھ نے اسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ دن کے مختلف حصوں میں اسے دورے پڑنے لگتے تھے۔ زرینہ بی بی سارا دن اس کا دھیان رکھتی تھیں پھر بھی کوئی بھول چوک ہو جاتی تھی۔ کل بھی وہ دورے کے دوران اپنے ہاتھ پر چوٹ لگوا بیٹھا تھا۔

''دنیا میں اچھے اور برے، دونوں طرح کے لوگ ملتے رہتے ہیں۔ ہمارا کام ہے اچھے لوگوں کی قدر کریں اور برے لوگوں کو اپنی زندگی سے نکال دیں۔'' اس نے بہرام کو نصیحت کی اور پلیٹ میں موجود چاولوں پر سالن ڈالا۔

''لیکن......'' بہرام نے کچھ کہنا چاہا۔

''لیکن ویکن سب بعد میں، پہلے یہ کھانا کھاؤ جو بی بی نے بڑی محبت سے اسپیشلی تمہارے لیے بنایا ہے۔'' اس نے بہرام کو مزید بولنے سے روک دیا۔ اسے ڈر تھا کہ گفتگو کے اس نازک موڑ پر کہیں اس کی ذہنی رو بہک نہ جائے۔ وہ تکلیف دہ باتوں کے متعلق سوچنا شروع کر دیتا تو نتیجہ دورے کی شکل میں بھی نکل سکتا تھا۔

''بی بی بتا رہی تھیں کہ تمہیں ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ راجما (سرخ لوبیا) کا سالن بہت پسند ہے اس لیے آج انہوں نے خاص طور پر تمہارے لیے یہ کھانا بنایا ہے۔'' اس نے ایک چمچ بھر کر بہرام کے منہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بتایا۔

''بی بی ایسی ہی ہیں۔ ان کی ہمیشہ سے عادت ہے کہ جب بھی راجما بناتی ہیں، میرے لیے ضرور بھیجتی تھیں۔''

''یعنی مجھے تم سے جیلس ہونا چاہیے۔ تم میری بی بی کے پیار میں زبردستی کے حصے دار بنے بیٹھے ہو۔'' وہ نہیں چاہتا تھا کہ بہرام ماضی کے بارے میں سوچے اس لیے اسے کھانا کھلانے کے ساتھ ساتھ ایک کے بعد ایک بات نکالتا جا رہا تھا۔

''نہیں، نہیں۔ ایسا بالکل بھی نہیں ہے عمار بھائی! آپ سے بڑھ کر تو بی بی کو کسی سے پیار ہو ہی نہیں سکتا۔'' بہرام نے جلدی سے وضاحت دی جس پر وہ ہنس دیا۔

''مجھے معلوم ہے یار لیکن کیا کریں کہ تم ہو ہی اتنے پیارے بچے کہ بی بی تو بی بی، میں بھی تم سے پیار کرنے پر مجبور ہوں۔ بالکل ایسا لگتا ہے جیسے اللہ نے مجھے چھوٹا بھائی دے دیا ہے۔'' بہرام کی اداسی دور کرتے کرتے وہ خود اداسی کی لپیٹ میں آ گیا اور دل پر دور بیٹھے سعد کی یاد نے دستک دی۔ اس پر پڑی افتاد سعد کے لیے سب سے بڑا امتحان لے کر آئی تھی۔ اغوا، ایک گردے سے محرومی، داؤ پر لگا کیریئر اور دربدری سمیت بہت کچھ سہا تھا اس بے چارے نے۔ سعد کو اس سب سے نکالنے کے لیے اس نے اپنی ذات پر بہت کچھ سہا تھا لیکن جانتا تھا کہ جو کچھ گزر چکا، سعد اس کے اثرات سے اگلے کئی برسوں تک نہیں نکل سکے گا۔ بہرام بھی کچھ اس طرح کی تکلیف سے گزر رہا تھا اور اس نے اپنے دل میں عزم کر لیا تھا کہ اسے نارمل کرنے کے لیے جو کچھ بس میں ہوا ضرور کرے گا۔

''مطلب آپ مجھ سے جیلس نہیں ہیں۔'' بہرام ہلکا سا مسکرایا۔ اتنے دنوں میں یہ پہلی بار تھا کہ وہ نہ صرف ہلکے پھلکے موڈ میں بات کر رہا تھا بلکہ مسکرایا بھی تھا۔

''بالکل بھی نہیں ہوں لیکن اب تم باتیں کم کرو اور کھانا

زیادہ کھاؤ ورنہ کھانا ٹھنڈا ہو کر اپنا مزہ کھو دے گا اور بی بی ناراض ہوں گی کہ میں نے تمہیں باتوں میں لگا کر ان کی ساری محنت ضائع کر دی۔" معاذ نے اسے ٹوکا اور ساتھ ہی گھڑی پر بھی نظر ڈالی۔

"یہ بی بی کے ہاتھ کا راجما ہے عمار بھائی! یہ ٹھنڈا ہو کر بھی اپنا مزہ نہیں کھو سکتا۔" بہرام کو بیچ بیچ زرینہ بی بی کے ہاتھ کا بنا راجما بہت پسند تھا اس لیے پورے وثوق سے دعویٰ کیا۔

"مان لیا بھئی کہ بی بی دنیا کے بڑے سے بڑے شیف کو مات دے سکتی ہیں لیکن بات یہ ہے کہ کھانے کے بعد تمہیں میرے ساتھ ایک جگہ چلنا ہے اور وہاں ہمارا وقت پر پہنچنا بہت ضروری ہے۔" اس نے بہرام کو اصل بات بتائی۔

"کہاں، کہاں جانا ہے ہمیں؟" بہرام تھوڑا سا بے چین دکھائی دینے لگا۔

"ہے ایک جگہ جہاں تمہیں ایک اچھے انسان سے ملوانا ہے، تم ان صاحب سے ملو گے تو تمہیں مل کر بہت اچھا لگے گا اور تمہاری صحت پر بھی اس کا بہت اچھا اثر پڑے گا۔"

"ہم کسی ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہیں؟" بہرام نے فوراً اندازہ لگا لیا۔

"ہاں۔" اسے اعتراف کرنا پڑا پھر اسے ذہنی طور پر آمادہ کرنے کے لیے نرمی سے بولا۔

"جس طرح ہمارے جسم کے کسی حصے میں تکلیف ہو تو ہمیں ڈاکٹر کے پاس جانا پڑتا ہے، اسی طرح جب دماغ کسی وجہ سے ڈسٹرب ہو جائے اور تکلیف میں چلا جائے تو اس کا علاج بھی بہت ضروری ہے۔ جسمانی طور پر الحمد للہ تم بالکل فٹ ہو لیکن تمہارا ذہنی دباؤ تمہاری زندگی کو بری طرح متاثر کر رہا ہے۔ آج ہم جن ڈاکٹر صاحب کے پاس جانے والے ہیں وہ اس مشکل سے نکلنے میں تمہاری مدد کریں گے۔"

"کیا میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا؟" بہرام نے بے یقینی سے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ ان شاء اللہ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔" اس نے پورے وثوق سے جواب دیتے ہوئے گلاس میں تھوڑا سا پانی نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے دو گھونٹ پانی پیا اور گلاس اسے واپس پکڑا دیا۔

"کیا اس کے بعد مجھے وہ ڈراؤنے خواب آنے بند ہو جائیں گے؟" اس کا لہجہ سہما ہوا تھا۔

"ضرور۔" معاذ نے ایک بار پھر اسے یقین دہانی کروائی پھر مزید حوصلہ بڑھانے کے لیے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر نرمی سے دباؤ ڈالتے ہوئے بولا۔

"انسانوں کی زندگی میں مشکلات اور تکالیف آتی رہتی ہیں۔ کچھ تکالیف ایسی ہوتی ہیں جنہیں سہنا وقتی طور پر ہمیں ناممکن لگتا ہے لیکن یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی کو بھی اس کی برداشت سے زیادہ تکلیف میں مبتلا نہیں کرتا۔ جو اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں، وہ اوّل وقت میں اس تکلیف پر صبر کر کے اجر کے حقدار قرار پاتے ہیں۔ باقیوں کو بھی شور، شکوہ اور واویلا کرنے کے بعد بالآخر ہار ماننا ہی پڑتی ہے تو پھر کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ اوّل وقت میں صبر کر لیا جائے اور سوچا جائے کہ اپنے اس غم کے مداوے کی کیا صورت نکالی جا سکتی ہے۔ خود کو غم میں غرق کر لینا ناشکری ہے۔ ناشکرا انسان نہ تو اللہ کو پسند ہوتا ہے اور نہ اپنے لیے مفید۔"

"مگر میں...... میں کیسے جیوں گا اپنے گھر والوں کے بغیر؟ میں تو ابھی اتنا بڑا بھی نہیں ہوا کہ خود اپنے لیے کچھ کر سکوں۔" وہ ایک طرف اپنے پیاروں کی جدائی کے غم سے نڈھال تھا تو دوسری طرف اسے مستقبل کے اندیشے ڈرا رہے تھے۔

"کیا شیر خوار حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی چھوٹے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے کہ جب حضرت موسیٰ کو ان کی والدہ نے فرعون سے بچانے کے لیے ایک صندوق میں ڈال کر دریا میں بہا دیا تھا تو نہ صرف اللہ نے ان کی حفاظت فرمائی بلکہ ایسا انتظام بھی کر دیا کہ ان کی پرورش ان کے سب سے بڑے دشمن کے محل میں ہی کروا ڈالی۔ ہم سوچ بھی کیسے سکتے ہیں کہ جس رب نے یہ کائنات بنائی ہے، وہ اس کا انتظام سنبھالنے سے قاصر ہو گا۔ وہ تو بس ہمارے ایمان کی آزمائش کے لیے ہمیں ایسے امتحانات میں مبتلا کرتا ہے ورنہ کائنات کا بڑے سے بڑا کام اس کی محض "کُن" کا منتظر ہے۔ وہ چاہے تو ایک لمحے میں اس دنیا سے ظلم کا خاتمہ کر کے یہاں امن قائم کر دے لیکن وہ ایسا نہیں کرے گا کیونکہ اس نے اس دنیا کو ہمارے لیے امتحان گاہ کے طور پر بنایا ہے اور ہم میں سے ہر ایک کو لازماً اپنے اپنے ظرف کے مطابق آزمایا جائے گا۔" اس کے دلائل ایسے تھے کہ بہرام کو قائل ہو کر خاموشی اختیار کرنی پڑی لیکن یہ بھی طے تھا کہ محض ان چند باتوں سے اس کا علاج ممکن نہیں تھا۔ اسے اس ٹراما سے نکالنے کے لیے کسی مستند ڈاکٹر کی مدد درکار تھی اور آج وہ اسی مقصد سے اسے اپنے ساتھ لے جانے والا تھا۔

"تم ریڈی رہو، میں یہ برتن بی بی کو دے کر آتا ہوں

پھر ہم نکلتے ہیں۔'' اس نے بہرام کا شانہ تھپتھپایا اور ٹرے اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ ابھی وہ ٹرے باورچی خانے میں رکھ کر پلٹ ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے جا کر دیکھا تو بنجامن کا ڈرائیور تھا۔ بہرام کو ماہر نفسیات کے پاس لے جانے کا پروگرام سن کر بنجامن نے خود انہیں گاڑی مع ڈرائیور فراہم کرنے کی پیشکش کر دی تھی جسے اس کے خلوص کے باعث رد کرنا ممکن نہیں تھا۔

''بس دو منٹ رکو، میں بہرام اور آغا جان کو لے کر آتا ہوں۔'' سلام دعا کے بعد اس نے ڈرائیور سے کہا اور واپس اندر چلا گیا۔

''کون ہے؟ کیا ڈرائیور آ گیا ہے؟'' آغا گل جو بالکل تیار اپنے کمرے سے باہر آ چکے تھے، اس کے پلٹتے قدموں کی چاپ سن کر پوچھنے لگے۔

''جی، ڈرائیور آ گیا ہے۔ آپ چلیں، میں بہرام کو لے کر آتا ہوں۔'' اس نے انہیں جواب دیا اور اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں بہرام موجود تھا۔ اب وہاں زرمینہ بی بی بھی موجود تھیں اور بہرام پر سے صدقے کے پیسے وار رہی تھیں۔

''آ جاؤ بہرام! ہمیں لے جانے کے لیے گاڑی آ گئی ہے۔'' اس نے پکارا۔

''جاؤ میرے بہادر بچے! اللہ تمہارا حامی و ناصر ہوگا۔'' زرمینہ بی بی نے دعاؤں کے ساتھ اسے رخصت کیا۔ معاذ اس کا ہاتھ تھام کر اسے باہر لے آیا۔ بہرام کا ہاتھ بالکل سرد ہو رہا تھا جسے وہ اپنی گرمجوش گرفت میں لیے اسے حوصلہ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

باہر آ کر اس نے بہرام کو پچھلی نشست پر اپنے اور آغا گل کے درمیان بٹھایا اور سفر شروع ہو گیا۔ آغا گل نے بہرام کو بہلائے رکھنے کے لیے اس سے ہلکے پھلکے موضوعات پر گفتگو شروع کر دی۔ وہ ان کی باتوں پر زیادہ نہ سہی، کچھ نہ کچھ ردعمل دیتا رہا اور اتنا بھی کافی تھا کہ ان کا اصل مقصد بس اس کا دھیان بٹا کر اسے پُرسکون رکھنا تھا۔ معاذ جو اب تک اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا محسوس کر رہا تھا کہ آہستہ آہستہ اس کا تناؤ کم ہو رہا ہے اور وہ آغا گل کی باتوں میں دلچسپی لے رہا ہے۔

''تمہیں بتاؤں کہ جب میں تمہاری عمر کا تھا تو میرا پسندیدہ کھیل کون سا تھا؟'' اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے انہوں نے اچانک اس سے کہا۔

''کون سا تھا؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

''کرکٹ۔ میں کرکٹ کھیلتا تھا اور اپنی ٹیم کا کپتان تھا۔'' انہوں نے فخر سے بتایا۔

''کیا واقعی آغا جان؟'' بہرام کو گویا یقین نہیں آیا۔

''اور نہیں تو کیا۔ تم کیا سمجھتے ہو یہ اندھا بالکل ناکارہ ہے کیا؟'' انہوں نے بھی جیسے بُرا مان لیا تھا۔

''نہیں آغا جان! میں یہ تو نہیں کہہ رہا۔ بس مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ آپ کیسے کھیل لیتے تھے۔'' وہ شرمندہ شرمندہ سا وضاحت دینے لگا۔

''ہم اسپیشل لوگوں کی ایک ٹیم تھی اور ہم اپنے لیے بنائے گئے قاعدے قوانین کے تحت کھیلتے تھے۔ تم بتاؤ، تمہیں کرکٹ پسند ہے؟'' انہوں نے گفتگو کا رخ اس کی ذات کی طرف موڑ دیا۔

''جی، بہت پسند ہے لیکن میں زیادہ اچھی کرکٹ نہیں کھیل پاتا۔ اکثر تو لڑکے مجھے ٹیم میں شامل ہی نہیں کرتے کہ تمہاری وجہ سے ہم میچ ہار جاتے ہیں۔'' اس نے جھینپتے ہوئے انداز میں بتایا۔

''ایسا اس لیے ہے کہ تم نے درست کھیل کا انتخاب نہیں کیا ہے۔ تم فٹ بال کھیل کر دیکھو۔ اس میں یقیناً کامیاب رہو گے۔''

''آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' وہ ان کے مشورے پر حیران ہوا۔

''تمہاری ٹانگوں کی مضبوطی کی وجہ سے۔ یہ لمبی اور مضبوط ٹانگیں ایک فٹ بالر کی ہیں۔'' انہوں نے اپنے ہاتھ سے اس کی ٹانگ کو دبایا۔

''شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں کبھی کبھی دوستوں کے ساتھ فٹ بال کھیلتا تھا تو وہ یہی کہتے تھے کہ تمہارے پاس بال چلی جائے تو تم اسے گول کرنے سے پہلے چھوڑتے ہی نہیں ہو۔'' ماضی کی خوشگوار یاد نے اس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے چمک سی دوڑا دی پھر کچھ مایوسی سے بولا۔

''لیکن لڑکے زیادہ فٹ بال کھیلنا پسند ہی نہیں کرتے۔ کہتے ہیں ہمارے خطے میں فٹ بال کا کوئی اسکوپ نہیں ہے۔''

''کھیل خود کو چاق و چوبند اور فٹنس فری رکھنے کے لیے ہوتے ہیں ہیرو! جو کوئی گیم کھیلتے ہیں، وہ اپنے بچپن اور جوانی کو انجوائے کرتے ہیں۔ ہر ایک پروفیشنل کھلاڑی بن جائے یہ ضروری نہیں ہوتا۔ کیریئر بنانے کے لیے انسان کوئی اور فیلڈ بھی چن سکتا ہے۔ گیارہ افراد کی ٹیم میں اتنی بڑی

انسانی آبادی میں سے بھلا کس کس کو شامل کیا جاسکتا ہے۔“

اس بار معاذ نے گفتگو میں حصہ لیا اور اسے سمجھانے لگا۔ اس کی بات سن کر بہرام نے سر کو تفہیمی انداز میں جنبش دی اور کچھ کہنے کے لیے رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا لیکن یکدم ہی اس کی زبان گنگ ہوگئی اور آنکھیں پھیلنے کے ساتھ ساتھ جسم میں تناؤ کی کیفیت بھی پیدا ہوگئی۔ اس کی اس بدلتی کیفیت نے معاذ کو بھی رخ بدل کر دیکھنے پر مجبور کیا۔ وہ ایک جیپ تھی جو ان کی گاڑی کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور اس جیپ میں بیٹھے انڈین آرمی کے سپاہیوں کو صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ ان سورماؤں کے ظلم کا نشانہ بننے والے بہرام کی حالت کا انہیں دیکھ کر بگڑ جانا ایک فطری سی بات تھی۔

”ادھر مت دیکھو بہرام! آغا جان کی طرف دیکھو۔ دیکھو، آغا جان تم سے کیا کہہ رہے ہیں۔“ اس نے بے اختیار ہی بہرام کی توجہ ان لوگوں کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کی۔

”بہرام! کیا بات ہے، یہاں دیکھو میری طرف۔“ آغا گل دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن معاذ کے لہجے کی بے قراری نے کسی غیر معمولی صورتِ حال کا احساس دلا دیا اور وہ بے حد محبت اور فکرمندی سے بہرام کو پکارنے لگے لیکن وہ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوا اور پتھرائی ہوئی نظروں سے اسی سمت دیکھتا رہا جس سمت وہ جیپ جاتی دکھائی دے رہی تھی۔

”کچھ نہیں ہوا، سب ٹھیک ہے۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور تمہیں کچھ نہیں ہونے دیں گے۔“ معاذ اس کے اکڑتے ہاتھ پیروں کو سیدھا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے دلاسا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ آغا گل بھی شفقت سے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے اسے سنبھالنے کی اپنی سی کوشش کر رہے تھے لیکن بہرام ان تسلی دلاسوں سے بہت دور جاچکا تھا۔ وہ کبیر کے اس باغ میں پہنچ گیا تھا جہاں ابلیس نے اس کی آنکھوں کے سامنے موت کا وحشی رقص کیا تھا۔ ان لمحات کی ساری وحشت اس کے وجود میں اتر آئی تھی۔ اس وحشت کا شکار اب وہ منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکال رہا تھا۔

”گاڑی تیز چلاؤ۔“ معاذ کو اندازہ ہوگیا کہ معاملہ ان کے بس سے باہر ہے اور بہرام کے حق میں یہی بہتر ہے کہ اسے جلد از جلد کلینک پہنچا دیا جائے۔ اس کے کہنے پر ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار تیز کردی۔ وہ فوجی جیپ جو اس سارے انتشار کا سبب بنی تھی، ایک موڑ مڑنے کے بعد نظروں سے اوجھل ہوچکی تھی۔

”یا اللہ! اس بچے پر رحم فرما اور اس کڑی آزمائش سے نکال کر ایک بار پھر بالکل تندرست کردے۔“ بہرام کی حالت پر پریشان آغا گل بہت رقت سے اس کے لیے دعا مانگ رہے تھے۔ ساتھ ساتھ اس پر قرآنی دعائیں پڑھ کر پھونکنے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

”بس ہم پہنچ گئے ہیں۔“ ڈرائیور نے تسلی دینے والے انداز میں اطلاع دی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ پوری قوت لگانے کے باوجود معاذ کے لیے بہرام کی وحشت کو قابو کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ چیختا چلاتا عالمِ جنوں میں گاڑی سے نکل بھاگنے کی کوشش میں تھا اور معاذ نے اس کی اس کوشش کو ناکام بنانے کے لیے اسے مضبوطی سے اپنے بازوؤں کے حلقے میں جکڑ رکھا تھا۔

”اللہ کا شکر ہے۔“ معاذ نے ڈرائیور کی اطلاع پر سر اٹھا کر سامنے دیکھا تو متعلقہ ڈاکٹر کے کلینک کا بورڈ دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ بہرام کوئی دشمن ہوتا تو وہ اسے دو چار ہاتھ لگا کر خاموشی سے بیٹھنے پر مجبور کردیتا لیکن وہ تو خود مظلوم تھا جس کے ساتھ سختی کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

”میں اندر اطلاع کرتا ہوں۔“ گاڑی کلینک کے سامنے روک کر ڈرائیور کہتا ہوا تیزی سے نیچے اترا اور کلینک کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ ویسے وہ کہنے ہی کو کلینک تھا ورنہ وسعت کے حساب سے اسے چھوٹا موٹا اسپتال سمجھا جاسکتا تھا۔ ڈرائیور کے اندر جانے کے ایک ڈیڑھ منٹ بعد ہی اندر سے چار لحیم شحیم آدمی برآمد ہوئے اور سیدھے ان کی گاڑی کی طرف چلے آئے۔

”آپ لوگ اندر ویٹنگ ایریا میں جاکر بیٹھیں، پیشنٹ کو ہم خود دیکھ لیں گے۔“ ان میں سے ایک نے معاذ اور آغا گل کو مخاطب کر کے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ دونوں گاڑی سے نیچے اتر آئے لیکن چیختے چلاتے بہرام کو چھوڑ کر جانے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

”پلیز، آپ لوگ اندر ویٹنگ ایریا میں جاکر بیٹھیں اور ہمیں ہمارا کام کرنے دیں۔“ کہنے کو اب بھی درخواست ہی کی گئی تھی لیکن انداز میں ایک قطعیت سی تھی۔

”آئیں آغا جان! ہم اندر چلتے ہیں۔“ وہ تربیت یافتہ لوگ تھے۔ معاذ نے مناسب سمجھا کہ ان کا کام انہی پر چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ آغا گل کا ہاتھ تھام کر انہیں اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

بہرام کے لیے اپائنٹمنٹ پہلے ہی لیا جاچکا تھا۔ استقبالیہ پر رسمی سی کارروائی کے بعد انہیں انتظار گاہ میں

بٹھادیا گیا۔ وہاں بیٹھے معاذ کی نظر بس بار بار داخلی دروازے کی طرف اٹھتی رہیں لیکن حیرت انگیز طور پر بہرام کو لینے جانے والے وہاں سے آتے دکھائی نہ دیے۔ یہاں تک کہ انہیں ایک کمرے میں جانے کے لیے کہا گیا۔ اس کمرے میں دو جونیئر ڈاکٹرز موجود تھے جنھوں نے ان دونوں کو سامنے بٹھا کر بہرام کے کیس کی تفصیلات بتانے کی درخواست کی۔

''ایکسکیوزمی ڈاکٹر! میں کچھ بھی ڈسکس کرنے سے پہلے اپنے مریض کے متعلق جاننے، بلکہ اسے ایک نظر دیکھنے کی خواہش رکھتا ہوں۔'' اسے بہرام کے بارے میں جاننے کی بے چینی تھی اس لیے ہر طرح کی مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر سیدھی بات کی۔

''وہ اب پہلے سے بہتر ہے۔ تسلی کے لیے ہم آپ کو دکھا بھی دیتے ہیں۔'' ڈاکٹرز میں سے ایک نے بُرا مانے بغیر نرمی سے اسے جواب دیا اور اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ پر چند بار انگلیاں چلا کر اسکرین کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ وہاں ایک چھوٹے سے لیکن صاف ستھرے کمرے کا منظر تھا جس میں اجلی چادر والے بستر پر لیٹا بہرام صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وحشت کے رنگ چھٹ جانے کے بعد اس کا چہرہ بہت معصوم اور بھولا بھالا لگ رہا تھا۔

''کیا اسے ٹرنکولائزر دی گئی ہے؟'' معاذ نے بہرام کے بالوں کو انگلیوں سے سنوارتے میل نرس کو ایک نظر دیکھا اور سامنے بیٹھے ڈاکٹر سے سوال کیا۔

''مجبوری تھی۔ پیشنٹ جس ابتر حالت میں تھا، اگر ایسا نہ کیا جاتا تو اس کو مزید نقصان پہنچ سکتا تھا لیکن آپ فکر نہ کریں۔ یہاں رہ کر اس کا ٹریٹمنٹ ہوگا تو آہستہ آہستہ یہ نارمل لائف کی طرف واپس آجائے گا۔'' ڈاکٹر نے اسے نرمی سے وضاحت دی۔

''یعنی آپ بہرام کو ایڈمٹ کرلیں گے؟'' ڈاکٹر کی وضاحت نے اسے سوال کرنے پر مجبور کیا۔

''اسے اس کی ضرورت ہے۔ مرض کی شدت کم ہو تو ہم خود بھی مریض کو اس کے اہلِ خانہ کے درمیان رکھنا پسند کرتے ہیں لیکن بہرام کی جو حالت ہے وہ بتا رہی ہے کہ اسے مسلسل انڈر آبزرویشن رکھنا ہوگا اور ظاہر ہے اس کے لیے ہمیں اسے ایڈمٹ کرنا پڑے گا۔'' ڈاکٹر نے اپنی بات کے اختتام پر کندھے اچکائے۔

''اگر آپ کی تسلی ہو گئی ہو تو اب ہمیں چند سوالوں کے جواب دے دیں۔'' اس بار دوسرا ڈاکٹر معاذ سے مخاطب ہوا۔

''جی ضرور۔'' معاذ نے اسے جواب دیا پھر وہ اور آغا گل کافی دیر تک ان کے سوالوں کے جوابات دیتے رہے۔

''تھینک یو سو مچ! اب آپ لوگ کچھ دیر ویٹنگ روم میں بیٹھیں۔ ہم نے ہسٹری لے لی ہے۔ کچھ دیر میں ڈاکٹر بٹ خود آپ کو کال کریں گے۔'' تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد انہیں ایک بار پھر انتظار گاہ میں بھیج دیا گیا۔ وہاں ان جیسے چند مزید افراد بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اپنے پیاروں کی بیماری سے ان کے ساتھ ساتھ خود بھی لڑتے ان افراد کے چہروں پر تھکن اور پریشانی کے آثار تھے۔ سیاہ چادر میں لپٹی ایک درمیانی عمر کی عورت سراپا غم بنی بیٹھی تھی۔ آنسو بار بار پلکوں کی سرحد پار کر کے اس کے رخساروں پر پھسل جاتے تھے۔ وہ انہیں ہاتھ میں پکڑے ٹشو پیپر سے صاف کرتی تھی لیکن اگلے ہی لمحے پھر رخسار گیلے ہو جاتے تھے۔ اس کے ساتھ بیٹھی ایک دوسری عورت اس کا یہ حال دیکھ کر ہمدردی سے اس سے استفسار کرنے لگی جس کے جواب میں اس کے رونے میں مزید شدت آگئی پھر پانی پلائے جانے پر مشکل سے ہچکیوں پر قابو پا کر بتانے لگی۔

''چوبیس سالہ اکلوتا بیٹا ہے۔ ساتھ پڑھنے والی کسی مسلمان لڑکی سے عشق کر بیٹھا تھا۔ لڑکی کے گھر والوں کو ایک ہندو سے اپنی بیٹی بیاہنا منظور نہ تھا۔ انہوں نے تعلیم چھڑوا کر اسے اپنے پریوار میں ہی کہیں بیاہ دیا۔ بس تب سے یہ دیوانہ ہوا پھرتا ہے۔ تین بار آتما ہتھیا کی کوشش کر چکا ہے۔ تینوں بار بڑی مشکل سے بچایا گیا۔ میری اور اس کے پتا کی نیندیں حرام ہو گئی ہیں۔ دن رات اس کی نگرانی کرتے رہتے ہیں اور اس ڈر سے سو نہیں پاتے کہ جانے کب وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے لے گا۔ پہلے بھی کئی ڈاکٹروں سے علاج کروا چکے ہیں لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ صاف کہتا ہے، آپ لوگ کتنی بھی نگرانی کرلو، میں اپنی جان لے کر رہوں گا۔ میرے پاس اپنی پریمیکا کے بنا جینے کا کوئی کارن ہی نہیں ہے۔'' عورت اپنی بپتا سنا کر ایک بار پھر رونے لگی۔ احوال جاننے کے لیے سوال کرنے والی عورت اسے دلاسا دینے لگی۔

''میرے پتی کو کسی نے ڈاکٹر بٹ کے بارے میں بتایا تھا کہ بہت گیانی ڈاکٹر ہیں۔ ان کے کلینک پر آنے والا کوئی پیشنٹ بھی فائدہ اٹھائے بنا واپس نہیں لوٹا تو ہم اپنے بیٹے کو بھی یہاں لے آئے۔''

''یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ خدا نے چاہا تو آپ کا

بیٹا جلد شفایاب ہوجائے گا۔ ڈاکٹر بٹ واقعی بہت قابل ڈاکٹر ہیں بلکہ سچ کہوں تو وہ قابل سے زیادہ اللہ والے ہیں۔ اللہ کے بھروسے پر بگڑے سے بگڑا کیس لے لیتے ہیں اور پھر اللہ ہی کے سہارے مریض شفایاب بھی ہوجاتا ہے۔ میرا اپنا بھائی......" عورت اب اپنا قصہ شروع کرچکی تھی۔ لاشعوری طور پر وہاں جاری یہ گفتگو سنتے معاذ اور آغا گل کا دھیان اپنے نام پکارے جانے پر اس گفتگو کی طرف سے ہٹ گیا۔ انہیں ڈاکٹر ناصر بٹ کے کمرے میں جانے کا کہا جا رہا تھا۔ وہ دونوں جلدی سے متعلقہ کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

"السلام علیکم!" سادہ لیکن بے حد صاف ستھرے کمرے میں قدم رکھتے ہی انہیں سلام کی آواز سنائی دی۔ سامنے ہی گھومنے والی کرسی پر چالیس بیالیس کے قریب ایک روشن چہرے والا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی ذہین آنکھیں براہ راست ان دونوں کے چہروں پر ٹکی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پر بہت دھیمی سی خیر مقدمی مسکراہٹ تھی۔ مجموعی طور پر وہ ایسی شخصیت کا مالک تھا کہ دیکھنے والا پہلی نظر میں ہی اس کے لیے ایک خوشگواریت سی محسوس کرتا تھا۔

"وعلیکم السلام!" معاذ اور آغا گل نے بیک وقت گرمجوشی سے ڈاکٹر بٹ کے سلام کا جواب دیا پھر ان کے اشارے پر کرسیوں کی طرف بڑھے۔ معاذ، آغا گل کو کرسی پر بٹھا کر اپنے لیے کرسی کھسکا رہا تھا کہ ڈاکٹر بٹ کے ہاتھ اٹھا کر روکنے پر ٹھٹک کر رک گیا۔

"بہرام کے سلسلے میں مجھے جو کچھ ڈسکس کرنا ہوگا، آغا صاحب سے کرلوں گا۔ یہ ساتھ ریسٹ روم میں ایک صاحب ملاقات کے لیے آپ کے منتظر ہیں۔ بہتر ہوگا آپ ان سے ملاقات کرلیں۔" ڈاکٹر بٹ کے الفاظ اس کے لیے حیرت انگیز تھے۔

"آغا جان......!" اس نے بے ساختہ ہی مستفسرانہ انداز میں آغا گل کو پکارا۔

"وقت ضائع نہ کرو برخوردار! تمہاری ضد پوری کرنے کے لیے ہم سے جو کچھ بن پڑا ہے، کر گزرے ہیں۔" انہوں نے شفیق سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی پکار کا جواب دیا تو وہ بھی کھل کر مسکرایا اور تیزی سے اس بند دروازے کی طرف بڑھ گیا جس کی طرف ڈاکٹر بٹ نے نظروں سے اشارہ کیا تھا۔

☆☆☆

"کیا حال کرلیا ہے اپنا؟" اس نے بستر پر نڈھال لیٹی مومل کے بالوں میں نرمی سے انگلیاں چلاتے ہوئے اسے محبت سے ٹوکا۔ مومل کو انتہائی نگہداشت میں رکھا گیا تھا اور ایک ایک کرکے ہی سب کو ملاقات کی اجازت دی جا رہی تھی۔ سکینہ شاہ اور صداقت شاہ اس سے ملاقات کرکے آچکے تھے اور اب سنبل کی باری آچکی تھی۔ نیلی اس کی وہیل چیئر کو مومل کے بیڈ کے قریب چھوڑ کر خود باہر نکل گئی تھی اور اب دونوں بہنیں وہاں تنہا تھیں۔

"یہ سوال تو مجھے آپ سے کرنا چاہیے ادی! اس حال میں تو ہم نے آپ کو پاکستان سے روانہ نہیں کیا تھا۔" مومل نے اس سے گلہ کیا تو اس کی آنکھوں میں بہن کے لیے گہرا دکھ تھا۔ وہ کیسے سوچ سکتی تھی کہ ایک دن بہن کو یوں حال سے بے حال وہیل چیئر کا محتاج دیکھے گی۔

"زندہ واپس آگئی ہوں، اس پر شکر ادا کرو ورنہ برین ٹیومر نے جس طرح اپنے پنجے گاڑے تھے، قابل ترین ڈاکٹرز میری زندگی سے مایوس ہوچکے تھے۔ میرا زندہ بچ جانا میرے رب کی قدرت کا ایک کرشمہ اور پیار کرنے والوں کی دعاؤں کا ثمر ہے۔" سنبل نے مسکرا کر اسے بتایا۔

"آپ میں سے کسی نے بھی مجھے آپ کی بیماری کے بارے میں زیادہ تفصیل سے نہیں بتایا تھا۔ گھر کی چھوٹی ہوں تو سب نے مجھے بالکل بچہ ہی سمجھ لیا ہے۔" مومل نے منہ بنا کر شکوہ کیا۔ ڈاکٹرز نے اسے پین کلر کی بھاری مقدار دی تھی اس لیے اس وقت وہ اس لائق تھی کہ اپنے پیاروں سے آرام سے ملاقات کر رہی تھی۔

"تم دادی، نانی بھی بن جاؤ تو ہمارے لیے بچی ہی رہوگی۔ پتا نہیں تمہیں یاد بھی ہے کہ نہیں کہ کیسے میں اور ادا سائیں تمہیں گود میں اٹھائے پھرتے تھے۔ ادا سائیں کو تو تم جب چاہے گھوڑا بنا کر ان کی پیٹھ پر سواری کرنے بیٹھ جاتی تھیں۔" ماضی کی خوشگوار یادیں سنبل کی آنکھوں میں جھلملا رہی تھیں۔

"کیسے بھول سکتی ہوں میں آپ دونوں کا وہ لاڈ پیار۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ نے اور ادا سائیں نے اماں اور بابا سائیں سے بڑھ کر میرے لاڈ اٹھائے ہیں۔" مومل کے نقاہت زدہ چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی پھر ذرا چونک کر پوچھنے لگی۔

"یہ ادا سائیں کہاں ہیں؟ میرے پاس آئے کیوں نہیں؟"

"بس آتے ہی ہوں گے۔ انہیں ائیرپورٹ سے ہی ایک ضروری کام سے روانہ ہونا پڑا تھا لیکن فکر نہیں کرو، وہ بس پہنچتے ہی ہوں گے۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہارا

آپریشن کتنے بجے شروع ہونا ہے۔ تمہارے آپریشن تھیٹر میں جانے سے پہلے پہلے وہ یقیناً پہنچ جائیں گے۔" تجل کو خود بھی عالم شاہ اور سرمد کی طرف سے پریشانی تھی لیکن موّل کو تسلی دیتی رہی۔

"وہ ادا سائیں کا رائٹ ہینڈ سرمد بھی انہی کے ساتھ گیا ہے کیا؟" موّل نے اچانک پوچھا۔

"یہ تو طے شدہ ہے۔ جانتی ہو نا کہ وہ کبھی ادا سائیں کو اکیلا نہیں چھوڑتا۔"

"لیکن احمق کسی اور کو تو تنہا چھوڑ گیا تھا۔"

"کس کی بات کر رہی ہو؟" تجل نے ناسمجھی سے پوچھا۔

"سرمد کی منگیتر کی۔ بے چاری دو تین بار بہانے سے اس کی خیریت معلوم کرنے حویلی آئی تھی۔ بڑی پیاری لڑکی ہے۔ سرمد کے لیے بہت اداس اور پریشان تھی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ فکر نہ کرو، سرمد صحیح سلامت آجائے گا اور جب آجائے گا تو ہم سب سے پہلا کام ان دونوں کے بیاہ کا کریں گے۔" موّل نے شوخی سے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"تم خدیجہ کی بات کر رہی ہو نا؟ وہی جو لطیف سومرو کی حویلی میں کام کرتی تھی اور جس نے سرمد کے کہنے پر ہمیں بعض اہم معلومات بھی فراہم کی تھیں۔" تجل نے استفسار کیا۔

"ہاں ہاں، وہی خدیجہ! آئی تھی تو بتا رہی تھی کہ سومرو خاندان کا بہت برا حال ہے۔ باپ بیٹے کو قدرت کی جو مار پڑی سو پڑی، باقی خاندان کو بھی بھگتنا پڑ رہا ہے۔ ان کے ہاں کوئی بالغ مرد نہیں ہے جو جائداد اور حویلی کے معاملات کی نگرانی کر سکے۔ موقع کا فائدہ اٹھا کر سومرو کا ایک کزن مدد کے بہانے ہر شے پر قابض ہو گیا ہے اور حویلی کی عورتوں اور بچوں کو اپنی ضروریات کے لیے ترس ترس کر کچھ مل پاتا ہے۔" موّل نے اسے سومرو خاندان کے حالات سے آگاہ کیا۔

"اللہ رحم کرے ان پر۔ انسان طاقت کے نشے میں بھول جاتا ہے کہ اس کے اعمال کی فصل اس کے ساتھ ساتھ اس کی آل اولاد کو بھی کاٹنا پڑے گی۔" دشمنوں کا برا حال جان کر اس کے دل کو کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی بلکہ اندر ایک اداسی سی اتر آئی تھی۔

"ادا سائیں آئے نہیں ابھی تک؟" موّل کو پھر بھائی کی یاد نے ستایا۔

"معلوم کرتی ہوں۔" تجل ہاتھ میں پکڑے موبائل کی طرف متوجہ ہوئی لیکن اسی وقت ایک نرس اور نیلی آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"ٹائم ہو گیا ہے۔ ہمیں پیشنٹ کو اوٹی میں لے جانے کے لیے تیار کرنا ہے۔" نرس نے اطلاع دی۔

"ادا سائیں......؟" موّل نے گویا سوال کیا۔ تجل کی سوالیہ نظر بس بھی نیلی کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ جواباً صرف سر کو نفی میں جنبش دے کر رہ گئی۔

"کوئی بات نہیں۔ تم اللہ کا نام لے کر آپریشن کے لیے جاؤ۔ ادا سائیں یقیناً کہیں پھنس گئے ہوں گے۔ ان شاء اللہ تمہارا آپریشن ہونے تک واپس آجائیں گے پھر تم ان سے مل لینا۔" اندر سے اس کا اپنا دل عالم شاہ کے نہ پہنچنے پر گھبرا رہا تھا لیکن موّل کو تسلی، دلاسے دے کر آپریشن کے لیے جانے پر آمادہ کر لیا۔ اس صورتِ حال میں خاموش کھڑی نیلی اس کی طرف سے اشارہ ملنے پر اس کی وہیل چیئر دھکیل کر باہر لے آئی۔

"میرا دل بہت گھبرا رہا ہے نیلی! ادا سائیں کو اب تک آجانا چاہیے تھا۔" باہر نکلنے کے بعد اس نے نیلی کے سامنے اپنے خوف کا اظہار کیا۔

"اللہ سب خیر کرے گا، بس اللہ سے دعا کریں۔ شاہ سائیں کئی بار ان سے رابطے کی کوشش کر چکے ہیں لیکن کال نہیں لگ رہی۔" نیلی اصل میں خود تشویش میں مبتلا تھی۔

"یارب! ہم تیرے بڑے حقیر اور کمزور بندے ہیں۔ ہم پر رحم کر اور ہمیں مزید آزمائش سے بچالے۔" تجل نے دل ہی دل میں بڑی رقت سے رب کو پکارا اور خود بخود ہی دل پر سکینت سی اترتی محسوس کی۔ اس کیفیت کا ہی اثر تھا کہ جب وہ اماں اور بابا سائیں کے پاس پہنچی تو اس کے چہرے کے تاثرات بالکل نارمل تھے۔

"موّل کو اوٹی میں لے جا رہے ہیں۔ معمولی سا آپریشن ہے۔ ان شاء اللہ جلدی نمٹ جائے گا۔" اس نے اطلاع کے ساتھ ساتھ انہیں تسلی بھی دی۔

"اللہ سائیں خیر رکھے اور میرے بچوں کو آزمائشوں سے نکال لے۔" سکینہ شاہ نے بھیگی ہوئی آواز میں دعا مانگی۔

"آمین یارب العالمین!" قربان شاہ نے ان کی دعا پر سب سے پہلے بہ آوازِ بلند کہا۔ وہ ملازمین کی طرف سے اطلاع ملنے پر ان لوگوں سے پہلے اسپتال پہنچے ہوئے تھے اور ان لوگوں کے ساتھ اپنے پوتے اعظم کو دیکھ کر نہال ہو گئے تھے۔ اعظم بھی حیرت انگیز طور پر فوراً ہی ان کے ساتھ گھل مل گیا تھا اور اس وقت بھی انہی کی گود میں بیٹھا ہوا تھا۔

"میں دوبارہ عالم کا نمبر ملاتا ہوں۔" صداقت شاہ

نے جیب سے اپنا موبائل نکالا۔ پاکستان کی حدود میں قدم رکھتے ہی ان سب کے سابقہ نمبر ایکٹو ہو گئے تھے اس لیے کال کرنے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔

''پتا نہیں کہاں ہے؟ بیل جا رہی ہے لیکن کال ریسیو نہیں کر رہا۔'' نمبر ملانے کے بعد وہ کچھ دیر موبائل کان سے لگائے بیٹھے رہے پھر مایوس ہو کر کال کاٹ دی۔ اسی وقت ان کے موبائل پر کال آنے لگی۔ نامانوس نمبر سے آنے والی کال ریسیو کرتے ہوئے جانے کیوں ان کے ہاتھ لرزنے لگے۔ دوسری طرف سے کال کرنے والے نے پہلے اپنا تعارف کروایا پھر ان کے بارے میں تصدیق چاہی کہ آیا وہ عالم کے والد صداقت شاہ ہیں یا نہیں؟ ان کی طرف سے تصدیق کیے جانے پر دوسری طرف سے جو اطلاع دی گئی، وہ لرزا دینے والی تھی۔

☆☆☆

''اور یہ ہے دیوارِ گریہ یا Western Wall جسے ہم مسلمان دیوارِ براق بھی کہتے ہیں۔'' آج وہ لوگ Trifurcation of faith سے بالکل سیدھے چلتے چلے آئے تھے اور نتیجتاً دیوارِ گریہ تک پہنچ گئے تھے۔ ان کے سامنے یہودی کی ایک کثیر تعداد اپنے سروں پر مخصوص ٹوپی کپاہ (kipah) اور بازوؤں میں تفلن (Tefflin) پہنے عبادت میں مصروف تھی۔ کوئی دیوار پر ہاتھ رکھے گریہ و زاری کر رہا تھا تو کوئی اپنے سامنے رکھی تورات اور تالمود کو ہل ہل کر پڑھنے میں مصروف تھا۔

''یہ کتنی عظیم الشان دیوار ہے اور بے شک میں یہودی نہیں ہوں لیکن اس کے لیے دل میں ایک عقیدت سی محسوس کر رہی ہوں۔'' ماہ بانو بڑے بڑے پتھروں سے تعمیر کی گئی دیوار پر اپنی پُر اشتیاق نظریں جمائے بے ساختہ ہی بولی تو شہر یار مسکرا دیا اور نرمی سے بولا۔

''عقیدت تو محسوس ہونی ہی ہے۔ آخر ہمیں بھی تو نسبت ہے اس دیوار سے۔ روایات کے مطابق معراج کے وقت نبی کریم ﷺ اپنے براق کے ساتھ یہاں اترے تھے اور یہیں براق کو باندھا تھا۔''

''کاش ہم ایک دوسرے کے عقائد کا احترام کرتے اور کوئی ایسی صورت نکال لیتے کہ آپس میں الجھے بغیر اپنے اپنے مقدس مقامات پر آزادانہ آ جا سکیں۔'' وہ اپنی نظروں سے دیوار کی طوالت ناپتے ہوئے حسرت سے بولی۔ یہ دیوار 485 میٹر طویل تھی اور اس کی بلندی 19 سے 40 میٹر کے درمیان تھی۔

''انسان کی فطرت میں اتنی صلح جوئی ہو تو پھر جھگڑا کس بات کا۔ یہ ہماری ''میں'' ہی تو ہے جس نے زمین پر فساد برپا کر رکھا ہے۔''

''یہ تو ہے۔'' ماہ بانو نے اس کی تائید کی اور پُر اشتیاق نظروں سے اردگرد دیکھنے لگی۔ ہر طرف انسانوں کا ایک ہجوم سا تھا۔

''بہت رش ہے، کیا یہاں ہمیشہ ہی اتنا رش ہوتا ہے؟''

''آج شبات یعنی یوم سبت ہے اور اہل یہود کی اکثریت اس دن کا زیادہ حصہ دیوارِ گریہ پر گزارنا پسند کرتی ہے۔'' شہر یار نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ماہ بانو کے مقابلے میں اسے معلوماتِ عامہ سے زیادہ دلچسپی تھی اور موقع ملنے پر وہ یہ معلومات اس سے شیئر بھی کرتا تھا، اب بھی بتانے لگا۔

''شبات تقریباً 26 گھنٹوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جمعے کو سورج ڈھلنے پر اس کا آغاز ہوتا ہے اور ہفتے کی رات آسمان پر تین ستاروں کے نظر آنے تک جاری رہتا ہے۔ اس روز اہلِ یہود کاروبار نہیں کرتے۔ پیسوں کا لین دین کرنا تو دور، ذکر بھی نہیں کرتے۔ گھر کی بتیاں جو جل رہی ہوں، انہیں بجھاتے نہیں اور جو بجھی ہوئی ہوں، انہیں جلاتے نہیں۔ اس روز گھر کا چولہا بند رہتا ہے۔ سفر نہیں کرتے اور سر پر کپاہ پہنے زیادہ تر وقت عبادت میں گزارتے ہیں۔''

''مگر ہمارے میزبان مسٹر ایڈمنڈ تو یہ سب کرتے دکھائی نہیں دیے۔ آج یہاں آنے سے پہلے بھی انہوں نے ہمیں خاصا پُرتکلف ناشتا کروا کر بھیجا ہے اور یقیناً اس کی تیاری کے لیے انہیں چولہا جلانا پڑا ہوگا۔''

''بھئی باغی اور منکر تو ہر مذہب کے پیروکاروں میں ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں ہی دیکھ لو کہ کتنے لوگ بنا کسی شرعی عذر کے نماز اور روزے چھوڑ دیتے ہیں بلکہ بعض تو اتنے ڈھیٹ ہوتے ہیں کہ رمضان میں بھی سرعام کھانے پینے کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔'' شہر یار پہلے اس کی بات سن کر ہنسا پھر دلیل دی۔

''یہ بھی ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔'' وہ فوراً قائل ہو گئی۔

''میں زیادہ تر ٹھیک ہی کہتا ہوں۔'' اس نے خوامخواہ کالر کھڑے کیے۔

''لیکن سب کچھ نہیں کہتے۔'' ماہ بانو نے اسے کن انکھیوں سے دیکھا۔

''کیا مطلب؟'' اس نے حیرانی ظاہر کی۔

''ہم روزانہ اٹھ کر گھومنے کیوں نکل کھڑے ہوتے ہیں؟'' وہ واقعی الجھن میں تھی کہ ابھی تک انہوں نے کوئی ایسا اقدام کیوں نہیں کیا تھا جس سے ان کی یہاں آمد کا مقصد پورا ہوتا یا کم از کم کوئی پیش رفت ہی ہو پاتی۔

''ہم یہاں گھومنے ہی تو آئے ہیں۔ کام دھام کے لیے تو زندگی پڑی ہے۔'' شہریار کا جواب اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔

''لیکن......''

''کوئی لیکن ویکن نہیں یار! ہم نے اتنی زندگی کمانے اور محنت کرنے میں گزاری ہے۔ میں چاہتا ہوں ہم یہ ٹرپ ریلیکس رہ کر بالکل کسی آزاد سیاح کی طرح انجوائے کریں۔ میں صبح اٹھ کر چند shekel (اسرائیلی کرنسی) کمانے کے لیے محنت مزدوری نہیں کرنا چاہتا۔'' شہریار نے اسے ''لیکن'' کے آگے کچھ نہیں بولنے دیا تو اسے یکدم ہی احساس ہوا کہ وہ ایک بڑی غلطی کرنے جا رہی تھی۔

''ٹھیک ہے جناب! یہاں آپ باس ہیں۔ یہاں آپ جو کہیں گے وہی ہوگا لیکن واپس جا کر میں چارج دوبارہ اپنے ہاتھوں میں لے لوں گی اور بچت کے سارے طریقے استعمال کروں گی پھر شکایت مت کیجیے گا کہ میں کھانے میں گوشت کم اور گھاس پھونس زیادہ کھلاتی ہوں۔'' اب وہ اپنی غلطی کو کور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''واپس جا کر کیا ہوگا، یہ تو واپس جا کر ہی دیکھیں گے۔ فی الحال تو آؤ اس یادگار دیوار کے سامنے ایک سیلفی بناتے ہیں۔'' اس نے ماہ بانو کو اپنے ساتھ کھڑا کر لیا اور سیلفی لینے لگا۔

''مزہ نہیں آرہا یار! اس جگہ تو فل پکچر ہونی چاہیے۔'' ایک دو سیلفیز لینے کے بعد اس کا موڈ بدل گیا اور یوں نظریں ادھر ادھر گھمانے لگا جیسے تصویر کھنچوانے کے لیے کوئی موزوں بندہ تلاش کر رہا ہو۔

''ایکسکیوزمی!'' آخر کار اس نے کپاہ پہنے ایک پینتیس چالیس سالہ شخص کو منتخب کر کے اسے مخاطب کر ہی لیا۔

''آپ مجھ سے کچھ کہہ رہے ہیں؟'' وہ شخص کچھ حیران سا ان کی طرف متوجہ ہوا۔

''جی...... میں چاہتا ہوں اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو آپ ہم میاں بیوی کی ایک مکمل اور اچھی سی فوٹو بنا دیں۔'' اس نے اس شخص سے اپنا مدعا بیان کیا۔

''اوہ، ضرور۔ کیوں نہیں۔'' وہ فوراً راضی ہو گیا اور اس کے ہاتھ سے موبائل لے کر ان کے پسندیدہ زاویے سے تصویر بنانے لگا۔

''میرے خیال میں ایک اچھی پکچر بن چکی ہے۔ آپ چیک کرلیں۔ اگر آپ کو پسند نہیں آئی تو میں دوسری بنا دوں گا۔'' تصویر لینے کے بعد اس نے موبائل اسکرین ان دونوں کے سامنے کی۔

''بہت عمدہ۔ یہ ایک خوبصورت تصویر ہے۔ میں آپ کو مشورہ دینا چاہوں گا کہ آپ جو بھی کام کرتے ہیں، اسے چھوڑ کر فوٹوگرافی شروع کر دیں۔ آپ اپنی موجودہ فیلڈ کے مقابلے میں اس فیلڈ میں زیادہ کامیاب رہیں گے۔'' شہریار نے ہاتھ بڑھا کر اس شخص سے موبائل لے لیا اور ایک عام سی تصویر کی یوں تعریفیں کرنے لگا جیسے کوئی شاہکار تخلیق پا گیا ہو۔ اس کی اس حرکت پر ماہ بانو کے لیے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ وہ شخص کون ہے۔

''تھینک یو سوچ۔ میں آپ کے اس مشورے کو یاد رکھوں گا اور مستقبل میں کبھی جاب چینج کرنے کا ارادہ ہوا تو اسے ضرور آزماؤں گا۔'' وہ خوش مزاجی سے بولا اور پھر بڑے دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے اپنا تعارف کرواتے ہوئے بولا۔

''میں جمی ہوں، جمی واکر! میرے خیال میں آپ سیاح ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں ایک مقامی ہونے کی حیثیت سے یروشلم ایکسپلور کرنے میں آپ کی بھرپور معاونت کر سکتا ہوں۔''

''تھینک یو سوچ جمی! یہ آفر تو ہمیں ہمارے میزبان کی طرف سے بھی حاصل ہے لیکن ایک اچھا سیاح ہمیشہ مقامات کو خود ایکسپلور کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔'' اس نے بہت سلیقے سے اس کی پیشکش کو رد کر دیا۔

''اوہ...... یعنی میں ایک اچھا دوست بنانے کا موقع گنوا رہا ہوں۔'' اس نے بھی بہت طریقے سے نیا جال پھینکا۔

''میرے والد صاحب کی نصیحت تھی کہ سفر میں دوست اور دشمن دونوں ہی مت بنانا ورنہ تکلیف ہوگی۔ ان کے مطابق سفر بس اس لیے ہوتا ہے کہ آپ کچھ خوشگوار یادیں اپنی یادداشت میں جمع کر سکیں۔ اس میں نہ دشمنی کی تلخی ہونی چاہیے اور نہ ہی بچھوڑے کا غم۔'' وہ اس کے جال میں پھنسنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''اوکے، ایز یو وش۔ بہرحال آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' آخر کار اسے ہتھیار ڈالنا پڑے اور شہریار سے مصافحہ کر کے وہاں سے ہٹ گیا۔

''ایڈیٹ!'' اس کے دور چلے جانے کے بعد شہریار

زیرِلب بڑبڑایا۔

"کر لیتے دوستی۔ بے چارہ سہولت سے ساتھ ساتھ رہ لیتا۔" ماہ بانو نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے معصومیت سے کہا۔

"جس کے ساتھ تم ہو، اسے کسی دوست یا دشمن کی بھلا کیا ضرورت۔" شہریار نے اس سے بھی زیادہ معصومیت کا مظاہرہ کیا اور اس کا ہاتھ تھام کر ہجوم میں آگے بڑھ گیا۔

اب وہ مغرب کی طرف ایک تنگ راستے کی جانب بڑھ رہے تھے اور اس گلی میں جانے کا ارادہ رکھتے تھے جسے مسلمان البراق ایلی کے نام سے پکارتے ہیں۔ دیوارِ گریہ کے سامنے مناجات اور آہ وزاری کرتے، اس کی درزوں میں اپنی حاجات پر مشتمل کاغذ اڑستے، اہلِ یہود سمیت وہ جاسوس بھی کہیں پیچھے رہ گیا تھا جو ایک مسلمان جوڑے کی یروشلم میں موجودگی کی "اصل" وجہ کھوجنے کے لیے ان کے پیچھے تھا۔

☆☆☆

"جارو!" ریسٹ روم میں ملاقات کے لیے موجود شخص کو دیکھ کر وہ بیک وقت حیرت و مسرت کا شکار ہوا۔

"تم اتنی شدت سے مجھے یاد کر رہے تھے تو مجھے ملاقات کے لیے آنا ہی پڑا۔" حکیم جبار علی عرف جارو نے مسکراتے ہوئے اسے گلے لگالیا۔ اس نے اپنی ڈاڑھی اور مونچھوں کو ترشوا کر ترتیب میں کر لیا تھا اور اس معمولی سی تبدیلی سے اس کی شخصیت کا تاثر بدل گیا تھا۔ اس تبدیلی میں آنکھوں پر لگی سنہری فریم والی نفیس سی عینک کا بھی خاصا دخل تھا۔ اس پر پہلی نظر پڑتے ہی کسی پڑھے لکھے معزز آدمی کا گمان ہوتا تھا اور کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ شخص ایک ایسا خطرناک لڑاکا ہے جو کسی جنگلی جانور کی سی خو بو رکھتا ہے۔ اس کی غیر معمولی سماعت کا معاذ خود گواہ تھا۔ غیر معمولی قوتِ سماعت کے ساتھ ساتھ جارو غیر معمولی قوتِ برداشت کا بھی مالک تھا اور جسمانی تشدد کے ساتھ ساتھ موسم اور ماحول کی سختیاں جھیلنے کی بھی بے پناہ صلاحیت رکھتا تھا۔

"بروقت آمد کا شکریہ۔ یقین کرو اگر تم نہیں آتے تو میرے اندر کی گھٹن میرے ضبط کو توڑ دیتی اور میں کوئی ایسا قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاتا جس کے نتائج یقیناً اچھے نہ نکلتے۔"

"تمہیں اس جذباتیت سے گریز کرنا چاہیے۔ تم جانتے ہو کہ تمہاری منزل کوئی اور ہے۔" جارو نے اسے سمجھایا۔

"طریقہ کوئی بھی ہو، اصل مقصد تو امتِ مسلمہ کے کام آنا ہی ہے نا۔ یہاں میری موجودگی میں ایک بے گناہ خاندان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا ہے اور اس خاندان کا بچ جانے والا واحد معصوم و مظلوم بچہ اس حالت میں ہے کہ اسے دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ تم یقین کرو، بہرام کو انصاف دلائے بغیر میں چین کی نیند نہیں سو سکتا۔"

"یہ کام تو ہم بھی کر سکتے ہیں۔"

"بے شک کر سکتے ہو لیکن اس طرح مجھے اپنے کندھوں پر چڑھے قرض کو اتارنے کا موقع نہیں ملے گا، نہ ہی وہ گھٹن کم ہو گی جس نے مجھے جیتے جی مار دیا ہے۔" اس پر واقعی بہت بوجھ تھا اور یہ بات ذہن سے نکلتی ہی نہیں تھی کہ پری وش کے خاندان کی تباہی میں کہیں نہ کہیں اس کی ذات ملوث ہے۔ یہ وہ تھا جس کی خاطر اس رات پری وش گھر سے باہر نکلی تھی اور اس وحشیانہ کھیل کا آغاز ہوا تھا جس میں کئی افراد کی ہلاکت کے باوجود کھیل ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا۔

"اتنی حساسیت اچھی نہیں ہوتی دوست!" جارو نے ایک سرد آہ بھری۔

"بے حسوں میں شامل ہونے کے مقابلے میں یہ کہیں بہتر ہے۔"

"کیا کرنا چاہتے ہو تم؟" جارو نے اسے غور سے دیکھا۔

"ظالم کے ہاتھ توڑنا۔"

"تمہاری یہی ضد ہے تو تیاری پکڑ لو۔ ہم بہت جلد مہندر سنگھ کو اس کے انجام تک پہنچانے والے ہیں۔ سارا منصوبہ تیار ہے، بس عملدرآمد ہونا باقی ہے۔" جارو دبی آواز میں اسے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔

"منتظر رہنا، ہم آج ہی کی رات اس خبیث کو اس کے انجام تک پہنچا دیں گے۔" ساری تفصیل بتا چکنے کے بعد جارو روانگی کے لیے تیار دکھائی دینے لگا اور اس سے مصافحہ کر کے ایک اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے اس دروازے کے پیچھے غائب ہونے کے بعد معاذ بھی اٹھ کر ڈاکٹر بٹ والے کمرے میں واپس آگیا۔ ڈاکٹر بٹ نے اس کی طرف خوشدلانہ مسکراہٹ اچھالی اور دوبارہ آغا گل کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"آپ بے فکر ہو جائیں بڑے صاحب! ان شاءاللہ آپ کا بچہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا لیکن آپ کو کچھ دن اسے یہاں داخل کرنا پڑے گا اور اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک اٹینڈنٹ کو بھی یہاں چھوڑنا ہوگا۔"

"اس کا کوئی مسئلہ نہیں ڈاکٹر صاحب! میں رک جاؤں گا بہرام کے ساتھ۔"

"بہت شکریہ مسٹر عمار! اصل میں ہمارے کچھ اسٹاف ممبران دنوں چھٹیوں پر ہیں اس لیے ہمیں آپ کو زحمت دینا

پڑ رہی ہے۔'' ڈاکٹر کا انداز معذرت خواہانہ تھا۔ معاذ نے اسے رشک سے دیکھا۔ وہ جتنا اچھا ڈاکٹر تھا، اتنا ہی اچھا ایکٹر بھی تھا اور بہت خوبصورتی سے اس کے وہاں رکنے کا جواز تراش لیا تھا۔

☆☆☆

''ہیلو سویٹی!'' سنائی دینے والی اس مردانہ پکار پر اس نے بڑی جدوجہد کے بعد اپنی گردن کو جنبش دی اور رخ موڑ کر اس مرد کی طرف دیکھا جس کے ہاتھوں میں آج کل اس کی زندگی کا چارج تھا۔

''کیا ہوا، مجھے پہچانا نہیں؟ میں جارج ہوں، تمہارا سابق عاشق اور موجودہ میزبان۔'' اس کی آنکھوں میں اجنبیت کا تاثر دیکھ کر وہ اپنا بڑا سا منہ پھاڑ کر زور سے ہنسا اور اپنا تعارف کروانے لگا۔

''میں بیٹھنا چاہتی ہوں۔'' جارج کی کسی بھی بات کا جواب دیے بغیر اس نے اپنی خواہش بیان کی۔ اس وقت وہ اسٹریچر نما سخت بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ پیر اسٹریچر کے ساتھ منسلک چمڑے کی بیلٹوں سے بندھے ہوئے تھے۔ اسے اس بستر پر ایک ہی حالت میں لیٹے ہوئے گھنٹوں گزر چکے تھے لیکن وہ کروٹ لینے جیسی معمولی خواہش پوری کرنے سے بھی قاصر تھی۔

''وائے ناٹ ڈارلنگ! مجھے تمہاری خدمت کر کے خوشی محسوس ہو گی۔'' جارج کا انداز چسکا لینے والا تھا اور وہ گویا اس کی بے بسی سے لطف لے رہا تھا۔ اس نے جواباً کچھ نہیں کہا اور ہونٹ بھینچے خاموش بیٹھی رہی۔ کسی کم ظرف کو جواب دینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

''تمہاری ٹانگیں آج بھی اتنی ہی خوبصورت ہیں کہ کسی کا بھی ایمان خراب کر سکتی ہیں۔'' ٹانگوں پر بندھی بیلٹ کھولنے کے بعد اس کی بے جان ہو جانے والی ٹانگوں کا مساج کرنے کے بہانے اس نے انہیں خوب اچھی طرح ٹٹولا۔ اسے جدید انداز کے جس تشدد سے گزارا گیا تھا، یہ بے جان ٹانگیں اس کا تحفہ تھیں۔ دیکھنے میں اس کے جسم پر ایک خراش تک نہیں تھی لیکن یہ صرف وہی جانتی تھی کہ میڈم ایکس کے منتخب کردہ اس وحشی نے اس کی زبان کھلوانے کے لیے کتنی بربریت کا مظاہرہ کیا تھا۔ شاید اصل مقصد زبان کھلوانا تھا بھی نہیں اور وہ موقع ملنے پر ماضی کی اس بے عزتی کا بدلہ لے رہا تھا جو اس نے سونیا کے ہاتھوں رد ہونے کے باعث اٹھائی تھی۔

''کتنی مغرور ہوا کرتی تھیں تم نوجوانی میں۔ کسی حقیر کتے کی طرح تم نے میری محبت کو ٹھکرا دیا تھا۔ آج اپنا حال دیکھو۔ کسی بے بس چوہیا کی طرح میرے سامنے پڑی ہو۔ میں اگر چاہوں تو تمہارے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

''فی الحال تو تم مجھے اٹھا کر بٹھا دو۔''

''آج بھی وہی طنطنہ ہے۔'' سونیا کے بیزار لہجے پر اسے غصہ آنے لگا تاہم اس نے اسے سہارا دے کر بٹھا دیا۔

''میں آج بھی ہولی گولڈن اسٹار کی رکن ہوں اور میری ماں تنظیم کے سرکردہ لوگوں میں سے ایک ہے اس لیے میرا یہ انداز جائز ہے۔'' بے شک وہ اپنی مرضی سے حرکت کرنے کے قابل نہیں تھی لیکن لہجہ مضبوط اور باوقار تھا۔

''معتوب رکن...... جسے اس کی ماں نے خود زبان کھلوانے کے لیے میرے حوالے کیا ہے۔'' جارج استہزائیہ ہنسا۔

''کبھی کبھی انسان کو آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ مجھ پر بھی یہی وقت آیا ہوا ہے لیکن تم دیکھنا کہ میں اس دور سے گزر جاؤں گی اور جلد وہ وقت دوبارہ آ جائے گا جب تم جیسے میرے حکم پر دم ہلاتے پھریں گے۔'' اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

''یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔''

''نہیں، خود پر یقین۔'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

''میری مانو تو میرے ساتھ ڈیل کر لو۔''

''کیسی ڈیل؟'' وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور اسے گھورا۔

''میری خواہش پوری کر دو، میں تمہارے لیے اوکے کی رپورٹ دے دوں گا۔'' جارج کی آفر پر اس کا دل بری طرح دھڑکا۔ یہ بات اس کے ذہن میں بھی تھی۔ ماضی میں وہ اپنے حسن و جوانی کے بدلے کئی کامیاب سودے بھی کر چکی تھی۔ اس کے حسن کی قیمت پر بڑے بڑے مسائل چٹکی بجاتے حل ہو جاتے تھے۔ وہ جانتی تھی جارج سے بھی یہ سودا ہو سکتا ہے۔

''کیا کہتی ہو؟'' جارج اس کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

''نہیں......'' سونیا نے پہلے ایک گہرا سانس لیا پھر گردن نفی میں ہلاتے ہوئے صاف انکار کر دیا۔ اس پر ابھی یہ انکشاف ہوا تھا کہ اب وہ ایسا کچھ نہیں کر سکتی۔ جب وہ تنظیم کے مفاد میں یہ سب کر گزرتی تھی تو اس کے ذہن میں یہ بات ہوتی تھی کہ وہ اپنی جاب کر رہی ہے اور کسی بڑے

مقصد کے حصول کے لیے یہ چھوٹی سی قربانی دی جاسکتی ہے لیکن یہ تب کی بات تھی جب اس کا دل کسی کا اسیر نہیں تھا۔ دل اسیر ہوجائے تو انسان پر کچھ پابندیاں خودبخود ہی نافذ ہوجاتی ہیں۔ اس کے دل نے بھی اسے بتادیا تھا کہ بے شک معاذ احمد اس کے لیے قابل حصول نہیں ہے لیکن اسے چاہنے کے بعد خود وہ بھی کسی کو ''حاصل'' نہیں رہی ہے۔ محبت سب سے پہلے انسان کو وفاداری سکھاتی ہے اور اس کی ساری وفاداریاں بھی اب معاذ کے ساتھ تھیں۔

''سوچ لو، میں یہ آفر دوبارہ نہیں کروں گا۔'' جارج کو اس کے انکار نے حیران کیا تھا۔

''یہ آفر میں اس صورت میں قبول کرتی جب میں نے کچھ غلط کیا ہوتا۔ اس وقت میرے ساتھ سچ کی طاقت ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میں نے تنظیم کے ساتھ کوئی دھوکا، کوئی غداری نہیں کی۔ مجھ سے جو بھی غلطیاں ہوئیں، وہ غیر ارادی تھیں اور صرف اور صرف اس وجہ سے سرزد ہوئیں کہ میرا دماغ میرے اپنے کنٹرول میں نہیں تھا۔''

''تمہارا تو دل بھی تمہارے کنٹرول میں نہیں تھا اور تم اس یونیورسٹی کے لڑکے پر فدا ہوچکی تھیں۔'' جارج کے پاس اس کے متعلق ساری معلومات تھیں چنانچہ آرام سے طنز کیا۔

''مجھے اس بات سے انکار نہیں ہے کہ میرے دل میں معاذ کے لیے فیلنگز تھیں لیکن فیلنگز ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اس کی خاطر تنظیم سے غداری کرجاتی۔ تنظیم ہر صورت میرے لیے پہلے نمبر پر ہے۔ مجھ پر میری فیلنگز کے حوالے سے طنز کرتے ہوئے یہ بات یاد رکھو کہ ماضی میں، میں تنظیم کی خاطر اپنا آپ ان لوگوں کے حوالے بھی کرچکی ہوں جن سے مجھے کراہیت محسوس ہوتی تھی۔ داراب خان سے میری شادی یاد ہے تمہیں......؟ کوئی بھی کیسے یہ بات بھول سکتا ہے کہ صرف اور صرف تنظیم کے مفادات کی خاطر میں نے اس موٹے، بھدے اور عمر دراز گینڈے کی بیوی بننا قبول کرلیا تھا۔'' بولتے بولتے وہ خاصی جذباتی ہوگئی تھی۔

''جب اس گینڈے کو برداشت کرلیا تھا تو مجھے کیوں قبول نہیں کرسکتیں؟ صرف چند گھنٹوں کے عوض میں تمہیں آزادی کی آفر کررہا ہوں۔'' جارج اپنے مطالبے پر اڑا ہوا تھا۔

''کیونکہ داراب کو میں نے تنظیم کی خاطر قبول کیا تھا اور تم مجھ سے جو مطالبہ کررہے ہو، وہ ہم دونوں کو تنظیم کا غدار بنادے گا۔ یاد رکھو، میں موقع ملنے پر کسی ذمے دار سے تمہاری اس حرکت کی شکایت ضرور کروں گی۔ تم جیسی کالی بھیڑوں کی نشاندہی بہت ضروری ہے۔ جو شخص اپنی ایک خواہش کے حصول کے لیے اس حد تک جاسکتا ہے، وہ آئندہ تنظیم کو کوئی بڑا نقصان بھی پہنچاسکتا ہے۔'' وہ جارج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بولتی جارہی تھی اور جارج کا چہرہ لحہ بہ لحہ سرخ پڑتا جارہا تھا۔ آخرکار اس کا ضبط جواب دے گیا اور اس نے پوری قوت سے سونیا کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ رسید کردیا۔ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ اس کے ہونٹ کے کنارے سے خون کی لکیر سی بہہ نکلی۔

''اب تمہارے ساتھ جو کچھ ہوگا، اس کی ذمے دار صرف اور صرف تم ہوگی۔''

''بے فکر رہو، تم سے شکوہ نہیں کروں گی۔'' وہ جارج کی دھمکی سے خوفزدہ ہونے کے بجائے بے خوفی سے مسکرائی۔ رخسار پر چھپے انگلیوں کے نشانات، ایک باچھ سے بہتا خون اور ہونٹوں کی بے خوف مسکراہٹ کا یہ امتزاج اس کے چہرے کو ایسا تاثر دے رہا تھا جسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل تھا۔

''میں تمہیں شکوہ کرنے کے قابل چھوڑوں گا بھی نہیں۔'' مشتعل جارج نے اسے اسٹریچر سے گھسیٹا اور فرش پر گھسیٹتے ہوئے ہی اسی کمرے کے ایک کونے میں بنے گلاس چیمبر میں لے جا پھینکا۔ سونیا جانتی تھی کہ یہ چھوٹا سا چیمبر صرف ایک بٹن دبانے پر سرد جہنم میں تبدیل ہوجائے گا۔ وہ خود کو اس عذاب سے گزرنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ کرتی ہوئی گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی۔ عشق کیا تھا تو عشق کا امتحان تو دینا ہی تھا۔

''اب تم اپنی زبان کھولوگی یا یہیں فریز ہوکر مرجاؤگی۔'' چیمبر کے اندر کسی گوشے میں لگے اسپیکر پر اس نے جارج کی سخت آواز سنی۔

''جہنم میں جاؤ تم۔'' وہ آہستہ سے بڑبڑائی لیکن سر اٹھاکر اس کی طرف نہیں دیکھا۔

آہستہ آہستہ چیمبر کا درجۂ حرارت گرنا شروع ہوگیا۔ ہلکی ٹھنڈک سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ کہاں تک جائے گا، وہ خوب واقف تھی۔ جلد ہی وہ مرحلہ آگیا جب اس کا جسم کانپنے لگا اور دانت بجنے لگے۔ جسم کو سکیڑتے سکیڑتے اس کی یہ حالت ہوگئی گویا کوئی گیند ہو لیکن جتنا وہ خود کو اپنے آپ میں چھپاتی تھی، سردی کی شدت اتنی ہی بڑھتی جاتی تھی۔ اگر اس کی ٹانگوں میں جان ہوتی تو وہ چیمبر کے اندر تھوڑی سی اچھل کود کرکے ہی اپنے جسم کو گرماہٹ دینے کی کوشش کرتی لیکن بے بسی کی انتہا تھی کہ وہ ایسا نہیں کرسکتی تھی۔ ویسے بھی اسے معلوم تھا کہ ایسا کرنا بھی بس ایک ناکام

کوشش ہی ہوتی۔ اس چیمبر میں آنے والوں کو ان ساری کوششوں کے باوجود بھی آخر کار ناکام ہو کر ہتھیار ڈالتے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

''میں مر کر اسی چیمبر میں منجمد ہو جاؤں گی لیکن یہ طے ہے کہ کوئی میری قوتِ ارادی کو نہیں توڑ سکے گا۔'' وہ اپنے خیال میں میڈم ایکس کا چہرہ لائی اور ضدی سے انداز میں اسے باور کروایا۔

''میں منجمد ہو کر کیسی لگوں گی؟ کیا اس سلیپنگ بیوٹی کی طرح جو ایورسٹ کی بلندیوں پر سالہا سال سے سو رہی ہے اور عورت کے عزم و حوصلے کی علامت بنی ہوئی ہے۔'' اس کی دماغی رو بھٹکی اور اسے شیشے کے اس چیمبر سے نکال کر ہمالیہ کی بلندیوں پر لے گئی۔ اصل میں یہ صرف ضد اور ارادے کی مضبوطی تھی جس نے اسے لبوں کو کھولنے نہیں دیا تھا ورنہ ٹھنڈک اب اس انتہا پر تھی کہ جسم کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی سن ہونے لگا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے ہر طرف دھند ہی دھند ہے اور وہ ایک برفیلی چوٹی پر ''سلیپنگ بیوٹی'' کے قرب میں ہی کہیں پڑی ہوئی ہے۔ یہ خیال اتنا قوی تھا کہ اسے باقاعدہ اپنے چہرے پر برف کے گالے گرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ آہستہ آہستہ ان کے گرنے کی رفتار بڑھتی چلی گئی اور اس کا وجود اس برف کے نیچے دبنا شروع ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور بند پپوٹوں کو بھی برف نے ڈھانپ دیا۔ بس یہ آخری احساس تھا جو اس کے تصور نے اسے محسوس کروایا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو اس کے ہر طرف سفیدی ضرور تھی لیکن اس سفیدی کے بوجھ تلے اس کا وجود دبا نہیں جا رہا تھا۔

''گڈ مارننگ مادام!'' اپنے قریب سے سنائی دینے والی آواز نے اسے احساس دلایا کہ وہاں اس کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ اس نے نظریں گھما کر آواز کی سمت دیکھا۔ نرس کے مخصوص یونیفارم میں ایک نوجوان لڑکی اس کی طرف دیکھتے ہوئے پیشہ ورانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔

''آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں؟'' سونیا کو اپنی طرف متوجہ پا کر اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔

''میرا جسم ٹھیک سے حرکت نہیں کر پا رہا ہے۔'' نرس کے سوال پر اس نے پہلی بار اپنی حالت پر غور کیا۔ اسے شدید نقاہت محسوس ہو رہی تھی اور ہاتھ پیروں میں اکڑاؤ سا تھا۔ حقیقتاً ابھی اس کا دماغ پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا اور وہ سب یاد نہیں آیا تھا جس سے گزر کر وہ یہاں تک پہنچی تھی۔

''ڈونٹ وری! آہستہ آہستہ آپ پوری طرح ٹھیک ہو جائیں گی۔'' نرس نے اسے تسلی دی اور اس کی ڈرپ میں انجکشن شامل کرنے لگی۔

''لیکن مجھے ہوا کیا ہے؟'' اس نے سوال کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی یاد کرنے کی کوشش کی لیکن عین اسی وقت دروازے کی طرف سے سنائی دینے والی چاپ نے اس کی توجہ کھینچ لی۔

''کیا تمہیں واقعی یاد نہیں کہ تمہیں کیا ہوا ہے؟'' وہ میڈم ایکس تھی جو ہمیشہ کی طرح تازہ دم و چاق و چوبند اس کی طرف چلی آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر سونیا کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور وہ سب کچھ یاد آ گیا جو اس کے ساتھ ہوا تھا۔ بے ساختہ ہی اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

''جو کسی کاز کے ساتھ جڑے ہوں، انہیں بھی بھی سخت آزمائش سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم اپنے حصے کی آزمائش سے سرخرو ہو کر نکل آئی ہو۔'' میڈم ایکس نے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات سے اس کی کیفیت کا اندازہ لگا لیا اور نرم لہجے میں بولی۔ ساتھ ہی اس نے نرس کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔

''کیا سچ؟'' اس نے تلخی سے پوچھا۔

''ہاں، اگر تم جارج کی آفر قبول کر لیتیں تو آج اس بستر کے بجائے قبر میں لیٹی ہوتیں۔'' میڈم ایکس کے جواب نے اس کے دماغ کی ساری بتیاں جلا دیں اور سمجھ گئی کہ ماضی کے حوالے سے جارج کی وہ ساری گفتگو اور واہیات پیشکش وغیرہ سب کے پیچھے پوری پلاننگ تھی۔ میڈم ایکس کو اس کی اس عادت کا اچھی طرح پتا تھا کہ جہاں مسئلے کا حل نہ مل رہا ہو، وہاں وہ اپنا جسم استعمال کر کے مطلب نکال لیتی ہے۔ وہ جارج کے تشدد پر نہیں ٹوٹی تھی تو اسے اس طرح آزمانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان کے خیال میں اگر وہ جھوٹی ہوتی تو جارج کو رشوت دے کر جان چھڑا لیتی۔ میڈم ایکس کو لگ رہا تھا کہ وہ سچی ہونے کی وجہ سے ایسا نہیں کر پائی تھی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے محبت نے ماضی کی روش چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ اس کا دل اڑ گیا تھا کہ جو اس دل کا مالک ہے، اس کے سوا کسی کو جسم تک رسائی نہیں دینی ہے۔

''تمہارے ساتھ ساتھ میں بھی کڑی آزمائش سے گزری ہوں۔ میرا دل ہر پل یہ دعا کرتا رہا ہے کہ خداوند تمہیں اس آزمائش میں ناکام نہ ہونے دے۔'' اس کی سوچوں سے بے نیاز میڈم ایکس اپنی ہی بولتی جا رہی تھی لیکن سونیا کو اس کے ان دو جملوں نے چونکا دیا۔ ماں کا یہ روپ اس نے کہاں دیکھا تھا؟ اسے بے یقینی سی ہونے لگی

کہ اس کی ماں نے اس کے لیے دعا کی تھی۔

’’تم اس آزمائش میں ناکام ہو جاتیں تو میرے ماتھے پر ہمیشہ کے لیے داغ لگ جاتا۔ تنظیم کے بڑے کہتے کہ رابیل نے اپنی بیٹی کی تربیت ٹھیک نہیں کی اور اس کی تربیت پر مسلمان باپ کا خون غالب آگیا۔‘‘ میڈم ایکس کے اگلے الفاظ نے اس کی ساری خوش فہمیوں پر پانی پھیر دیا۔ وہ ایک ماں کی حیثیت سے پریشان نہیں تھی۔ وہ ہولی گولڈن اسٹار کی کارکن کی حیثیت سے پریشان تھی کہ کہیں اس کی وفاداری پر کوئی الزام نہ آجائے۔

’’کیا خدا آپ کے سینے میں ایک ماں کا دل رکھنا بھول گیا تھا؟‘‘ اسے رابیل کے الفاظ پر اتنا غصہ آیا کہ چڑ کر سوال کر بیٹھی۔

’’اس سینے میں صرف اسرائیل کی اس بیٹی کا دل ہے جس نے عہد دے رکھا ہے کہ دنیا کے ہر فائدے اور محبت کا نمبر اسرائیل کے بعد آئے گا۔‘‘ اس پر سونیا کے لہجے کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

’’میری قوم نے ماضی میں بہت دکھ اٹھایا ہے، دربدری کے عذاب سے گزری ہے۔ دنیا کی ہر قوم کے ہاتھوں رسوا ہوئی ہے تب کہیں جا کر ہمیں زمین کا یہ ٹکڑا نصیب ہوا ہے۔ اس مقدس سرزمین پر اپنا حق قائم رکھنے کے لیے ہم وہ سب کچھ کریں گے جو کیا جا سکتا ہے۔ اس زمین پر اپنا حقِ ملکیت برقرار رکھنا اور پوری دنیا میں قومِ یہود کی اجارہ داری قائم کرنا ہمارا وہ نصب العین ہے جسے ہم ہمیشہ سب سے اوپر رکھتے ہیں۔ اولاد کی محبت سے بھی اوپر......‘‘

’’تو میرے ساتھ یہ سب کرتے ہوئے آپ کم از کم اسی بات کا لحاظ کر لیتیں کہ میں نے اپنی اب تک کی ساری زندگی صرف اور صرف اسرائیل کے مفاد کی خاطر جی ہے۔‘‘ اس نے اپنے شکستہ وجود کی طرف اشارہ کیا۔

’’کچھ نہیں ہوا ہے تمہیں۔ بس تھوڑی سی ویکنیس اور فٹنس کے مسائل ہیں۔ بہترین کیئر اور علاج سے چند دنوں میں ہی بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔‘‘ میڈم ایکس نے گویا کان پر سے مکھی اڑائی پھر مزید بولی۔

’’اچھا ہے، اس بہانے تم کچھ عرصہ آرام بھی کر لو گی۔ کئی برسوں سے مسلسل کام کر رہی ہو۔ یہ بریک تمہیں دوبارہ تازہ دم کر دے گا۔‘‘

’’مجھے نیند آرہی ہے۔‘‘ اسے ان ساری تسلیوں کی ضرورت نہیں تھی اس لیے بیزاری سے بولی اور آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ میڈم ایکس کچھ دیر وہاں کھڑی اسے جانچتی ہوئی نظروں سے گھورتی رہی پھر پلٹ کر باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کو محسوس کر کے سونیا نے آنکھوں پر سے بازو ہٹا لیا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے تھے۔ یہ اس کی زندگی کا المیہ تھا کہ وہ جن لوگوں سے محبت کے حصول کی خواہشمند تھی، ان کے پاس اس کے کاسے میں ڈالنے کے لیے چند میٹھے بول بھی نہیں تھے۔ آنکھوں کے نمکین پانی میں بیک وقت معاذ اور میڈم ایکس کے چہرے جھلملا رہے تھے۔

☆☆☆

’’اوہ انکل بنجامن آپ؟ آپ کیسے آگئے یہاں؟‘‘ اس نے دروازے سے اندر داخل ہوتے بنجامن کو دیکھ کر بیک وقت خوشی اور حیرت کا اظہار کیا۔

’’یہاں سے واپسی میں آغا گل میرے پاس سے ہوتا ہوا گھر گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس بچے کو ایڈمٹ کر لیا گیا ہے اور تم ایز اٹینڈنٹ یہاں ٹھہرے ہوئے ہو تو میں نے سوچا کہ میں بھی وزٹ کر لوں۔‘‘ انہوں نے بستر پر سوئے ہوئے بہرام پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دیا اور اپنے ہاتھ میں موجود بڑا سا ناشتے دان ایک میز پر رکھ کر خود بھی صوفے پر ٹک گئے۔

’’جی، میں نے ہی کہا تھا آغا جان سے کہ آپ کو مطلع کر دیں کہ شاید ایک دو دن میں اپنی جاب پر نہیں آسکوں گا۔ اصل میں یہاں اٹینڈنٹ کا مسئلہ ہے اور بہرام کی حالت ایسی نہیں کہ اسے اکیلا چھوڑا جا سکے اس لیے میرا یہاں رہنا ضروری ہے لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میں یہاں رہ کر بھی کام کرتا رہوں گا۔ میں نے آغا جان سے کہا تھا کہ آپ سے کہیں کہ مجھے یہاں ایک عدد لیپ ٹاپ بھجوا دیں۔ بس اس کے بعد آگے کی ساری ذمے داری میری ہے کہ کیسے کام چلانا ہے۔‘‘

’’آغا نے مجھے تمہارا میسیج کنوے کر دیا تھا لیکن اس ٹائم میں تمہیں لیپ ٹاپ پہنچانے نہیں بلکہ تمہاری آنٹی کے ہاتھ کا بنا کھانا پہنچانے آیا ہوں۔ کام کا کیا ہے، کام ساری زندگی ہوتے رہتے ہیں۔ ابھی تم اس بچے پر فوکس کرو۔ یہ یہاں سے ڈسچارج ہو جائے تو بعد میں آرام سے کام نمٹا لینا۔‘‘ بنجامن کے لہجے میں بڑی اپنائیت تھی۔

’’تھینک یو سو مچ انکل! آنٹی کو بھی میری طرف سے اسپیشل تھینکس کہیے گا لیکن اس تکلیف کی ضرورت نہیں تھی۔ کھانا یہاں مل جاتا ہے۔‘‘

’’پر میری ڈیئر وائف کے ہاتھ سے بنے کھانے جیسا ڈیلیشیس تو نہیں ہو سکتا نا۔‘‘ بنجامن نے چیلنج کرنے والے انداز

میں کہا تو وہ بے ساختہ ہنس دیا پھر تائید کرتے ہوئے بولا۔
"اس میں تو کوئی شک نہیں۔ مجھے کشمیر کے حسن کے بعد جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے، وہ آنٹی کے ہاتھ کا ذائقہ ہی ہے۔"
"بس تو پھر کھولو ٹفن۔ میں نے بھی تمہارا ساتھ دینے کے خیال سے گھر پر ڈنر نہیں کیا تھا۔"
"پکی بات ہے نا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے ساتھ آپ دوسری شفٹ لگا رہے ہوں۔" اس نے بنجامن کو چھیڑا۔
"وہ جو تمہاری آنٹی ہے نا، وہ مجھے بہت اچھی طرح جانتی ہے۔ اس نے مجھے گھر پر ڈنر کرنے ہی نہیں دیا کہ اسے معلوم تھا میں نے یہاں تمہارے ساتھ شفٹ ضرور لگانی ہے۔" بنجامن نے بھولی صورت بنا کر سچائی اگل دی جس پر وہ خوب کھلکھلا کر ہنسا۔
"آہستہ ہنسو، کہیں بچے کی نیند خراب نہ ہو جائے۔" بنجامن نے ناراض سے انداز میں اسے ٹوکا۔
"اس کی فکر نہ کریں۔ یہ دوا کے زیر اثر گدھے گھوڑے سب بیچ کر سو رہا ہے۔ میری ہنسی تو کیا، توپ کی آواز سے بھی نہیں جاگے گا۔ اسی لیے تو میں آپ سے اصرار کر رہا ہوں کہ مجھے یہاں لیپ ٹاپ بھجوا دیں۔ یہاں فارغ بیٹھ کر دیواروں کو گھورتے رہنے کے بجائے میں کچھ کام کر لوں گا تو آگے میرے لیے آسانی رہے گی۔"
"او کے۔ تم اتنا انسسٹ کر رہے ہو تو میں واپس جا کر ڈرائیور کے ہاتھ تمہیں لیپ ٹاپ بھجوا دوں گا۔ ابھی تو تم کھانا نکالو ورنہ میرے پیٹ کے چوہے بھوک سے بے چین ہو کر میرے سارے انٹرنل آرگنز کو کھا جائیں گے۔" بنجامن نے اپنی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دہائی دی تو وہ ہنس کر ناشتے دان کھولنے لگا۔ کئی خانوں پر مشتمل ناشتے دان کے ہر ڈبے میں انواع و اقسام کے کھانے بھرے ہوئے تھے اور ناشتے دان کھلتے ہی سارے کمرے میں خوشبو بھر گئی تھی۔
"اب تو مجھ سے بھی صبر نہیں ہو رہا۔" وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ندیدے پن سے بولا۔
"اور اڑاؤ میرا مذاق۔ اصل نصیحت تو تمہیں آفٹر میرج ہو گی۔ میری دعا ہے کہ تمہیں بھی میری وائف جیسا ٹیسٹی فوڈ تیار کرنے والی وائف ملے۔" بنجامن نے اس کی کیفیت سے حظ اٹھاتے ہوئے لقمہ منہ میں ڈالا۔
"ہمارے ایسے نصیب کہاں؟ ہمیں تو شاید کنوارا ہی اس دنیا سے رخصت ہونا پڑے۔" بے اختیار ہی تجمل کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا گیا اور ساتھ ہی اس کا وہ خط بھی جس میں اس نے اس کے جذبات کو سمجھنے کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ واضح کر دیا تھا کہ ان کا ساتھ کبھی ممکن نہ ہو سکے گا۔ اسے ایک طرف اپنا آپ معاذ کے قابل نہیں لگتا تھا تو دوسری طرف اپنی زندگی کی طرف سے ہی مایوسی اور بے یقینی تھی۔ کچھ یہی کیفیت معاذ کی اپنی بھی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ لوٹ کر کبھی وطن واپس جا بھی سکے گا یا نہیں۔
"کہاں کھو گئے ینگ مین! نہ کھانا کھا رہے ہو، نہ میری بات کا جواب دے رہے ہو۔" وہ جو تجمل کا خیال آنے پر ارد گرد سے کٹ گیا تھا، بنجامن کے شانہ ہلانے پر ماحول میں واپس آیا اور کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔
"بس ایسے ہی کچھ یاد آ گیا تھا۔ آپ بتائیں، آپ کیا کہہ رہے تھے؟"
"میں پوچھ رہا تھا کہ تمہیں اپنے کنوارے ہی مر جانے کا شک کیوں ہے؟" بنجامن نے اپنا سوال دہرایا۔
"تو کون کرے گا مجھ سے شادی؟ میں نہ تو عام کشمیری مردوں جتنا خوبصورت ہوں، نہ میرے پاس زیادہ تعلیم یا روپیہ پیسا ہے اور تو اور، یادداشت بھی سلامت نہیں۔ لوگوں نے مجھے جو بتایا، وہ میں نے خود کو تسلیم کر لیا۔ اب ضروری تو نہیں کہ سامنے والے بھی اسی طرح مجھے تسلیم کر لیں۔" اس نے بات بتائی۔
"ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہارے معتبر ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ آغا گل جیسے صاحب کردار انسان نے تمہیں اپنا بیٹا تسلیم کیا ہے اور پھر تمہارا اپنا کیریکٹر...... آئی سویئر! اگر میری کوئی بیٹی ہوتی تو میں ریلیجن کا ڈیفرنس ہونے کے باوجود اس کے ساتھ تمہاری شادی بنا دیتا۔" بنجامن کے لہجے میں سچائی تھی۔
"تھینک یو سو مچ انکل! اپنے لیے آپ کی اتنی اچھی رائے نے مجھے آپ کا مقروض کر دیا ہے۔" معاذ کو سچ مچ اس کے خلوص نے متاثر کیا۔
"تم یہ ڈیزرو کرتے ہو ینگ مین! بہرحال ابھی یہ ایموشنل باتیں چھوڑو اور اپنی آنٹی کے ہاتھوں کی بنی پڈنگ کھاؤ۔ بلیو می، یہ پڈنگ صرف دنیا کے خوش قسمت ترین لوگوں کو ہی ملتی ہے۔" بنجامن نے بڑے طریقے سے گفتگو کا موضوع بدلا اور اسے پڈنگ پیش کی۔
"یہ واقعی ورلڈز بیسٹ پڈنگ ہے۔ آپ اس کے لیے آنٹی کو میرا اسپیشل تھینکس بول دیجیے گا۔" معاذ نے پڈنگ چکھی اور دل کھول کر اس کی تعریف کرنے لگا۔ بنجامن اس

تعریف پر ایسے خوش ہو گیا جیسے خود اس کی تعریف ہو رہی ہو۔ بہت خوشگوار ماحول میں کھانا ختم کرنے اور کشمیری چائے کا ایک کپ پینے کے بعد بنجامن وہاں سے رخصت ہو گیا تو معاذ سوئے ہوئے بہرام کے پاس آ کر کھڑا ہوا۔ وہ اتنی گہری نیند سو رہا تھا کہ اس کی اور بنجامن کی گفتگو اور قہقہوں سے بھی نہیں جاگا۔ معاذ نے اس کے ماتھے پر آئے بالوں کو سمیٹا اور وہاں محبت سے ایک بوسہ دیا۔

”پیشنٹ کو جگا دیں، اس کے کھانے اور دوا کا وقت ہو گیا ہے۔“ اسٹاف کا ایک لڑکا دستک دے کر اندر آیا اور اسے مخاطب کیا۔

”میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ یہ اتنی دیر سے بغیر کچھ کھائے پیے مسلسل سوئے جا رہا ہے، اس طرح تو اسے کمزوری ہو جائے گی۔“

”اس کی آپ فکر نہ کریں۔ ڈرپ کے ذریعے انہیں طاقت مل رہی ہے لیکن فی الحال ذہنی سکون اور آرام زیادہ ضروری ہے۔ ہم آہستہ آہستہ خود ہی ان کی نیند کا دورانیہ کم کر کے فزیکل ایکٹیوٹیز بڑھاتے جائیں گے۔“ اس نے رسان سے معاذ کی تشویش دور کی۔ معاذ بھی مطمئن سا ہو کر بہرام کو جگانے لگا۔ تھوڑی سی کوشش سے وہ جاگ گیا اور اس کے اصرار پر فرمانبرداری سے کھانا اور دوائیں بھی کھا لیں۔ اس سارے عمل کے دوران وہ کچھ کھویا کھویا سا تھا۔ کوئی ہنگامہ کرنا تو دور کی بات، کسی قسم کی گفتگو بھی نہیں کی تھی۔ معاذ نے چند ایک سوال کیے تو ان کا جواب بھی بس ہاں ہوں میں ہی دیا اور پھر تھوڑی ہی دیر میں دوبارہ سو گیا۔ اس کے جاگنے سونے کے اس درمیانی عرصے میں بنجامن کا ڈرائیور اسے لیپ ٹاپ پہنچا گیا تھا۔ وہ لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ گیا اور آن لائن ہو کر بنجامن کا شکریہ ادا کیا اور کام پر ایک سرسری سی نظر ڈالی۔ وہ آج رات اس کام کو کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا لیکن خود کو آن لائن ظاہر کرنا ضروری تھا۔ دھیرے دھیرے وقت آگے بڑھنے لگا۔ اسپتالوں کے عمومی ماحول کی طرح جلد ہی سناٹا چھا گیا اور اندازہ ہونے لگا کہ مریضوں اور ان کے تیمارداروں کی اکثریت سو چکی ہے۔ اسٹاف کے بارے میں بھی یہی قیاس کیا جا سکتا تھا کہ ان کی اکثریت سونے یا کم از کم اونگھنے میں معروف ہوگی۔ یہ کوئی جنرل اسپتال تو تھا نہیں کہ رات میں بھی ایمرجنسی کیسز آتے رہتے۔ یہ لوگوں کے نفسیاتی علاج کا اسپتال تھا جہاں لوگ مقررہ اوقات میں ہی معائنے کے لیے آتے تھے اور صرف چند مخصوص مریضوں کو داخل کیا جاتا تھا۔ ان میں سے کچھ کے ساتھ اٹینڈنٹ ہوتے تھے اور کچھ کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

”ٹک ٹک۔“ سناٹے میں کمرے کے دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک بھی اسے واضح سنائی دی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر دروازے کی طرف گیا اور محتاط لہجے میں پوچھا۔

”کون؟“

”مددگار۔“ دھیمی آواز میں طے شدہ کوڈ ادا کیا گیا۔

”آپ کی آمد کا شکریہ۔“ اس نے جوابی کوڈ دہراتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ وہ ایک نوجوان تھا جس نے اپر کا ہڈ سر پر اوڑھ رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر ماسک تھا اور ہاتھ میں چائے کا تھرماس تھاما ہوا تھا۔ معاذ اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ باہر سیکیورٹی پر مامور لوگوں سے یہ کہہ کر آیا ہوگا کہ مسٹر عمار کو رات بھر جاگ کر اپنا کچھ اہم کام نمٹانا ہے اس لیے انہوں نے اپنے لیے چائے منگوائی ہے۔

”ٹائم زیادہ نہیں ہے۔ آپ کو فوری طور پر یہاں سے نکلنا ہوگا۔“ تھرماس میز پر دھرتے ہوئے اس نے پیغام دیا تو معاذ نے نوٹ کیا کہ اس کے ہاتھوں میں دستانے تھے یعنی وہ اپنے فنگر پرنٹس کے معاملے میں محتاط تھا۔

”ٹھیک ہے، پھر تو ہم چینج کر لیتے ہیں۔“ لمبی چوڑی گفتگو کرنے کے بجائے معاذ نے بھی فوری عمل کرنا مناسب سمجھا۔ چند منٹوں میں ہی وہ ایک دوسرے کے لباس میں کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ دونوں کا قد و قامت تقریباً یکساں تھا اس لیے لباس پورا آیا تھا۔ بس معاذ کو اس کی قمیص تھوڑی سی تنگ ہو رہی تھی لیکن اوپر اپر ہونے کی وجہ سے دیکھنے والوں کو محسوس نہیں ہو سکتا تھا۔

”ماسک اور دستانوں کی اضافی جوڑی اپر کی جیب میں موجود ہے۔“ لباس کی تبدیلی کے بعد اس نے معاذ کو آگاہ کیا۔ کمرے کے اندر آنے کے بعد بھی اس نے اپنے چہرے سے ماسک نہیں اتارا تھا اور دستانے بھی ظاہر ہے وہ اتارنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

”تھینک یو۔“ معاذ نے جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ماسک اور دستانوں کی ویسی ہی جوڑی برآمد کر لی جو وہ نوجوان پہنا ہوا تھا۔ ان دونوں چیزوں کو پہننے کے بعد وہ باہر جانے کے لیے بالکل تیار تھا۔ ہڈ کو اس نے سر پر اس حد تک آگے کھسکا لیا تھا کہ چہرہ بھی اچھا خاصا چھپ گیا تھا۔

”فی امان اللہ!“ وہ دروازے سے نکلنے لگا تو پیچھے

سے نوجوان کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ وہ ذرا سا ٹھٹکا لیکن پھر رک کر کوئی جواب دیے بغیر باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے بہرام یا کسی اور حوالے سے بھی اس نوجوان کو کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اسے سب کچھ سمجھا بجھا کر بھیجا گیا ہے اور وہ معاملات کو بہترین طریقے سے سنبھال لے گا۔ سیکیورٹی کیمروں اور گارڈز دونوں کی نظروں کی زد میں آنے سے بچنے کے لیے وہ تیزی سے سر جھکائے بیرونی گیٹ سے باہر نکل گیا اور بائیں جانب کا رخ کیا۔ بائیں جانب سے چکر کاٹ کر جیسے ہی وہ عقبی حصے میں پہنچا وہاں تاریکی میں ایک جیپ کا ہیولا دکھائی دیا۔ احتیاط کے باعث جیپ کی ساری لائٹیں بند تھیں۔ اس کے قریب پہنچتے ہی اسے پچھلی نشستوں کی جانب سے پکارا گیا۔

''یہیں آجاؤ دوست! یہاں تمہارے لیے بہت جگہ ہے۔'' جبار علی کی آواز پہچاننا اس کے لیے قطعی مشکل نہیں تھا چنانچہ بلا جھجک جیپ میں سوار ہو گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی جیپ ہلکی سی غراہٹ کے ساتھ اسٹارٹ ہو گئی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ اس کی اندر باہر کی لائٹیں اب بھی بند تھیں۔

''سب تیاری مکمل ہے؟'' اس کی بے چینی نے اس سے سوال کروایا۔

''بے فکر رہو، سب ریڈی ہے۔ میرے بندے مجھے مسلسل مہندر کی لوکیشن سے آگاہ کر رہے ہیں۔ آج کا دن اس نے اپنی رکھیل کے لیے مخصوص کر رکھا ہے اور اس وقت گھر سے وہیں جانے کے لیے نکلا ہوا ہے۔ ہم بہت جلد اس تک پہنچ جائیں گے۔'' جبار علی نے اسے آگاہ کیا تو وہ ایک ہنکارا بھر کر نشست پر سیدھا ہو کر بیٹھا اور ٹانگوں کو ذرا سا پھیلایا۔ اس کی ٹانگ نشست کے ساتھ کھڑی کسی شے سے ٹکرائی۔ اس سے قبل کہ وہ شے گر جاتی، اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے سنبھال لیا۔ مخصوص ساخت اور سرد لمس نے اسے آگاہ کر دیا کہ وہ کیا شے ہے۔

''ڈریگو ہے۔'' جبار علی نے اس کے رائفل کو چھونے کو محسوس کر لیا۔

''اوہ، عمدہ رائفل ہے۔'' وہ اس روسی ساختہ اسنائپر رائفل سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہ عمومی اسنائپر رائفلز کے مقابلے میں سیمی آٹومیٹک رائفل تھی جسے ہر بار فائر کے بعد کاک نہیں کرنا پڑتا تھا اور اس کی رینج ہزار میٹر تھی۔

''استعمال کی ہے؟'' جبار علی نے پوچھا۔

''اچھی خاصی مشق ہے لیکن ذاتی طور پر مجھے بیرٹ ایم 107 زیادہ پسند ہے۔'' وہ شوٹنگ کلب کا ممبر رہا تھا۔ اسے شروع سے اسلحے میں دلچسپی تھی پھر میڈم ایکس کی قید میں دی جانے والی تربیت نے اسے ان معاملات میں مزید طاق کر دیا تھا۔

''تم اس امریکن رائفل کی بات کر رہے ہو جس کی کارگر رینج ساڑھے اٹھارہ سو میٹر ہے؟'' جبار علی نے چونک کر اس سے پوچھا۔

''ہاں وہی، اس کے میگزین میں بھی ڈریگو کی طرح دس گولیاں لگتی ہیں لیکن ایک تو اس کی رینج زیادہ ہے، دوسرے میرا ہاتھ بھی اس پر زیادہ صاف ہے اس لیے مجھے وہ زیادہ پسند ہے۔'' اس نے بتایا۔

''میرے لیے یہ بہت اہم خبر ہے۔ اصل میں بھارتیوں کے ساتھ ایک ٹاکرے میں بیرٹ ایم 107 اچھے خاصے میگزینز کے ساتھ ہمارے ہاتھ لگی تھی لیکن افسوس ہمارے ساتھیوں میں سے کوئی بھی اسے اس کی اصل افادیت کے ساتھ استعمال کرنے کا اہل نہیں ہے۔''

''اگر موقع ملا تو میں اس سلسلے میں تم لوگوں کی مدد ضرور کروں گا اور کوشش کروں گا کہ ایک دو بندوں کو بیرٹ کے استعمال میں طاق کر دوں۔'' اس نے جبار علی کی بات سن کر پیشکش کی۔

''ابھی تو اس معاملے کو دیکھتے ہیں۔ ہوشیار رہو، ہم اپنے ٹارگٹ سے قریب ہیں اور اب ہمیں حرکت میں آنا ہے۔'' جبار علی نے اسے آگاہ کیا۔ ذرا سی دیر میں ان کی جیپ درختوں کے ایک جھنڈ کی آڑ میں رک چکی تھی۔

''مہندر کو اپنی رکھیل کے گھر پہنچنے کے لیے اس سڑک سے لازمی گزرنا پڑتا ہے اس لیے ہم نے اس کے لیے یہاں گھات لگا رکھی ہے۔'' جبار علی نے جیپ سے اترتے ہوئے اسے آگاہ کیا۔ پتلی سی اس پہاڑی سڑک کے دونوں اطراف میں گھنے درختوں کا سلسلہ تھا اور وہ اپنے ہاتھوں میں رائفلز سنبھالے ان درختوں کی آڑ میں ہی کھڑے ہوئے تھے۔ ڈرائیور البتہ حسب حکم اپنی نشست پر ہی جما ہوا تھا۔

''وہ بس پہنچ گیا ہے۔'' جبار علی کے کان میں یقیناً کوئی آلہ لگا ہوا تھا اور اسے اس کے ساتھی ہر لمحے کی خبر دے رہے تھے۔

ظلم وجبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب ناک تھا/باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

کیمرا

عتیق بخاری

کوئی ایجاد ہو یا دریافت... ہر چیز کا اثر اس کے مثبت یا منفی استعمال سے ظاہر ہوتا ہے... اور یہ استعمال انسان کی نیت کی نشاندہی کرتا ہے... اس نے بھی اس ایجاد سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی لیکن اس کی نیت نے ہی اس کے گرد جال بُن دیا... کیونکہ اعمال کا دارومدار تو نیت پر ہی ہوتا ہے جناب۔

ایک ذراسی غلطی سے حال و مستقبل تاریک کرنے والے بے وقوف ملازم کا احوال

''مووی دیکھ چکے ہو؟'' نیلے کوٹ والے نے سامنے بیٹھے شخص سے پوچھا۔ انداز چڑانے والا تھا۔ جواب میں سامنے والے نے اُسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔

''اب یہ سوال تو نہیں کرنے والے کہ کون سی مووی......؟ بھئی وہی ریکارڈنگ جو میں نے تمہیں بھجوائی تھی، جس میں تمہارا مکار چہرہ اور مکاریاں سب صاف صاف دکھائی دے رہے ہیں۔'' نیلے کوٹ والے کا انداز اب دل جلانے والا تھا۔

"وارنر! تم...... تم کیا چاہتے ہو مجھ سے؟" لیو نے پہلی بار زبان کھولی۔ اس کے چہرے پر غصہ تھا۔

"ارے، تم تو بڑی جلدی معاملہ سلجھانے پر آ گئے۔ گڈ...... تو لیو! سنو اب کہ میں کیا چاہتا ہوں۔" وارنر نے کرسی کی پشت سے اطمینان سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"میری نظر تمہاری سیٹ پر ہے۔ اگر تم اس سیٹ کو چھوڑتے ہو تو آفس رولز کے مطابق میں فوراً اس عہدے پر فائز ہو جاؤں گا۔ تم ایسا کرو، استعفا دے دو۔" اس نے بڑے آرام سے کہا۔

"استعفا......؟ کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے وارنر؟" اس کے لہجے میں شدید غصہ جھلک رہا تھا۔

"ہاں استعفا...... اگر تم چاہتے ہو کہ باس تک یہ ریکارڈنگ نہ پہنچے تو فوراً میری بات مان لو۔" وارنر نے سنجیدگی سے کہا۔

"وارنر! تم بہت گھٹیا انسان ہو۔ مجھے، یعنی اپنے ہی دوست کو بلیک میل کر رہے ہو۔" لیو نے دانت پیسے۔

"ہاں، میں گھٹیا ہوں جو اپنے ہی دوست کو بلیک میل کر رہا ہوں...... لیکن یہ بھی تو سوچو کہ ایک گھٹیا انسان نے ہی مجھے یہ موقع فراہم کیا ہے۔ میری برائی پر غور کرنے سے پہلے ذرا اپنی طرف بھی نظر ڈالو کہ تم نے کتنا بڑا جرم کیا ہے۔ جس کمپنی میں برسوں سے کام کر رہے ہو، اس کے اہم راز تم نے مخالف کمپنی کو پیسوں کے لالچ میں دے دیے ہیں۔" وارنر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

"میں...... میں مار ڈالوں گا تمہیں۔" لیو مشتعل ہو گیا۔

"فی الحال اپنی جان کی فکر کرو۔ تم بری طرح پھنسنے والے ہو۔ جانتے ہو نا تم پر دھوکا دہی کا کیس بنے گا۔ یہ تو ڈر ہے ہی لیکن تم باس کو جانتے ہو، وہ تمہیں مروا بھی سکتا ہے۔" وارنر نے گویا اسے سمجھایا۔

"تم ریکارڈنگ باس کو دکھاؤ گے؟ دکھا دو۔ میں صاف مکر جاؤں گا کہ میں اس میں موجود ہوں۔ کہہ دوں گا کسی مخالف نے میری شہرت، عہدے سے حسد کرتے ہوئے میرے خلاف جعلی ویڈیو تیار کی ہے۔" جھکنے یا ڈرنے کے بجائے لیو نے کہا۔ وہ ہار مانتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"یہ کہنے کا خیال تم دل سے نکال دو۔ بڑی واضح ویڈیو بنی ہے۔ تمہاری گاڑی کی نمبر پلیٹ صاف صاف دکھائی دے رہی ہے۔ وہی گاڑی جو تمہیں غالباً تمہاری اچھی کارکردگی پر کمپنی کی ہی جانب سے دی گئی ہے۔ تم کاغذات کسی کو پکڑاتے اور رقم کا لفافہ لیتے ہوئے بڑے واضح اور یوں صاف نظر آ رہے ہو کہ کوئی شک و شبہ پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا لیو۔ بڑے شاطر انسان نے بڑی ہوشیاری سے یہ ساری ریکارڈنگ کی ہے۔ تمہارے بچنے کے چانسز صفر فیصد ہیں۔" وارنر نے اس کی غلط فہمی چند جملوں میں دور کر دی۔

"کیا کچھ رقم میں یہ معاملہ طے نہیں ہو سکتا؟" لیو یکدم بے بس سا نظر آنے لگا۔

"نہیں...... ہرگز نہیں...... تم نے بہت پیسا جمع کر لیا ہے اور اب مخالف کمپنی سے بھاری دولت لے چکے ہو۔ اب ایسا کرو کہ یہ دولت اور اپنی جان بچانے کے لیے اس کمپنی کو چھوڑ کر چلے جاؤ۔" وارنر نے قطعیت سے کہا۔ لیو اسے گھور رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ وارنر کو کچا چبا جائے۔

"یہ تو ہو سکتا ہے کہ باس تمہارے ڈیتھ وارنٹ جاری نہ کرے لیکن وہ تمہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے ایسا مضبوط کیس بنوا کر بھجوائے گا کہ تم برسوں باہر نہیں آ سکو گے اور تمہارا پیسا، شاندار فلیٹ، گاڑیاں، سب ضبط ہو جائے گا۔ تو میرے دوست! میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نجی مصروفیات کا بہانہ بنا کر استعفا دو اور اپنی زندگی آزاد حالت میں گزارو۔" وارنر نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بڑے سکون سے کہا۔

"وارنر! کوئی اور راستہ بھی تو......" لیو نے کہنا چاہا۔ وہ اپنے بہت بڑے عہدے کو چھوڑنے پر خود کو آمادہ نہیں کر پا رہا تھا۔

"سب راستے بند ہو چکے ہیں لیو۔" وارنر نے غصے سے میز پر ہاتھ مارا۔ "تم نے جس جگہ سے پیسا کمایا، اسی کے راز بیچے اور جس کے راز بیچ دیے، اب بھی وہیں پر رہ کر اپنی زندگی کو مزید پُرآسائش بنانے کی سوچ رہے ہو۔ تم اب اس آفس کے دشمن ہو، تمہیں نکل جانا ہوگا۔ اب جلدی سے سائن کرو ان کاغذات پر۔" وارنر نے بات ختم کر کے چند کاغذات جو اس کے سامنے رکھے تھے، اس کی جانب کھسکائے۔

لیو کے چہرے پر بیک وقت غم، غصہ، بے بسی اور وارنر کے لیے شدید نفرت نظر آ رہی تھی۔ اس نے کاغذ کو غور سے دیکھا، پین نکالا اور ہونٹ بھینچتے ہوئے سائن کر دیے۔ سائن کر کے اس نے تھکے تھکے انداز میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ وہ ہارا ہوا نظر آ رہا تھا۔ دولت کماتے کماتے بہت زیادہ دولت کے لالچ میں اس نے بڑی ہوشیاری سے

ایک منفی قدم اٹھایا تھا اور اسی قدم نے اسے اوندھے منہ گرادیا۔ وارنر کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اب لیو کی کرسی اور عہدہ اس کے پاس آنے والے تھے۔

☆☆☆

"زبردست...... ! اچھی مووی تھی۔" سین ختم ہوتے ہی کارٹر نے ریموٹ سے ٹی وی کی آواز بند کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، لیو کا کردار منفی تھا۔ اسے اسی کے مطابق درست سزا ملی۔" گلین نے تائید کی۔ دونوں جرم و سزا پر مبنی مووی دیکھ رہے تھے۔ اب مووی ختم ہونے پر تبصرہ جاری تھا۔

"جب لیو کاغذات مخالف پارٹی کے حوالے کر رہا تھا، مجھے اسی وقت لگا تھا کہ اب یقیناً یہ ضرور پھنسے گا۔" کارٹر بولا۔

"پھنسنے کا تو اندازہ تھا لیکن یہ بات چونکا دینے والی ہے کہ اس کا قریبی دوست ہی اس کے کرتوتوں کی ویڈیو بنا کر اسے بلیک میل کرے گا۔" گلین بولا۔

"ویسے اگر دیکھا جائے تو وارنر کا کردار بھی منفی ہی ہے۔ اگر وہ مثبت سوچ رکھتا تو لیو والی ویڈیو فوراً باس کو دے دیتا تاکہ لیو کو سزا ملتی اور کمپنی بھی نقصان سے بچ جاتی۔ اس کے بجائے اس نے لیو کو بلیک میل کیا اور اس ریکارڈنگ کو اس سے کرسی چھیننے کے لیے استعمال کیا۔" گلین نے مزید کہا۔

"ہاں، ایسا ہی ہے لیکن دو منفی کرداروں کا آپس میں دوست ہونا اور پھر ایک کا دوسرے کے لیے خطرہ بن کر اسے برباد کردینا۔ ساری اسٹوری کافی دلچسپ لگی۔ کہانی کے دونوں کردار منفی ضرور تھے لیکن وارنر کے لیے نتیجہ مثبت رہا۔" کارٹر ہنسا۔

"میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہیے۔ کافی کام ہے۔" گلین نے یکدم اٹھ کر کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو وہ فائل جو تمہارے پاس ہے، کل مکمل کرکے لے آنا۔" کارٹر نے دروازہ بند کرنے سے پہلے کہا۔ دونوں ایک ہی کمپنی میں کام کرتے تھے۔ دونوں اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ دونوں کے فلیٹ کا فاصلہ بھی زیادہ نہ تھا۔ ایک ہی جگہ کام کرنے اور رہنے کی وجہ سے دوستی ہوئی اور جب شوق بھی ایک جیسے ہوئے تو دوستی بڑھ گئی۔ چھٹی کے دن مووی دیکھنا یا مچھلی کا شکار کرنا دونوں کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ آج چھٹی کے روز دونوں نے مل کر مووی دیکھی اور اب اگلے ورکنگ ڈے کی تیاریوں میں لگ گئے۔ دونوں کے پاس اہم فائلز ہوتی تھیں۔ کمپنی کا بہت اہم کام ان کے ذمے تھا۔

☆☆☆

"ہاں بھئی کارٹر! کیسا چل رہا ہے کام؟" چارلی کے کمرے سے نکلتے ہوئے ولیم نے سوال کیا۔ کارٹر کچھ کاغذات اٹھائے کمرے میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ ولیم باہر نکلا۔ وہ کمپنی کے باس اور آدھے کاروبار کے مالک چارلی کا چھوٹا سوتیلا بھائی تھا۔

"سب اچھا چل رہا ہے سر!" کارٹر نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر لا کر کہا۔ ولیم تھا ہی ایسا کہ اسے دیکھ کر کسی کا بھی مسکرانے کو دل نہیں کرتا تھا۔ شکل سے آوارہ نظر آنے والے ولیم نے کبھی کاروبار یا آفس کے کام میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ وہ کبھی کبھار چکر لگاتا اور سب ورکرز سے اونچی آواز میں قہقہے لگا کر باتیں کرتا۔ بے فکری سے ادھر اُدھر گھومتا اور چلا جاتا۔ اس کے باوجود سب ورکرز کے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی کیونکہ اس کی سرگرمیاں ایسی ہی تھیں۔ ایک نمبر کا آوارہ، نکما اور جواری تھا۔ چارلی نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایسا لگتا تھا اسے اس کی ان حرکات کی کوئی پروا نہیں۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا اور کم عمری ہی میں کامیاب بزنس مین بن گیا تھا۔ چارلی ویسے بھی کم گو، خاموش طبیعت کا انسان تھا۔ اس کی ماں کا جب انتقال ہوا وہ محض چھ برس کا تھا۔ اس نے اس سانحے کا بڑا اثر لیا اور چپ سا ہوگیا۔ اپنے باپ کی دوسری شادی، ولیم کی پیدائش، گھر میں کسی بھی تبدیلی یا بڑی سے بڑی بات پر بھی وہ کوئی خاص ردعمل نہ دیتا۔ ایک کار حادثے میں اس کی سوتیلی ماں کی بھی ڈیتھ ہوگئی اور باپ ٹانگوں سے معذور ہوگیا تو اسے اچانک بزنس سنبھالنا پڑا۔ اس کے باپ کو امید نہیں تھی کہ چارلی یہ کام کرسکے گا لیکن خاموش طبع چارلی نے کم بول کر ہی اپنے ورکرز کو نئے باس یعنی اپنے ساتھ کام کرنے پر آمادہ کرلیا۔ اس نے کمپنی میں کچھ نئی اصلاحات کیں جن کا خاطر خواہ فائدہ ہوا اور چند سالوں میں ہی بزنس جو پہلے ہی اچھا چل رہا تھا، مزید ترقی کرگیا۔ چارلی کے برعکس اس کا سوتیلا بھائی کچھ اور ہی طبیعت کا تھا۔

معاملہ سر سے اوپر ہونے لگا جب باپ کو پتا چلا کہ ولیم نے جوئے میں بھاری رقم ہار دی ہے۔ اس نے اسے کڑے الفاظ میں سرزنش کرتے ہوئے کہا کہ اگر وہ دوبارہ بھی جوا کھیلتا پایا گیا تو اسی روز اسے جائداد سے عاق کردیا

جائے گا۔

ولیم نے باپ کو اتنے غصے میں کبھی نہیں دیکھا تھا اور جائیداد سے محرومی کی دھمکی بھی پہلی بار سنی تو وہ ذرا محتاط ہو گیا اور وعدہ کیا کہ وہ کبھی بھی جوئے کے بڑے شوق کے قریب بھی نہیں پھٹکے گا۔ وہ لاکھ ڈھیٹ اور من مرضی والا سہی لیکن پیسے سے محروم ہونے کا سوچ کر اس نے خود کو جوئے سے روک لیا۔ باپ کے لیے اتنا بھی کافی تھا۔

☆☆☆

”مچھلی کا شکار میرے لیے بہت دلچسپ رہا ہے۔ اتنا کہ میری ہفتے بھر کی تھکن اتر جاتی ہے۔“ گلین نے کارٹر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں، یہ شوق بہت اچھا ہے۔ میرے باپ کو بھی تھا۔ اس کے ساتھ بچپن ہی سے مچھلی کے شکار پر جا جا کر یہ شوق مجھے بھی لاحق ہو گیا۔“ کارٹر نے باسکٹ ایک سائڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔

”شام کا کیا پروگرام ہے؟“ گلین نے سوال کیا۔

”پروگرام تو ہے لیکن شام کا نہیں۔“ کارٹر نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب، پھر کب کا ہے؟“ گلین نے پوچھا۔

”گلین! میں کچھ دنوں سے ایک بات سوچ رہا ہوں۔“ کارٹر نے سامنے پانی کی لہروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ سوچتی سی نظروں کے ساتھ گلین کو بڑا عجیب سا لگا۔

”کون سی بات کارٹر! بتاؤ مجھے۔“ گلین نے متوجہ ہو کر کہا۔

”تمہیں ہی تو بتانی ہے۔ ہم دونوں ہی مل کر اس پروگرام پر عمل کر کے اس سے اپنے مقاصد حاصل کریں گے۔“ کارٹر اس کی جانب مڑ گیا۔ گلین حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”گلین! یاد ہے وہ مووی جس میں وارنر نے لیو کی ویڈیو بنا کر اسے بلیک میل کیا اور بہت فائدہ حاصل کیا۔“ کارٹر نے بات شروع کی۔

”ہاں، یاد ہے۔ پچھلے سنڈے دیکھی تھی لیکن اس مووی کا ہمارے کسی پروگرام سے کیا تعلق؟“ گلین نے الجھتے ہوئے سوال کیا۔

”گلین! یہ کیمرا بڑے کام کی چیز ہے۔“ کارٹر مسکرایا۔

”ہاں...... لیکن اس میں نئی بات کیا ہے؟“ گلین نے حیرانی سے پوچھا۔

”اس مووی کو دیکھ کر میں نے ایک بات سیکھی ہے کہ کیمرا استعمال کر کے بہت سے فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں اور...... میں نے بھی کیمرے سے ایک بہت بڑا کام لینے کا فیصلہ کیا ہے۔“ کارٹر نے کہا تو توجہ سے سنتا گلین چونکا۔

”کیا تم بھی کسی کو بلیک میل کرنا چاہتے ہو؟“ گلین نے پوچھا۔

”بلیک میل تو نہیں لیکن میں کسی کی ویڈیو بنا کر کسی اور کو دے کر معقول پیسا کما سکتا ہوں۔“ کارٹر نے پاس پڑا چھوٹا سا پتھر پانی میں پھینکتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر شاطرانہ مسکراہٹ تھی۔ گلین کا منہ کھل گیا۔

”کیا کہہ رہے ہو کارٹر؟ تم ایسا کیسے کر سکتے ہو۔ میرا خیال ہے یہ غلط اور مشکل کام ہے...... اوہ، تم مجھے بھی تو اس میں شامل کرنے والے ہو نا؟ نہیں بھئی نہیں...... چھوڑو اس بات کو۔“ گلین بڑی جلدی جلدی بول رہا تھا جیسے تیز بولنے سے وہ کارٹر کو جلد اس کام سے روک لے گا۔

”نہیں، اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے تو اب اس پر عمل بھی ہو گا۔ گلین! بے وقوف مت بنو اور میرا ساتھ دو۔ ملازمت میں ترقی بھی مل جائے گی۔“ کارٹر نہ صرف اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا بلکہ گلین کو بھی اپنے ساتھ شامل ہونے پر اصرار کر رہا تھا۔

”ملازمت میں ترقی؟“ گلین بری طرح چونکا۔

”کیا تم یہ کام اپنی کمپنی کے کسی فرد کے خلاف کرنا چاہ رہے ہو؟“ اس نے کہا تو کارٹر کھل کر مسکرایا۔

”ہاں میرے دوست! ایسا ہی ہے۔ کیا تفصیل سننا چاہو گے؟“ کارٹر نے کہا۔

”ہاں جلدی بولو، مجھے بہت تجسس ہو رہا ہے۔“ گلین اس کے قریب ہو کر بولا۔

”تم جانتے ہو نا کہ باس چارلی کے باپ نے اپنے چھوٹے بیٹے ولیم کو دھمکی دی ہے کہ جس روز وہ جوا کھیلتا پایا گیا، اسے جائیداد سے عاق کر دیا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں باس چارلی پورے ترکے کا اکیلا وارث ہو گا۔ اس دھمکی کے بعد ولیم نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اب جوئے کے قریب بھی نہیں پھٹکے گا لیکن مجھے پتا ہے کہ وہ اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا۔ وہ چھپ کر جوا کھیلتا ہے۔“ کارٹر نے بات کرنا شروع کی تو گلین کو اس کا پلان سمجھ میں آنے لگا۔

”یعنی تم ولیم کی جوا کھیلنے کی ویڈیو بنا کر اس سے کہو گے کہ بھاری رقم اور کمپنی میں ترقی دلوا دے ورنہ اس کی ویڈیو باپ تک پہنچ جائے گی؟“ گلین کو اتنی ہی سمجھ آئی تھی۔

”نہیں، ہرگز نہیں۔ میں نے بتایا تھا نا کہ میں کسی کو

بلیک میل نہیں کررہا۔ میں کیمرے کو کسی اور طریقے سے فائدے کے لیے استعمال کرنے لگا ہوں۔" کارٹر بولا۔ گلین سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"میں اور تم پہلے تو اس جگہ کا پتا لگائیں گے کہ ولیم کہاں پر جاکر باپ کی نافرمانی کررہا ہے۔ اس کے بعد اس کی جوا کھیلتے ہوئے ویڈیو بنائیں گے اور بجائے اس کو بلیک میل کرنے کے، یہ ویڈیو باس چارلی کو دے دیں گے۔"

"اوہ...... اچھا۔" کارٹر اصل پلان بتانے لگا تو اب گلین کو بھی صحیح سمجھ آنے لگی۔

"ہم باس چارلی سے کہیں گے کہ باپ کے سارے کاروبار اور بزنس کا مالک بننے کے لیے تم ہمیں کیا قیمت دے سکتے ہو؟ اس سوال سے پہلے ہم اسے یہ ویڈیو دکھادیں گے۔ یقیناً وہ ہمیں بہت بھاری انعام دے گا اور کیونکہ ہم نے اس کے لیے اتنا بڑا کام کیا ہے، وہ ہمیں نہ صرف ہمیشہ کمپنی میں رکھنا چاہے گا بلکہ ہمارے عہدوں میں ترقی بھی کرے گا۔" کارٹر نے بات مکمل کی۔

"کارٹر! تم ولیم کی ویڈیو چارلی کے حوالے اس لیے کرنا چاہتے ہو کہ وہ اپنے باپ کو ولیم کا وہ جرم دکھائے جس کے کرنے پر باپ نے اسے جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی دی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ باپ کی دھمکی محض دھمکی ہی ہو۔ ویڈیو دیکھ لینے کے بعد وہ ولیم کو عاق نہ کرے۔ ایسی صورت میں تو ہمیں کچھ نہیں ملے گا نا تو پھر خوامخواہ کیوں یہ کام کریں۔" گلین نے ایک خدشہ ظاہر کیا۔

"نہیں، ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ میں چارلی کے باپ کو آٹھ برسوں سے جانتا ہوں۔ وہ جو کہتے ہیں، وہ کرتے بھی ہیں۔ اگر ولیم کو کہا ہے کہ اسے جوا کھیلنے پر جائیداد سے عاق کیا جائے گا تو...... تم ویڈیو بناتے ہی اس بات کا یقین کرلینا کہ تمہاری پروموشن بھی ہوگئی اور بینک بیلنس بھی انعام کی رقم ملنے پر بڑھ گیا ہے۔" کارٹر نے پورے یقین سے کہا کیونکہ تھا بھی ایسا ہی۔

گلین چند سیکنڈ اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ "اس میں خطرہ بھی تو ہوسکتا ہے۔"

"کیسا خطرہ؟ ہم کون سا اسلحے کا استعمال کررہے ہیں جو جوابی حملے کا خطرہ موجود ہوگا۔" کارٹر نے ہنس کر کہا۔

"اسلحہ ہم تو استعمال نہیں کررہے لیکن جس کی ویڈیو بنائی جارہی ہوگی اگر اسے کوئی شک ہوگیا تو وہ تو اسلحہ استعمال کرسکتا ہے نا۔" گلین نے کہا۔

"تو کیا تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ ہم اس کے سامنے کھڑے ہوکر ویڈیو بنائیں گے اور وہ اس بات پر ناراض ہوگا اور ہمیں کوئی نقصان پہنچائے گا؟" کارٹر بے اختیار ہنسا۔

"پھر بھی، ڈر تو ہوتا ہی ہے لیکن کچھ حاصل کرنے، آگے بڑھنے کے لیے یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔" خدشہ ظاہر کرنے والا گلین متوقع کامیابی کا یقین کرتے ہوئے رضامند ہوگیا۔

"چلو پھر کل ہی سے اس پلان پر کام کرنے کا آغاز کرتے ہیں اور آج تک جن لوگوں نے کیمرے کی مدد سے زبردست فائدے اٹھائے ہیں، ہم بھی ان میں شامل ہوجاتے ہیں۔" کارٹر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"اور جو نتیجہ نکلے گا وہ مثبت ہوگا لیکن صرف ہمارے حق میں۔" گلین گاڑی اسٹارٹ کرکے ہنستے ہوئے بولا۔ جواباً کارٹر نے قہقہہ لگایا۔ دونوں نئے پلان کے بارے میں سوچتے ہوئے گھر کی جانب جارہے تھے۔

☆☆☆

ولیم آفس میں داخل ہوا تو گلین نے اسے غور سے دیکھا۔ لاابالی انداز میں چلتا ہوا وہ چارلی کے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں گلین نے اسے واپس جاتے ہوئے دیکھا۔

"بس ویڈیو بن جائے، اس کے بعد اس آفس میں یقیناً کچھ نیا دیکھنے کو ملے گا...... تبدیلی آئے گی۔" گلین نے سوچا۔ شیشے کے پار ولیم بڑی سی شاندار گاڑی میں بیٹھتا اسے صاف دکھائی دے رہا تھا۔

☆☆☆

"کارٹر! کیا تم اسی وقت مل سکتے ہو؟" کارٹر رات کے کھانے کی تیاری کرنے ہی والا تھا کہ گلین کا فون آگیا۔

"کیوں، خیریت؟" کارٹر نے پوچھا۔

"وہ جو پلان بنایا تھا، اس کے بارے میں اہم اطلاع ملی ہے۔" گلین نے جواب دیا۔ وہ کافی پُرجوش لگ رہا تھا۔

"ارے تم نے تو بڑی جلدی کامیابی حاصل کرلی۔ میں آرہا ہوں۔" کارٹر خوش ہوکر بولا۔ کچھ ہی دیر بعد دونوں گلین کے لاؤنج میں بیٹھے تھے۔

"کارٹر! تم نے جب اپنا پلان بتایا تھا تو مجھے ایک ڈر یہ بھی تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ولیم سدھر گیا ہو اور ہم اپنا سامنہ لے کر رہ جائیں لیکن تمہاری بات درست ثابت ہوئی۔ واقعی وہ اب بھی جوا کھیلتا ہے۔" گلین کے چہرے پر بڑی جاندار مسکراہٹ تھی۔

"ہاں، مجھے تو پہلے ہی پتا تھا۔ میں اِدھر اُدھر سے سن چکا ہوں۔ ایسی باتیں کہاں چھپی رہتی ہیں۔ میں نے ان باتوں کو سن تو لیا تھا لیکن جانتا نہیں تھا کہ ایک دن یہ میرے فائدے کے لیے کام آئیں گی۔ تم بتاؤ، کیا اس جگہ کا پتا چلا ہے جہاں ولیم جوئے کے لیے جاتا ہے؟" کارٹر نے درست اندازہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، بالکل۔ میں نے کسی ذریعے سے اس کے بارے میں مکمل معلومات لے لی ہیں۔ وہ کب، کہاں جاتا ہے اور اب بھی کیسے باپ کا پیسا برباد کر رہا ہے۔" گلین نے بتایا۔

"کسی ذریعے سے......؟ تم نے کیسے پتا کروایا یعنی کیا کسی اور کو تو پتا نہیں چل گیا ہمارے پلان کے بارے میں؟" کارٹر نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ارے بھئی میں پاگل ہوں کیا؟ کسی کو پیسے دے کر کسی کے بارے میں معلومات لینے میں کہاں ایسا ہوتا ہے کہ راز بھی اگل دیا جائے۔" گلین نے مسکرا کر کہا۔

"اوہ......!" کارٹر نے سکون کا سانس لیا۔ "گلین! ویسے تم نے مجھے حیران کردیا ہے۔ تم نے تو بڑی تیزی سے کام کیا ہے۔" کارٹر نے تعریف کی۔

"اور ایک اور سمجھداری کی بات بھی تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ گیٹ اپ بنا کر خود ہی ویڈیو بنانا بالکل بے وقوفانہ حرکت ہے۔ یہ کام بھی اسی سے کروایا جاسکتا ہے جس نے ولیم کے بارے میں معلومات دی ہیں یا کسی اور سے بھی...... بس تھوڑا سا معاوضہ دینا پڑے گا اور ہمارا اتنا بڑا کام ہوجائے گا۔" گلین نے اسے سمجھایا تو کارٹر نے فوراً اس کی بات پر رضامندی دے دی۔

"چارلی کو معلوم نہیں کہ ہم اس کے لیے کتنا بڑا کام کرنے جارہے ہیں۔" گلین نے کہا۔

"اور جب معلوم ہوگا تو پھر دیکھنا تم۔ جتنا بڑا کام ہے، اتنا ہی بڑا انعام ملے گا ہم دونوں کو۔"

"ویسے کارٹر! میں مان گیا۔ تم نے کیسے اتنا اچھا پلان بنایا۔" گلین مسکرایا۔

"ولیم مجھے ہمیشہ ہی سے بہت بُرا لگتا ہے۔ ایک بار جب چند دنوں کے لیے اسے آفس سنبھالنا پڑا تھا کیونکہ باس چارلی بزنس ٹور پر گیا تھا، تم ابھی اس آفس میں نہیں آئے تھے، تو ان دنوں اس نے میرے ساتھ کافی ناروا سلوک کیا تھا۔ ایک فائل کے معاملے پر اس نے مجھے سب کے سامنے ذلیل کیا۔ میں نے کئی بار اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کا سوچا لیکن بس میں سوچتا ہی رہا اور اب دیکھو، اس کے کرتوت اور موو ی کو دیکھ کر ملنے والا آئیڈیا کیسے میری مدد کرنے والے ہیں۔" کارٹر نے غصے اور نفرت سے کہا۔

"ولیم کے ساتھ کافی بُرا ہوجائے گا، ہے نا؟" گلین ہنسا۔

"ولیم کے ساتھ اس سے بھی زیادہ بُرا ہونا چاہیے۔ وہ ہے ہی اس لائق، آوارہ، باپ کا نافرمان۔ ساری محنت تو چارلی کی ہے۔ وہ اچھا انسان بھی ہے۔ واقعی ولیم کو کچھ بھی نہیں ملنا چاہیے...... اور اس نے میرے ساتھ برا کیا تھا، اس کے لیے تو اسے سزا ضرور ملنا چاہیے۔" کارٹر کے لہجے میں غصہ تھا۔

☆☆☆

"بہت اہم فائل تھی کارٹر! کہاں گنوادی تم نے؟" چارلی پریشانی اور غصے سے بولا۔

"سر! سمجھ نہیں آرہی کہ فائل کہاں گئی۔ میں نے تو وہیں رکھی تھی جہاں ہمیشہ رکھتا ہوں۔" کارٹر بھی پریشان تھا۔ بڑی اہم فائل جو اس کے پاس موجود تھی، غائب ہوچکی تھی۔ چارلی نے اسے آفس طلب کرلیا تھا اور اس پر بہت برہم تھا۔

"وہاں رکھی تھی تو پھر کیا جادو سے غائب ہوگئی؟" چارلی نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ "جاؤ اور تلاش کرواسے۔ میرا بہت بڑا نقصان ہوجائے گا اگر وہ فائل نہ ملی تو۔" چارلی کا غصہ بڑھتا جارہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنا یا کارٹر کا سر دیوار پر دے مارے۔ کارٹر آفس سے باہر نکلا اور اپنی کرسی پر سر تھامے بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا کارٹر؟" گلین نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ کارٹر نے چونک کر سر اٹھایا۔ گلین اس کے پاس کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر تشویش تھی۔

"بہت بڑا مسئلہ ہوگیا ہے۔ کمپنی کی ایک اہم فائل......" کارٹر بتانے ہی والا تھا کہ اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اسے ایک بار پھر آفس میں بلایا گیا تھا۔ گلین اپنی سیٹ پر جاکر بیٹھ گیا۔ اپنے کمرے کی شیشے کی دیوار کے پار اسے باس چارلی کا کمرا نظر آرہا تھا۔ کارٹر اندر جاچکا تھا۔ گلین اس کمرے کے بند دروازے پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

☆☆☆

"یہ...... یہ...... میں نہیں ہوں۔" کارٹر ہکلایا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ اسکرین پر نظر آنے والے منظر نے اس کے ہوش اڑادیے تھے۔

''اچھا...... واقعی؟'' چارلی کے لہجے میں غصہ اور طنز دونوں ہی تھے۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں باس! میرا یقین کریں۔'' کارٹر رو دینے کو تھا۔

''بہت خوب۔ جو فائل صرف تمہارے پاس تھی، اب غائب ہے اور اسکرین پر دکھائی دے رہا ہے کہ وہی فائل تم کسی کو پکڑا رہے ہو اور پھر ایک لفافہ پکڑ رہے ہو۔ اس سب کے بعد تم کہتے ہو کہ یہ تم نہیں ہو۔'' چارلی کا لہجہ خوفناک حد تک سرد ہو چکا تھا۔

''باس! میری سمجھ میں نہیں آرہا......!'' کارٹر کے پسینے چھوٹ گئے۔

''میری بھی سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم نے مجھے دھوکا کیوں دیا؟'' چارلی نے دانت پیسے اور پھر بولا۔ ''کتنے پیسے ہیں اس لفافے میں غدار؟'' چارلی نے دانت کچکچائے۔

''باس! یقین کریں، یہ میں نہیں ہوں۔ کسی نے میرے خلاف سازش کی ہے۔ یہ فیک ویڈیو ہے۔ اس میں موجود چہرہ تو میرا ہے لیکن دراصل کوئی اور ہے اور دیکھیں فائل پکڑنے اور لفافہ دینے والے کا چہرہ ماسک میں چھپا ہوا ہے۔ صاف لگ رہا ہے کہ کسی نے مجھے پھنسانے کے لیے پہلے کمپنی کی اہم ترین فائل چرائی جو میرے پاس تھی پھر یہ جعلی ویڈیو......'' کارٹر کی بات ادھوری رہ گئی۔

''کوئی تمہارے خلاف کیوں سازش کرے گا۔ کیا تمہارا ایسا کوئی دشمن ہے جو وہ فائل اڑالے جو صرف تمہاری ڈیسک یا الماری میں ہی موجود تھی؟'' اس بار چارلی دہاڑا۔

''مجھے نہیں معلوم۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ یہ ویڈیو جعلی ہے۔'' کارٹر کے لہجے میں بے بسی و بے چارگی تھی۔ یکدم چارلی اٹھا اور اس سے پہلے کہ کارٹر کچھ سمجھتا، چارلی نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ دے مارا۔

''گھٹیا آدمی! فراڈ کرتے ہو اور اوپر سے معصومیت کا ڈھونگ رچا رہے ہو۔ دیکھنا اب میں کیا کرتا ہوں تمہارے ساتھ۔ نکل جاؤ میرے کمرے سے۔ دفع ہوجاؤ۔'' چارلی نے انتہائی غصے سے کہا۔

☆☆☆

گلین بار بار باس کے روم کی جانب دیکھ رہا تھا اور بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔

'نہ جانے کارٹر اور باس میں کیا بات ہو رہی ہو گی؟' وہ بار بار ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ باس کے روم کا

دروازہ کھل گیا۔ گلین نے دیکھا، کارٹر مرے مرے قدموں کے ساتھ باہر آرہا تھا۔ گلین تیزی سے اٹھا اور اس کے کیبن کی جانب بھاگا تاکہ اندر ہونے والی گفتگو کے بارے میں جان سکے۔

''کارٹر! کون سی فائل کی بات کرنے والے تھے تم......؟ کیا ہوا ہے؟ تمہیں باس نے کیوں بلایا تھا؟'' گلین نے تیز لہجے اور ایک ہی سانس میں اتنے سوال کر ڈالے۔

''گلین! میں بہت بڑی سازش کا شکار ہو چکا ہوں۔ بہت بڑی افتاد آن پڑی ہے۔'' کارٹر رو دینے کو تھا۔

''کیا ہوا؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔'' گلین نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ کارٹر نے ساری بات اسے بتائی تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''بہت برا ہوا ہے کارٹر! مجھے یقین ہے کہ تم ایسا نہیں کر سکتے اس لیے گھبراؤ مت۔ باس کو بھی اس بات کا یقین آجائے گا۔'' گلین اسے تسلی دینے لگا۔

''لیکن ایسا کون کر سکتا ہے میرے ساتھ؟'' کارٹر نے دونوں ہاتھوں میں سر تھاما ہوا تھا۔

''کوئی تمہارا مخالف، تمہارا دشمن ہی ایسا کر سکتا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون؟ اور دیکھو یہ بات ان دنوں میں ہوئی ہے جب ہم دونوں ایک پلان ترتیب دے کر اس پر عمل کرنے ہی والے تھے۔'' گلین دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔ کارٹر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا اپنے ہاتھ رگڑ رہا تھا۔ گلین اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''کارٹر! دماغ پر زور دو پلیز! مجھے یقین ہے تمہارے ذہن میں ضرور کچھ ایسا آجائے گا جس سے کوئی کلیو مل جائے۔'' گلین نے نرمی سے کہا۔

''دماغ پر زور دینے کی ہمت کہاں سے لاؤں۔ میرے اعصاب اس اچانک پڑنے والی مصیبت سے ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ میں تو کچھ بھی......''

''شش......!'' گلین نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور تیزی سے ایک طرف کو گیا اور چند سیکنڈ بعد واپس آیا۔

''کیا ہوا، کون تھا؟ تم مجھے چپ کیوں کروا رہے تھے؟'' کارٹر نے گھبرائے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''جب میں اور تم بات کر رہے تھے تو مجھے شک پڑا کہ کوئی ہماری باتیں سن رہا ہے لیکن میں نے پہلے تو غور نہ کیا لیکن اب واضح ایک سایہ سا نظر آیا تھا اس لیے میں تمہیں اشارہ کر کے باہر گیا تھا لیکن وہ جو کوئی بھی تھا، بڑی تیزی سے غائب ہو گیا۔'' گلین نے دھیمی لیکن تشویش بھری آواز میں بتایا۔

''اس کا مطلب ہے یہیں کہیں میرا کوئی دشمن موجود ہے جو مجھے پھنسانے کے بعد مزید کچھ کرنے کے لیے ہماری باتیں سن رہا تھا۔'' کارٹر مزید گھبرایا۔

''ہاں، میں اب جاتا ہوں۔ تم ذرا محتاط رہو۔'' گلین نے آہستگی سے کہا۔

''لیکن گلین......! اب کیا ہوگا؟ سوچ سوچ کر میرا دل کانپ رہا ہے۔'' کارٹر کی گھبراہٹ عروج پر تھی۔ گلین نے کوئی بھی جواب نہ دیا اور کارٹر کے ہاتھ پر تھپکی دے کر باہر نکل گیا۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ کارٹر کو ''اب کیا ہوگا'' کا جواب مل گیا۔

باس چارلی نے کمپنی کے ساتھ بہت بڑا فراڈ کرنے کے پکے ثبوت کے بعد پولیس کو بلا لیا تھا۔ کارٹر اپنی بے گناہی پر ڈٹا ہوا تھا لیکن اس کی بات پر یقین نہ کرتے ہوئے اسے لے جایا جا رہا تھا۔

''کارٹر! ڈرنا مت میرے دوست! جلد حقائق سامنے آجائیں گے اور تم آزاد ہو جاؤ گے۔'' گلین نے اس کے قریب آکر اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ کارٹر کی آنکھیں نم تھیں اور وہ شکست خوردہ سا پولیس وین کی جانب جا رہا تھا۔

گلین نے اپنی کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں موند لیں۔ وہ دو روز قبل اپنی اور اس کمپنی سے تعلق رکھنے والے ایک اہم شخص کی ملاقات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

''کیوں ملنا چاہتے تھے تم مجھ سے؟'' ولیم نے میز پر ٹانگیں رکھتے ہوئے سوال کیا۔

''سر! ایک خاص بات کرنا تھی آپ سے۔'' گلین نے جواب دیا۔ اگر کارٹر اسے یہاں دیکھ لیتا تو شدید حیران ہوتا اور اگر اسے پتا چل جاتا کہ اس کا دوست یہاں کیا کرنے آیا ہے تو وہ مارے حیرت اور صدمے کے یقیناً مر ہی جاتا۔

''کیا خاص بات؟'' ولیم چونکا۔ آج دوپہر لنچ کے وقت جب وہ اپنے پسندیدہ ہوٹل میں تھا تو اچانک گلین بھی وہاں پہنچ گیا اور اجازت طلب کر کے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے بیٹھتے ہی بغیر کوئی تمہید باندھے اسے کہا تھا کہ وہ اس سے ایک اور ہوٹل میں شام کے وقت ملے۔ بہت اہم بات ہے۔ ولیم نے اپنی کمپنی کے ملازم کی بات سن کر کچھ خاص رد عمل نہ دیا تو گلین بولا۔

"سر! آپ کے والد اور آپ کی جائداد کے بارے میں بہت خاص خبر ہے۔" ولیم نے ذرا چونک کر اس کی جانب دیکھا اور چند لمحے سوچنے کے بعد اس جگہ ملنے کی ہامی بھر لی جہاں گلین نے کہا تھا اور اب دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

"خاص بات یہ ہے کہ آپ کا کوئی مخالف آپ کو جائداد سے عاق کروانے کا مکمل بندوبست کیے ہوئے ہے۔ اس نے ایک سازش تیار کی ہے اور اگر آپ نے بروقت قدم نہ اٹھایا تو باپ کی طرف سے شدید ردعمل کے ساتھ ساتھ سوسائٹی میں بہت بدنامی کا بھی سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔" گلین نے بات کا آغاز کیا تو ولیم نے بڑے غور سے اس کی جانب دیکھا۔

"اچھا...... کون ہے وہ جو یہ چاہتا ہے؟" ولیم کا لہجہ عام سا تھا۔ اسے لگا کہ گلین ایسے ہی اس کی گڈبک میں آنے کے لیے یہ کہہ رہا ہے۔

"شاید آپ کو یقین نہیں آ رہا؟" گلین نے اتنی بڑی بات بتانے کے بعد کوئی بھی خاص تاثرات اس کے چہرے پر نہ پا کر پوچھا۔ ولیم اب بھی اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"کارٹر...... کارٹر ہے وہ جو بڑے پکے ثبوت کے ساتھ یہ سب کرنے والا ہے۔" گلین نے نام لیا اور ثبوت کا بھی ذکر کیا تو پہلی بار ولیم ذرا متوجہ ہوا۔

"جلدی بولو۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"مجھے پتا چلا ہے کہ کارٹر آپ کی جوا کھیلتے......" گلین نے وہ ساری بات بتا دی جو کارٹر نے اس کے ساتھ کی تھی۔ بس یہ حذف کر دیا کہ بات کس کے ساتھ یعنی گلین کے ساتھ ہوئی ہے۔

"میں تمہاری بات کا کیسے یقین کر لوں؟" ولیم کے چہرے پر غصے کے تاثرات واضح تھے۔ وہ اپنے دشمن کو جلد از جلد نمٹانا چاہ رہا تھا۔

"یہ لیں۔" گلین نے موبائل اس کے سامنے کر دیا۔ یہ اس روز کی ریکارڈنگ تھی جب کارٹر کو گلین نے اپنے گھر بلایا تھا اور اس سے پلان کے بارے میں مکمل گفتگو کی تھی۔ ریکارڈنگ میں کارٹر اور اس کی بات چیت بڑی واضح دکھائی و سنائی دے رہی تھی۔ اس کا ولیم کے لیے غصہ و نفرت بھرا لہجہ بڑا نمایاں تھا۔ وہ جس سے بھی بات کر رہا تھا، وہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ولیم ہونٹ بھینچے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے تاثرات تھے۔

"اوہ...... تو یہ ہے آستین کا سانپ...... میرے باپ کے کاروبار سے مجھے ہی الگ کرنا چاہتا ہے...... میں اسے شوٹ کر دوں گا۔" ولیم پھنکارا۔

"نہیں، شوٹ نہیں۔ اس طرح تو آپ جیل جائیں گے اور آپ کے ڈیڈی کے لیے باس چارلی کو اپنا اکلوتا وارث بنانے میں کافی آسانی ہو جائے گی کہ نافرمان بیٹا آوارہ بھی ہے اور اب قتل بھی کر دیا۔" گلین نے اسے سمجھایا۔

"تو...... تو پھر میں کیا کروں؟"

"آپ کا کیا خیال ہے کہ میں صرف آپ کو اطلاع دینے آیا تھا کہ آپ کے خلاف سازش تیار ہو رہی ہے؟" گلین نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"یعنی؟" ولیم کو صاف معلوم ہوا کہ گلین بھی کوئی پلان بنائے ہوئے ہے۔

"کارٹر ایک ویڈیو کے ذریعے یہ سب کرنا چاہتا ہے تو کیا اس کے خلاف کوئی ویڈیو نہیں بنائی جا سکتی؟" گلین مسکرایا۔

"کیسی ویڈیو اور کیسے...... اور کون بنائے گا؟" ولیم نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"ویڈیو بن چکی ہے اور میں نے بنائی ہے۔ دراصل میں اس کے کافی قریب ہوں اور وہ مجھ پر کافی اعتماد بھی کرتا ہے اس لیے میرے لیے ویڈیو بنانا بہت آسان رہا۔" گلین نے میز پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے بتایا۔

"کیا ہے اس میں؟" ولیم نے بے تابی سے پوچھا۔

"ایسا کچھ...... کہ نہ صرف اس کی بے عزتی ہوگی اور کمپنی سے نکالا جائے گا بلکہ ساتھ ہی اس پر فراڈ کا کیس بھی بن جائے گا۔" گلین نے کہا۔

"اوہ...... گڈ! تو لاؤ وہ ریکارڈنگ مجھے دے دو۔" ولیم نے یوں ہاتھ بڑھایا جیسے کوئی عام سی چیز لیتا ہو۔

"کیسے دے دوں؟" کہتے ہوئے گلین نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لیا۔ اس نے "کیسے" پر خوب زور دیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

"سمجھ گیا۔ تمہیں اس کا معاوضہ چاہیے ہوگا؟" ولیم سمجھ گیا تھا۔

"تو اور کیا سر! میں نے یہ محنت اسی لیے تو کی ہے کہ اس کام کا "اچھا سا معاوضہ" لے سکوں۔" گلین کہیں سے بھی وہ گلین نہیں لگ رہا تھا جو عام سے ذہن کا، کام سے کام رکھنے والا شخص تھا۔

"کیا چاہیے تمہیں؟" ولیم آگے جھک کر بولا۔

''سر! آپ کو بہت بڑی معصیت اور جائداد سے محروم ہونے سے بچایا ہے اس لیے منہ مانگی قیمت لوں گا۔'' گلین نے سنجیدگی سے کہا۔
''بولو۔'' ولیم سکون سے بولا۔
''زبردست پروموشن اور بینک اکاؤنٹ میں قابلِ ذکر اضافہ۔'' گلین نے اپنی ڈیمانڈ بتائی۔
''ہو جائے گا۔ اب تم ویڈیو میرے حوالے کردو۔'' ولیم فوراً مان گیا۔
''آدھا معاوضہ کام سے پہلے اور آدھا کام ہونے کے بعد۔'' گلین نے مطالبہ کیا۔ ''رقم ویڈیو دینے سے پہلے اور کارٹر کے خلاف کارروائی ہونے کے بعد اس کمپنی میں میری پروموشن۔'' وہ مزید بولا۔
ولیم نے چند گھنٹوں میں اس کی ڈیمانڈ پوری کردی اور اس سے وہ ویڈیو لے لی جس میں کارٹر کمپنی کی ایک اہم فائل کسی کو دے کر رقم وصول کر رہا تھا۔ گلین کو مالی فائدہ تو مل ہی رہا تھا، ساتھ ہی وہ ولیم کی گڈ بک میں بھی آ گیا تھا۔ کمپنی کا آدھا مالک اس کی ہمیشہ پشت پناہی کے لیے تیار تھا جس کے مطابق بڑے طریقے سے پلان تیار کیا گیا تھا۔
ولیم نے پہلے تو چارلی کو فون کر کے کہا۔ ''تمہاری ایک اہم فائل غائب ہے جو کارٹر کے پاس تھی۔ ذرا معلوم کرو کہ کہاں گئی؟''
چارلی پریشان ہو گیا اور پوچھا۔ ''تم یہ بات کیوں کر رہے ہو؟ فائل کے بارے میں کچھ جانتے ہو تو بتاؤ۔''
جواباً ولیم نے کہا۔ ''پہلے اس سے بات تو کرو پھر میں تمہیں کچھ اہم بتاؤں گا اور ثابت کردوں گا کہ میں اچھا بیٹا اور اچھا بھائی ہوں جو اپنے بزنس سے ہرگز لاتعلق نہیں رہتا۔''
چارلی نے فوراً کارٹر کو بلایا اور اس سے تسلی بخش جواب نہ پا کر ولیم سے رابطہ کیا تو اس نے وہ ویڈیو اسے بھیج دی جو گلین نے اس کے گھر سے فائل چرا کر تیار کرلی تھی۔ سب کچھ حسبِ توقع رہا۔ کارٹر بری طرح پھنس گیا۔ ولیم کی وقعت یکدم فیملی کے سامنے بڑھ گئی اور گلین کی جاب و مالی پوزیشن مزید مستحکم ہو گئی۔ اس پر کارٹر کو ہلکا سا شک بھی نہیں ہوا تھا۔ گلین نے اس کے پاس جا کر اسے تسلی دی تھی۔ چہرے پر شدید پریشانی کے تاثرات رکھے تھے۔ کارٹر کچھ بھی نہ سمجھ پایا نہ کر پایا۔ فائل کا غائب ہونا اور پھر ویڈیو دونوں کارٹر کو بری طرح پھنسانے کے لیے کافی تھے۔ اگر کسی اور نے فیک ویڈیو بنائی ہوتی تو کارٹر کسی نہ کسی طرح مسئلہ حل کر لیتا اور کیس سے بچ جاتا لیکن یہاں معاملہ ولیم کے ہاتھ میں تھا جس نے کارٹر کے خلاف بڑے پکے انتظامات کر رکھے تھے۔

☆☆☆

''میں بری طرح سے ڈیل کیا گیا ہوں۔ اتنا عرصہ میں نے کمپنی میں کام کیا مگر میرا اعتبار نہیں کیا گیا۔'' کارٹر بہت دکھی نظر آ رہا تھا۔ گلین اس سے ملنے کے لیے جیل گیا تھا۔
''کارٹر! تمہیں کسی پر شک نہیں ہے؟'' گلین نے اسے ٹٹولنے کے لیے پوچھا۔
''شک تو کسی پر بھی نہیں ہے لیکن مخالف تو بہت ہیں۔ کوئی بھی مجھے وہاں سے نکلوانے کے لیے یہ سب کر سکتا ہے۔'' کارٹر دھیرے سے بولا۔
''میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہارے لیے اس سلسلے میں کچھ کر سکوں۔'' گلین نے دلاسا دیا۔ کارٹر خاموش رہا۔
''تم جب باہر آؤ گے، دیکھنا چند دن میں ہی ان بُرے دنوں کو بھول جاؤ گے۔'' گلین مزید بولا۔
''میں اب اس شہر میں نہیں رہوں گا۔ میری بہت بدنامی ہوئی ہے۔ میرا اتنا اچھا عہدہ تھا لیکن جس طرح میں وہاں سے رسوا ہو کر نکلا ہوں، وہ میں بُھلا نہیں سکتا۔'' کارٹر کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔
''اچھا، میں چلتا ہوں۔ جب تک تمہارا مسئلہ حل نہ ہو جائے، آتا رہوں گا۔'' گلین نے اٹھتے ہوئے کہا۔
''تھینک یو گلین! اس معصیت میں تم نے اخلاقی طور پر مجھے بہت سپورٹ کیا ہے۔'' کارٹر نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔
''بھئی تمہارا فرینڈ ہوں...... بیسٹ فرینڈ۔ یہ سب میں نہیں تو اور کون کرے گا؟'' گلین نے اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ کارٹر کی آنکھوں میں اس کے لیے ممنونیت تھی۔ گلین اٹھا اور باہر نکل آیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

''گلین! کچھ ہی لمحوں میں تمہاری پسندیدہ گاڑی تمہارے گھر کے سامنے پہنچنے والی ہے۔'' رابطہ ہوتے ہی ولیم نے خوشخبری سنائی۔ گلین بہت خوش تھا۔ اس کے کیے گئے بڑے کام کا بڑا معاوضہ اس کو مل رہا تھا۔ پیسا، گاڑی، نئی رہائش گاہ۔ اس کی زندگی بدل گئی تھی۔
کارٹر اپنے ہی بچھائے جال میں خود ہی پھنس گیا تھا۔

جو پلان اس نے بنایا تھا، بالکل ویسا ہی پلان اس کے خلاف بن گیا۔ اس کا سوچ سوچ کر دماغ پھٹ رہا تھا کہ کس نے اسے اس حال تک پہنچایا؟

"گلفین میرا کافی خیال رکھ رہا ہے۔ میرا اچھا دوست ہے۔ اگر وہ ساتھ نہ دیتا تو میرا اس سے بھی زیادہ بُرا حال ہو جاتا۔" اس نے سوچا۔

"معلوم نہیں میں اس مصیبت سے کب نکلوں گا...... سب ٹھیک ہو جائے گا...... میری حیثیت کلیئر ہو جائے گی، تب بھی وہ صورتِ حال تو نہیں رہے گی نا جو پہلے تھی۔" اس نے سر پکڑ لیا۔

"گلفین ملنے آئے گا تو اس سے کہوں گا کہ وہ کسی طرح پتا کرے کہ کس نے میری فائل اٹھائی اور پھر اس کی مدد سے فیک ویڈیو......" کارٹر سوچتے سوچتے رک گیا۔ اس کے ذہن میں یکدم جھماکے سے ہونے لگے۔ فائل...... ویڈیو...... باس سے فائدہ...... قریبی دوست کا سازش تیار کرنا...... کئی چیزیں بیک وقت اس کے دماغ میں آگئیں۔

"یہ میں نے پہلے کیوں نہیں سوچا؟" کارٹر کے چہرے پر غصے اور نفرت کے تاثرات تھے۔ وہ اپنی مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔

☆☆☆

"کیسے ہو کارٹر؟ میں ذرا مصروف تھا اس لیے ملنے نہیں آسکا۔" گلفین اس سے ملنے جیل آیا تھا اور اب اس کا حال دریافت کر رہا تھا۔

"تم سناؤ، تم کیسے ہو؟ تم تو یقیناً بہت مزے میں ہو گے، ہے نا؟" کارٹر نے چبا چبا کر کہا۔ گلفین چونکا۔

"کیا مطلب؟" اس نے کارٹر کو دیکھ کر معصومیت بھرا سوال کیا۔

"اس سب کے پیچھے تم ہو گلفین......! تم ہی ہو جس نے مجھے اس حال تک پہنچایا...... کتنا پاگل ہوں میں، اتنی دیر سے سمجھا۔" کارٹر دانت پیس رہا تھا۔

"اوہ...... تو تمہیں پتا چل گیا۔" گلفین مسکرایا۔

"ہاں، مجھے اچھی طرح پتا چل گیا ہے کہ تم بہت گھٹیا اور نیچ ذہنیت کے ہو۔ اپنے ہی دوست کی فیک ویڈیو بنوا کر اسے پھنسوایا۔ تم نے ہی فائل اڑائی تھی۔ ہے نا؟" کارٹر غصے میں بول رہا تھا۔

"فیک ویڈیو ہی نہیں...... اصل ویڈیو بھی بنائی۔ وہی جس میں تم ولیم کے خلاف پلان بنا رہے تھے۔" گلفین نے اسے مزید چڑایا۔ کارٹر کا دل اس کا منہ نوچنے کو کر رہا تھا لیکن وہ بے بس تھا۔

"اور کارٹر یاد ہے جس موی کو دیکھنے کے بعد تم نے اور پھر میں نے یہ آئیڈیا لیا، تم نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وارنر منفی ضرور ہے لیکن جو کچھ نتیجہ ہے وہ اس کے حق میں مثبت ہے...... بھئی میں نے تو تمہاری اس بات کو بہت پسند کیا...... اور ہاں یاد آیا، اس میں بھی تو دوست ہی نے دوست کو پھنسایا تھا۔" گلفین ڈھٹائی سے بولے جا رہا تھا۔

"گلفین! ہم دونوں فائدہ اٹھانے والے تھے۔ میں نے تمہیں اپنا سمجھ کر اپنے پروگرام میں شامل کیا تھا اور تم......" کارٹر غم و غصے میں تھا۔

"تمہارا شکریہ کہ تم نے مجھے اپنے ساتھ شامل کیا لیکن کارٹر میرے دل میں ایک خیال پیدا ہوا...... یعنی بڑا زبردست خیال کہ اگر کچھ کر کے انعام دو لوگوں نے حاصل کرنا ہے تو وہ آدھا آدھا ہو گا۔ کیوں نہ میں اکیلا ہی سارا فائدہ اٹھاؤں...... بس اسی لیے یہ سب کیا۔" گلفین نے اپنی کارستانی کی بڑی "معقول" وجہ بتائی۔

"میں باہر آجاؤں پھر دیکھنا تم۔ میں تمہیں برباد کر دوں گا۔" کارٹر نے دھمکی دی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ ولیم تمہیں اتنی جلدی باہر آنے دے گا؟ مسٹر کارٹر! تم نے اس کی زندگی تباہ کرنے، اسے کوڑی کوڑی کا محتاج کرنے کی بھیانک سازش تیار کی تھی۔ وہ تمہیں مزید تنگ کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا اور...... میں نے اسے کوڑی کوڑی کا محتاج ہونے سے بچایا ہے...... مجھے وہ کبھی بھی برباد نہیں ہونے دے گا۔ جب بھی تم باہر آؤ گے تو بے شک آزما لینا۔" گلفین اٹھ کھڑا ہوا۔ یقیناً یہ اس کی اور کارٹر کی اس جگہ پر آخری ملاقات تھی۔

"کارٹر!" گلفین جاتے جاتے رکا۔ "میں جانتا ہوں کہ میں نے ایک منفی کام کیا ہے لیکن مثبت تو تم بھی نہیں تھے۔ تم نے جس کے خلاف سازش کی، میں نے اسے سازش کا شکار ہونے سے بچا لیا۔ غور کرو تو تم اور میں، دونوں ہی گھٹیا ہیں۔" گلفین نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ کارٹر اب اسے گھور بھی نہیں رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"اور ہاں کارٹر! تم نے درست کہا تھا...... یہ کیمرا واقعی بڑے کام کی چیز ہے۔ کیا خوب کام کیا اس نے...... شکریہ میرے دوست، مجھے زبردست آئیڈیا دینے کے لیے۔" گلفین نے آخری جملہ کہا اور باہر نکل آیا۔

⌘⌘⌘

مزاج پُرسی

مرزا امجد بیگ

زن... زر... اور زمین کے مسائل نے ہمیشہ جرائم کی پرورش کی ہے... وہ جو حُسنِ زن کا اسیر ہوا اور اپنا ہی زر گنوا بیٹھا اور پھر لالچ نے سر اٹھایا اور زمین کے خواب آنکھوں میں بس گئے مگر... اس بار بھی وہی ہوا جس کا اسے نہ تو ڈر تھا اور نہ ہی یقین کہ اچانک بیگ صاحب سے ہونے والی ملاقات سے چند دنوں میں ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی یوں الگ ہو جائے گا مگر... کسی کو ڈر اور یقین ہو یا نہ ہو... قدرت تو اپنا قانون نہیں بدل سکتی تھی... لہٰذا قدرت کا اشارہ ہوا اور بیگ صاحب کی طوفانی دلیلوں نے سارا مطلع صاف کر دیا... نہ زن رہی... نہ زر رہا اور نہ ہی زمین کے خواب پورے ہوئے۔

قتل کی سازش میں زبردستی لپیٹنے والے ایک

بھائی کا بھائی کے خلاف مقدمے کا احوال

کافی غور و خوض کے بعد میں نے قتل کے ایک ملزم حبیب اللہ کا کیس لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی بیوی غزالہ نے مجھ سے ایک ایسی بات کہہ دی تھی کہ میں اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ہماری پہلی ملاقات سٹی کورٹ کے زینوں پر ہوئی تھی۔ میں سیکنڈ فلور کی ایک عدالت سے نکل کر نیچے جا رہا تھا کہ میرے ساتھ زینہ اترنے والی ایک عورت نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''وکیل صاحب! مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔ کیا آپ مجھے اپنے صرف دس منٹ دے سکتے ہیں؟''

اس قسم کی درخواستیں وکلاء حضرات کو اکثر سننے کو ملتی ہیں۔ وکلاء برادری اور جج حضرات کے علاوہ عدالتوں کے اندر اور باہر عموماً دو طرح کے لوگ اِدھر سے اُدھر حرکت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو وہ ہیں جو کسی نہ کسی حوالے سے زیرِ سماعت کیسز سے متعلق ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جنہیں کسی وکیل کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ اپنے حق کے حصول کے لیے یا پھر کسی حق تلفی سے بچنے کے لیے وکیل کی مدد کے متلاشی اور محتاج ہوتے ہیں۔ عدالت سے انصاف حاصل کرنے کی غرض سے انہیں کسی قابل وکیل کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

میں نے اس اجنبی خاتون کو آخر الذکر کیٹیگری میں رکھتے ہوئے سرسری انداز میں سوالیہ جواب دیا۔ ''آپ

کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتی ہیں؟''
''سلسلہ تو اس وقت زیرِ بحث آئے گا جب آپ کہیں رک کر میری بات سننے کے روادار ہوں گے۔'' اس نے شائستہ انداز میں کہا۔ ''آپ تو کسی ایکسپریس ٹرین کی طرح بھاگے ہی چلے جا رہے ہیں۔''
وہ اپنے لب و لہجے سے تعلیم یافتہ اور مہذب لگ رہی تھی۔ میں نے تعلیم اور مہذب کے الفاظ ایک ساتھ اس لیے استعمال کیے ہیں کیونکہ تعلیم اور تہذیب دو الگ چیزیں ہیں۔ آپ کے اردگرد اکثر لوگ تعلیم یافتہ اور بڑی بڑی ڈگری ہولڈرز ہوتے ہیں لیکن تہذیب انہیں چھو کر نہیں گزری ہوتی کیونکہ ان کے والدین نے انہیں جدید مغربی تعلیم دلوانے کے لیے لاکھوں اور کروڑوں روپے خرچ کیے ہوتے ہیں مگر ان کی تربیت پر ذرا دھیان نہیں دیا ہوتا اور سچی بات تو یہ ہے کہ تربیت کے بغیر کوئی شخص تہذیب کے ''ت'' کا بھی ادراک نہیں پا سکتا۔ شائستگی اور خوش اخلاقی اس کے قول و فعل میں کہاں سے آئے گی؟
ویسے اس عورت کا یہ اعتراض صد فیصد جائز اور درست تھا کہ میں بغیر رکے، زینے اترتے ہوئے اس سے ہمکلام تھا۔
''اب تو یہ ایکسپریس ٹرین بلڈنگ سے باہر آ چکی اور اس کے ساتھ ہی آپ بھی۔'' میں نے پیشِ منظر میں نگاہ دوڑاتے ہوئے سرسری انداز میں کہا پھر کینٹین کے نزدیک استادہ ایک عمر رسیدہ گھنے سایہ دار درخت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''چلیں، وہاں ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر آپ کے سلسلے کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔''
وہ بلاتردد میرے ہمراہ ہولی۔
وہ ماہ مئی کی کھوپڑی کے اندر دماغ کو پگھلا دینے والی ایک تپش زدہ دوپہر تھی۔ ہم دونوں مذکورہ درخت کی گھنیری چھاؤں میں بچھی کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھ چکے تو میں نے گہری نظر سے اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔
میرے محتاط اندازے کے مطابق اس کی عمر تیس سے متجاوز مگر چالیس سے کم تھی۔ درمیانہ قد، گہری گندمی رنگت اور پُرکشش خال و خط۔ اس کی آنکھیں نمایاں اور خوبصورت تھیں۔ بھرے بھرے بدن کے ساتھ وہ بلاشبہ ایک حسین اور جاذبِ نظر عورت تھی۔ میں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس خوش شکل عورت سے پوچھا۔
''آپ کے لیے ٹھنڈا منگواؤں یا گرم؟''
''اس آگ برساتی جہنمی فضا میں گرم تو کوئی پاگل انسان ہی لینا چاہے گا بیگ صاحب!'' اس نے بیزار کن لہجے میں جواب دیا۔ ''اور میں ٹھنڈے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کر رہی۔ بس، آپ توجہ سے میری بات سن لیں۔''
اس کی زبان سے ''بیگ صاحب'' کے الفاظ سن کر میں چونک اٹھا اور میں نے بے ساختہ پوچھ لیا۔ ''آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟ میرے خیال میں آج ہم پہلی بار مل رہے ہیں۔''
''میرا نام غزالہ ہے۔'' وہ اپنا تعارف کرانے کے بعد میرے خیال کی تصدیق کرتے ہوئے بولی۔ ''بے شک یہ ہماری پہلی ملاقات ہے اور میں آپ کے نام کے آخری حصے یعنی ''بیگ صاحب'' سے بھی ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی واقف ہوئی ہوں۔ آپ جس عدالت سے نکلے ہیں نا، میں وہیں سامعین کے درمیان موجود تھی۔''
''آپ اس عدالت میں کیا کر رہی تھیں غزالہ صاحبہ؟'' میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے استفسار کیا۔
''میں پچھلے دو ماہ سے سٹی کورٹ کے چکر کاٹ رہی ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں نے یہاں بسے ہوئے انسانوں کے جنگل کو پہلی بار دیکھا ہے اور وہ بھی کسی شوق میں نہیں، بلکہ مجھے مجبوراً یہاں آنا پڑتا ہے۔''
میں نے ایک ویٹر کو اشارہ کر کے دو کولڈ ڈرنکس کا آرڈر دے دیا۔ غزالہ نے میرے اس عمل پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ میں نے اس کی نرگسی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنے سوال کو دہرا دیا کیونکہ اس نے ابھی تک مجھے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔
''آپ عدالت میں کیا کر رہی تھیں؟''
''مجھے اپنے شوہر حبیب اللہ کے لیے کسی قابل وکیل کی تلاش تھی اور وہی بات کہ ڈھونڈنے والے کو تو اللہ بھی مل جاتا ہے۔ سو، آپ مجھے مل گئے۔'' وہ ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔ ''میں نے آپ کی آج کی ساری جرح اور دلائل کا نظارہ کیا ہے۔ اس کے بعد ہی میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ صرف آپ ہی حبیب اللہ کو اس مصیبت سے نجات دلا سکتے ہیں۔''
بات کے اختتام پر اس کی آواز میں نمی اتر آئی تھی۔ میں نے معتدل انداز میں پوچھا۔ ''آپ کا شوہر حبیب اللہ کس مصیبت میں گرفتار ہے؟''
''وہ ایک ناکردہ جرم میں جیل چلا گیا ہے اور حبیب

اللہ کو اس حال تک پہنچانے والا کوئی غیر نہیں بلکہ اس کا اکلوتا چھوٹا بھائی منیب اللہ ہے۔ اس کمینے شخص نے پولیس کے ساتھ مل کر ایسی سازش بنی ہے کہ حبیب اللہ ایک عورت کے قتل کے الزام میں اس وقت جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے ہے۔ اس کا کیس عدالت میں چل رہا ہے مگر حبیب اللہ کا وکیل اس کے معاملے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لے رہا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی منیب اللہ کے ہاتھوں بک چکا ہے۔ بہت ہی تشویش ناک اور واہیات صورت حال ہے بیگ صاحب!''

''آپ کا شوہر کام کیا کرتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اور مقتولہ کون ہے؟ مقتولہ کا آپ کے شوہر سے کیا تعلق ہے؟''

''مقتولہ کا نام صبا شامی ہے۔'' غزالہ نے بتایا۔ ''وہ ایک فوڈ میگزین ''ڈائن گک بک'' کے نام سے نکالتی تھی۔ حبیب اللہ اسی میگزین میں بطور پیسٹر کام کرتا تھا۔ ڈائن گک بک کا آفس آئی آئی چندریگر روڈ پر ہے۔''

''صبا شامی کو کب اور کہاں قتل کیا گیا تھا؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔ ''اور یہ بھی بتائیں کہ مقتولہ کی جان کس طرح لی گئی؟''

میں نے اپنی ڈائری اور پین نکال لیا تھا کیونکہ غزالہ کی کہانی میں دلچسپی کا عنصر بڑھتا چلا جارہا تھا۔ میں عموماً آفس سے باہر کسی کلائنٹ سے اتنی تفصیلی بات نہیں کرتا لیکن ایک تو اس روز میرا کسی عدالت میں اور کوئی کیس نہیں تھا، دوسرے لنچ میں ابھی ایک گھنٹا باقی تھا اور تیسرے، غزالہ کی وہ بات بھی میرے ذہن میں محفوظ تھی جس نے مجھے یہ کیس لینے کے لیے مجبور کیا تھا۔ میں نے مذکورہ بات کا شروع میں بھی ذکر کیا ہے، اس کے بارے میں وضاحت بعد میں کروں گا۔

''صبا شامی کی موت دو ماہ پہلے سترہ مارچ کی سہ پہر میں واقع ہوئی تھی۔'' غزالہ نے میرے سوالات کے جواب میں بتایا۔ ''اس وقت وہ اپنے آفس میں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ پولیس کے مطابق حبیب اللہ نے صبا شامی کی چائے میں زہر ملا دیا تھا۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔'' میں نے الجھن زدہ نظر سے غزالہ کی طرف دیکھا۔ ''آپ کا شوہر اس میگزین کے آفس میں ایک کاپی پیسٹر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ آفس کے اسٹاف کو چائے وغیرہ پلانا تو چپراسی کا کام ہوتا ہے۔ کیا وقوعہ کے دن آپ کے شوہر نے اپنی باس کو چائے پیش کی تھی؟''

''ایسی بات نہیں ہے بیگ صاحب!'' غزالہ نے معتدل انداز میں کہا۔ ''حبیب اللہ اپنے کام سے کام رکھنے والا ایک سنجیدہ طبع انسان ہے۔ اس روز حسب معمول آفس بوائے مقصود حسین ہی نے سب کو چائے پلائی تھی۔ میڈم صبا شامی کے کمرے میں بھی مقصود ہی چائے دے کر آیا تھا......''

''پھر تو سب سے پہلے مقصود سے کڑی پوچھ تاچھ کرنا چاہیے تھی۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے شوہر کو قتل کے الزام میں کیوں دھر لیا گیا؟''

''آپ بالکل درست انداز میں سوچ رہے ہیں بیگ صاحب!'' وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''میڈم صبا شامی کی لاش دریافت ہونے کے بعد جب پولیس وہاں آئی تو حالات و واقعات کی روشنی میں انہوں نے مقصود ہی سے اپنی تفتیش کا آغاز کیا تھا مگر مقصود نے حبیب اللہ کا نام لے دیا۔''

''اس کا کیا مطلب ہوا؟'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''آپ کے شوہر کا اس زہریلی چائے سے کیا لینا دینا؟''

''بات دراصل یہ ہے جناب......!'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں مجھے تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مقصود پورے اسٹاف کے لیے الگ برتن میں چائے بناتا ہے اور میڈم کی چائے کے لیے دوسرا برتن استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ وہ دوسرے لوگوں سے مختلف چائے پیتی ہیں، یعنی پیتی تھیں۔ انہیں بلیک ٹی پسند تھی۔ نہ دودھ، نہ چینی، صرف قہوہ اور وہ بھی اسٹرانگ۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''جب پولیس نے آفس بوائے مقصود سے پوچھا کہ اس نے اپنی باس کو زہریلی چائے کیوں پلائی تو اس نے کہا کہ وہ پتی حبیب اللہ نے اسے لا کر دی تھی اور کہا تھا کہ میڈم کو اسٹرانگ ٹی پسند ہے تو آج یہ پتی ٹرائی کرو۔ اسے کیا پتا تھا کہ حبیب اللہ نے اس پتی کے اندر زہر ملایا ہوگا۔ اس نے حبیب اللہ کی دی ہوئی پتی سے صبا شامی کے لیے ایک کپ اسٹرانگ بلیک ٹی تیار کر دی تھی......بس۔''

''بلیک ٹی تو ویسے ہی کافی اسٹرانگ ہوتی ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا اور پوچھا۔ ''کیا حبیب اللہ نے مقصود حسین کے بیان کی تصدیق کر دی تھی؟''

غزالہ کے جواب نے مجھے حیران کر دیا۔ ''جی۔''

اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''حبیب اللہ نے یہ تسلیم کرلیا تھا کہ اس نے اسٹرانگ پتی کا ایک سیمپل لاکر مقصود کو دیا تھا۔ اس پتی کی مقدار آدھی چائے کے چمچ جتنی تھی۔ مقصود، میڈم کی بلیک ٹی میں ایک چمچ پتی ڈالا کرتا تھا اور حبیب اللہ نے اس سے کہا تھا کہ اس کی دی ہوئی آدھی چمچ پتی ایک چمچ دوسری پتی سے کہیں زیادہ اسٹرانگ چائے بنائے گی۔''

''پیسٹنگ کرتے کرتے آپ کے شوہر کو کیا سوجھی تھی کہ وہ اپنی باس کے لیے کہیں سے اسٹرانگ پتی اٹھالایا؟'' میں نے غزالہ کے چہرے پر نگاہ جما کر پوچھا۔ ''اور اتنی بڑی مصیبت میں پھنس گیا۔''

''یہ آئیڈیا دراصل میرے دیور نجیب اللہ کا تھا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''نجیب اللہ ایک ٹریول ایجنسی میں کام کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی سائڈ میں چھوٹے موٹے کام بھی پکڑتا رہتا ہے۔ وقوعہ سے چند روز پہلے اس نے حبیب اللہ سے کہا کہ اس کا ایک دوست چائے کی پتی کا کاروبار کرتا ہے اور اس کے پاس ایک نہایت ہی اسٹرانگ پتی آئی ہے۔ خصوصاً بلیک ٹی پینے والوں کے لیے تو یہ ایک انمول تحفہ ہے۔ نجیب کو معلوم تھا کہ حبیب اللہ کی باس بلیک ٹی پینے کی عادی ہے۔ اس نے حبیب اللہ کو ایک پڑیا میں پتی کا سیمپل لاکر دیا اور یہ بھی بتایا کہ وہ اپنے دوست کے چائے کے بزنس میں پیسا لگانا چاہتا ہے۔ اس سیمپل کی ٹرائی کے بعد وہ فیصلہ کرے گا کہ ابتدائی طور پر اس بزنس میں کتنا انویسٹ کرنا چاہیے۔''

''اور آپ کے شوہر نے کسی قدح و جرح کے بغیر اپنے چھوٹے بھائی کا دیا ہوا وہ ''ٹی سیمپل'' اپنی میڈم صبا شامی پر ٹرائی کرڈالا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''اور صبا شامی کی موت کے بعد جب حبیب اللہ ایک بڑی مصیبت میں مبتلا ہوگیا تو نجیب اللہ نے بڑی ڈھٹائی سے اس واقعے سے اپنی لاعلمی کا اظہار کردیا...... ہیں نا؟''

''جی...... بالکل......!'' وہ حیرت بھری الجھن سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ''آپ کا اندازہ درست ہے مگر سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ نے اتنا صحیح اندازہ لگایا کیسے؟''

''آپ کی باتوں کو نہایت ہی توجہ سے سن کر۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''تھوڑی دیر پہلے آپ نے مجھے بتایا تھا کہ حبیب اللہ کو اس حال تک پہنچانے والا اس کا اپنا بھائی نجیب اللہ ہے۔ آپ نے اپنے دیور کے لیے ''کمینہ'' کا لفظ بھی استعمال کیا تھا۔ اس کے بعد مجھے بہت کچھ سمجھنے کے لیے نہایت ہی کم محنت کرنا پڑی۔''

''آپ تو کمال کے وکیل ہیں بیگ صاحب!'' وہ ستائشی نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولی۔ ''اور آپ کا نشانہ بھی لاجواب ہے...... زبردست۔''

کسی حسین و جمیل عورت کی زبان سے اپنی تعریف سن کر سب کو اچھا لگتا ہے مگر اس وقت میرا تمام تر فوکس اس کیس کی روح پر تھا۔ میں نے غزالہ سے استفسار کیا۔

''کیا نجیب اللہ آپ کے شوہر کا سگا بھائی ہے؟''

''باپ کی طرف سے سگا۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''مگر دونوں کی مائیں الگ ہیں۔ میرے مرحوم سسر نے دو شادیاں کی تھیں۔''

''یہاں قریب ہی میں میرا آفس ہے۔'' میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''میرے لنچ کا وقت ہوگیا ہے۔ میں چار بجے اپنے آفس میں موجود ہوں گا۔ باقی کی باتیں وہیں پر ہوں گی۔ جب تک آپ اپنے دوسرے کام نمٹالیں اور اگر......'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کردی۔ ''آپ میرے ساتھ لنچ کرنا چاہیں تو بھی کوئی حرج ہے اور نہ ہی کوئی وقت۔''

''بہت شکریہ بیگ صاحب!'' وہ جلدی سے بولی۔ ''مجھے ابھی بالکل بھوک نہیں ہے۔ ویسے آپ کا یہ اندازہ بھی درست ہے کہ میرے پاس اور بھی مصروفیت ہے۔ مجھے کسی کام سے بولٹن مارکیٹ تک بھی جانا ہے۔ واپسی میں آپ کے آفس آتی ہوں۔''

غزالہ کی شکل سے تو بالکل یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس وقت بھوک محسوس نہ کررہی ہو لیکن میں نے لنچ کی پیشکش کے بعد اس پر اصرار نہیں کیا۔ ویسے اس کی خودداری اور بردباری مجھے اچھی لگی تھی۔

اس نے میرے آفس کی لوکیشن سمجھی اور ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد وہ سٹی کورٹ کے اس گیٹ کی جانب بڑھ گئی جس کے اس پار ایم اے جناح روڈ المعروف ''بندر روڈ'' اپنے بے ہنگم ازدحامی ٹریفک کے ساتھ رواں دواں تھی۔

اس سہ پہر غزالہ سے میری تفصیلی ملاقات آفس میں ہوگئی تھی۔ آئندہ روز میں نے جیل جاکر اس کے شوہر حبیب اللہ سے بھی اہم بات چیت کرلی چنانچہ ہرزاویے

سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے وہ کیس لینے کا عندیہ دے دیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ کو اس کیس کے پس منظر سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ان میں سے زیادہ تر باتیں مجھے غزالہ اور اس کے شوہر حبیب اللہ نے بتائی تھیں اور کچھ ریسرچ میں نے خود بھی کی تھی۔ خاص طور پر منیب اللہ اور مقتولہ صبا شاہی کے حوالے سے۔ آپ اس مختصر بیانی سے اپنا ذہن بنا لیں۔ اگلی آدھی ملاقات کورٹ روم میں ہوگی۔

☆☆☆

جیسا کہ غزالہ نے بتایا حبیب اللہ کے باپ نجیب اللہ نے دو شادیاں کی تھیں۔ اس کی پہلی بیوی یعنی حبیب اللہ کی ماں کا نام شاکرہ بیگم تھا اور اس کی دوسری بیوی یعنی منیب اللہ کی ماں کا نام شبانہ تھا۔ ان تین کرداروں (نجیب اللہ، شاکرہ اور شبانہ) کے نام اور ذکر کے ساتھ لفظ ''تھا'' کا استعمال اس لیے کیا جا رہا ہے کہ وہ تینوں اپنی طبعی عمر گزار کر اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔

نجیب اللہ پراپرٹی کا کام کرتا تھا۔ اس کا باقاعدہ کوئی آفس یا اسٹیٹ ایجنسی نہیں تھی۔ وہ چلتے پھرتے یہ کاروبار چلا رہا تھا مگر وہ تھا خاصا چلتا پرزہ قسم کا بندہ۔ اس نے ہوائی روزی کے ذریعے کورنگی میں اسی گز کا ایک عالیشان گھر بنا لیا تھا۔ آج کل اس گھر میں حبیب اللہ اپنی بیوی غزالہ اور سات سالہ بیٹے تیمور کے ساتھ رہ رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ فی الحال اس سے یہ گھر چھوٹ گیا تھا اور وہ پچھلے دو ماہ سے جیل آشیانی ہو چکا تھا۔

حبیب اللہ کی عمر چالیس سال تھی اور غزالہ اس سے پانچ سال چھوٹی تھی۔ ان کی شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور ان کی صرف ایک ہی اولاد تھی۔ سات سالہ تیمور جو کلاس ٹو میں پڑھتا تھا۔

غزالہ کا تعلق درس و تدریس سے تھا۔ اس نے سوشیالوجی میں ماسٹرز کر رکھا تھا اور ایک گورنمنٹ ہائی اسکول میں ''سوشل اسٹڈیز'' پڑھاتی تھی۔ حبیب اللہ اور غزالہ کی تنخواہ کو ملا کر اتنا ہو جاتا تھا کہ ان کی زندگی خوش و خرم بسر ہو رہی تھی۔

نجیب اللہ کی زندگی میں دوسری بیوی یعنی شبانہ کی آمد ایک حسین اتفاق تھا۔ شبانہ ایک مالدار بیوہ تھی۔ وہ اپنے لیے ایک گھر خریدنے کے سلسلے میں نجیب اللہ سے ملی تو ان کے بیچ راہ و رسم کا معاملہ چل نکلا۔ شبانہ کے پہلے شوہر نوازش علی کا انتقال ہو چکا تھا اور نوازش سے اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ مکان خریدنے کے حوالے سے نجیب اللہ اور شبانہ میں جو دو چار ملاقاتیں ہوئیں، ان میں وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ ایک ماہ کے میل جول کے بعد نجیب اللہ نے شبانہ کو نہ صرف محمود آباد میں ایک سو بیس گز کا ایک عمدہ گھر دلوا دیا بلکہ وہ اس کا گھر والا بھی بن گیا۔

نجیب اللہ نے کچھ عرصے تک اپنی دوسری شادی کو خفیہ رکھا مگر جب شبانہ سے اس کی دوسری اولاد یعنی منیب اللہ پیدا ہوا تو یہ معاملہ کھل کر سامنے آ گیا۔ اس وقت حبیب اللہ کی عمر دس سال تھی۔ ابتدا میں حبیب اللہ کی ماں شاکرہ بیگم نے نجیب اللہ کی دوسری شادی کے خلاف روایتی احتجاج بھی کیا مگر انتہائی پُرامن انداز میں۔ پھر رفتہ رفتہ شاکرہ نے اپنے حالات سے سمجھوتا کر لیا اور اس کا سب سے بڑا سبب نجیب اللہ تھا۔ اس نے دونوں بیویوں اور دونوں اولادوں کے حقوق ادا کرنے اور اپنے فرائض نبھانے میں بھی غفلت یا غیر ذمے داری کا ثبوت نہیں دیا تھا۔

نجیب اللہ کی دونوں ازدواجی زندگیاں بڑی ہموار اور پُرسکون چلتی رہیں مگر الگ الگ گھروں میں۔ وہ ایک رات کورنگی میں بسر کرتا اور دوسری شب محمود آباد میں گزارتا۔ شاکرہ اور شبانہ کی آپس میں میل ملاقات نہیں تھی البتہ بڑے ہو جانے پر حبیب اللہ اور منیب اللہ کبھی کبھار مل لیا کرتے تھے جس پر ان کی ماؤں کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔

اب نجیب اللہ، شاکرہ بیگم اور شبانہ اس دنیا میں باقی نہیں ہیں مگر ان کی دو اولادیں حبیب اللہ اور منیب اللہ بقیدِ حیات ہیں اور وقت نے ان جزوی سوتیلے بھائیوں کو بڑے نازک موڑ پر لا کر ایک دوسرے کے سامنے کھڑا کر دیا ہے۔

نجیب اللہ کی وفات کے بعد کورنگی والا اسی گز کا مکان اس کی بیوی شاکرہ کے نام ٹرانسفر ہو گیا تھا اور شاکرہ کے انتقال کے بعد مذکورہ مکان حبیب اللہ کی ملکیت بن چکا تھا جہاں وہ غزالہ اور تیمور کے ساتھ امن و سکون کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

نجیب اللہ نے شبانہ سے جب شادی کی تو محمود آباد والے ایک سو بیس گز کے مکان کی مالک شبانہ تھی کیونکہ اس نے اپنے پیسوں سے وہ مکان خریدا تھا۔ نجیب اللہ کی وفات کے چند سال بعد ہی شبانہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اس وقت تک منیب اللہ جوان اور عاقل و سمجھ دار ہو چکا تھا لہٰذا ضروری قانونی کارروائی کے بعد ماں والا وہ مکان منیب

اللہ کے نام ٹرانسفر ہو گیا۔ منیب اللہ اس مکان کا مالک بنا اور اس کے ساتھ ہی اس کی زندگی کہیں سے کہیں نکل گئی۔

منیب اللہ نے انٹرنس کا امتحان بڑی مشکل سے پاس کرنے کے بعد ادھر اُدھر چھوٹی موٹی نوکریاں کرنا شروع کر دی تھیں۔ کئی سال تک مختلف ناکام تجربات کرنے کے بعد وہ ٹریول ایجنسی پر ملازم ہو گیا۔

منیب اللہ کا پلس پوائنٹ محمود آباد والا وہ مکان تھا جس کا وہ بلا شرکت غیرے مالک بن چکا تھا۔ جب وہ جم کر کام کرنے لگا تو اس کے ایک سے ایک رشتے بھی آنے لگے اور یہیں پر اس نے اپنی زندگی کی سنگین غلطی کر دی۔ اس نے ایک ایسی حسین و جمیل لڑکی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا جس کی نظر اس مکان پر گڑی ہوئی تھی۔ اس لڑکی کا نام تھا.....نورین!

نورین کا تعلق ایک پیشہ ور گروہ سے تھا۔ وہ لوگ مالدار اسامیوں کی تلاش میں رہتے تھے اور نورین ان کا ایک آزمودہ کار ہتھیار تھی۔ وہ ایک کم عمر اور دلکش لڑکی تھی۔ اس کے اعضا بولتے تھے اور آنکھیں اشاروں کی شاعری کرتی تھیں۔ منیب اللہ پہلی ہی ملاقات میں نورین پر مرمٹا تھا۔ ملاقات کا سلسلہ آگے بڑھا تو منیب نے اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔

”نورین! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔“ اس نے بے حد جذباتی لہجے میں کہا۔ ”میں چاہتا ہوں تم میری زندگی کا مستقل حصہ بن جاؤ۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟“

”منیب! میں بھی تمہیں بے طرح چاہنے لگی ہوں۔“ نورین نے اپنے ہنر کے جوہر دکھاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن شادی کے نام پر مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔“

”کیسا ڈر؟“ منیب نے چونکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے بتاؤ، تم کس چیز سے خوفزدہ ہو؟“

”میں ایک غریب ماں کی غریب بیٹی ہوں......“

نورین نے اتنا کہہ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا تو منیب نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ”غریب ہونے میں ایسی کیا خرابی ہے؟“

”مجھے ڈر ہے کہ تمہارے گھر والے کہیں انکار نہ کر دیں۔“ نورین نے اپنے اسکرپٹ کے مطابق اداکاری کا عمل جاری رکھتے ہوئے اداس لہجے میں کہا۔

”اگر صرف یہی تمہارا ڈر ہے تو اس خوف کو ابھی اپنے ذہن سے نکال دو۔“ منیب نے اپنے ہاتھ کو نورین کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ”میرے آگے پیچھے اور کوئی بھی نہیں ہے۔ میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں اپنی زندگی کے فیصلے خود کرتا ہوں۔“

اس وقت وہ دونوں ایک آزاد خیال کیفے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی ملاقاتیں ایسے ہی رومان پرور ماحول والے ریسٹورنٹس میں ہوا کرتی تھیں جہاں آنے والوں کو کوئی ڈسٹرب نہیں کرتا تھا۔ وہ لوگ جب تک چاہیں وہاں بیٹھ کر اپنے دل کے ارمان نکال سکتے تھے۔

”مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ تم اپنی مرضی کے مالک ہو۔“ نورین نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پژمردہ لہجے میں کہا۔ ”لیکن اس معاملے میں، میں آزاد نہیں ہوں کیونکہ میری ماں ہی میری زندگی کے سارے فیصلے کرتی ہے۔ جب تک وہ راضی نہیں ہو گی، میں تم سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتی۔“

”تم تو راضی ہو نا؟“ منیب نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”ہاں...... میں تم سے بہت زیادہ محبت کرنے لگی ہوں۔“ نورین نے بڑی لگاوٹ سے کہا۔ ”میں تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی لیکن اس رشتے کو قائم کرنے کے لیے ماں کی رضامندی بہت ضروری ہے۔“

”تمہاری ماں کو میں راضی کر لوں گا۔“ منیب نے بڑے عزم سے کہا۔ ”بتاؤ، تم مجھے اپنی ماں سے کب ملوا رہی ہو؟“

”میں پہلے ماں سے بات کر لوں، پھر تمہیں بتا دوں گی۔“

”ٹھیک ہے، میں انتظار کروں گا۔“ منیب نے معتدل انداز میں کہا۔

نورین نے منیب کو زیادہ انتظار نہیں کرایا اور دو روز کے بعد ہی وہ اسے اپنی ماں سے ملوانے لے گئی۔ وہ ایک انتہائی پسماندہ علاقے میں واقع ٹین کی چھت والا ایک چھوٹا سا کوارٹر تھا۔ نورین کی ماں کا کردار ادا کرنے والی وہ عمر رسیدہ عورت بھی اسی گروہ کی ایک رکن تھی جس کے لیے نورین کام کرتی تھی۔

”نورین نے تمہاری بہت تعریف کی ہے بیٹا!“ اس بڑھیا...... اداکاری کی پڑیا نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اس کے باپ کے گزر جانے کے بعد میں نے اس کی پرورش میں کوئی غفلت نہیں برتی اور اسے کبھی باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ اس سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ مجھے نورین کا کس قدر خیال ہے۔ یہ تم سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ مجھے اس کی خواہش پوری کرنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن......!“

"لیکن کیا آنٹی؟" نورین کی ماں نے اچانک بات ادھوری چھوڑی تو منیب نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ "آپ بولتے بولتے رک کیوں گئیں؟"

"بیٹا! میری عمر خاصی ہو چکی ہے اور اب میں بیمار بھی رہنے لگی ہوں۔" اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "پتا نہیں کب میرا بلاوا آجائے۔ میں اپنی زندگی میں نورین کے مستقبل کو محفوظ کر دینا چاہتی ہوں۔ تم میری بات تو سمجھ رہے ہو نا؟"

اپنی بات کے اختتام پر بوڑھی فنکارہ نے سوالیہ نظر سے منیب کی طرف دیکھا جو اس کا داماد بننے کی خواہش لے کر اس جھونپڑی میں آیا تھا لیکن اس بڑھیا کی نظر میں اس کی حیثیت ایک صحت مند شکار ایسی تھی۔ عنقریب جس کا تیا پانچا ہونے جا رہا تھا۔

"جی بالکل!" منیب نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "میں آپ کی مشکلات اور پریشانیوں کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں لیکن آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ شادی کے بعد آپ اس کوارٹر میں کسمپرسی کی زندگی نہیں گزاریں گی۔ میں آپ کو اپنے ساتھ رکھوں گا۔"

"تم سمجھے نہیں بیٹا!" نورین کی بناوٹی ماں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "میں اپنے لیے نہیں بلکہ نورین کے مستقبل کے لیے فکر مند ہوں۔ میں اس کی زندگی کا کوئی پائدار تحفظ چاہتی ہوں۔ میں تو چند دن کی مہمان ہوں۔ میرے جانے کے بعد نورین کو کسی قسم کی کوئی پریشانی نہ ہو، بس میں اس بات کو یقینی بنانا چاہتی ہوں۔ کیا تم اس کی گارنٹی لے سکتے ہو؟"

"میں کچھ سمجھا نہیں آنٹی!" منیب نے متذبذب نظر سے باری باری ان ماں بیٹی کو دیکھا پھر نورین کی ماں سے پوچھا۔ "آنٹی! آپ مجھ سے کس قسم کی گارنٹی چاہتی ہیں؟"

"کیا تم اپنا مکان نورین کے نام کر سکتے ہو؟" عیار بڑھیا نے منیب اللہ کے چہرے پر نظر جما کر سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"مم..... میں آپ کو..... سوچ کر جواب دوں گا آنٹی!" منیب نے گڑبڑائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"سوچ بچار کے بعد فیصلہ کرنا سمجھداری ہے بیٹا!" بڑھیا نے بدستور منیب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ "مجھے تمہاری یہ ادا پسند آئی۔ میں کسی ایسے ہی دانشمند نوجوان کو اپنا داماد بنانا چاہتی ہوں۔ ویسے......" اس نے لحاتی توقف کیا پھر سپاٹ انداز میں دریافت کیا۔

"تمہیں سوچنے کے لیے کتنا وقت چاہیے بیٹا؟"

"بس...... دو چار دن۔" منیب نے جواب دیا۔

"میں تمہیں کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے دس دن کی مہلت دے رہی ہوں۔" نورین کی ماں کا کردار ادا کرنے والی اس عمر رسیدہ عورت نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "گیارھویں دن تم مجھے بتا دینا کہ تمہیں میری شرط منظور ہے یا نہیں۔"

"ٹھیک ہے آنٹی!" وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

"لیکن ان دس دنوں میں تم نورین سے بالکل نہیں ملو گے۔" اس عورت نے تنبیہ کرنے والے انداز میں کہا۔ "امید ہے تم میری اس خواہش کا پاس کرو گے۔"

"جی آنٹی!" منیب اللہ نے مریل سی آواز میں کہا۔

اس کے ساتھ ہی وہ ملاقات ختم ہو گئی۔

منیب اللہ گھر آیا تو اس کے دل کی عجیب حالت تھی۔ وہ ہر قیمت پر نورین کو حاصل کرنا چاہتا تھا اور نورین کی ماں نے اپنی بیٹی کی قیمت ایک سو بیس گز پر بنا ہوا وہ عالیشان مکان لگا دی تھی۔ اگر وہ ٹھنڈے دماغ سے سوچتا تو اسے بڑھیا کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دینا چاہیے تھا مگر نورین کا "معاملہ" اس کا دماغ نہیں بلکہ دل کنٹرول کر رہا تھا اور دل اپنے معاملات میں دماغ کی دخل اندازی کو پسند نہیں کرتا۔

"نورین کی ماں نے میرا محمود آباد والا مکان اپنے نام نہیں بلکہ نورین کے نام لگوانے کی بات کی ہے۔" اس گمبھیر صورت حال میں دل کی طرف سے یہ فتویٰ آگیا۔ "جب نورین میری بیوی بن جائے گی تو پھر وہ مکان اس کے نام ہو یا میرے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ تھوڑی ہوں گے بھلا۔ میرا سب کچھ نورین کا اور اس کا سب کچھ میرا۔"

محبت کرنے میں کوئی عیب نہیں ہے لیکن حماقت کرنے میں ہزاروں خرابیاں، برائیاں اور پریشانیاں ہیں اور منیب اللہ کی بدقسمتی کہ وہ احمقانہ انداز میں محبت کرنے چلا تھا۔ اب اس کا حافظ و ناصر اللہ کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتا تھا کیونکہ اس نے خود کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

فراڈن آنٹی نے تو منیب پر دس دن کی قدغن لگا دی تھی مگر اس کا دل نورین کو دیکھنے اور اس سے ڈھیروں باتیں کرنے کے لیے مچل رہا تھا۔ تیسرے دن اچانک نورین اس سے ملنے آگئی۔ منیب نے نورین کی آمد کو بھی اپنے دل کی سچی تڑپ سے تعبیر کیا اور اسے ایک معجزہ سمجھ کر خوشی سے

نہال ہو گیا۔

"منیب......!" نورین نے اسکرپٹ کے مطابق عمدہ پرفارمنس دیتے ہوئے محبت سے لبریز لرزاں لہجے میں کہا۔ "میں تم سے ملے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ تم چاہے اپنا مکان میرے نام کرو یا نہ کرو اور...... یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ تم مجھ سے شادی کرو۔ بس، میں تم سے ایک ہی التجا کروں گی کہ کبھی مجھ سے جدا نہیں ہونا۔"

بات ختم کرتے ہی وہ بے ساختہ منیب کے سینے سے لگ گئی۔ منیب ابھی تک نورین کے اتنا نزدیک نہیں آیا تھا۔ اسے تو گویا زمین و آسمان کے خزانے مل گئے تھے۔ وہ یعنی اس کا دل تو پہلے ہی نورین کے لیے پگھل چکا تھا۔ بس زبان سے اظہار کرنا باقی تھا۔

"نورین!" وہ اس کی پشت کو تھپکتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔ میں نے تمہاری ماں کی شرط ماننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

منیب اللہ نے نورین کو اتنی بڑی خوشخبری سنا دی تھی کہ اس ملاقات میں نورین نے منیب کو اپنے حشر خیز سراپا کی حسین گزرگاہوں تک جزوی رسائی کے لیے سیف پیسج دے دیا تھا۔

آئندہ دو ماہ کے اندر محمود آباد والا وہ ایک سو بیس گز پر تعمیر شدہ مکان نورین کے نام ٹرانسفر ہو چکا تھا اور نورین منیب کی بیوی بن کر اپنے گھر میں آ گئی تھی۔ اگلے تین ماہ ہنسی خوشی اور خیریت سے گزر گئے۔ اس کے بعد ہنسی، خوشی اور خیریت کے گزرنے کا نمبر آ گیا۔ ان میں صبح شام جھگڑا ہونے لگا۔ اس تناؤ کی فضا میں کمی آنے کے بجائے ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا اور پھر ایک روز نورین نے کورٹ میں خلع کا کیس فائل کر دیا۔

منیب اللہ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی درخواست میں نورین نے اس کی "ناکارگی" کو جواز بنایا تھا۔ جب کوئی بیوی اپنے شوہر پر ازدواجی نالائقی کا الزام لگا کر اس سے نجات پانے کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا دے تو اس کے بعد کسی بحث اور جرح کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

عدالت نے نورین کے حق میں فیصلہ سنا دیا اور منیب اللہ کو اپنے ہی گھر سے اس طرح بے دخل ہونا پڑا جیسے کوئی نامراد عاشق اپنے محبوب کے کوچے سے بے آبرو ہو کر نکلتا ہے۔

بقول کسے، منیب اللہ دیکھتے ہی دیکھتے سڑک پر آ گیا تھا۔ اس طوفانی جھٹکے نے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں اور وہ نورین کے منصوبے کو بھی اچھی طرح سمجھ گیا تھا مگر وہی بات کہ اس دوران میں وقت کا پنچھی بہت آگے نکل چکا تھا۔ اس کے گھر سے باہر نکلتے ہی نورین کی بناوٹی منحوس ماں اور دو تین مسٹنڈے قسم کے رشتے دار مرد اس گھر پر قابض ہو گئے تھے۔

منیب کا پلڑا اچانک اس قدر اٹھ گیا تھا کہ وہ ہزار چاہنے کے باوجود بھی اس جرائم پیشہ عیار گروہ سے کسی قسم کا انتقام لینے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔ سو، مجبوراً وہ اختر کالونی کے ایک تین منزلہ مکان کی چھت پر بنے ہوئے اکلوتے کمرے میں کرائے دار کی حیثیت سے جا بسا۔

ان نامساعد اور غدار حالات میں اس نے اپنے بھائی حبیب اللہ سے بھی مدد کی درخواست کی اور حبیب اللہ نے اسے دو تین ہزار کی امداد بھی دی مگر منیب درحقیقت اس سے جو چاہتا تھا، اس حوالے سے حبیب اللہ نے اس کی مطالبہ نما خواہش کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال باہر کیا تھا۔

ہر طرف سے ناکام اور مایوس ہونے کے بعد منیب اللہ کے دل و دماغ میں حبیب اللہ کے خلاف نفرت، عداوت اور انتقام کے جذبات پلنے اور بڑھنے لگے تھے تاہم اس نے اپنے ان منفی خیالات کو بھی حبیب اللہ پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔

اس کیس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتولہ صبا شاہی کی موت سترہ مارچ کی سہ پہر چار اور پانچ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ کیمیکل ایگزامنر نے اپنی رپورٹ میں مقتولہ کی موت کا سبب ایک سریع الاثر زہر "سوڈیم آرسائنٹ" کو قرار دیا تھا۔ چائے کی پیالی کے لیبارٹری ٹیسٹ سے پہلے بھی یہی بات سامنے آئی تھی کہ وقوعہ کے روز اپنی موت سے پہلے مقتولہ نے جو بلیک ٹی نوش کی تھی، اس میں سوڈیم آرسائنٹ نامی زہر ملا ہوا تھا۔

چائے والے کپ پر مقتولہ کے فنگر پرنٹس بڑے واضح ملے تھے اور آفس بوائے مقصود حسین کی انگلیوں کے نشانات بھی ایک دو مقام پر پائے گئے تھے مگر میرے موکل اور اس کیس کے ملزم حبیب اللہ کے فنگر پرنٹس کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔

حبیب اللہ کو مقصود حسین کے بیان پر اس کیس کی بھٹی میں جھونکا گیا تھا۔ حبیب اللہ نے مقصود کے بیان کی تردید نہیں کی تھی مگر اس کے جوابی وضاحتی بیان پر کوئی یقین

کرنے کو تیار نہیں تھا۔ شاید اسی کو وقت اور حالات کی ستم ظریفی کہا جاتا ہے۔

☆☆☆

اس کیس کو عدالت میں لگے ہوئے دو ماہ سے زیادہ ہو گئے تھے لیکن پچھلی تین پیشیوں پر کوئی قابلِ ذکر کارروائی دیکھنے کو نہیں ملی تھی۔ سابق وکیل کی اس کیس سے عدم دلچسپی یا بدنیتی کا ذکر کوئی معنی نہیں رکھتا چنانچہ میں آپ کو آگے لیے چلتا ہوں۔

اس دوران میں، میں نے کیس کے مختلف پہلوؤں کو بڑی تفصیل کے ساتھ اسٹڈی کر لیا تھا۔ وکیلِ صفائی چونکہ تبدیل ہو گیا تھا اس لیے کاغذی کارروائی میں چند منٹ لگ گئے۔ اس کے بعد استغاثہ کی جانب سے مقتولہ کے شوہر جنید شامی کو گواہی کے لیے پیش کیا گیا۔

جنید شامی کی عمر پچپن کے آس پاس تھی۔ وہ گندمی رنگت، میانے قد اور مائل بہ فربہی بدن کا مالک ایک عام سی شکل کا انسان تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس نے اپنا بیانِ حلفی ریکارڈ کرا دیا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا۔

''شامی صاحب!'' وکیل استغاثہ نے اپنے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''وقوعہ کے روز آپ نے مقتولہ کے آفس میں کیا دیکھا تھا؟''

''جب میں ''ڈائن گگ بک'' کے آفس پہنچا تو وہاں پر میں نے ہنگامی صورتِ حال کا نظارہ کیا۔'' گواہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''میرے پوچھنے پر اسٹاف نے مجھے بتایا کہ میڈم صبا اپنے کمرے میں بڑی خراب حالت میں پڑی ہیں۔ میں آن واحد میں صبا کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں نے اپنی بیوی کو اس کی کرسی پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس کا جسم بے حس و حرکت تھا اور ناک سے خون نکل رہا تھا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ صبا اب اس دنیا میں باقی نہیں رہی۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک افسردہ سانس خارج کی پھر بجھے ہوئے لہجے میں اپنی بات مکمل کر دی۔

''میں نے فوراً دو فون کیے۔ ایک پولیس اسٹیشن اور دوسرا ڈاکٹر کو۔ پولیس سے پہلے ڈاکٹر وہاں پہنچ گیا اور اس نے صبا کے وائٹل سائنز کو چیک کرنے کے بعد اس کی موت کی تصدیق کر دی۔ ڈاکٹر کے مطابق صبا کو بلیک ٹی میں کوئی خطرناک زہر ملا کر دیا گیا تھا۔ بعد میں پوسٹ مارٹم رپورٹ سے پتا چلا کہ صبا کو موت کی نیند سلانے کے لیے ''سوڈیم آرسائن'' نام کے کسی انتہائی مہلک زہر کا استعمال کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ پولیس نے جائے وقوعہ پر جو کارروائی کی، اس کی تفصیل اس کیس کی فائل میں موجود ہے۔''

''شامی صاحب!'' وکیل استغاثہ نے اکیوزڈ باکس میں گردن جھکا کر کھڑے ملزم حبیب اللہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اپنے گواہ سے استفسار کیا۔ ''کیا آپ اس بندے کو جانتے ہیں؟''

''جی بالکل!'' وہ توانا لہجے میں بولا۔ ''یہ شخص میری بیوی کا ملازم ہے اور مجھے پتا چلا ہے کہ اسی نے وہ زہریلی چائے کی پتی لا کر آفس بوائے کو دی تھی۔''

''تو آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ملزم نے دیدہ و دانستہ ایک منصوبے کے تحت آپ کی بیوی کی جان لینے کی کوشش کی تھی؟'' وکیل استغاثہ نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔ ''اور بدقسمتی سے وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی رہا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''جی...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' گواہ نے اثبات میں جواب دیا۔ ''اس بدبخت کی سازش کامیاب ہو گئی اور اس نے بڑی ہوشیاری سے سارا الزام اپنے سوتیلے بھائی نجیب اللہ پر ڈال دیا جس بے چارے کا اس معاملے سے کوئی تعلق، واسطہ نہیں ہے بلکہ نجیب اللہ تو میری مقتولہ بیوی کو جانتا تک نہیں۔''

وکیلِ استغاثہ نے مزید دو تین سوالات کے بعد جرح ختم کر دی تو اپنی باری پر میں وٹنس باکس کے قریب چلا گیا اور جنید شامی کی طرف دیکھتے ہوئے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

''جنید صاحب! مجھے آپ کی بیوی کی موت کا بہت افسوس ہے مگر یہ سوال و جواب بھی اس کارروائی کا لازمی حصہ ہے اور یہ سب آپ کی بیوی کی موت کے ذمے دار شخص کو قرار واقعی سزا دلوانے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ امید ہے آپ میری بات اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے؟''

''کوئی ایسا ویسا اچھی طرح......!'' جنید شامی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''آپ کی دوہری پالیسی کو سمجھنے کے لیے کسی راکٹ سائنس کی ضرورت نہیں وکیل صاحب! ایک طرف آپ مجھ سے دلی ہمدردی کا اظہار کر رہے ہیں اور صبا کے قاتل کو پھانسی کے پھندے پر لٹکا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی آپ میری بیوی کے قاتل کی وکالت کرنے اور اسے بے گناہ ثابت کر کے باعزت بری کرانے کی غرض سے وکیلِ صفائی کی حیثیت سے یہاں موجود ہیں۔

آپ کے کردار کے کس پہلو پر یقین کیا جائے؟"
"ایکسکیوزمی!" میں نے استغاثہ کے گواہ کی ترش بیانی کا بُرا ماننے کے بجائے معتدل انداز میں استفسار کیا۔ "جنید صاحب! آپ کام کیا کرتے ہیں؟"
"میں ایک ٹریول ایجنسی چلاتا ہوں۔" اس نے کھرے لہجے میں جواب دیا۔
"ٹریول ایجنٹ ہونا بھی کوئی بُری بات نہیں ہے۔ میرے مؤکل کا چھوٹا بھائی اور اس کیس میں استغاثہ کا گواہ منیب اللہ بھی کسی ٹریول ایجنسی ہی میں کام کرتا ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ "ویسے میرے خیال میں آپ کو ٹریول ایجنٹ ہونے کے بجائے سرکاری وکیل ہونا چاہیے تھا۔ آپ کی باتیں سن کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ بہت اچھے انداز میں استغاثہ کا تحفظ کر سکتے ہیں۔ باقی جہاں تک آپ کے لیے میری ہمدردی کا معاملہ ہے تو......" میں نے دانستہ رک کر ایک بوجھل سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔
"میں نے خلوصِ نیت سے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا تھا۔ اگر آپ کو میری نیت پر کسی قسم کا شک ہے تو یہ آپ کی نیت کا معاملہ ہوگا۔ میں تو واقعتاً صبا شامی صاحبہ کے قاتل کو سزائے موت دلوانے کی خواہش رکھتا ہوں اور کورٹ روم میں میری تمام تر کوششیں اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے ہیں۔"
"اچھی بات ہے۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔
"جنید صاحب!" میں نے باقاعدہ جرح کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا میں آپ کی ٹریول ایجنسی کا نام جان سکتا ہوں؟"
"شامی ٹریولز!" اس نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔
"کیا استغاثہ کا گواہ اور میرے مؤکل کا سوتیلا بھائی منیب اللہ بھی آپ کی ٹریول ایجنسی سے کوئی تعلق رکھتا ہے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔
"نہیں۔" اس نے بڑی شدت سے انکار کرتے ہوئے بتایا۔ "میں اس شخص کو بالکل نہیں جانتا بلکہ میں نے تو اس کا نام بھی پہلی بار اس کیس میں سنا ہے۔"
"ٹھیک ہو گیا۔" میں نے سرسری انداز میں کہا اور پوچھا۔ "آپ کی مقتولہ بیوی صبا شامی کے فوڈ میگزین "ڈائن" کا آفس آئی آئی چندریگر روڈ پر ہے۔ کیا "شامی ٹریولز" بھی اسی علاقے میں واقع ہے؟"
"نہیں...... میری ایجنسی میٹروپول پر ہے۔"
"جنید صاحب!" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی دیر پہلے آپ نے پراسیکیوٹر کے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ وقوعہ کے روز جب آپ ڈائن کے آفس پہنچے تو آپ نے اپنی بیوی کو اس کی کرسی پر مُردہ حالت میں بیٹھے دیکھا تھا۔ یہ عدالت جاننا چاہتی ہے کہ اس روز آپ کو فون کر کے وہاں آنے کو کہا گیا تھا یا آپ اپنی مرضی سے آئے تھے؟"
"ان دونوں میں سے کوئی بھی وجہ نہیں تھی۔" اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "بلکہ میں صبا کے بلانے پر اس کے آفس گیا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ صبا کی گاڑی میں کوئی خرابی ہو گئی تھی اور اس نے اپنی گاڑی کو گیراج بھیج دیا تھا۔ میرا مطلب ہے اس نے گیراج فون کر کے وہاں سے کسی مکینک کو بلا لیا تھا اور وہی مکینک اس کی گاڑی کو اپنے گیراج لے گیا تھا۔ صبا کی گاڑی اس روز مل نہیں سکتی تھی اس لیے اس نے مجھے فون کر کے کہا تھا کہ میں اسے پک کر لوں۔ میں تو اپنی بیوی کو لینے ڈائن کے آفس گیا تھا۔"
یہ "ڈائن" چڑیل یا پچھل پیری والا نہیں ہے، لہٰذا اس سے ڈرنے یا خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنے ذہن میں "ڈائننگ" کو رکھ کر "ڈائن" کا سامنا کریں گے تو خوف کے بجائے مزہ آئے گا۔
"آپ ڈائن کے آفس کتنے بجے پہنچے تھے؟" میں نے اگلا سوال کیا۔ "میرا مطلب ہے وقوعہ کے روز؟"
"یہی کوئی چھ بجے کے آس پاس۔"
"اس افسوسناک صورتِ حال میں آپ نے دو فون کیے تھے۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "ایک پولیس کو اس سانحے کی اطلاع دینے کے لیے اور دوسرا کسی ڈاکٹر کو بلانے کے لیے۔ مذکورہ ڈاکٹر کا نام کہیں بھی درج نہیں ہے۔ کیا آپ مجھے اس ڈاکٹر کا نام بتا سکتے ہیں؟"
"کیوں نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "اس ڈاکٹر کا نام کریم واسطی ہے اور وہ میرا دوست بھی ہے اسی لیے تو میرے بلانے پر وہ فوراً وہاں پہنچ گیا تھا۔"
"گڈ!" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر اپنے کام کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ "مقتولہ صبا شامی نے اپنی خراب گاڑی کو کس گیراج میں بھیجا تھا؟"
ایک لمحے میں مجھے اس کی آنکھوں میں الجھن تیرا کی کرتی دکھائی دی لیکن اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا

اور بڑے اعتماد سے تفصیلی جواب دیا۔

''سراج مکینیکل ورکس...... سراج بھائی کا آٹو گیراج بہت مشہور ہے۔ میں اپنی گاڑیوں کا ہر کام ہمیشہ سراج بھائی کی ورکشاپ سے ہی کراتا ہوں۔ یہ گیراج گرومندر کے علاقے میں واقع ہے۔''

''اس جانکاری کو معزز عدالت کے سامنے لانے کا بہت شکریہ جنید صاحب!'' میں نے معتدل انداز میں کہا پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک اہم سوال کے جواب میں بے احتیاطی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ میرے مؤکل یعنی اس کیس کے ملزم حبیب اللہ نے ایک گہری سازش کے تحت آپ کی بیوی کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا؟''

''ملزم نے اپنے ناپاک ارادے کی تکمیل کے لیے آفس بوائے مقصود حسین کا کندھا استعمال کیا تھا یعنی اسے اپنا آلۂ کار بنا کر میری بیوی کو زہریلی بلیک ٹی پلوائی تھی۔'' اس نے تصحیح کرنے والے انداز میں کہا۔ ''میں نے کہیں بھی یہ نہیں کہا کہ ملزم نے اپنے ہاتھوں سے صبا کی جان لی تھی۔''

''اس درستی کے لیے میں آپ کا شکرگزار ہوں جنید صاحب!'' میں نے تشکر آمیز نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر ہر دو صورت میں آپ کی بیوی کا قتل ہوا ہے۔ کیا آپ اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں؟''

آخری جملہ میں نے اسے گھیرنے کے لیے ادا کیا تھا۔ وہ فوراً سے پیشتر بول اٹھا۔ ''اس ٹھوس حقیقت کو بھلا کیونکر جھٹلایا جاسکتا ہے۔ اس کیس کی عمارت اسی ستون پر تو کھڑی ہے وکیل صاحب!''

''درست فرمایا آپ نے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ یہ بھی تسلیم کریں گے کہ ہر جرم کا کوئی نہ کوئی محرک ضرور ہوتا ہے۔ اگر استغاثہ بلکہ آپ کے مطابق میرے مؤکل نے آپ کی بیوی کا قتل کیا ہے تو معزز عدالت کو بتائیے کہ اس جان لیوا واردات کا موٹیو (محرک) کیا ہو سکتا ہے؟''

''یہ تو آپ اپنے مؤکل سے پوچھیں وکیل صاحب!'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اس کیس میں ملزم کی حیثیت سے وہ نامزد ہے، میں نہیں۔ میں آپ کو صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ وقوعہ سے ایک ماہ پہلے صبا نے ملزم کو اپنے کمرے میں بلا کر بری طرح بے عزت کیا تھا کیونکہ اس شمارے میں ایک بہت بڑی غلطی چلی گئی تھی۔ عین ممکن ہے کہ ملزم نے اپنی اسی تذلیل کا انتقام لینے کے لیے یہ سنگین قدم اٹھایا ہو۔''

''آپ کے اس تعاون کا بہت شکریہ جنید صاحب! بس، آپ سے ایک آخری سوال......!'' میں نے معتدل دوستانہ انداز میں کہا۔ ''آج کل کراچی سے فرینکفرٹ بزنس کلاس کا فیئر کیا چل رہا ہے؟''

''آپ ایجنسی پر تشریف لائیں وکیل صاحب!'' وہ زیرِلب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''آپ جیسے قابل آدمی کو میں خصوصی ڈسکاؤنٹ دوں گا۔''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ از ایڈجارنڈ فار دی ڈے۔''

اس عدالتی کارروائی کے دوران میں میرے مؤکل کی بیوی غزالہ کورٹ روم میں موجود تھی۔ جب میں باہر نکلا تو وہ بھی میرے ساتھ تھی۔ پارکنگ لاٹ کی طرف جاتے ہوئے ہمارے درمیان مختصر سی گفتگو بھی ہوئی۔

''میں پچھلے تین ماہ سے عدالت میں اِدھر اُدھر خوار ہو رہی ہوں۔'' اس نے میری معیت میں قدم اٹھاتے ہوئے توانا لہجے میں کہا۔ ''مگر ہر پیشی پر حبیب اللہ سے ملاقات کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ حبیب اللہ کا وکیل آخر کر کیا رہا تھا۔''

''قتل کے مقدمات میں کچھ زیادہ ہی پیچیدگیاں ہوتی ہیں اس لیے وکیل کو الزام دینا میرے خیال میں مناسب نہیں ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''وکیل کا کام کیس کو چلانا ہوتا ہے۔ اگر حبیب اللہ کے وکیل نے اس سلسلے میں کسی غفلت کا مظاہرہ کیا ہے تو اسے بھول جائیں۔ آپ کو موجودہ صورتِ حال پر فوکس کرنا چاہیے۔ اب یہ کیس میرے ہاتھ میں ہے۔ میں تو جو کروں گا، سو کروں گا لیکن اس کے ساتھ ہی آپ کو بھی بھاگ دوڑ کرنا ہو گی۔ اس کے بعد ہی ہم مطلوبہ نتائج حاصل کر پائیں گے۔''

''آپ کس قسم کی بھاگ دوڑ کی بات کر رہے ہیں بیگ صاحب؟'' اس نے رک کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''میں اس کیس کے حوالے سے اپنا ہوم ورک کر چکا ہوں لیکن ابھی تھوڑا کام باقی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''بعض کرداروں کے بارے میں مجھے خاص نوعیت کی معلومات درکار ہوں گی جو آپ مجھے فراہم کریں گی۔ مجھے یقین ہے آپ یہ کام کر لیں گی

کیونکہ اس ڈیل میں، میں آپ کی راہنمائی کروں گا۔''

''میں حبیب اللہ کی باعزت رہائی کے لیے آپ سے ہر قسم کا تعاون کرنے کو تیار ہوں بیگ صاحب!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں چاہتی ہوں میرے شوہر کو پھنسانے والے اس شیطان غیب اللہ کو عبرتناک سزا ہو۔''

''میں آپ کے جذبات اور احساسات کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''لیکن آپ کو ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے۔''

''کون سی بات؟'' اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''اس کیس کے ساتھ جڑے ہوئے درجن بھر کرداروں میں سے میرا فوکس صرف اور صرف آپ کے شوہر حبیب اللہ پر ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''میری پہلی اور آخری کوشش اسے اس مقدمے میں بے گناہ ثابت کرنا ہے اور یہ اسی وقت ہو پائے گا جب صبا شامی کی موت کا ذمے دار شخص میری جرح کے فریم میں فکس ہوگا۔ اس کے سامنے آتے ہی حبیب اللہ خود بخود بے قصور نظر آنے لگے گا۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

''میری جرح کے فریم میں کس کردار کا چہرہ اجاگر ہوتا ہے، وہ آپ کی خواہش کے مطابق...... غیب اللہ بھی ہو سکتا ہے یا پھر مقصود حسین و جنید شامی میں سے کوئی ایک اور یا پھر ان کے علاوہ کوئی اور شخص۔ بظاہر یہی نظر آ رہا ہے کہ غیب اللہ نے کسی غلط مقصد سے چائے کی پتی کا وہ سیمپل حبیب اللہ کو دیا تھا جس کے اندر ''سوڈیم آرسائنٹ'' ملا ہوا تھا۔ اگر اس حرکت سے غیب اللہ کا مقصد صبا شامی کو موت کے گھاٹ اتار کر اس کے قتل کے الزام میں حبیب اللہ کو پھنسانا تھا تو ہمیں صبا شامی اور غیب اللہ کی دشمنی کو سمجھنا ہوگا۔ یہ بات ہمیں معلوم ہو چکی ہے کہ غیب اللہ آپ کے شوہر حبیب اللہ سے شدید نفرت کرتا ہے۔ اگر نفرت کا یہ معاملہ حبیب اللہ تک ہی محدود ہوتا تو غیب اللہ اس کی جان لینے کے لیے کوئی ڈائریکٹ ایکشن بھی لے سکتا تھا، صبا شامی کی زندگی سے کھیلنے کی کیا ضرورت تھی؟ خیر، ابھی کھدائی کا عمل جاری ہے......!''

میں نے معنی خیز انداز میں اپنی بات نامکمل چھوڑی تو غزالہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ ''کون سی کھدائی؟''

''کورٹ روم کسی معدن کی طرح ہوتا ہے غزالہ صاحبہ!'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''اس کھان (کان) میں اپنی جرح کے اوزاروں سے کھدائی کرنا پڑتی ہے۔ دونوں کان کن یعنی پراسیکیوٹر اینڈ ڈیفنس اپنے اپنے انداز میں کھدائی کر کے اپنی پسند اور ضرورت کی معدنیات کو ڈھونڈنے کے لیے تگ و دو کرتے ہیں۔ اب یہ حالات و واقعات، وقت اور قسمت پر منحصر ہے کہ کس کے ہاتھ میں کیا آتا ہے۔ بعض اوقات جان توڑ محنت کے باوجود بھی کوئی ڈھنگ کی شے ہاتھ نہیں آتی اور اگر نصیب ساتھ دے رہا ہو تو سطحی سی کھدائی کے بعد ہی ہیرے، جواہرات اور تیل نکل آتا ہے۔''

''تو آپ کا کہنا یہ ہے کہ اگر قسمت ساتھ نہ دے تو ساری محنت اکارت چلی جاتی ہے؟'' اس نے ایک اہم سوال کیا۔

''کامیابی ایک نسخۂ خاص کی رہین منت ہے غزالہ صاحبہ!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''اس نسخۂ کیمیا کے تین اجزا ہیں۔ نمبر ایک، انسان کی قابلیت۔ نمبر دو، انسان کی محنت۔ نمبر تین، انسان کی قسمت۔ ان میں سے دو کا تعلق انسان کے اختیار سے ہے یعنی قابلیت اور محنت لیکن تیسرے جز یعنی قسمت کا معاملہ انسان کے بس میں نہیں ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنی پیشہ ورانہ قابلیت کو استعمال کر کے اس کیس کو جیتنے کے لیے کڑی محنت کروں گا۔ باقی رہ گئی قسمت تو......!'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''نصیب آپ کا ہو، میرا ہو یا پھر حبیب اللہ کا...... اس کا لکھاری، وکیل اور جج میں نہیں، کوئی اور ہے اور اس ذاتِ پاک کو قاضی القضاۃ، قاضی الحاجات اور قادرِ مطلق کہا جاتا ہے۔ آپ میری پیشہ ورانہ صلاحیت پر بھروسا رکھیں مگر اس کے ساتھ ہی راقم النصیب اور مالک التقدیر سے دعا کرنا بھی ضروری ہے۔''

''آپ کی بات میری سمجھ میں آ گئی ہے بیگ صاحب!'' وہ بڑے عزم سے بولی۔ ''آپ اپنا کام جاری رکھیں۔ باقی جو میرے پروردگار کو منظور، وہی مجھے منظور۔''

میں نے اس سے رخصت چاہی اور سلام دوداع کر کے اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

اگلی پیشی پر ڈائننگ کیک کے آفس بوائے مقصود حسین کو گواہی کے لیے پیش کیا گیا۔ پچھلے دو ہفتوں میں غزالہ نے مجھے میری مطلوبہ معلومات فراہم کر دی تھیں جن

کی بنیاد پر میں نے اپنے ذرائع استعمال کر کے اس کیس کے حوالے سے خود کو اپ گریڈ کر لیا تھا۔

مقصود حسین کی عمر چالیس سے متجاوز تھی۔ وہ اکہرے بدن کا مالک ایک دراز قامت شخص تھا اور شخصیت کے اعتبار سے ''آفس بوائے'' کا ٹائٹل اس پر جچتا نہیں تھا۔ بہرکیف، اس کا بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس اسٹینڈ کے پاس چلا گیا۔

''مقصود صاحب!'' اس نے اپنے گواہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ کتنے عرصے سے مقتولہ کے پاس کام کر رہے تھے؟''

''جب سے وہ آفس شروع ہوا ہے۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''عرصہ بتائیں؟''

''کم و بیش دو سال سے۔''

''اور ملزم؟'' وکیل استغاثہ نے سوالیہ نظر سے گواہ کی طرف دیکھا۔

''یہ ایک سال پہلے ہمارے آفس میں آیا تھا۔''

''اس عرصے میں آپ نے ملزم کو کیسا پایا تھا؟''

''بہت ہی پراسرار۔'' گواہ نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔ ''خاموش طبع اور اپنے آپ میں کھویا ہوا۔''

''وقوعہ کے روز کیا ہوا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

''ہمارے آفس میں دو بار چائے بنتی ہے۔'' گواہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''صبح گیارہ بجے اور سہ پہر چار بجے۔ آفس کا ٹائم صبح دس بجے سے شام چھ بجے تک ہے۔ تمام اسٹاف اوقات کار کی پابندی کرتا ہے۔ بس ہماری میڈم دس کے بجائے گیارہ بجے آفس آتی ہیں...... میرا مطلب آفس آیا کرتی تھیں اور لنچ کا وقفہ دو بجے سے تین بجے تک ہوتا ہے جس میں لوگ کھانا کھانے کے علاوہ ظہر کی نماز بھی ادا کر لیتے ہیں۔''

''اتنی زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔'' وکیل استغاثہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ وقوعہ کے روز یعنی سترہ مارچ کی سہ پہر والی چائے کے ساتھ کیا ماجرا ہوا تھا؟''

''میں میڈم اور دیگر اسٹاف کے لیے ایک ہی وقت پر چائے بناتا تھا لیکن میڈم چونکہ بلیک ٹی پینا پسند کرتی تھیں اس لیے میں نے ان کے لیے الگ کیتلی رکھی ہوئی تھی جبکہ دیگر اسٹاف کی چائے میں دوسرے برتن میں تیار کیا کرتا تھا۔'' گواہ نے وکیل استغاثہ کے سوال کا جواب دیتے

''بہت دن سے اماں، ابا اور بھائیوں نے چکر نہیں لگایا؟'' وجاہت نے بیوی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایسا کرو ناجیہ کل رات زبردست سا کھانا بناؤ، ان لوگوں کو بلا لیتے ہیں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟''

''آپ کو بھی ہری ہری سوجھتی ہے۔ گرمی کس غضب کی پڑ رہی ہے؟ بھئی مجھ سے نہیں کھڑا ہوا جاتا باورچی خانے میں۔ بازار سے کچھ بندوبست کر لیجیے، پیزا وغیرہ منگوا لیجیے۔'' ناجیہ تڑخ کر بولی۔

☆☆☆

صرف دو دن بعد ناجیہ نے وجاہت سے لاڈ بھرے انداز میں کہا۔ ''عرصہ ہو گیا امی، بابا اور بھائیوں نے میرے گھر کا چکر ہی نہیں لگایا۔ ایسا لگتا ہے کہ مجھے بیاہ کر سب بھول ہی گئے ہیں۔ ایسا کرتے ہیں کہ اس ویک اینڈ پر شاندار سا باربی کیو کرتے ہیں۔ امی، بابا اور بھائیوں کو مدعو کرتے ہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا وجاہت؟''

☆☆☆

''ہیلو گوہر کیا حال ہے؟'' بڑی آپا شمسن کا فون تھا۔

''آپا، طبیعت کچھ ماندی سی ہے۔''

''ارے کیا ہوا میری بہنا کو، میں ابھی آتی ہوں۔''

''آپا جیسی بہن اللہ سب دوستوں کو دے۔''

آپا آئیں اور بکھرے گھر کو سمیٹنے میں مدد بھی کی اور سارے خاندان کا قصہ بھی سنایا۔ ماں جائی سے مل کر کیسا سکون ملا۔ ٹھنڈی پڑ گئی کلیجے پر۔

☆☆☆

''ہیلو گوہر کیا حال ہے؟'' منجھلی نند رقیہ کا فون تھا۔

''باجی طبیعت کچھ خراب ہے۔''

''ارے کیا ہوا میری پیاری بھابی کو؟ میں ابھی آتی ہوں۔''

''ہیلو، ہیلو! باجی۔''

''لو فون رکھ دیا۔ یہ میری منجھلی نند بھی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہی رہتی ہیں۔ اب آئیں گی، بکھرا گھر دیکھ کر پورے خاندان میں میرے پھوہڑپن کا ڈھول پیٹتی پھریں گی اور سارے خاندان کی گوسپ سنا کر میرا بلڈ پریشر الگ بڑھا دیں گی۔ اف یہ سسرالی بھی نرا عذاب ہی ہیں!''

(تحریر: شاہین کمال، کلگری، کینیڈا)

ہوئے بتایا۔ ’’لنچ کے بعد ملزم میرے پاس کچن میں آیا اور اس نے مجھ سے کہا کہ اس کے ایک دوست نے چائے کی پتی کا بزنس شروع کیا ہے۔ وہ ایران اور سری لنکا سے چائے کی اعلیٰ درجے کی پتی امپورٹ کررہا ہے۔ میڈم اسٹرانگ بلیک ٹی پینے کی شوقین ہیں اس لیے میں ان کے لیے ایک سیمپل لایا ہوں۔ آج تم اسی سیمپل کو ٹرائی کرو۔ اگر میڈم کو یہ پتی پسند آگئی تو آئندہ ہم اپنے آفس کے لیے یہی پتی لایا کریں گے۔‘‘ وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

’’ملزم نے مجھے ایک پڑیا دی۔ میں نے اس پڑیا کو کھول کر دیکھا تو اس کے اندر آدھا چمچ پتی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ تو بہت کم ہے۔ میں میڈم کے ایک کپ کے لیے جتنی پتی استعمال کرتا ہوں، یہ تو اس سے آدھی ہے۔ اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا یہ پتی بڑی کڑک ہے۔ یہ آدھی مقدار بھی بہت اسٹرانگ بلیک ٹی بنائے گی۔ میں نے اس کی بات مان لی۔ بس، میرا اتنا سا قصور ہے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے پتا نہیں تھا کہ اس پتی میں کوئی زود اثر زہر ملا ہوا ہے۔‘‘

’’آپ نے ملزم کی فراہم کردہ پتی سے مقتولہ کے لیے ایک کپ اسٹرانگ بلیک ٹی تیار کی اور لے جا کر اپنی میڈم کو پیش کردی۔ آپ کی میڈم نے وہ بلیک ٹی پی جو اس کی زندگی کی آخری چائے ثابت ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب آپ چائے کا کپ اور ساسر اٹھانے اپنی میڈم کے کمرے میں گئے تو وہ اس دنیا سے اس دنیا میں منتقل ہوچکی تھیں۔‘‘ وکیل استغاثہ نے اپنے گواہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’اس کے علاوہ اور کچھ؟‘‘

’’کچھ نہیں۔‘‘ گواہ نے نفی میں گردن ہلادی۔

’’وقوعہ سے لگ بھگ ایک ماہ پہلے کا وہ دن اپنی یادداشت میں تازہ کریں جب مقتولہ نے کسی غلطی پر ملزم کو جھاڑ پلائی تھی۔‘‘ وکیل استغاثہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

’’جی...... مجھے اچھی طرح یاد ہے۔‘‘ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ’’اس روز میڈم بہت غصے میں تھیں اور جلدی گھر بھی چلی گئی تھیں۔‘‘

’’یور آنر!‘‘ وکیل استغاثہ نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے فاتحانہ انداز میں کہا پھر میری طرف گردن موڑ کر ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

’’یور وٹنس پلیز!‘‘

’’مقصود حسین۔‘‘ میں نے وٹنس اسٹینڈ کے پاس جا کر استغاثہ کے گواہ سے سوال کیا۔ ’’آپ نے کم و بیش ایک سال ملزم کے ساتھ ڈائن لنگ بک کے آفس میں کام کیا ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟‘‘

’’آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے وکیل صاحب!‘‘ اس نے مختصر جواب دیا۔

’’کیا اس ایک سال کے دوران میں کبھی ملزم نے رومال کے اندر سے پھڑپھڑاتا ہوا کبوتر نکال کر دکھایا تھا؟‘‘ میں نے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔

’’نن...... نہیں۔‘‘ اس نے الجھن زدہ لہجے میں جواب دیا۔

’’اس نے کبھی ہوا میں ہاتھ گھما کر کوئی سیب نکالا ہو؟‘‘

’’نہیں جی...... بالکل نہیں۔‘‘

میرے ان منفرد سوالات نے استغاثہ کے گواہ کو گہرے تذبذب میں ڈال دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس سے یہ سب کس لیے پوچھ رہا ہوں۔ میں نے اسے الجھن میں جتلا رہنے دیا اور تیز آواز میں استفسار کیا۔

’’کیا ملزم نے کبھی کاغذ کے کسی مستطیل ٹکڑے کو کرنسی نوٹ میں تبدیل کرکے دکھایا یا چٹکی بجا کر اندھیرے کمرے میں روشنی پھیلادی اور یا پھر اس نے ہوا میں اڑنے کا مظاہرہ کیا؟‘‘

وہ زچ ہوکر بولا۔ ’’اس قسم کا کام تو مداری اور جادوگر کرتے ہیں وکیل صاحب!‘‘

’’آبجیکشن یور آنر!‘‘ وکیل استغاثہ نے بہ آواز بلند کہا۔ ’’ڈیفنس کونسلر استغاثہ کے معزز گواہ سے اوٹ پٹانگ سوالات پوچھ کر گواہ کو ہراساں کرنے کے ساتھ ہی عدالت کا قیمتی وقت بھی برباد کررہے ہیں۔‘‘

’’بیگ صاحب! آپ پراسیکیوشن کے اس اعتراض کے جواب میں کیا کہنا چاہیں گے؟‘‘ جج نے مجھ سے پوچھا۔

’’جناب عالی!‘‘ میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔ ’’میں نے اپنی دانست میں ابھی تک معزز عدالت کے قیمتی وقت کا ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں کیا اور نہ ہی میں نے استغاثہ کے گواہ کو ہراساں کرنے کی غلطی کی ہے۔ باقی میں نے گواہ سے جو بھی سوالات کیے ہیں، ان میں کچھ بھی اوٹ پٹانگ نہیں ہے بلکہ اس نوعیت کے... سوالات پوچھنے کی تحریک مجھے گواہ ہی نے دی ہے اور میں اس کی وضاحت بھی ثبوت کے ساتھ کرسکتا ہوں۔‘‘

’’آبجیکشن اوور رولڈ!‘‘ جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’ڈیفنس! پلیز پروسیڈ فردر!‘‘

''مقصود صاحب!'' میں گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''آپ کے خیال میں یہ سارے کام مداری اور جادوگر ہی کر سکتے ہیں؟''

''جی۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''کیونکہ یہ بہت ہی پراسرار کام ہیں؟''

''جی بالکل۔''

''اور ملزم مداری ہے، نہ جادوگر اور نہ ہی پراسرار؟''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب!''

''اگر میں ٹھیک کہہ رہا ہوں تو پھر آپ نے غلط بیانی کیوں کی مقصود صاحب؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ تو چیٹنگ ہے۔''

''م...... میں نے...... کون سی غلط بیانی کی ہے؟'' وہ ہکا بکا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔

''مقصود صاحب!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر ٹھوس انداز میں کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں آپ نے معزز عدالت کو بتایا تھا کہ آپ نے ایک سال کے عرصے کے دوران میں ملزم کو بہت ہی پراسرار پایا تھا اور اب آپ اپنی کہی بات سے مکر رہے ہیں۔ آپ نے ابھی ابھی میرے اس سوال کی تصدیق کی ہے کہ ملزم مداری ہے نہ جادوگر اور نہ ہی کوئی پراسرار انسان۔ کیا یہ کھلا تضاد نہیں ہے؟''

''ملزم کی ذات کے حوالے سے پراسرار سے میری مراد یہ تھی کہ وہ بہت کم گو اور خاموش طبع شخص ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''آپ کے اس وضاحتی بیان سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ملزم ایک دانشمند اور بردبار شخص ہے۔'' میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تیز آواز میں کہا۔ ''شاید آپ مولائے کائنات کے اس فرمان سے واقف نہیں ہیں کہ......

کم کھانا صحت، کم سونا عبادت اور کم بولنا حکمت ہے......

خیر۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنی جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے استغاثہ کے گواہ سے پوچھا۔

''مقصود صاحب! تھوڑی دیر پہلے آپ نے وکیل استغاثہ کی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ وقوعہ سے ایک ماہ پہلے مقتولہ صبا شامی نے کسی بات پر ملزم کو جھاڑ پلائی تھی۔ آخر وہ بات تھی کیا؟''

''ملزم سے کوئی سنگین غلطی ہو گئی تھی۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''میں اسی غلطی کے بارے ہی میں تو پوچھ رہا ہوں۔''

''یہ تو مجھے معلوم نہیں۔'' میرے کڑے استفسار نے استغاثہ کے گواہ کو گڑبڑا دیا۔ ''میڈم نے اپنے کمرے میں بلا کر ملزم کی بے عزتی کی تھی۔ ان دونوں کے بیچ کیا باتیں ہوئی تھیں، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے مصلحت بردار لہجے میں کہا۔ ''آپ یہ تو بتا ہی سکتے ہیں کہ اس موقع پر بند کمرے میں مقتولہ اور ملزم کے علاوہ اور کون موجود تھا؟''

وہ بڑے وثوق کے ساتھ بولا۔ ''کوئی نہیں۔''

''پکا؟''

''جی...... بالکل پکا۔''

''جناب عالی!'' میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''استغاثہ کے معزز گواہ مقصود حسین نے ابھی عدالت کو پورے وثوق سے بتایا ہے کہ مذکورہ روز بند کمرے کے اندر مقتولہ اور ملزم کے سوا اور کوئی بندہ بشر موجود نہیں تھا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ مقتولہ سے کسی قسم کا سوال جواب ممکن نہیں رہا لیکن ملزم اس وقت کورٹ روم میں موجود ہے۔ اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں ملزم سے چند سوالات کرنا چاہوں گا۔''

''پرمیشن گرانٹیڈ!'' جج نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''تھینک یو یور آنر!'' میں نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ ''استغاثہ کے مطابق میرے مؤکل نے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے ایک گہری سازش کے تحت مقصود حسین کا استعمال کرتے ہوئے مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کا مذموم منصوبہ بنایا تھا۔ اس پیش منظر میں قتل کا محرک ''بے عزتی کا انتقام'' قرار پاتا ہے مگر ابھی تک اس ''بے عزتی'' کی کوئی تفصیل سامنے نہیں آسکی۔ میں اسی لیے ملزم سے سوال کرنا چاہتا ہوں تاکہ زیر سماعت کیس کے اس خلا کو پُر کیا جا سکے۔''

جج نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''حبیب اللہ!'' میں نے اکیوزڈ اسٹینڈ کے پاس جا کر ملزم سے کہا۔ ''عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ وقوعہ سے کم و بیش ایک ماہ پہلے آپ سے ایسی کون سی غلطی ہو گئی تھی جس پر مقتولہ نے آپ کی بے عزتی کر دی تھی؟''

''اس واقعے کو بالکل غلط انداز میں پیش کیا جا رہا ہے۔'' ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''تو پھر مذکورہ واقعے کا درست انداز کون سا ہے؟''

''اگر آپ طباعت اور اشاعت کے معاملات کو سمجھے

ہیں تو مجھے وضاحت کرنے میں آسانی رہے گی۔''

حبیب اللہ نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے جواب میں کہا۔ ''مجھے پوری جانکاری تو حاصل نہیں ہے۔ ہاں، البتہ میں اس کام کو تھوڑا بہت سمجھتا ہوں۔''

''چلے گا۔'' ملزم نے سرسری انداز میں کہا۔ ''پہلے تو میں یہ واضح کردوں کہ اس معاملے میں نہ تو میری کوئی غلطی تھی اور نہ ہی میڈم نے میری بے عزتی کی تھی۔'' اس نے رک کر ایک گہری سانس لی پھر اپنے بیان کو مکمل کرتے ہوئے بتانے لگا۔

''پبلشنگ کے شعبے میں رائٹر لکھتا ہے، ایڈیٹر اس میٹر کو جانچتا ہے، خوش نویس اس کی کتابت کرتا ہے، پروف ریڈر مسودے کے مطابق اس کا صحیح مطالعہ کرتا ہے اور اس کے بعد سارا کام فلم پروسیس کے لیے چلا جاتا ہے۔ جب سب کچھ پیسٹنگ ٹیبل پر پہنچتا ہے تو میں ڈمی کے مطابق کاپی کی پیسٹنگ شروع کرتا ہوں۔ میرا کام مکمل ہونے کے بعد ایڈیٹر شیٹ چیک کرتا ہے اور میگزین چھپنے کے لیے پرنٹنگ پریس چلا جاتا ہے۔ اس میگزین کو بھی انہی مراحل سے گزارنے کے بعد پرنٹنگ پریس بھیجا گیا تھا لیکن اس شمارے میں ایک بھیانک غلطی چلی گئی تھی۔ اس شعبے میں اگر کوئی غلطی چلی جاتی ہے تو ننانوے اعشاریہ نو، نو فیصد وہ غلطی چھپنے کے بعد ہی نظر میں آتی ہے اور...... تب کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا۔'' وہ ایک بار پھر متوقف ہوا، ٹھہری ہوئی نظر سے جج کی طرف دیکھا اور ان الفاظ میں اضافہ کردیا (واضح رہے کہ زیرِ نظر واقعہ کمپیوٹر کی آمد سے پہلے کا ہے)۔

''ہمارے ایک مستقل اور مشہور رائٹر ہیں زبیر اکرام۔ ''ڈائن'' کے ہر شمارے میں ان کا کچھ نہ کچھ ضرور شائع ہوتا ہے۔ اس وقت جو شمارہ زیرِ بحث ہے، اس میں موصوف کے آرٹیکل پر مصنف کے نام کے طور پر ''زبیرا کرام'' چلا گیا تھا۔ یہ بنیادی طور پر کتابت کی غلطی تھی کہ اسپیس اور نقطوں کی ادل بدل سے زبیر کا زبیرا بن گیا۔ اس کے بعد پروف ریڈر کی غفلت کہ اس نے ایک انسان کو جانور بننے سے نہیں روکا۔ میں تو اس معاملے میں کسی قطار شمار ہی میں نہیں تھا۔ میرے پاس جو فلمیں پہنچیں، وہ میں نے ڈمی کی روشنی میں پیسٹ کردیں۔ ہمارے زبیر اکرام صاحب ایک شیف بھی ہیں اور میڈم کے بہت قریب بھی اسی لیے ان کی شکایت پر یہ ایشو کچھ زیادہ ہی ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ اس غلطی کو لے کر میڈم نے اپنے کمرے میں بلا کر مجھ سے بھی بازپرس کی تھی مگر میری وضاحت پر انہیں احساس ہوگیا کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ بہرحال، اس روز میڈم کا موڈ آف رہا اور وہ آفس سے جلدی اٹھ گئی تھیں۔''

''جنابِ عالی!'' ملزم کی بات مکمل ہونے پر میں نے جج سے کہا۔ ''میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم نے جو وضاحت پیش کی ہے، اس کی تصدیق کے لیے ڈائن کے دیگر اسٹاف کو بھی گواہی کے لیے عدالت میں بلایا جاسکتا ہے اور اس سلسلے میں سب سے بڑا ثبوت تو وہ میگزین ہے جس میں زبیر اکرام صاحب کو سہواً ''زبیرا کرام'' بنادیا گیا تھا۔ ڈائن کک بک کا مذکورہ شمارہ میں آئندہ پیشی پر معزز عدالت کی خدمت میں ''حاضر'' کردوں گا۔'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر بہ آوازِ بلند کہا۔

''جنابِ عالی! استغاثہ نے صبا شامی کے قتل کا جو محرک بتایا تھا، حقیقت سامنے آنے کے بعد وہ ریت کی دیوار ثابت ہوا ہے۔ جیسا کہ اگر میرے اس بیان میں شامل لفظ ''دیوار'' کے اندر سے الف کو اڑا دیا جائے تو وہ لفظ ''دیور'' بن جائے گا۔ سو، ٹائپسٹ کی اس غلطی یعنی ''ریت کی دیور'' پر مجھے کسی قسم کی ڈانٹ ڈپٹ یا پھر سزا نہیں دی جاسکتی۔ اس سے صورتِ حال روزِ روشن کے مانند عیاں ہوجاتی ہے کہ وقوعہ سے ایک ماہ پہلے نہ تو مقتولہ نے ملزم کی بے عزتی کی تھی اور نہ ہی ملزم کا صبا شامی کے قتل میں کوئی ہاتھ ہے۔ جب ملزم کی تذلیل ہی نہیں ہوئی تھی تو پھر اس کا بدلہ لینے کا کیا جواز؟ ڈیٹس آل یور آنر!''

''جنابِ عالی!'' وکیل استغاثہ نے اضطراری لہجے میں جج سے درخواست کی۔ ''میں بھی اس کیس کے ملزم سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

''اجازت ہے۔'' جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''حبیب اللہ! کیا تم اس بات سے انکار کرتے ہو کہ ''ڈائن کک بک'' نامی میگزین کو جوائن کرنے سے پہلے تم ایک دوسرے فوڈ میگزین کی پیسٹنگ کیا کرتے تھے؟'' جج سے اجازت حاصل کرنے کے بعد وکیل استغاثہ نے ملزم سے سوال کیا۔ ''مذکورہ میگزین کا نام ''ہیلدی ٹیسٹ'' ہے اور حامد غفوری صاحب اس کے مالک ہیں۔''

''نہیں وکیل صاحب!'' ملزم نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے لہٰذا انکار کی کوئی گنجائش نہیں اور......'' وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''ہیلدی ٹیسٹ سے پہلے میں شام کے ایک اخبار میں......''

''اتنا زیادہ پیچھے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وکیل استغاثہ نے ہاتھ اٹھا کر ملزم کو مزید بولنے سے روک دیا اور کہا۔ ''معاملہ اگر ''میلڈی ٹیسٹ'' اور ''ڈائن گگ بک'' تک محدود رہے تو اچھی بات ہے۔'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر کریدنے والے انداز میں بولا۔

''کیا یہ سچ ہے کہ ایک عرصے تک ''میلڈی ٹیسٹ'' نمبرون فوڈ میگزین رہا ہے لیکن ''ڈائن گگ بک'' نے آتے ہی مارکیٹ کو اپنے حق میں کرلیا اور ایک سال کے اندر ہی ڈائن پہلے نمبر پر آگیا۔ پھر تم میلڈی ٹیسٹ کو چھوڑ کر ڈائن میں آ گئے۔''

''جی ہاں، یہی سچ ہے۔'' ملزم نے جواب دیا۔

''میلڈی ٹیسٹ کو چھوڑ دینے کے باوجود بھی تمہارا اکثر حامد غفوری صاحب سے ملنا جلنا رہتا ہے؟''

''اکثر نہیں، کبھی کبھار ان سے میری ملاقات ہوجاتی ہے۔'' ملزم نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں تعلقات ختم کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ میں تو شام کے اس اخبار کے مالک سے بھی ملتا رہتا ہوں جس کا ذکر میں کرنے ہی والا تھا کہ آپ نے روک دیا۔''

''میں ایک بار پھر تمہیں روکنا چاہوں گا۔'' وکیل استغاثہ نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ ''حامد غفوری صاحب اور مقتولہ صبا شامی کے درمیان کاروباری مسابقت و معاندت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ڈائن کی روز افزوں ترقی اور مقبولیت نے حامد غفوری صاحب کو گہری تشویش میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اس امر میں کسی شک کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی کہ ڈائن کو اتنی تیزی سے آگے لے جانے میں تمہارا بھی ہاتھ ہے۔''

''صرف میں ہی نہیں بلکہ میڈم صبا سمیت تمام اسٹاف ڈائن کی بہتری کے لیے کام کرتا تھا اور ہم سب کی کوششیں رنگ لاتی نظر بھی آتی تھیں۔'' ملزم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ مجھ سے پوچھنا کیا چاہ رہے ہیں وکیل صاحب؟''

''میرا سوال نہایت ہی سادہ، آسان اور منطقی ہے۔'' وکیل استغاثہ نے ملزم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔ ''جب کوئی شخص بیک وقت دو کاروباری حریفوں سے مل رہا ہو تو اس سے ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ بے وفائی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ تو کیا......'' اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر سرسراتی ہوئی معنی خیز آواز میں بولا۔

''تو کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ حامد غفوری صاحب نے تمہیں ایک مشن سونپ کر ڈائن میں بھیجا تھا تاکہ تم اس فوڈ میگزین کا بھٹا بٹھا سکو۔ ویسے صبا شامی کی موت کے بعد سے ڈائن مارکیٹ میں نہیں آیا۔ ڈائن کے منظر عام سے غائب ہوتے ہی حامد غفوری صاحب کا ''میلڈی ٹیسٹ'' دوبارہ پہلے نمبر پر آچکا ہے۔''

''پہلی فرصت میں میرے فاضل دوست......!'' میں نے پُرجوش انداز میں نعرہ لگایا۔

''ڈیفنس!'' جج نے مجھ سے مخاطب ہوکر پوچھا۔ ''آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

''جناب عالی! میں وکیل استغاثہ سے دست بستہ درخواست کرنا چاہوں گا کہ وہ پہلی فرصت میں سمجھ لیں کہ حامد غفوری صاحب نے ایک سازش کے تحت میرے مؤکل کو مقتولہ کے آفس میں کام کرنے بھیجا تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اس طرح ملزم کے حصے کی پریشانیاں میرے فاضل دوست کے گلے پڑ جائیں گی۔''

''وہ کیسے؟'' وکیل استغاثہ نے چونکتے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

''وہ ایسے مائی ڈیئر کونسلر......!'' میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈال کر سنسنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ''جب آپ ویسا سمجھیں گے تو حامد غفوری صاحب آپ پر کیس ٹھوک دیں گے...... الزام تراشی، بہتان بازی، تہمت سازی اور اسی قبیل کی درجنوں وجوہات کو بنیاد بنا کر......!

وکیل استغاثہ کے چہرے پر فکر کی لکیریں نمودار ہوئیں۔ قبل اس کے کہ وہ میری دھمکی آمیز وضاحت کے جواب میں لب کشا ہوتا، عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔

''بیگ صاحب!'' جج مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''آپ نے دو صفائی کے گواہوں کے نام دیے ہیں۔ آپ اپنے گواہوں کو کب پیش کریں گے؟''

''آئندہ پیشی پر جناب عالی!'' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''اس کے ساتھ ہی معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ اگلی پیشی پر اس کیس کے مدعی اور مقتولہ کے شوہر کو عدالت میں موجود رکھنے کا بندوبست کیا جائے۔ دراصل مجھے ان کی ایجنسی کے اندر سے کچھ ملا ہے۔''

''کیا......!'' وکیل استغاثہ نے چونک کر مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''آپ کو جنید شامی کی ٹریول ایجنسی میں سے کیا ملا ہے؟''

"کچھ بہت ہی خاص......!" میں نے پراسرار انداز میں کہا۔ "لیکن موصوف کی عدم موجودگی میں اس ایشو پر بات کرنا عدالتی اخلاقیات کے منافی ہوگا۔ آپ اپنے دو معزز گواہان جنید شاہی اور منیب اللہ کو آئندہ پیشی پر یہاں لانے کا انتظام کریں پھر روبرو بات ہوگی۔"

وکیل استغاثہ معاندانہ نظر سے مجھے گھور کر رہ گیا۔ جج نے اگلی پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

اگلے روز ملزم کی بیوی مجھ سے ملنے آفس چلی آئی۔

گزشتہ روز عدالت میں میری مصروفیت کچھ زیادہ تھی۔ حبیب اللہ کے کیس کے بعد مجھے وکلاء برادری کی ایک اہم میٹنگ اٹینڈ کرنا تھی اس لیے میں غزالہ سے بات نہیں کر سکا تھا۔ وہ ہر پیشی پر عدالت میں حاضر ہوتی تھی۔

"بیگ صاحب!" رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔ "میں کوئی وکیل یا جج نہیں ہوں لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ کیس اپنے منطقی انجام کی جانب بڑھ رہا ہے۔"

"اس نوعیت کے اندازے لگانے کے لیے انسان کا وکیل یا جج ہونا نہیں بلکہ صاحب فہم ہونا ضروری ہے۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "آپ نے سوشیالوجی میں ماسٹرز کر رکھا ہے لہٰذا آپ کا معاشرتی علم اور سماجی شعور بلند ہے۔ اگر آپ کو ایسا لگتا ہے تو آپ کا یہ احساس بالکل درست ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ اس کیس کی بنیاد اور دیواریں مکمل ہو چکی ہیں۔ بس چھت ڈالنا باقی ہے۔ آئندہ ایک یا زیادہ سے زیادہ دو پیشیوں میں یہ کام بھی نمٹ جائے گا۔"

"ان شاء اللہ!" وہ تہ دل سے بولی۔

"کیا آج اس طرف آپ کا کسی خاص مقصد سے آنا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں تیمور کے لیے ایک سائیکل خریدنے پاکستان چوک آئی تھی۔" اس نے بتایا۔ "دل میں آپ کا خیال آ گیا۔ سوچا، آپ کو سلام کرتی چلوں۔"

"اچھا کیا۔" میں نے کہا۔ "تیمور نے اس کیس کا اثر تو لیا ہوگا؟"

"جی مگر میں نے اسے اچھے سے سنبھال رکھا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "تیمور ابھی صرف سات سال کا ہے مگر سمجھ داروں جیسی میچور سوچ ہے اس کی۔ میں نے اس سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ وہ کہتا ہے، گندے چاچو نے پاپا کو پھنسایا ہے۔ پاپا جلدی گھر آ جائیں گے اور چاچو اس کیس میں خود پھنس جائیں گے۔"

"آپ کا بیٹا ٹھیک کہتا ہے۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جو دوسرے کے لیے گڑھا کھودتا ہے، ایک دن وہ خود اس گڑھے میں گرتا ہے۔ قدرت کا قانون یہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ منیب اللہ نے حبیب اللہ کے لیے جو گڑھا کھودا ہے، اس میں وہ خود گرتا ہے یا پھر اس کا کوئی اور سنگی ساتھی جس کے اشارے پر اس نے آپ کے شوہر کے خلاف یہ سازش بُنی ہے۔"

وہ مزید تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر پہلے استغاثہ کے دو ایسے گواہوں کو بھگتایا گیا جن کے بیان میں کوئی خاص بات نہیں تھی لہٰذا میں ان کو نظر انداز کر کے آگے بڑھتا ہوں۔

میں نے گزشتہ پیشی پر جج سے درخواست کی تھی کہ اس پیشی پر مقتولہ کے شوہر کو عدالت میں بلایا جائے لیکن مجھے پتا چلا کہ جنید شاہی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے اس نے میڈیکل سرٹیفکیٹ بھجوا دیا تھا۔ جج نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔

"وکیل صاحب! آپ کا کوئی گواہ باقی ہے؟"

"یس یور آنر!" وکیل استغاثہ نے کراری آواز میں جواب دیا۔ "اب میں استغاثہ کے ایک اہم گواہ کو پیش کرنا چاہوں گا۔"

جج نے سر کی اثباتی جنبش کے ساتھ کہا۔ "پرمیشن گرانٹیڈ!"

اس کے ساتھ حبیب اللہ کا چھوٹا سوتیلا بھائی منیب اللہ وٹنس اسٹینڈ پر پہنچ گیا۔ منیب کی عمر تیس کے اریب قریب تھی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی ہوشیاری اور چالاکی پائی جاتی تھی۔ منیب اللہ کو کٹہرے میں کھڑے دیکھ کر ملزم حبیب اللہ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمودار ہو گئے تھے۔ میں نے کورٹ روم کی آخری چوبی بینچ کی طرف نگاہ اٹھائی تو وہاں براجمان غزالہ مجھے غیظ و غضب کی کیفیت میں دکھائی دی۔ منیب کے لیے اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔

منیب اللہ کا بیان حلفی ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ نے اپنی جرح کا آغاز کچھ اس انداز سے کیا۔ "منیب صاحب! کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟" بات کے اختتام پر اس نے اکیوزڈ اسٹینڈ پر موجود ملزم حبیب اللہ کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

"جی بالکل۔" گواہ نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے

حقارت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ شخص کہنے کو تو میرا بھائی ہے لیکن اسے خطرناک ناگ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔''

''یہ آپ نے بڑی عجیب بات کر دی منیب صاحب!'' وکیل استغاثہ نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''ایک بھائی دوسرے بھائی کے لیے ناگ کیسے ہو سکتا ہے؟ عدالت یہ راز جاننے میں دلچسپی رکھتی ہے۔''

''دیکھیں جی......!'' گواہ نے ملزم کو گھورنے کے بعد وکیل استغاثہ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ہم دونوں باپ کی طرف سے بھائی ہیں مگر ہماری مائیں الگ تھیں یعنی ہم ایک ماں کی اولاد نہیں ہیں اور اسی بات کا فائدہ ملزم گاہے بہ گاہے اٹھانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے میرا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں خاموش ہو گیا۔ چند لمحات تک وہ اپنی جذباتی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا پھر قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے اپنی ماں کے انتقال کے بعد بہت بُرا وقت دیکھا ہے۔ میری جاب چھوٹ چکی تھی اور رہنے کا کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ ایسے میں، میں نے ملزم سے اپنا حق مانگا لیکن اس بے ایمان شخص نے مجھے بری طرح دھتکار دیا جیسے میں اس سے بھیک مانگ رہا ہوں۔''

''ایک منٹ......!'' وکیل استغاثہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے عیاری بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ''آپ اپنے کون سے حق کی بات کر رہے ہیں؟''

''یہ سچ ہے کہ ہماری ماں ایک نہیں تھی مگر ہم دونوں ایک ہی باپ کی اولاد ہیں لہٰذا باپ کی وراثت میں ہم دونوں کا برابر حق ہے۔'' استغاثہ کے گواہ نے خود کو مجبور، مظلوم اور حق دار ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے جذباتی انداز میں کہا۔ ''کورنگی والے اسّی گز کے جس مکان میں ملزم کی رہائش ہے، وہ ہم دونوں کے باپ نجیب اللہ نے بنایا تھا۔ جتنا حق حبیب اللہ کا اس مکان پر ہے، اتنا ہی حق دار میں بھی ہوں۔ جب میں نے انتہائی خراب حالات میں اس بندے سے اپنے حق کی بات کی تو اس نے مجھے الٹا جواب دیا۔'' وہ لمحے بھر کو رکا پھر اپنی وضاحت کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اس نے کہا...... نجیب اللہ کے مرنے کے بعد مذکورہ مکان اس کی بیوی شاکرہ بیگم یعنی حبیب اللہ کی ماں کے نام ہو گیا تھا اور جب شاکرہ بیگم کا انتقال ہوا تو وہ مکان حبیب اللہ کی ملکیت ہو گیا۔ اب اگر مجھے اس مکان کی نسبت سے حق وراثت حاصل کرنا ہے تو میں جا کر اپنے مرحوم باپ نجیب اللہ سے بات کروں۔ آپ ہی بتائیں وکیل صاحب! اس نامعقول شخص نے کیسی ٹیڑھی بلکہ بے ہودہ بات کی تھی؟''

وکیل استغاثہ نے اس کے استفسار کا جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔ ''جب ملزم نے آپ کو اس قسم کا جواب دیا تو آپ نے اس سے کیا کہا تھا؟''

''میں نے کہا کہ میں اس پر کیس کر دوں گا۔'' گواہ نے بتایا۔ ''اور عدالت سے اپنا حق حاصل کر کے ہی دم لوں گا۔''

''اس کے بعد......؟'' وکیل استغاثہ نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

''میں ابھی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اس چالباز ناگ نے قتل کے اس مقدمے میں مجھے گھسیٹ لیا۔''

''گویا آپ واضح الفاظ میں معزز عدالت کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آپ نے زہریلی چائے کی پتی والی وہ پڑیا ملزم کو نہیں دی تھی؟''

''بالکل نہیں۔'' منیب اللہ نے پوری قطعیت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں کسی زہر فروش کو نہیں جانتا اور...... میں تو اس گھٹیا شخص سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ اس کے توسط سے بھلا اپنے کسی دوست کے چائے کی پتی والے کاروبار کو بڑھانے کی کوشش کیوں کروں گا۔''

''دیٹس آل یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے روئے سخن جج کی جانب پھیرتے ہوئے بہ آواز بلند کہا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یور وٹنس پلیز!''

اپنی باری پر میں گواہ سے جرح کرنے کے لیے وٹنس اسٹینڈ کے نزدیک چلا گیا اور منیب اللہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

''منیب صاحب! اگر آپ نے اپنی حماقت سے سب کچھ کھو دیا تھا تو اس میں میرے موکل کا کیا قصور؟ کیا حبیب اللہ کے کہنے پر آپ نے نورین سے عشق کیا تھا؟''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ ''اس عدالت میں صبا مرڈر کیس کی کارروائی چل رہی ہے اور ڈیفنس کونسلر استغاثہ کے معزز گواہ کا دھیان کسی غیر متعلق معاملے کی طرف موڑنے کی کوشش کر رہے ہیں جو عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کے مترادف ہے۔ عدالت سے میری درخواست ہے کہ ڈیفنس کو ایسی حرکتیں کرنے سے باز رہنے کی تاکید کی جائے۔''

''بیگ صاحب! آپ نے گواہ کے جس عشق اور حماقت کا تذکرہ کیا ہے، کیا اس کا زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق ہے؟'' جج نے مجھ سے پوچھا۔
''جناب عالی! اگر گواہ منیب اللہ کے خراب حالات کا ذکر ضروری ہے تو پھر اس خرابی کے اسباب کا تذکرہ غیر ضروری نہیں ہوسکتا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اگر اس بیان کے لیے پراسیکیوشن پر کوئی قدغن نہیں ہے تو پھر ڈیفنس پر آبجیکشن کا کیا جواز؟''
میری دلیل خاصی وزنی تھی جس کے نتیجے میں جج نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ نہایت ہی مختصر الفاظ میں اپنے موقف کی وضاحت کر کے عدالتی کارروائی کو آگے بڑھائیں۔''
میں نے گردن کو فرمانبردارانہ انداز میں اثباتی حرکت دینے کے بعد نورین کے ہاتھوں منیب اللہ کے بے وقوف بن کر برباد ہونے والے افسوسناک واقعے کا اجمالی جائزہ پیش کر دیا پھر استغاثہ کے گواہ کی طرف دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں استفسار کیا۔
''بتائیں منیب صاحب! اگر آپ نورین سے دھوکا کھا کر سڑک پر آگئے تھے تو اس میں میرے مؤکل کی کیا خطا تھی۔ آپ نے اسے زہریلی چائے کی پتی دے کر اس معصیت میں کیوں پھنسایا ہے؟''
''میں تھوڑی دیر پہلے بڑے واضح الفاظ میں بتا چکا ہوں کہ میں نے ملزم کو زہریلی پتی والی پڑیا نہیں دی تھی۔'' وہ خفگی بھرے لہجے میں بولا۔ ''اور جہاں تک نورین کا معاملہ ہے تو میں اس موضوع پر بات بھی نہیں کرنا چاہتا۔''
''ٹھیک ہو گیا منیب صاحب!'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''نورین کی دھوکا دہی اور آپ کے نامراد عشق کے تذکرے کو یہیں پر دفن کر دیتے ہیں کیونکہ ہمارے پاس اس کے علاوہ اور بھی کئی اذکار ہیں۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔
''منیب صاحب! آپ نے وکیل استغاثہ کی جرح کے دوران میں معزز عدالت کو بتایا تھا کہ آپ کسی زہر فروش کو نہیں جانتے۔ کیا آپ چند منٹ گزر جانے کے بعد بھی اپنے اس بیان پر قائم ہیں؟''
''جی بالکل۔'' اس نے پوری ڈھٹائی کے ساتھ جواب دیا۔ ''اور یہی سچائی بھی ہے۔''
''چلیں آپ کی سچائی کا پوسٹ مارٹم کر لیتے ہیں۔''
میں نے اپنی بھاگ دوڑ اور ریسرچ کی بنا پر معنی خیز انداز میں کہا پھر جج کی طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''جناب عالی! میں اپنا پہلا گواہ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔''
''پرمیشن گرانٹڈ!'' جج نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
میں نے صفائی کے دونوں گواہوں کو آج عدالت میں بلایا ہوا تھا جو عدالت کے باہر ایک بینچ پر بیٹھے اپنا نام پکارے جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں اگر چاہتا تو انہیں کورٹ روم کے اندر سامعین کے درمیان بھی بٹھا سکتا تھا لیکن میری کوشش یہی تھی کہ استغاثہ خصوصاً استغاثہ کے دو گواہ مقتولہ کا شوہر جنید شامی اور ملزم کا سوتیلا بھائی منیب اللہ میرے گواہوں کی صورتیں نہ دیکھ پائیں۔ اس سے میرے کام میں دقت آسکتی تھی۔ بہرکیف میرا پہلا گواہ خورشید بھائی وٹنس اسٹینڈ پر آکر کھڑا ہو گیا۔
جب پچے والے کی پکار پر خورشید بھائی عدالت کے کمرے کے اندر داخل ہوا تو منیب اللہ کے چہرے پر خوف کے سائے لہرانے لگے تھے اور اس کی بدلتی ہوئی کیفیت کو حاضرین عدالت کے علاوہ جج نے بھی خصوصی طور پر نوٹ کیا تھا۔ جب خورشید بھائی کا بیان ریکارڈ ہو چکا تو میں اس کے نزدیک چلا گیا۔
''خورشید بھائی! آپ کیا کرتے ہیں؟'' میں نے اپنے گواہ سے پوچھا۔
''میری کیمیکل کی ایک دکان ہے۔'' گواہ نے جواب دیا۔ ''میری دکان پر ہر قسم کے فصلی اور گھریلو کیڑے مکوڑوں کو تلف کرنے والی زود اثر ادویات گولیوں، سفوف، لیکوئیڈ وغیرہا کی شکل میں موجود ہیں۔ میرے پاس کاشت کار بھائی بھی آتے ہیں اور گھریلو مکھی، مچھر، کاکروچ، کھٹمل اور دیگر حشرات الارض کے ستائے ہوئے لوگ بھی۔''
''کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟'' میں نے منیب اللہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اپنے گواہ سے استفسار کیا۔
''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''کچھ عرصہ پہلے تک یہ محمود آباد میں رہتا تھا۔ اب اس کی رہائش کہاں ہے، میں نہیں جانتا۔''
''مگر منیب اللہ نے تو عدالت میں بیان دیا ہے کہ وہ کسی زہر فروش کو نہیں جانتا۔'' میں نے گواہ کے چہرے پر نگاہ جما کر کریدنے والے انداز میں کہا۔
خورشید بھائی کے جواب دینے سے پہلے ہی منیب

اللہ بول اٹھا۔ ''وکیل صاحب! آپ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔ میں نے تو کسی زہر فروش سے اپنی شناسائی سے انکار کیا ہے۔ خورشید بھائی تو کیڑے مار ادویات فروخت کرتے ہیں اور...... میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے ان کی دکان سے جرمن کاکروچ کو ختم کرنے کے لیے ایک دوائی بھی خریدی تھی۔''

''شکریہ نجیب صاحب!'' میں نے اپنے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے استغاثہ کے گواہ سے کہا پھر اپنے گواہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''خورشید بھائی! یہ تو اچھا ہوا کہ آپ کے پرانے محلے دار نے آپ کو پہچاننے کا اقرار کرلیا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اب آپ لگے ہاتھوں معزز عدالت کو یہ بھی بتادیں کہ آپ نے پچھلے دنوں اس بندے کو جرمن کاکروچ سے نجات کے لیے جو دوا دی تھی، اس کے اندر بنیادی طور پر کون سا کیمیکل پایا جاتا ہے؟''

''وکیل صاحب! تمام کیڑے مار ادویات میں پائے جانے والے کیمیکلز ایک طرح کے پوائزن ہی ہوتے ہیں۔'' اس نے تحمل لہجے میں جواب دیا۔ عام طور پر ایسی ادویات میں زنک، پارا، نائٹرس، سوڈیم اور آرسینک وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔''

''تھوڑی دیر پہلے آپ کے سامنے استغاثہ کے گواہ اور آپ کے پرانے محلے دار نجیب اللہ نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ اس نے جرمن کاکروچ کے خاتمے کے لیے آپ سے کوئی زود اثر دوائی خریدی تھی۔'' میں نے خورشید کے چہرے پر نگاہ جما کر سوال کیا۔ ''میں یہ جاننا چاہوں گا کہ مذکورہ دوائی میں کون سا زہریلا کیمیکل شامل ہوتا ہے؟''

''جرمن کاکروچ سائز میں بہت چھوٹے ہوتے ہیں وکیل صاحب! اور ان میں بلا کی قوتِ مزاحمت پائی جاتی ہے۔'' گواہ نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''آپ نے دیکھا ہوگا، یہ بدذات فریزر کے اندر بھی زندہ رہتے ہیں اور گرم توے کے اوپر چہل قدمی کرنے سے بھی ان کے پاؤں میں چھالے پڑتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کی جلن کا انہیں احساس ہوتا ہے چنانچہ......'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھما پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''جرمن کاکروچ کا یقینی خاتمہ کرنے کے لیے جو سریع الاثر اور قابل بھروسا دوائی تیار کی گئی ہے، اس میں سوڈیم کے ساتھ آرسینک کو بھی شامل کیا گیا ہے۔''

''آرسینک تو ایک خطرناک زہر ہے۔'' میں نے

ایک بچے کی گواہی

ایک کافر عورت ایک بار آنحضور ﷺ کا امتحان لینے کی غرض سے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس کے ہمراہ اس کا دو ماہ کا شیر خوار بچہ تھا۔ بچے نے رسول اللہ ﷺ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''یا رسول اللہ ﷺ السلام علیکم! ہم ماں بیٹا آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہیں۔''

ماں نے یہ دیکھا تو چہرہ پیلا پڑ گیا۔ غصے میں آ کر بچے سے کہنے لگی۔

''خبردار چپ رہو، یہ گواہی تیری زبان پر کیسے آگئی؟ تجھے یہ کس نے سکھادی۔'' بچے نے بغیر کسی انتظار کے جواب دیا۔

''اے میری ماں! اپنے سر کے اوپر دیکھو۔ یہ حضرت جبریل علیہ السلام ہیں۔ مجھے وہ چودھویں کے چاند کی طرح نظر آرہے ہیں۔ یہی اللہ کا فرشتہ مجھے کفر و شرک میں فرق سکھا رہا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے اس نیک بخت بچے سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

''اے دودھ پیتے بچے! مجھے اپنا نام تو بتاؤ۔'' بچے نے کہا۔

''میرا نام حق تعالیٰ کے نزدیک تو عبدالعزیز ہے مگر ان مشرکوں نے میرا نام عبدالعزیٰ رکھ چھوڑا ہے۔ اس ذات پاک کے صدقے جس نے آپ ﷺ کو پیغمبری بخشی، میں اس عزیٰ بت سے پاک ہوں، بری ہوں اور بیزار ہوں۔''

رسول اللہ ﷺ کی نگاہِ کرم کے طفیل اسی لمحے بہشت سے ایک ایسی خوشبو کا جھونکا آیا جس نے اس خوش نصیب بچے کو اور اس کی ماں کے دماغ کو مہکا دیا تھا۔ جس کا نگہبان خود خدا ہو اس کی حفاظت بھی وہی کیا کرتا ہے۔

اس بچے کے ساتھ ماں بھی ایمان لے آئی تھی۔ یوں اللہ کے نبی پاک ﷺ کا امتحان لینے آنے والی کافر عورت ایمان کی دولت لے کر واپس جارہی تھی۔

حکایات رومی و سعدیؒ سے انتخاب

مرسلہ۔ نازش علی، سرگودھا

تشویش بھرے انداز میں کہا۔

"جی بالکل!" خورشید بھائی نے تصدیقی انداز میں کہا۔

"آرسینک کے ایک انتہائی مہلک، جان لیوا مرکب کو آرسائن کہا جاتا ہے...... ہیں نا؟" میں نے سوالیہ نظر سے خورشید بھائی کی طرف دیکھا۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب!" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اور سوڈیم کی موجودگی میں یہ "سوڈیم آرسائن" ہو جاتا ہے۔"

"اور یہ زود اثر زہر آپ نے غیب اللہ کو دیا تھا؟"

"میں اپنی دکان میں جتنے بھی کیمیکلز، ادویات کی شکل میں فروخت کرتا ہوں، وہ بنیادی طور پر زہر ہی ہوتے ہیں۔" خورشید بھائی نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ "اسی لیے ہر بوتل پر باقاعدہ وارننگ کے ساتھ "پوائزن" بھی لکھا ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص ان ادویات کو کیڑے مکوڑوں کے بجائے انسان پر استعمال کر بیٹھے تو اس کے لیے ہمیں یعنی تمام کیمیکل فروشوں کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ ہاں، میں نے یہ کیمیکل غیب کو فروخت کیا تھا۔"

"ٹھیک ہو گیا۔" میں نے اپنی جرح کو سمیٹتے ہوئے خورشید بھائی سے کہا۔ "بس، آپ سے ایک آخری سوال۔" لمحاتی توقف کے بعد میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سوڈیم آرسائن...... میرا مطلب ہے جرمن کاکروچ کا مکمل صفایا کرنے والی وہ زود اثر دوائی دیکھنے میں کیسی ہے؟"

"بالکل دانے دار چائے کی پتی جیسی۔" خورشید بھائی نے جواب دیا۔

میں نے فاتحانہ انداز میں وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا اور چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یور ونس پلیز!"

"نو کوئسچن!" وکیل استغاثہ نے بددلی سے کہا۔

"جنابِ عالی!" میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا۔ "استغاثہ کے اہم گواہ اور میرے موکل کے سوتیلے بھائی غیب اللہ کی مصنوعی سچائی کا پوسٹ مارٹم روبرو عدالت ہو چکا اور اس انوکھے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے پتا چلتا ہے کہ غیب اللہ نے خورشید بھائی کی دکان سے ایک ایسا زہر خریدا تھا جو دانے دار چائے کی پتی جیسا نظر آتا ہے۔ یعنی اگر کسی انسان کو فوراً سے پیشتر موت کے منہ میں دھکیلنا ہو تو اسے اس خصوصی پتی سے چائے بنا کر پلا دینا چاہیے۔ حالیہ پوسٹ مارٹم کی روشنی میں اگر ہم مقتولہ صبا شامی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کا جائزہ لیں تو ان دونوں رپورٹس میں قدرِ مشترک ہے...... "سوڈیم آرسائن" یعنی سوڈیم اور آرسینک کا انتہائی سریع الاثر مرکب۔ اس ریسرچ سے یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ استغاثہ کے گواہ غیب اللہ نے خورشید بھائی کی دکان سے جرمن کاکروچ کے خاتمے کے لیے چائے کی پتی جیسی دکھائی دینے والی جو دوائی خریدی تھی، وہ ایک خوبصورت بہانے سے اس نے اپنے سوتیلے بھائی اور اس کیس کے ملزم حبیب اللہ کو دے دی۔ اس طرح میرا موکل تارِ عنکبوت میں پھنس گیا۔"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔ "میرے فاضل دوست اس وقت ایک وکیل کم اور فکشن رائٹر زیادہ لگ رہے ہیں جو ملزم کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے ایک بے قصور کردار غیب اللہ کو قاتل کی حیثیت سے اپنی اسٹوری میں فٹ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر میری طرف دیکھے بغیر جج سے کہا۔

"کیا اس شہر میں کیڑے مار ادویات فروخت کرنے والی صرف ایک ہی دکان ہے جہاں سے استغاثہ کے معزز گواہ غیب اللہ نے مذکورہ دوائی خریدی تھی؟ کیا چائے کی پتی جیسی نظر آنے والی وہ دوائی کسی اور کیمیکل فروش کے پاس نہیں ہے؟ اور سب سے اہم بات یہ کہ کیا ملزم حبیب اللہ پر کوئی ایسی پابندی عائد تھی کہ وہ کسی کیمیکل اسٹور سے جرمن کاکروچ کو تلف کرنے والی دوائی خرید نہیں سکتا تھا؟"

وکیل استغاثہ نے دو سانس میں اپنے دل کا غبار دھو ڈالا تھا۔ جج نے اس کی بات توجہ سے سنی اور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آبجیکشن سسٹینڈ...... بیگ صاحب! آپ پراسیکیوشن کے اعتراضات کا جواب دیں۔"

"جنابِ عالی! یہاں پر سب سے اہم شے ہے قتل کا محرک۔" میں نے ٹھہرے ہوئے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "استغاثہ نے میرے موکل کو اس کیس میں فکس کرنے کے لیے جس موٹیو کو بنیاد بنایا ہے، اس کی حقیقت معزز عدالت کے سامنے کھل چکی ہے۔ مقتولہ صبا شامی نے کبھی بھی میرے موکل کی بے عزتی نہیں کی چنانچہ میرا موکل اس سے بدلہ لینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا جبکہ استغاثہ کے

گواہ مُنیب اللہ کی ذات شک کے دائرے کے اندر نظر آرہی ہے۔ میں نے اس لیے پچھلی پیشی پر وکیل استغاثہ سے درخواست کی تھی کہ اس پیشی پر مُنیب اللہ اور جنید شامی کو ایک ساتھ عدالت میں حاضر کیا جائے کیونکہ میں نے ان دونوں کرداروں کی اصلیت کا پردہ فاش کرنے کے لیے صفائی کے دو گواہوں کا بندوبست کر رکھا تھا جن میں سے ایک یعنی کیمیکل فروش خورشید بھائی کی گواہی ہو چکی ہے۔ میرے دوسرے گواہ کا تعلق براہِ راست مقتولہ کے شوہر جنید شامی سے ہے لیکن موصوف ناسازیِ طبع کے باعث آج عدالت میں پیش نہیں ہو سکے۔ اگر عدالت کا حکم اور اجازت ہو تو میں اپنے دوسرے گواہ سراج بھائی کو اندر بلانا چاہوں گا۔ اس کے بعد میں مُنیب اللہ سے بھی چند سوالات کروں گا جس کے نتیجے میں صورتِ حال روزِ روشن کے مانند عیاں ہو جائے گی اور اس اجلی عدالتی فضا میں میرے موکل اور اس کیس کے ملزم حبیب اللہ کی بے گناہی بھی ثابت ہو جائے گی۔“

اس کے بعد جج کی اجازت سے میں نے ”سراج مکینیکل ورکس“ کے مشہورِ شہر مالک، ماہر مکینک سراج بھائی کو گواہی کے لیے کورٹ روم کے اندر بلا لیا۔ سراج بھائی نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا جو بیان ریکارڈ کرایا، اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

”سترہ مارچ کی تاریخ میں کسی بھی وقت سراج بھائی کے گیراج سے کوئی بھی مکینک صبا شامی کے آفس گاڑی لینے نہیں گیا تھا لیکن اگلے روز یعنی اٹھارہ مارچ کی دوپہر مقتولہ کا شوہر جنید شامی خود اپنی بیوی کی گاڑی کو سروس کے لیے سراج بھائی کے گیراج چھوڑ گیا تھا...... وغیرہ ہم!“

”جنابِ عالی!“ سراج بھائی کی گواہی کے بعد میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے توانا لہجے میں کہا۔ ”مقتولہ کے شوہر جنید شامی نے اپنے بیانِ حلفی میں متعدد غلط بیانیاں کی ہیں جن میں سے ایک کی حقیقت سامنے آچکی ہے۔ جنید شامی نے معزز عدالت کو بتایا تھا کہ وقوعہ کے روز یعنی سترہ مارچ کو مقتولہ کی گاڑی میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی اور اس نے سراج بھائی کے گیراج سے کسی مکینک کو بلا کر اپنی گاڑی ”سراج مکینیکل ورکس“ واقع گرومندر بھجوادی تھی جبکہ سچ یہ ہے کہ مذکورہ گاڑی وقوعہ کے اگلے روز مقتولہ کا شوہر خود گیراج چھوڑ کر آیا تھا اور وہ بھی محض سروس کے لیے۔ اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ سترہ مارچ کی شام جنید شامی مقتولہ کو پک کرنے ڈائن ٹک بک کے آفس نہیں آیا تھا بلکہ وہ اپنی کسی سازش کے بھیانک متوقع نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا متمنی تھا۔“ میں نے سانس ہموار کرنے کی غرض سے توقف کیا پھر اپنے دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

”جنابِ عالی! یہ تو جنید شامی کا ایک جھوٹ ہے جس کی قلعی سراج بھائی کے بیان نے کھول دی ہے۔ باقی گڑبڑ گھوٹالے کو معزز عدالت کے سامنے لانے کے لیے میں استغاثہ کے گواہ مُنیب اللہ سے چند سوالات کرنا چاہوں گا۔“

”پرمیشن گرانٹیڈ!“ جج نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”مُنیب اللہ!“ میں نے استغاثہ کے خوفزدہ گواہ کے چہرے پر نگاہ جما کر سوال کیا۔ ”تم کون سی ٹریول ایجنسی میں کام کرتے ہو؟“

”فلائی اسکائی۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”تم نے ”شامی ٹریولز“ کا نام تو سنا ہوگا؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ ٹریول ایجنسی مقتولہ کے شوہر جنید شامی کی ملکیت ہے اور اس کا آفس میٹروپول پر ہے۔“

”جی...... میں نے یہ نام سنا ہے۔“ اس نے محتاط لہجے میں کہا۔

”صرف نام ہی سنا ہے یا کبھی وہاں جانے کا موقع بھی ملا ہے؟“

”نہیں جناب...... میں وہاں کبھی نہیں گیا۔“

”اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دے رہے ہو نا؟“

”جی......!“ وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

”بعد میں اپنے بیان کو بدلو گے تو نہیں؟“

”نن...... نہیں۔“

”گڈ!“ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔ ”انسان کو اپنے کہے ہوئے الفاظ پر قائم رہنا چاہیے۔“

میں نے لمحاتی توقف کیا تو استغاثہ کا گواہ بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ قبل اس کے کہ وکیل استغاثہ کو دولگا کر بنے بنائے کھیل کو بگاڑنے کی کوشش کرتا، میں نے اس کے گواہ کو اپنے ساتھ مصروف کر لیا۔

”پچھلے دنوں بلکہ چند ماہ پہلے ”شامی ٹریولز“ میں پیش آنے والا ایک واقعہ بہت مشہور ہوا تھا۔“ میں نے مُنیب اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

''جنید شامی نے اپنی ایجنسی کے دو بکنگ ایجنٹس کو بھاری کرپشن کے الزام میں فائر کردیا تھا...... کچھ یاد آیا؟''

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ امداد طلب نظر سے وکیل استغاثہ کو تکنے لگا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

''ان دو بکنگ ایجنٹس میں سے ایک کا نام توقیر احمد تھا۔ دراصل شامی ٹریولز میں فراڈ توقیر احمد ہی نے کیا تھا۔ دوسرا ایجنٹ بے چارہ تو اپنی بدقسمتی سے اس معاملے کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس بدنصیب بکنگ ایجنٹ کا نام......!''

میں نے سوچی سمجھی ترکیب کے تحت بات ادھوری چھوڑی تو منیب اللہ نے بے ساختہ میرے پھیلائے ہوئے جال میں قدم رکھ دیا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب!'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''ایجنسی کے حسابات میں ساری ہیرپھیر توقیر احمد ہی نے کی تھی۔ میں تو صرف اس لیے دھرلیا گیا تھا کہ میں توقیر کے بہت قریب تھا۔ بہرحال بعد میں میری بے گناہی ثابت ہوگئی تھی۔''

''بعد کی باتیں تو بعد میں دیکھیں گے۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''فی الحال تو تم معزز عدالت کو یہ بتاؤ کہ جب تم کبھی شامی ٹریولز گئے ہی نہیں، تم نے صرف اس ٹریول ایجنسی کا نام ہی سنا ہوا تھا تو پھر تم مذکورہ ایجنسی میں ہونے والے فراڈ کے واقعے میں کیسے نامزد ہوگئے تھے؟ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تمہارا ''شامی ٹریولز'' سے اندرونی گہرا تعلق رہا ہے۔''

''وہ جج...... جی...... میں نے کچھ عرصہ پہلے اس ایجنسی میں کام کیا تھا۔'' وہ کمزور سے لہجے میں بولا۔ ''اس واقعے کی وجہ سے میری جاب چھوٹ گئی تھی جس کے بعد میں نے ''فلائی اسکائی'' جوائن کرلی تھی۔''

میں نے گواہ کو فارغ کرنے کے بعد جج سے مخاطب ہوتے ہوئے دھواں دھار انداز میں کہا۔ ''جناب عالی! اب تک کی عدالتی کارروائی نے یہ واضح کردیا ہے کہ استغاثہ کی عمارت کھوکھلی اور بودی ہے۔ مقتولہ کے شوہر اور اس کیس کے مدعی جنید شامی نے عدالت کو بتایا کہ وہ منیب اللہ کو جانتا تک نہیں جبکہ یہ بندہ اس کی ٹریول ایجنسی میں نہ صرف کام کرچکا ہے بلکہ فراڈ کے الزام میں اسے ایجنسی سے نکال بھی دیا گیا تھا۔ مقتولہ کی گاڑی کی خرابی کے حوالے سے بھی جنید شامی کا جھوٹ پکڑ میں آچکا ہے اور اب......'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر پُرجوش لہجے میں اضافہ کردیا۔

''اور اب استغاثہ کے گواہ منیب اللہ نے معزز عدالت کے سامنے اپنی دروغ گوئی کا اعتراف بھی کرلیا ہے جس سے ثابت ہوجاتا ہے کہ منیب اللہ اور جنید شامی کے آپس میں گہرے روابط ہیں۔ عدالت سے میری درخواست ہے کہ استغاثہ سے تعلق رکھنے والے ان دونوں کرداروں کو شاملِ تفتیش کرنے کے احکامات صادر کیے جائیں تاکہ صبا شامی کے قتل کا معما حل ہوسکے۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا جناب عالی!''

جج نے انکوائری آفیسر سب انسپکٹر فرید خان کو میرے حسب منشا احکامات دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔

''دی کورٹ از ایڈجارنڈ فار فائنل ججمنٹ!''

☆☆☆

میں نے پچھلی پیشی پر منیب اللہ اور جنید شامی کی ''ڈرائی کلیننگ'' کا جو منصوبہ بنا رکھا تھا، اس پر جزوی عمل ہو پایا تھا کیونکہ جنید شامی نے میڈیکل سرٹیفکیٹ بھیج کر اس روز چھٹی کرلی تھی مگر میں بہ اندازِ دیگر اس کی چھٹی کا خواہاں تھا اسی لیے میں نے منیب اللہ کے ساتھ ہی جنید شامی کو بھی شاملِ تفتیش کرنے کی درخواست کی تھی۔ میری یہ کوشش رنگ لے آئی۔ پولیس کسٹڈی میں وہ دونوں تفتیشی ہتھکنڈوں کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرسکے اور پھر انہوں نے اپنے اپنے جرائم کا اعتراف کرلیا۔

شامی ٹریولز، ڈائن گک بک اور پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی والا بنگلا، سب کچھ مقتولہ صبا شامی کی ملکیت تھا اور پچھلے کچھ عرصے سے جنید شامی کی زندگی میں ایک اور عورت آگئی تھی لہٰذا اس نے اپنا معاملہ سیدھا کرنے کے لیے صبا شامی کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا اور اپنے اس مذموم ارادے کو پورا کرنے کے لیے اس نے منیب اللہ کا استعمال کیا۔ وہ منیب اللہ کے حالات سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ منیب، حبیب اللہ سے شدید نفرت کرتا تھا چنانچہ اس نے اسی نفرت کا استعمال کرتے ہوئے منیب اللہ کو اپنے منصوبے کا حصہ بنالیا تھا مگر دونوں کی بدقسمتی کہ یہ کیس میرے ہاتھ لگ گیا تھا۔

جنید شامی نے اس روز ناسازیِ طبع کا بہانہ کیا تھا یا اس کی طبیعت واقعتاً خراب رہی تھی، بہرحال میں نے اس کی ''مزاج پرسی'' کا شافی بندوبست کردیا تھا۔

(تحریر: حُسام بٹ)

پیش بندی

شاہ زین رضوان

سیاست کی بساط پر اکثر نئی نئی بازیاں لگائی جاتی ہیں... عجیب عجیب کہانیاں بنائی جاتی ہیں... یہاں بھی سیاست کے میدان میں ٹکے رہنے کے لیے اس قسم کی پیش بندی کرنا ضروری تھا... ورنہ حریف بہت کم نمبر سے ہار کر ایک بڑے صدمے سے دوچار ہو سکتا تھا اور... اسے یہ سودا منظور نہ تھا۔

کسی بھی حد تک مخالف قدم اٹھانے والے ایک فاتح کی پیش بندیوں کا احوال

بظاہر معمولی نظر آنے والے کام بسا اوقات نہایت ہی مفید، مؤثر اور دور رس نتائج کے حامل ثابت ہوتے ہیں۔ بس انہیں ڈھنگ سے کرنے کا ہنر آنا چاہیے۔ میں بھی ایک ایسے ہی کام میں مصروف تھا۔

سچی بات تو یہ ہے میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا میں صبح کے ساڑھے چھ بجے ایک ہاتھ میں بیلچہ اور دوسرے ہاتھ میں کدال لیے دو بڑی سڑکوں ''ونڈمل'' اور ''گرانڈ ہیرا'' کے سنگم پر گڑھا مزدوری کر رہا ہوں گا لیکن یہ سب ہو رہا تھا

کیونکہ سیاست کے میدان میں ایک روشن مستقبل کے حصول کی خاطر بہت کچھ ایسا بھی کرنا ضروری ہوجاتا ہے، عام حالات میں جس کا تصور بھی محال ہوتا ہے۔ بہرکیف، سیاست کی بساط پر ایسے بظاہر فضول اور بے معنی دکھائی دینے والے کام عوام کے دلوں میں، میرا مطلب ہے ووٹرز کے دلوں میں انسان کی عزت اور عظمت کو حد درجہ بڑھاوا دیتے ہیں۔ سو، میں اسی لیے میدان میں اتر آیا تھا، لاس ویگس کی گرمی کا مقابلہ کرنے کے لیے۔

آج سائن ریموول ڈے (انتخابی مہم کے بورڈز اور بینرز وغیرہ ہٹانے کا دن) تھا۔ میں اپنے پک اپ ٹرک پر سوار ہوکر وہاں پہنچا تھا۔ میرے ٹرک کا عقبی کھلا حصہ چھوٹے بڑے بورڈز سے بھر چکا تھا اور اب میں ایک کنگ سائز بورڈ کے ساتھ نبرد آزما تھا اور یہ میری مہم کا آخری کام تھا۔ سورج کی اٹھان کے ساتھ ہی ماحول کے درجۂ حرارت میں بھی اضافہ ہورہا تھا۔ اس وقت نوے درجے فارن ہائٹ سے کچھ اوپر ہی گرمی پڑ رہی تھی۔ ''لاس ویگس'' ویسے بھی صحرائی علاقے میں آباد ایک خوبصورت شہر ہے لہٰذا یہاں گرمی دوسری جگہوں کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی بیزار کن اور اذیت ناک ہوتی ہے۔

میرا پورا بدن پسینے میں شرابور تھا جس کے اثرات میرے لباس سے عیاں تھے۔ میں نے چونکہ علی الصباح اپنی اس مہم کا آغاز کردیا تھا اس لیے اب تک میں نصف درجن چھوٹے اور چوتھائی درجن درمیانے سائز کے بورڈز اتار کر اپنے پک اپ ٹرک پر لاد چکا تھا اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے، یہ آخری اور سب سے بڑے سائز کا بورڈ تھا جس کے لیے ''اتارنے'' نہیں بلکہ ''اکھاڑنے'' کا لفظ زیادہ مناسب معلوم ہوتا تھا۔

بل بورڈ (ایڈورٹائزنگ ہورڈنگ) کے سائز کا وہ بورڈ سب سے بڑا تھا اسی لیے اسے ''ونڈمل'' اور ''گرانڈ سیرا'' کے سنگم پر نصب کیا گیا تھا تاکہ دور سے بہ آسانی نظر آجائے۔ مذکورہ بورڈ پر دکھائی دینے والا نمایاں چہرہ ایک ایسے امیدوار کا تھا جو انتخابات کے پہلے مرحلے پر بری طرح شکست کھا چکا تھا۔ لاس ویگس میں ابتدائی انتخابات بارہ جولائی کو ہوئے تھے اور آج بائیس جولائی تھی۔ شہری قوانین کی رو سے ہارنے والے امیدواروں کو دس دن کے اندر اپنے تمام بورڈز اور بینرز کو ان کے مقامات سے ہٹانا ضروری تھا۔ اس قانون کے مطابق آج ''سائن ریموول'' کا آخری دن تھا۔ مذکورہ قانون صرف ہارنے والے امیدواروں پر لاگو ہوتا تھا۔ الیکشن میں کامیابی حاصل کرنے والے امیدواروں کی انتخابی مہم والے بینرز اور بورڈز جوں کے توں اپنے مقامات پر آویزاں اور نصب رہتے تھے جو درحقیقت ان کے لیے سال کے آخر میں ہونے والے فائنل انتخابات کی اشتہاری مہم کا کام کرتے تھے۔ عام طور پر دیکھنے میں یہی آیا تھا کہ انتخابات میں شکست کھانے والے امیدوار اس قانون کی زیادہ پروا نہیں کرتے تھے۔ وہ چونکہ اپنی ہار کا سوگ منانے میں مصروف ہوتے تھے اس لیے انہیں اپنے بورڈز اور بینرز ہٹانے کا خیال نہیں آتا۔ سو، بائیس جولائی کے دن ایک میں ہی اکیلا اس جان توڑ مشقت میں لگا پڑا تھا۔

الیکشن ہارنے کا احساس بڑا کربناک اور جان لیوا ہوتا ہے۔ اپنی شکست کو تسلیم کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ اسے ہضم کرنا۔ عوام کا آپ کے اوپر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ وہ آپ کو عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ ان کی تیز گھورتی ہوئی نگاہیں بہ زبانِ خاموشی آپ سے ان سوالات کے جوابات مانگ رہی ہوتی ہیں جنہیں آپ نے اپنی اشتہاری مہم میں سلوگنز کے طور پر استعمال کیا ہوتا ہے۔ وہ یہ سب پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کیونکہ وہ عوام ہیں، ہارنے اور جیتنے والے امیدواروں کے ووٹرز۔ الیکشن کا سارا کھیل انہی ووٹرز کا رہینِ منت ہوتا ہے۔

ناکام امیدوار اپنے بورڈز اور بینرز ہٹانے کی طرف اس لیے بھی زیادہ توجہ نہیں دیتے کہ اس قانون شکنی پر نہایت ہی معمولی سا جرمانہ بھرنا پڑتا ہے اور میں اسے ایک سنہری موقع سمجھتا ہوں۔ کچھ اچھا کر دکھانے اور خود کو منوانے کا ایک عظیم موقع۔

میں نے اپنے بیلچے کے بلیڈ کو اس کنگ سائز بل بورڈ کے ایک چوبی ستون کی جڑ کے نزدیک سخت زمین کے اندر دھنسایا اور پاؤں کے زور سے مذکورہ ستون کی جڑ اور زمین کے باہمی رشتے کو کمزور کرنے میں مصروف ہوگیا۔ وہ بورڈ دو موٹے چوبی ستونوں کی بلندی پر نصب کیا گیا تھا۔ میں نے پہلے باری باری مذکورہ ستونوں کی جڑوں کے آس پاس کی زمین کو کدال کی مدد سے کھود ڈالا تھا اور اب بیلچے کے ذریعے اس مٹی کو ہٹا رہا تھا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ایک تو کڑی مشقت، اوپر سے لاس ویگس کی جاں گسل گرمی۔ اس سے پہلے والے دس گیارہ بورڈز کو اتارنے کے لیے مجھے اتنی محنت نہیں کرنا پڑی تھی جتنی کہ اس ایک ہاتھی کی جسامت والے بل بورڈ کو اکھاڑنے کے لیے کرنا پڑ رہی

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر "آفیشل پیج" کی اصطلاح استعمال کررہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کررہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کردیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35895313

تھی۔ بہر حال، میں نے بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ محنت میں عظمت اور عظمت میں برکت ہوتی ہے اور مجھے یقین تھا کہ میں کڑی دھوپ میں جو کر رہا ہوں، اس کا پھل نہایت ہی خوش ذائقہ اور میٹھا ہوگا۔

''قانون کا نفاذ اور عمل داری......!''

یہ وہ سلوگن تھا جو اس بل بورڈ کی پیشانی پر جلی حروف میں لکھا گیا تھا اور اس کے نیچے امیدوار کا نام کچھ اس طرح درج تھا۔ ''ہارڈی ڈیلون، فار سٹی کونسل''۔ اسی بورڈ کے درمیانی حصے میں ہارڈی ڈیلون کا فوٹو بھی دکھائی دے رہا تھا جو ایک عام انسان کے سائز سے بھی بڑا تھا۔ میں دل ہی دل میں مسکرا اٹھا اور بے ساختہ میرے ہونٹوں سے یہ الفاظ خارج ہوئے۔

''ڈیلون! تمہارا سلوگن تو بڑا دھانسو ہے مگر تم...... اوّل درجے کے احمق ہو۔''

ان ابتدائی انتخابات میں، میں ایک کانٹے کے مقابلے سے گزرا تھا۔ میرے اور میرے حریف کے درمیان اکتالیس سے چالیس تک کا مارجن تھا۔ اگر باریک بینی سے دیکھا جائے تو ہم دونوں اکتالیس اعشاریہ کچھ کے فرق سے اس ریس میں دوڑنے والے دو گھوڑے تھے اور کسی وقت کچھ بھی ہوسکتا تھا اور پھر وہ ہوگیا جس کی کسی کو توقع نہیں تھی۔ بڑے بڑے جگادریوں اور کھاگ تجزیہ نگاروں کی پیش گوئیاں غلط ثابت ہوگئی تھیں۔ مجھے خود بھی پولنگ کے نتائج پر یقین نہیں آیا تھا۔ غیر متوقع نتائج ہارنے اور جیتنے والوں یعنی دونوں کو حیرت زدہ کر دیتے ہیں۔ یہی انتخابات کا کمال ہے۔

میں نے اس الیکشن کے لیے ذہنی، جسمانی اور مالی ہر قسم کی قربانی دی تھی۔ انتخابی مہم کے دوران میں، میں نے موسم کی شدت کی پروا کی تھی، نہ اپنے آرام کے بارے میں سوچا تھا اور نہ ہی اخراجات کے معاملے میں کسی کنجوسی سے کام لیا تھا۔ ہر اہم مقام پر میرے بورڈ اور بینر دکھائی دیتے تھے۔ انسان کی قابلیت اور محنت کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ناگزیر ایک شے ہوتی ہے، اس کی قسمت...... انسان کی ہار اور جیت میں اس کا نصیب سب سے اہم کردار ادا کرتا ہے۔

میں اس بل بورڈ کے دونوں چوبی ستونوں کی جڑوں کو خاصی گہرائی تک کھود ڈالنے کے بعد اس کی عقبی جانب بڑھ گیا۔ اب مجھے اس موٹی لکڑی کو ہٹانا تھا جس نے مذکورہ بورڈ کو پیچھے سے سہارا دے رکھا تھا۔ یہ کام ان دونوں ستونوں کی بہ نسبت کافی آسان تھا کیونکہ اس موٹی لکڑی کے زیریں سرے کو زمین کے اندر دبایا نہیں گیا تھا۔ اب سورج نے ڈھلائی کے سفر کا آغاز کر دیا تھا مگر ماحول کا درجۂ حرارت مسلسل بڑھ رہا تھا۔ اس وقت وہ سو درجے فارن ہائٹ سے اوپر جاچکا تھا۔ میں اس کسرت کے دوران میں وقفے وقفے سے پانی بھی پیتا جا رہا تھا۔ پانی کا اچھا خاصا اسٹاک میرے پک اپ ٹرک میں موجود تھا۔ آج میں پورے انتظامات کے ساتھ گھر سے نکلا تھا کیونکہ میں پانی کی کمی یا ہیٹ اسٹروک کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس سے عوام یعنی ووٹرز پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ وہ لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ جو سیاست داں ڈھنگ سے اپنا خیال نہیں رکھ سکتا، وہ ان کی جانوں کی کیا خاک حفاظت کرے گا؟ بس، عوام اسی ذہنیت کے حامل ہوتے ہیں۔

میں اپنے مشن میں مصروف تھا کہ ایک سیاہ سیڈان ادھر آنکلی۔ لامحالہ میں اس کار کی جانب متوجہ ہوگیا۔ سیڈان میرے ٹرک کے پہلو میں آکر رک گئی پھر اس کے اندر سے ایک دلکش عورت باہر نکلی اور سبک قدموں سے میری سمت بڑھنے لگی۔

مذکورہ عورت نے اپنی آنکھوں پر بڑے سائز کا دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس کے سر پر بیس بال والی کیپ تھی جس نے اس کے سنہری بالوں کو بڑی صفائی سے اپنے اندر چھپا رکھا تھا۔ مجھے اس کے شانے پر ایک بیگ بھی لٹکا ہوا نظر آیا۔ وہ بلاشبہ میری بیوی سے کہیں زیادہ حسین اور پُرکشش تھی اور خاصی کم عمر بھی۔

میں نے اپنی کدال کو مٹی کی چھوٹی سی ڈھیری کے اندر دھنسا کر کھڑا کر دیا اور اس بل بورڈ پر نگاہ ڈالی جسے میں اگلے چند منٹ میں زمین بوس کرنے والا تھا۔ وہ سٹی کونسل کے امیدوار ہارڈی ڈیلون کی انتخابی مہم کا آخری اور سب سے بڑا بورڈ تھا...... آہ!

''ایکسکیوزمی!'' اس حسین و جمیل عورت نے ہارڈی ڈیلون والے بل بورڈ کے سامنے پہنچنے کے بعد میری جانب دیکھتے ہوئے شائستہ لہجے میں کہا۔ ''میرا نام کارا اسمتھ ہے۔ میں لاس ویگس ہیرالڈ کے لیے کام کرتی ہوں۔ کیا آپ چند منٹ کے لیے مجھ سے بات کرسکتے ہیں؟''

میں اسے دیکھنے کے بعد اپنے کام کو روک چکا تھا۔ میں نے ٹھنڈے پانی کی ایک بوتل نکال لی اور اس کے

سوال کا جواب دینے سے پہلے اپنے حلق کو تر کرنا ضروری جانا۔ میں نے اسے بھی صاف اور ٹھنڈے پانی کی پیشکش کی جو اس نے ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ بڑی خوبصورتی سے مسترد کردی۔

''کیوں نہیں، ضرور۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''تم سے مل کر خوشی ہوئی مس اسمتھ! میں صحافیوں کی بہت عزت کرتا ہوں۔ بتاؤ، میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

اس نے اپنے سیل فون پر ''وائس ریکارڈنگ ایپ'' کو آن کیا اور فون کو میرے منہ کے انتہائی نزدیک لانے کے بعد استفسار کیا۔ ''اس تعاون کے لیے بہت شکریہ۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آج آپ یہاں کیا کررہے ہیں اور وہ بھی اس چلچلاتی دھوپ میں؟''

''تم تو جانتی ہی ہو کہ آج سائن ریموول کا آخری دن ہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر جواب دیا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ ہارنے والے امیدوار جب کسی بھی وجہ سے اپنے بینرز اور بورڈز ہٹانے نہیں آتے تو یہ کام شہری انتظامیہ کو کرنا پڑتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں ان چھوٹے موٹے کاموں کے لیے ہمیں سٹی گورنمنٹ کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے۔ ہر شہری کو اپنا فرض جان کر اس قسم کے کام اپنی مدد آپ کے تحت خود ہی کرلینا چاہئیں۔ میں جو کچھ بھی کررہا ہوں، اسے اپنے لیے باعثِ عزت و افتخار سمجھتا ہوں۔ کام کی عظمت کو پہچان کر ہی آپ انسانیت کی روح تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں۔''

''آپ کی سوچ نے مجھے متاثر کیا ہے مسٹر پرسیوال!'' کارا اسمتھ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن آپ جس شکست خوردہ امیدوار کے بینرز اور بورڈز ہٹا رہے ہو، آپ نے بڑے کلوز مارجن سے اسے ہرایا تھا۔ آپ اس ابتدائی الیکشن کے فاتح ہیں۔''

''ہاں، یہ سچ ہے کہ اس الیکشن میں ہارڈی ڈیلون میرے مقابلے پر کھڑا تھا۔ وہ میرا حریف تھا۔'' میں نے رسانیت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ایک بہت اچھا انسان بھی تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے درمیان کئی ایک معاملات کو لے کر اختلاف رائے بھی پایا جاتا تھا لیکن اس کے باوجود بھی ہم ایک دوسرے کی بے پناہ عزت کرتے تھے۔ ہم دونوں مل کر لاس ویگس کو ترقی کی بلندیوں تک پہنچانا چاہتے تھے لیکن افسوس کہ ہارڈی ڈیلون اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہے۔ اس کے ساتھ جو بھی ہوا، وہ ایک عظیم سانحہ ہے۔ میں ''سائن ریموول ڈے'' پر اس کے حصے کا کام کرکے بہت خوشی اور فخر محسوس کررہا ہوں۔''

لاس ویگس ہیرالڈ کی رپورٹر کارا اسمتھ نے مجھ سے مزید چند سوالات کیے اور میں نے ہر سوال کا جواب پورے اعتماد اور ایک ذمے دار سیاست داں کی حیثیت سے دیا۔ میرے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ووٹرز کے ذہنوں پر نقش ہوجانے کی تاثیر کا حامل تھا۔ نومبر میں ہونے والے فائنل الیکشن میں میری یہی باتیں ان کی یادداشت میں گونجیں گی اور وہ کسی بھی قیمت پر مجھے نظر انداز نہیں کرسکیں گے۔

کارا اسمتھ نے میری درجن بھر تصاویر بھی لیں جن میں دو تین ہارڈی ڈیلون والے بل بورڈ کے ساتھ بھی تھیں۔ تین چار تصاویر میں مجھے کدال اور بیلچے کی مدد سے کٹھن مشقت کرتے ہوئے بھی دکھایا گیا تھا۔ رپورٹر اپنا کام ختم کرکے سیڈان میں جا بیٹھی اور اس وعدے کے ساتھ رخصت ہوگئی۔

''مسٹر پرسیوال! کل کے ''لاس ویگس ہیرالڈ'' میں، میں آپ کی شاندار اور سنسنی خیز باتصویر اسٹوری چھاپنے والی ہوں۔ اس شہر کو آپ جیسے بے لوث سیاست دانوں کی ضرورت ہے۔''

کارا اسمتھ کے جانے کے بعد میں نے ہارڈی ڈیلون والے اس دیوہیکل بل بورڈ کو زمین بوس کیا اور... بہ مشکل تمام کھینچ کر اسے اپنے پک اپ ٹرک کے عقبی حصے میں دوسرے بورڈز کے اوپر پھینک دیا۔ اس تصادم سے اٹھنے والے غبار نے ہارڈی ڈیلون کے چہرے کو گرد آلود کردیا۔ میں جھک کر اپنا چہرہ اس کے چہرے کے نزدیک لے گیا اور رازدارانہ انداز میں کہا۔

''ہارڈی! میں نے گزشتہ روز ایک بے نامی اکاؤنٹ سے ''لاس ویگس ہیرالڈ'' کے آفس ایک ای میل کرکے ان سے کہا تھا کہ اگر آج وہ اپنی کسی رپورٹر کو یہاں بھیجیں تو انہیں اپنے اخبار کے لیے ایک شاندار کہانی مل جائے گی اور...... یہ کام ہوچکا۔ آئی ایم سوری برو......! سیاست کے میدان میں ٹکے رہنے کے لیے اس قسم کی پیش بندی کرنا ضروری ہوتی ہے ورنہ انسان کلوز مارجن سے ہار کر، صدمے کی شدت سے اپنی زندگی کا چراغ گل کربیٹھتا ہے۔''

✖✖✖

❄ شاہدہ جنید.....کراچی

اس قدر تنگ نہیں وسعتِ صحرائے جہاں
ہم تو اک اور ہی وحشت میں ملے ہیں تجھ سے

❄ ناہید یوسف.....اسلام آباد

اس عمر میں خوش فہمیاں اچھی نہیں ہوتیں
اس عمر کو وعدوں کے حوالے نہیں کرتا
اب اپنے ٹھکانے ہی پہ رہتا نہیں کوئی
پیغام پرندوں کے حوالے نہیں کرتا

❄ آصف غزالی.....مظفر گڑھ

مجھے خبر تھی مرے بعد وہ بکھر جاتا
سو اس کو کس کے بھروسے پہ چھوڑ کر جاتا

❄ منیب اشرف.....چکوال

تیرا آغاز تو ہوتا ہی وہاں سے ہے جہاں
ختم ہوجاتی ہے پیمائش دنیا مرے دل

❄ امان اللہ خان.....گلگت

ہم نہیں ہوں گے تو پیشانی کو
کسی پتھر پہ رگڑنا مری جاں

❄ جمیلہ سحر.....کوٹ لکھپت

اک نئی آگ ہجر میں ایسی بھڑک اٹھی کہ پھر
سارے ہی رنگ اتر گئے رنگِ وصال کے سوا

❄ نادیہ خان.....مری

آسمانوں کی کشش کھینچتی رہتی ہے مگر
خاک سے پاؤں نکالتے ہوئے ڈر لگتا ہے

❄ ملک اسلم طاہر.....ملک وال

نگاہ و دل ترے بارے میں متفق ہی نہ تھے
میں خود سے کتنا لڑا ہوں تری محبت میں

❄ محمد اظہر.....خیر پور

سنا ہے اب انہیں رستے فریب دیتے ہیں
جو لوگ چھوڑ گئے تھے مجھے شرارت میں

❄ ایم ایم ارشد.....چنیوٹ

مجھے اجالے کا لالچ دیا گیا اور پھر
میں دیکھتا رہا دن کو سیاہ ہوتے ہوئے

❄ مہتاب احمد.....حیدر آباد

اس کے بعد اور بھی سخت مقام آئے گا
حوصلہ یوں نہ گنوا یہ تیرے کام آئے گا

❄ عمران شیروانی.....لاہور

رستے گلیوں پہ ہنستے ہیں آنکھیں ویرانی پر
کیسا منظر بدل گیا اس خوش رفتار کے ساتھ
یوں بنیادوں سے مت کھیلو ورنہ بعض اوقات
ساری عمارت گر پڑتی ہے اک دیوار کے ساتھ

❄ کاشف بٹ.....کھاریاں

ہر جانب بارود بچھا ہے قدموں میں
اور خلقت دیوانی بڑھتی جاتی ہے

❄ تبسم.....کراچی

بہت بلند سہی مجھ سے آسماں پھر بھی
کہیں کہیں۔ تو مری خاک سے پلٹتا ہے

❊ نوشی اینڈ سفینہ...... فیصل آباد
کسی نے پھر ہمیں تسخیر کرلیا آخر
کوئی مثال تو آئی بڑی مثال کے بعد
عجب حبس کے عالم میں چل رہی تھی ہوا
ترے جواب سے پہلے بڑے سوال کے بعد

❊ احسان اللہ...... پنڈی
اک گھڑی وصل کی بے وصل ہوئی ہے مجھ میں
کس کے آنے کی خبر قتل ہوئی ہے مجھ میں
سانس لینے سے بھی بھرتا نہیں سینے کا خلا
جانے کیا شے ہے جو بے دخل ہوئی ہے مجھ میں

❊ الفت فاروق...... گھوٹکی
کچھ اس طرح سے وہ شامل ہوا کہانی میں
کہ اس کے بعد جو کردار تھا فسانہ ہوا

❊ نازیہ کومل...... لاڑکانہ
مجھے سنبھالنے میں اتنی احتیاط نہ کر
بکھر نہ جاؤں کہیں میں تری حفاظت میں

❊ شاہانہ علی...... چشتیاں
کتنی سرگوشیاں یادوں سے گلے ملتی ہیں
در و دیوار اکیلے ہوں تو گھر کھلتا ہے

❊ محمد مظہر...... ضلع چکوال
اب تو ساون میں بھی بارود برستا ہے یہاں
اب وہ موسم نہیں بارش میں نہانے والے
اتنا آسان نہیں شہرِ محبت کا پتا
خود بھٹکتے ہیں یہاں راہ بتانے والے

❊ سعید شیخ...... خانپور
آگ کی طرح بھڑکتی چلی جاتی ہے جو پیاس
ابر کی طرح برستا چلا جاتا ہے کوئی

❊ محمد ظفر اللہ ضیا...... کمالیہ ٹی
مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں ادھوری
مری موت سے نہ ہوگی مرے غم کی ترجمانی

❊ بشریٰ باجوہ...... آزاد کشمیر
سمٹتا پھیلتا رہتا ہے قسمت جان کر اپنی
شکایت دھوپ سے کب سایۂ دیوار کرتا ہے

❊ عبدالجبار رومی انصاری...... قصور
مانا کہ تلخ حقیقت ہے بھیدِ حیات
لب مسکان بھی رہتی ہے مقیدِ حیات

❊ صداقت علی...... ملتان
جنونِ سجدہ کی معراج ہے یہی شاید
کہ تیرے در کے سوا کوئی آشیاں نہ رہا

❊ حمیرا اقبال...... کوٹری
نیت ہی اگر ٹھیک زمانے کی نہیں ہے
جلدی تو مجھے بھی کہیں جانے کی نہیں ہے
اس بھیڑ میں سائے سے بچھڑتا ہوا سایہ
کہتا ہے یہاں ساتھ نبھانے کی نہیں ہے

❊ شہزاد رفیق...... مظفر آباد
مانا ہمیں جینے کا قرینہ نہیں آتا
اے زیست مگر تجھ سے ہمیں پیار بہت ہے

❊ مسرت جعفری...... ڈھڈیال
اس بت تراش عشق کو حیرت میں ڈال دے
پتھر کی آنکھ سے کوئی آنسو نکال دے

❊ عبدالقیوم اعوان...... خوشاب
کچھ نہ کچھ ہوتی ہے تسکین زیادہ نہ سہی
درد بڑھ جائے تو ہنستا ہی چلا جاتا ہوں

❊ اظہر کمال...... حیدرآباد
پھیلا رہا ہے دامنِ شب کی حکایتیں
سورج نہیں تو یہ پسِ کہسار کون ہے

❊ شاہد خان...... چارسدہ
دوڑتی پھرتی ہیں ہر سو میری بے کل آنکھیں
تجھ کو پھر ڈھونڈنے نکلی ہیں یہ پاگل آنکھیں

❊ ایس سجاد...... فیصل آباد
ستم کرو کہ کرم ہم گلہ نہیں کرتے
خزاں میں پھول یقیناً کھلا نہیں کرتے

❊ مجاہد حسین...... بھکر
ابھی تو اور بہت آسمان دیکھنے ہیں
یہ آسمان یہ پہلی اڑان کچھ بھی نہیں

❊ سدرہ شاہ...... کراچی
کیوں چاندنی راتوں کو دریا میں نہاتے ہو
سوئے ہوئے پانی میں کیا آگ لگانی ہے

❊ ہمایوں تنولی...... ہزارہ
وہ مسکرا کے نئے وسوسوں میں ڈال گیا
خیال تھا کہ اسے شرمسار کرنا ہے

❊ امجد علی مسعود...... سکھر
آگ اور بھڑکتی ہے پانی کے برسنے سے
یہ دل کا نشیمن ہے ساون میں بھی جلتا ہے

❊ نعیم خان...... پشاور
اک تجلی، اک تبسم، اک نگاہ دل نواز
اس سے زیادہ اے غم جاں دل کی قیمت کیا کہوں

❁ خواجہ رفیق......آزاد کشمیر

یہ کرشمہ ہے کہ زندہ ہوں کسی در کے بغیر
ورنہ پتھر میں کہاں عمر بسر ہوتی ہے

❁ الف جعفری......تواں کوٹ، لیہ

وہ پہلے جس کی آنکھوں میں غرورِ حسن چھایا تھا
وہ اب آنسو بہاتی ہے، محبت مسکراتی ہے

❁ محمد ارسلان......ہری پور ہزارہ

مانا وہ ایک خواب تھا دھوکا نظر کا تھا
اس بے وفا سے ربط مگر عمر بھر کا تھا

❁ فرزانہ احمد علی......تلہار

کسے خبر کہ میری روح کے دریچے میں
غمِ حیات کے کتنے چراغ جلتے ہیں

❁ عابد حسین شاہ......کوئٹہ

رات بھر تکتا رہا ہے چاند کس کا راستہ
حسن کو یوں ہم نے پابندِ وفا دیکھا نہ تھا

❁ محمد اسلم......کراچی

زاہد نے اس خیال سے تسبیح توڑ دی
کیا گن کے اس کا نام لوں جو بے حساب دے

❁ بخت علی شاہ......خانیوال

میں نے تو تیری یاد میں خود کو بھی کھو دیا
اب تو بھی اس خلوص سے مجھ کو تلاش کر

❁ شازیہ حسین......نوابشاہ

ہستی ہی اپنی کیا ہے زمانے کے سامنے
اک خواب ہیں جہاں میں بکھر جائیں ہم تو کیا

❁ رخسانہ کنول......منڈی بہاء الدین

عدم خلوص کے بندوں میں ایک خامی ہے
ستم ظریف بڑے جلد باز ہوتے ہیں

❁ فرح رحیم......کراچی

محبت بندگی ہے اس میں تن کا قرب نہ مانگو
کہ جس کو چھو لیا جائے اسے پوجا نہیں کرتے

❁ شبانہ یوسف......جھنگ سٹی

غریب ہم کو سمجھتے ہیں یہ جہاں والے
ہزار درد کی دولت سے مالا مال ہیں ہم

❁ رانا عمران......لاہور

یہ حُسن، یہ ادا، یہ نزاکت، یہ بانکپن
سب خوبیاں ہیں تجھ میں مگر بے وفا ہے تو

❁ عتیق علی......سرگودھا

ہم وفائیں کر کے رکھتے ہیں وفاؤں کی امید
دوستی میں اس قدر سوداگری بھی جرم ہے

❁ سلطان محمود......میانوالی

مات کے ڈر سے ہمیں یوں نہ جدائی دیتا
ہم بصد شوق ترے سامنے ہارے جاتے

❁ سلیمان خالد......حیدرآباد

باتیں ہوتی ہیں چند لفظوں کی
دے دیے جن کو طول جاتے ہیں

❁ خالد حسن چیمہ......پنڈی بھٹیاں

یہ میرا حوصلہ ہے تیرے بغیر
سانس لیتا ہوں بات کرتا ہوں

❁ چودھری اویس......فیصل آباد

میرا تجھ سے اٹوٹ رشتہ ہے
میں تماشا ہوں تو تماشائی

❁ نازش بٹ......کھوڑا

مقروض ہے یہ چاند بھی سورج کا دوستو
مانگے کی روشنی ہے، ہو کیا چاندنی بات

❁ ثمن زہرہ......لاہور

کسی کو گھر سے نکلتے ہی مل گئی منزل
کوئی ہماری طرح عمر بھر سفر میں رہا

❁ ظہیر اختر......سوات

وہ خاموش ہیں ہونٹوں کو سیے بیٹھے ہیں
ان کے سینے میں جو طوفاں ہے کوئی کیا جانے

❁ عبدالرؤف خان......ساہیوال

یوں ہی مرجھا سے گئے ہوں گے مہکتے گجرے
جانے والا نہ مگر لوٹ کے آیا ہوگا

❁ فیاض احمد......اوکاڑہ

محبت کر تو لیتے ہیں نبھانا بھول جاتے ہیں
لگا کر آگ سینے میں بجھانا بھول جاتے ہیں

کوپن برائے شمارہ مئی 2024

مُحفلِ شعر و سُخن

نام : --

پتا : --

ڈورتھی اینڈرسن نے لیلا بالڈون کے گھنگرالے سنہری بالوں اور اس کے مختصر لباس کے باوجود کیلی فورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کی تخریب کاری کی کہانی پر یقین کرلیا۔

ڈاٹ کو وہ کسی بھی طرح سے سائنس دان نہیں لگی۔

''آپ کو کیا لگتا ہے، کون ہے جو آپ کے آلات کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کررہا ہے؟'' ڈاٹ کی پارٹنر روتھ اسکر نے پوچھا۔

''میں پُریقین نہیں مس اسکر! مگر ایک فیلو کو خاص طور پر کچھ حسد ہے۔ چونکہ میں ایک عورت ہوں تو وہ سوچتا ہے کہ صنفِ نازک کو گھر تک ہی محدود رہنا چاہیے۔'' مس بالڈون نے کہا۔

روتھ نے ہاتھ اٹھایا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ہم پہلے نام کی بنیاد پر آگے بڑھیں گے...... تو مجھے روتھ کہتے ہیں اور یہ ڈاٹ ہے۔''

ڈاٹ نے بھی اس کی تقلید کی۔

روتھ، جو غیر ترقی یافتہ ساؤتھ ڈکوٹا میں پلی بڑھی تھی، روایتی ادب و آداب والی تھی جبکہ ڈاٹ نے اسٹولڈ انڈیانا پولس میں پرورش پائی تھی۔

''میں لیلا ہوں۔ مجھے آپ خواتین کے کام کرنے کا انداز پسند ہے۔ خیر، میرا حاسد فیلو انسٹی ٹیوٹ کا کلرک ہے۔ اس کی سوچ پچھلی صدی میں رہنے والوں جیسی ہے۔''

''اس کا نام کیا ہے؟'' ڈاٹ نے پوچھا۔

''ہیرام کوبی۔ وہ خود کو ماؤنٹ ولسن ماہرِ فلکیات تصور

عناد

صائمہ دانش

یہ دل کی بھی عجیب دنیا ہوتی ہے... جہاں کسی کے لیے محبت کا جہاں آباد ہو جاتا ہے اور کسی کے لیے نفرت، کدورت اور عناد کی جڑیں پھیل جاتی ہیں... اور دونوں جذبوں کا کوئی سبب نہیں ہوتا... محض ایک احساس اور ایک خیال اس جہان کو وسیع کر دیتا ہے... جیسے کہ اس نے محض عناد اور حسد کے سبب اس کی جان لے لی اور ساتھ ہی اپنی زندگی بھی تباہ کر ڈالی... واقعی یہ دل کی دنیا بھی عجیب ہوتی ہے۔

ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والے ایک ساتھی کی جلن کی تباہی

کرتا ہے جو کہ میں ہوں۔'' لیلا نے کہا۔ ''اور مسٹر اون ٹر بھی مجھ سے جان چھڑانے کی سازش کرتے نظر آتے ہیں کیونکہ میں عورت ہوں۔''

روتھ نے دوسرا نام بھی اپنے نوٹ پیڈ میں لکھا۔ ''تو آپ کون سے آلات استعمال کرتے ہیں اور کس قسم کی چھیڑ چھاڑ ہوئی ہے؟''

لیلا نے ان دونوں کو باری باری دیکھا اور بولی۔ ''اس کی وضاحت کرنا مشکل ہے کیونکہ آپ دونوں میں سے کوئی بھی سائنس دان نہیں ہے۔''

''ہاں واقعی، ہم نہیں ہیں۔'' ڈاٹ آرمی میں جانے والی تھی جب وہ ایک ہوس زدہ آدمی کے چنگل سے بھاگی اور اپنے خاندان تک کو پیچھے چھوڑ آئی پھر اس کی ملاقات روتھ سے ہوئی جس کے لیے گولی مارنا ایسے ہی تھا جیسے کیک بیک کرنا۔ انہوں نے ساتھ مل کر ایک زیادتی کی شکار عورت کے قتل کیس کو حل کیا تھا۔ روتھ، ڈاٹ سے پانچ سال بڑی تھی تو دنیا کے بارے میں اس کا تجربہ زیادہ تھا جبکہ ڈاٹ عقل مند اور تفتیش کے طریقوں میں ماہر تھی۔ انہوں نے مجبور خواتین کی مدد اور ان کا استحصال کرنے والے درندوں کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کے لیے ایک ایجنسی کھولی۔

''میری رپورٹ میں کچھ نمبر تبدیل کیے گئے تھے۔'' لیلا نے کہا۔ ''میرے احتیاط سے کیلیبریٹ کیے گئے آلات میں سے ایک بہت سختی سے ہینڈل کیا گیا اور بھی عجیب و غریب چیزیں رونما ہوئیں۔ دوسرے مرد میری واسر ڈگری اور ہارورڈ کے تجربے کے باوجود میری ملازمت سے ناراض ہیں اور مسٹر کولبی تو سب سے بدتر ہیں۔''

ڈاٹ ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھتے ہوئے کھڑکی سے باہر سان گیبریل پہاڑوں کو دیکھنے لگی۔

ماؤنٹ ولسن تقریباً چھ ہزار فٹ کی ایک شاندار برف سے ڈھکی ہوئی چوٹی تھی۔ اس میں نئی نصب شدہ شمسی دوربین اور ایک رصدگاہ تھی۔ ''کیا تم وہاں کام کرتی ہو؟''

''میں وہاں کی واحد خاتون سائنس دان ہوں۔ میں کبھی کبھی پہاڑوں پر جاتی ہوں لیکن اپنا زیادہ تر کام میں یہیں وادی میں کرتی ہوں۔'' وہ آگے جھکتے ہوئے بولی۔ ''مجھے بتائیں، کیا آپ میرا کیس لیں گی؟ یہ میری ڈریم جاب ہے۔ اگر مجھے ایک خراب ریسرچر کے طور پر پیش کیا گیا تو یہ میرا کیریئر تباہ کردے گا۔''

ڈاٹ نے روتھ کی طرف دیکھا۔

''ہمیں خوشی ہوگی۔'' روتھ نے کہا۔

لیلا نے اپنا موتیوں والا ہینڈ بیگ کھولا۔ نوٹوں کی ایک موٹی گڈی نکال کر روتھ کی طرف بڑھائی۔ ''کیا یہ شروع کرنے کے لیے کافی ہوں گے؟''

روتھ نے گڈی کی طرف دیکھا اور بغیر بولے رقم لے کر ڈاٹ کو تھما دی۔ ڈاٹ جانتی تھی اس کی دوست بڑی رقم سنبھالنے کی عادی نہیں تھی۔ انہوں نے لیلا کے لیے ایک رسید لکھ کر دی۔

''ہمیں یہ بتاؤ کہ مسٹر کولبی کہاں رہتے ہیں؟'' ڈاٹ نے کہا۔ ''اور ہم انسٹی ٹیوٹ کا بھی دورہ کرنا چاہیں گے۔''

''وہ ڈیل مار پر ایک بورڈنگ ہاؤس میں رہتا ہے۔'' لیلا نے کہا۔ ''آپ آج چھ بجے ہی انسٹی ٹیوٹ کیوں نہیں آجاتیں؟ زیادہ تر لوگ جا چکے ہوں گے۔ میں آپ کو ٹھیک سے آس پاس دکھا سکتی ہوں۔''

''بہترین خیال۔'' ڈاٹ نے کہا۔

''کیا تم خود کو محفوظ محسوس کرتی ہو لیلا؟ تمہیں لگتا ہے کہ تمہارے کام میں خطرہ ہے لیکن کیا تمہاری جان کو کوئی خطرہ ہوسکتا ہے؟''

ڈاٹ نے روتھ کی بات پر سر ہلایا جیسے اتفاق کررہی ہو۔

''اوہ، ڈیئر روتھ! کیا آپ کا مطلب ہے......'' لیلا بولتے بولتے رکی۔

''میرے تجربے کے حساب سے کچھ مرد اپنی خود پسندی میں سب کام اپنے حساب سے چلانے کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔'' روتھ نے کندھے اچکائے۔

''میں تمہیں گن چلانے کی تربیت دے سکتی ہوں اور اگر تم چاہو تو خواتین کے لیے مناسب ہتھیار خریدنے کے لیے مشورہ بھی دے سکتی ہوں۔''

''یہ شاید اتنا ضروری نہ ہو۔'' ڈاٹ نے تسلی بخش انداز میں کہا۔ ''پھر بھی ہم ہمیشہ اپنے کلائنٹس کو احتیاط کا مشورہ دیتے ہیں۔ یہ بس دوراندیشی ہے۔''

☆☆☆

ڈاٹ نے لیلا کو الوداع کر کے سگریٹ سلگایا اور اوپر کی سیڑھی پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔ روتھ کو گھر کے اندر سگریٹ کی بُو سے نفرت تھی۔

مسٹر فرونی خوبصورت گلابوں کی کاٹ چھانٹ میں مصروف تھا۔ انہوں نے گھر میں جاپانی باغبان رکھا تھا۔ یہ گھر دونوں نے ڈاٹ کے انکل سے کرائے پر لیا تھا۔

''مجھے سمجھ نہیں آتا کہ آپ اتنے خوبصورت پھول کیسے اُگا لیتے ہیں مسٹر فرونی۔'' ڈاٹ نے کہا۔ گن کے

چاروں طرف سرخ، گلابی، سفید اور پیلے رنگ کے بڑے اور چھوٹے پھول کھلے تھے۔

"شکریہ۔" اس نے کہا۔ "لیکن کیا تمھیں پتا ہے یہ سب کل چلے جائیں گے، جمعرات کو ہونے والے گلاب کے میلے کے لیے۔" پہلی جنوری کو ہونے والا سالانہ میلا جس میں گلاب کے پھولوں سے سجے وسیع فلوٹس تھے۔ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے یاد نہ کیا جائے۔ باغبان نے کہا تھا کہ وہ ہمیشہ میلے میں اپنے چچا کے گلاب عطیہ کرتا تھا۔

اسی وقت ایک نوعمر لڑکی دوڑتی ہوئی آئی۔

"ہیلو، کیکو!" ڈاٹ نے مسٹر فرونی کی بیٹی کو مخاطب کیا۔ وہ اسکول یونیفارم پہنے ہوئے تھی۔

"ہیلو، مس اینڈرسن!" لڑکی نے ہاتھ ہلایا پھر اپنے باپ کے پاس چلی گئی۔ "مجھے افسوس ہے کہ مجھے دیر ہوگئی۔ او...... تو...... سان۔"

"اپنی کتابیں نیچے رکھو اور کٹائی میں میری مدد کرو، کیکو چن!"

لڑکی، جس نے ایک امریکی نک نیم اپنایا تھا، فرمانبرداری کے ساتھ اپنا بیگ واک وے پر بچھا دیا اور کٹائیوں کا ایک جوڑا اٹھایا۔

"کیا یہ کوئی نیا کلائنٹ تھا جسے میں نے جاتے ہوئے دیکھا؟" کیکو نے دھیمی آواز میں ڈاٹ سے پوچھا۔

"ہاں، کیوں؟"

"کیا معاملہ ہے؟"

"وہ ایک سائنس دان ہے اور سوچتی ہے کہ کوئی اس کے کام میں چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے۔" ڈاٹ نے کہتے ہوئے رخ موڑ کر کش لگایا۔

لڑکی کا چہرہ روشن ہوا۔ "مس اینڈرسن! آپ جانتی ہیں میں پولیس میں آنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ اس معاملے میں مجھے مدد دیں گی؟"

ڈاٹ نے اسے دیکھا۔ جب سے ڈاٹ اور روتھ نے اپنا بورڈ باہر لٹکایا تھا تب سے کیکو مدد کے لیے کہہ رہی تھی۔ وہ سولہ سال کی ذہین اور زندہ دل لڑکی تھی۔

"ضرور۔ مجھے امید ہے کہ روتھ اور میں مس بالڈون کا معما حل کر سکتے ہیں۔"

"لیلا بالڈون؟" کیکو کی آواز بلند ہوئی۔ "خاتون فلکیات؟"

"ہاں وہی۔ تم اس کے بارے میں جانتی ہو؟"

کیکو نے ماؤنٹ ولسن کی طرف چمکتی نظروں سے دیکھا۔ "میں نے اخبار میں اس کے بارے میں پڑھا تھا اور میں تو اس سے ملنے کے خواب دیکھتی ہوں۔ اوہ، پلیز! ہمارا تعارف کروائیں۔"

"ہمارا آج چھ بجے اس کے انسٹی ٹیوٹ کا دورہ کرنے کا ارادہ ہے۔ شاید تم مل سکو۔"

مسٹر فرونی اپنی بیٹی کے پہلو سے نمودار ہوئے۔ "میں نے تمہارے پولیس میں بھرتی ہونے کی بات سنی۔ تم ایسا نہیں کروگی۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہاری مرحومہ والدہ کو یہ منظور ہوگا؟"

"میں نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے ڈیڈی!" اس نے ڈاٹ کو دیکھا۔ "میں ایک ماہر فلکیات بننا چاہتی ہوں۔ مس اینڈرسن ایک مشہور خاتون سائنس دان کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔" اس نے بڑی معصوم آنکھوں سے اپنے باپ کو دیکھا۔ "مس اینڈرسن نے کہا ہے کہ میں آج شام کیلی فورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے دورے پر ان کے اور مس اسکر کے ساتھ جا سکتی ہوں۔"

اس سے وہ تھوڑا نرم ہوا۔ "بہت اچھا کیکو چن۔ مس اینڈرسن! کیا آپ اسے باحفاظت گھر پہنچا دیں گی؟"

ڈاٹ مسکرائی۔ "میں خود ڈرائیو کر کے اسے گھر لے آؤں گی۔"

☆☆☆

وہ روتھ کے ساتھ آگے بیٹھی تھی اور کیکو پچھلی سیٹ پر جوش و خروش کے ساتھ چہک رہی تھی۔ وہ چھ بجنے سے چند منٹ پہلے کیلی فورنیا بلیوارڈ کے متاثر کن تھروپ ہال تک پہنچے۔ گنبد والی تین منزلہ عمارت جہاں انہیں لیلا سے ملنا تھا۔ سورج ایک گھنٹا پہلے غروب ہو چکا تھا اور چڑھتے ہوئے پورے چاند نے عمارت کے پیچھے کے پہاڑوں کو روشن کر دیا تھا۔

روتھ نے سامنے کھڑی ایک پرانے ماڈل کی فورڈ پولیس ویگن کی طرف اشارہ کیا۔

"مجھے اس کے بارے میں برے خیالات آ رہے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کچھ بھی نہ ہو۔" ڈاٹ نے کہا۔ "یا شاید لیلا کو ہماری مدد کی ضرورت ہو۔ چلو، دیکھتے ہیں کیا ہے؟"

روتھ نے سر ہلایا۔ "کیکو! ہمارے قریب رہنا۔"

جیسے ہی وہ تینوں چوڑے دروازے کے قریب پہنچے، دو آدمی نمودار ہوئے۔ ایک تھری پیس سوٹ اور ٹائی پہنے پچاس کی دہائی میں ایک جنٹل مین لگ رہا تھا جبکہ جوان شخص نے پولیس کی وردی پہن رکھی تھی۔ کمر کے گرد چوڑی پٹی تھی۔

وہ ٹائی ٹھیک کرتے ہوئے بولا۔ "خواتین! کیا میں

آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟‘‘
ڈاٹ آگے بڑھی۔ ’’ہم یہاں مس لیلا بالڈون سے ملنے آئے ہیں۔ اس نے ہمیں انسٹی ٹیوٹ کا دورہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ میں مس ڈور تھی اینڈرسن ہوں۔‘‘ اس نے اپنا دستانے والا ہاتھ بڑھایا۔
آدمی نے اس کا ہاتھ مختصراً ہلایا۔ ’’میں ڈیٹکٹیو رامیریز ہوں۔ آپ مس بالڈون کو کیسے جانتی ہیں؟‘‘ وردی والے نے ڈاٹ سے پوچھا۔
اس نے روتھ کی طرف اشارہ کیا۔ ’’مس روتھ اسکر اور میں ایک ایجنسی چلاتے ہیں۔ ہم پرائیویٹ تفتیش کار ہیں۔ مس بالڈون آج دوپہر ہماری خدمات لینے ہمارے پاس آئی تھیں۔‘‘ روتھ بولی۔
’’کس بارے میں؟‘‘ بوٹائی والے نے پوچھا جس نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کروایا تھا۔
’’مجھے ڈر ہے کہ معلومات خفیہ ہیں۔‘‘ روتھ نے جھجکتے ہوئے کہا۔
’’یہ لڑکی تمہارے ساتھ کون ہے؟‘‘ رامیریز نے پوچھا۔
’’وہ ہماری اسسٹنٹ ہے، مس کیکو فرونی!‘‘ ڈاٹ نے جلدی سے جواب دیا۔ روتھ نے ہنسی روکی۔ ڈاٹ نے دیکھا کہ لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے دونوں مردوں کے چہروں پر ناپسندیدگی کے تاثرات تھے۔
وہ جاپانی تھی تو کیا؟
’’کیا کوئی مسئلہ ہے حضرات؟‘‘ ڈاٹ نے پوچھا۔
’’کہہ سکتی ہو۔‘‘ رامیریز بدستور جھلایا ہوا تھا۔
دروازے دوبارہ کھل گئے۔ لگ بھگ ڈاٹ کی عمر کی ایک جوان لڑکی اسٹائلش ٹین کوٹ میں آگے بڑھی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی عورت جو ایک سویٹر کے نیچے سروس ڈریس پہنے ہوئی تھی، وہ بھی جاپانی لگ رہی تھی۔ کیکو کو دیکھ کر اس عورت کی آنکھیں چمک اٹھیں پھر وہ سر جھکا کر فرش کو گھورنے لگی۔
’’ڈیڈی! وہاں موجود پولیس والے نے کہا کہ مجھے جانا ہوگا اور مسز تاکاہاشی کو اپنی صفائی روک دینی چاہیے۔‘‘ امریکی لڑکی نے بوٹائی والے کو مخاطب کیا۔ ’’کیا مجھے واقعی جانا ہے؟‘‘
ڈیٹکٹیو نے گلا صاف کیا۔ ’’ہاں، مس طرا! آپ کو یہاں سے جانا ہوگا، مسز تاکاہاشی کی طرح۔ سب کو عمارت خالی کرنی چاہیے۔‘‘
بوٹائی والا اون طرتھا جس کا لیلا نے تذکرہ کیا تھا۔
رامیریز آگے بڑھا۔ ’’مجھے بتاتے ہوئے افسوس ہے کہ لیلا بالڈون مردہ پائی گئی ہیں۔‘‘
’’اوہ......!‘‘ روتھ کے منہ سے ایک تاسف زدہ سانس خارج ہوئی۔ ’’ہمیں آج شام یہ توقع تو بالکل نہیں تھی۔‘‘ روتھ نے اداس لہجے میں کہا۔
وہ انسٹی ٹیوٹ سے جانے لگے تو کیکو نے پوچھا کہ کیا وہ صفائی کرنے والی خاتون کو گھر تک لفٹ دے سکتے ہیں؟ یہ کہتے ہوئے کہ تاکاہاشی سان ان کے گھر کے قریب رہتی ہیں۔
اب وہ دونوں پچھلی سیٹ پر اپنی مشترکہ زبان میں آہستہ سے کچھ بڑبڑانے لگی تھیں۔
’’بے چاری لیلا! اس کا پریشان ہونا درست تھا۔ کیا تمہیں لگتا ہے کہ اسے کوئی اشارہ ملا تھا کہ اس کی جان کو خطرہ ہے؟‘‘
’’نہیں۔ تم نے اس کا ردعمل دیکھا تھا جب میں نے اسے گن چلانے کا مشورہ دیا۔ کتنے افسوس کی بات ہے وہ ہمارے پاس پہلے کیوں نہیں آئی۔‘‘ روتھ نے اپنی گود میں پڑے ہینڈ بیگ کو تھپتھپایا۔
جہاں تک ڈاٹ، روتھ کو جانتی تھی، وہ ہمیشہ پرس میں ریمنگٹن ڈیرنجر رکھتی تھی، چاہے وہ کہیں بھی جاتی۔ یہاں تک کہ چرچ بھی۔
’’میرا خیال ہے کہ ہم لیلا کے مقروض ہیں۔ ہمیں معلوم کرنا چاہیے کہ اسے کس نے مارا؟ ڈیٹکٹیو نے بھی یہی کہا تھا۔ لیلا کی موت فطری نہیں ہے اور نہ ہی اس نے خودکشی کی۔ ہمیں اس کیس کو دیکھنا ہوگا۔ آخر اس نے ہمیں ادائیگی کی ہے۔‘‘
روتھ نے اپنی ناک کو مسلا۔ ’’ٹھیک کہا۔ اس صورت میں ہمارا کام اس بدمعاش کو تلاش کرنا ہے جس نے لیلا کی جان لی۔‘‘
’’اون طر کی بیٹی کے بارے میں کیا خیال ہے؟‘‘ روتھ نے کہا۔ ’’ایک بگڑی ہوئی امیرزادی۔ وہ پیر پٹختے ہوئے گئی تھی جب ڈیٹکٹیو نے اسے جانے کو کہا۔‘‘
’’اور وہ لیلا کی موت پر ذرا بھی غمزدہ نہیں لگ رہی تھی۔‘‘ ڈاٹ نے لقمہ دیا۔
’’ویسے بھی مجھے حیرت ہے کہ وہ وہاں کیا کر رہی تھی؟‘‘
’’خیر، ہم صبح رامیریز کے لیے سوالات تیار کریں گے۔‘‘ ڈاٹ بولی۔
’’شاید ہیرام کو لبی آج شام انسٹی ٹیوٹ کے آس پاس نہیں تھا۔‘‘ روتھ بڑبڑائی۔
’’مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔‘‘ ڈاٹ نے اتفاق کیا۔ ’’ہم اسے کل ڈیل مار کے بورڈنگ ہاؤس میں تلاش کریں گے۔‘‘

"میرے خیال میں شاید مسٹر طر کو بھی تفتیش برداشت کرنا پڑے۔"

ڈاٹ مسکرائی۔ روتھ سے بہتر ساتھی شاید ہی کوئی اسے ملتا۔ ان کی مختلف شخصیتوں، صلاحیتوں اور قد کاٹھ کے باوجود وہ اکثر اپنے خیالات کو ایک جیسے راستے پر سفر کرتے ہوئے پاتیں۔ ڈاٹ کو امید تھی کہ روتھ کے ساتھ اس کا کاروبار طویل عرصے تک چلے گا۔

کیکو نے اگلی سیٹ کی پشت سے سر لگایا۔ "اس کا گھر وہیں ہے۔" اس نے ایک چھوٹے سے بنگلے کی طرف اشارہ کیا۔

ڈاٹ نے گاڑی روکی۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔" عورت نے کیکو کے والد کی طرح مضبوط لہجے میں کہا۔ وہ باہر نکلی اور اپنے روایتی انداز میں جھک گئی۔

"آپ کی رات اچھی گزرے، میم!" روتھ نے پکارا۔

مسز تاکاہاشی دوبارہ جھک گئی پھر اپنے گھر کی طرف لپکی۔

اس کے جانے کے بعد کیکو نے کہا۔ "اس ڈیٹکٹیو کو اس کا بھی انٹرویو کرنا چاہیے۔ وہ صفائی کرتے وقت اپنے کان کھلے رکھتی ہے۔ طر اور اس کی طرح کے اور لوگ، وہ سمجھتے ہیں کہ ہم غیر ملکی نا سمجھ ہیں اور یہ کہ انہیں ہم سے کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن تاکاہاشی سان انگریزی سمجھتی ہے۔"

"ہم......" ڈاٹ نے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا۔

☆☆☆

"آنے کا شکریہ مس اینڈرسن!" اگلی صبح نو بج کر تیس منٹ پر وہ اور رامیریز آمنے سامنے تھے۔ رامیریز نے ایک نوٹ بک اور پنسل نکالی۔ اس نے آٹھ بجے فون کر کے اسے بلایا تھا۔

ڈاٹ نے بیٹھتے ہوئے اپنے پسندیدہ سبز اسکرٹ کو ٹانگوں پر ہموار کیا۔

"گزشتہ شام مس اسکر نے کہا کہ وہ مس بالڈون کے ساتھ آپ کی ملاقات کی وجہ کو ظاہر نہیں کر سکتیں۔" اس نے شروع کیا۔ "مگر اب اس سائنس دان کا قتل کر دیا گیا ہے اور ہمیں یہ کیس حل کرنا ہے تو بتائیے کہ مس لیلا آپ کے پاس کیا خدشات لے کر آئی تھیں؟"

"جی، ضرور۔" ڈاٹ فرمانبرداری سے بولی۔ "لیکن پہلے میں یہ جاننا چاہوں گی کہ اسے کیسے مارا گیا؟"

"عام طور پر میں یہ معلومات ظاہر نہیں کرتا لیکن یہ معاملہ سنگینی اختیار کر گیا ہے۔ ادارے کے بانی اس کیس کو جلد سے جلد حل کرنے کے لیے محکمے پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔ مسز بیل کا پاسا ڈینا میں کافی اثر رسوخ ہے۔" اس نے اپنی انگلیاں چٹخائیں۔ "ڈرافٹنگ کمپاس کی بہت تیز نوک سے مس بالڈون کی گردن پر وار کیا گیا۔"

ڈاٹ کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔

"بے چاری عورت۔"

"ماہرین فلکیات کے ایک آلے سے وار...... مطلب اس قتل کی منصوبہ بندی نہیں کی گئی۔"

"بالکل۔"

"جب مس بالڈون ہم سے ملی......" ڈاٹ نے بات شروع کی۔ "انہیں نہیں لگتا تھا کہ ان کی زندگی خطرے میں ہے۔ وہ صرف بطور سائنس دان اپنی ساکھ کے لیے فکرمند تھی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ ایسا لگتا ہے کہ کوئی اس کی تحقیق کو ناقص دکھانے کے لیے چال چل رہا ہے۔"

"کیا اسے کسی پر شک تھا؟"

"اس نے ہیرام کوبلی نام کے ایک کلرک کا ذکر کیا تھا۔ وہ ڈیل مار پر ایک بورڈنگ ہاؤس میں رہتا ہے۔"

"کوئی دوسرا؟"

"اس نے اودن طر کا نام بھی لیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ وہ اسے اس کی جنس کی وجہ سے پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ سوچ کر کہ وہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے، اس نے ہماری خدمات حاصل کیں۔ اس شام ہمیں انسٹی ٹیوٹ کا دورہ کرانا پہلا قدم تھا۔"

"دلچسپ۔" وہ واپس اپنی کرسی پر جھکا۔

"ڈیٹکٹیو! آپ کو صفائی کرنے والی خاتون مسز تاکاہاشی کا انٹرویو کرنا چاہیے۔" ڈاٹ نے سنجیدگی سے کہا۔

"اوہ...... آپ کو لگتا ہے کہ مس بالڈون کی موت میں اس کا ہاتھ تھا؟ ان میں سے کچھ مشرقی......"

"یقیناً نہیں۔" ڈاٹ نے ٹوکا۔ "ہم نے اسے کل رات گھر تک لفٹ دی تھی۔ ہماری اسسٹنٹ نے ہمیں بتایا کہ طر جیسے لوگ مسز تاکاہاشی کے سامنے رازوں کو ظاہر کر لیتے ہیں کیونکہ انہیں لگتا ہے کہ وہ انگریزی نہیں سمجھتے لیکن اسے انگریزی سمجھ آتی ہے۔"

"کیا اس نے لڑکی کو کچھ خاص بتایا؟"

"مس فروبی کو اس نے ایسا کچھ نہیں بتایا مگر آپ کو مسز تاکاہاشی کے جوابات کا ترجمہ کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہوگی۔ کیکو دوپہر تک اسکول سے فارغ ہو جاتی ہے۔"

"اوکے۔ تو یہ تاکاہاشی خاتون کہاں رہتی ہے؟"

"ویسٹ گرین اسٹریٹ پر۔"

"بہت اچھے۔" اس نے میز پر اپنی پنسل تھپکی۔
"ہمیں انسٹی ٹیوٹ کے اندر دیکھنے کی ضرورت ہوگی اور شاید یہ عورت ہماری مدد کر سکتی ہے۔"

☆☆☆

ڈاٹ نے پہلے پیسفک ٹیلی فون اور ٹیلی گراف ڈائریکٹری کو چیک کیا تھا۔ اب اس نے کیل ٹیک کے قریب ڈیل مار کے واحد بورڈنگ ہاؤس کی گھنٹی بجائی۔ ایپرن پہنے ایک مضبوط عورت نے دروازہ کھولا اور ڈاٹ کو سر سے پیر تک دیکھا۔

"امید ہے کہ آپ کو کمرا نہیں چاہیے، مس! کوئی کمرا خالی نہیں، سب بھر چکے ہیں اور نہ ہی ایسی جگہ پر آپ جیسی اچھی خاتون کو قیام کرنا چاہیے۔"

"نہیں، میں ہیرام کولبی سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" اسے امید تھی کہ وہ اندر ہوگا کیونکہ انسٹی ٹیوٹ اب بھی بند تھا۔

"ٹھیک ہے، وہ یہیں ہے۔ وہ کام پر گیا اور سیدھا واپس آ گیا۔" اس نے اپنے پیچھے دیکھا اور آگے جھکتے ہوئے بولی۔ "مجھے امید ہے کہ اس کاہل نے اپنی نوکری نہیں کھوئی ہوگی۔ اس نے ابھی اپارٹمنٹ وقت پر نہیں دیا۔ ایک جواری اپنی تنخواہ جوئے میں ہی اڑاتا ہے۔"

"وہ کل بھی معمول کے مطابق کام پر گیا تھا؟"

اس نے سر ہلایا۔

"وہ کتنے بجے گھر لوٹا؟"

"کافی رات ہو گئی تھی۔ اس وجہ سے اس کا رات کا کھانا بھی چھوٹ گیا تھا۔ اس نے آٹھ بجے کے بعد اپنا چہرہ دکھایا۔ آپ اس سے پوچھ سکتی ہیں۔ آپ اندر آئیں گی؟"

"شکریہ میم! لیکن میں یہیں انتظار کروں گی۔"

ایک منٹ بعد ڈھیلی سی شرٹ پہنے ایک دبلا پتلا آدمی ظاہر ہوا۔ "آپ مجھے دیکھنا چاہتی تھیں مس؟" وہ کافی نروس لگ رہا تھا۔

"مسٹر کولبی!" ڈاٹ نے اس کا مصافحے کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ تھاما۔ "میں مس اینڈرسن ہوں۔ میں ایک پرائیویٹ ڈیٹکٹیو ہوں اور لیلا بالڈون کی موت کی تحقیقات کے لیے آئی ہوں۔ تم اس کے ساتھ کام کرتے تھے؟"

"کیا......؟" وہ چونکا۔ "کیا مطلب...... مس بالڈون نہیں رہی؟"

"جی بالکل۔ کیا انسٹی ٹیوٹ نے آپ کو اطلاع نہیں دی؟"

"او خدایا...... نہیں، میں آج صبح گیا تھا لیکن دروازے پر کچھ گارڈز نے مجھے واپس کر دیا۔ کیوں، یہ نہیں بتایا۔"

"کیا آپ کو کوئی اندازہ ہے کہ ایسا کون کر سکتا ہے؟" ڈاٹ نے سوال کیا۔

"نہیں...... نہیں۔" اس نے ہونٹ سکیڑ کر نفی میں سر ہلایا۔ "لیکن اگر آپ ادائیگی کریں تو میں ایک بار سوچ سکتا ہوں۔" اس کا لہجہ معنی خیز ہوا۔

ڈاٹ نے اپنی کمر سیدھی کی اور شائستگی سے مسکرا دی۔

"انصاف کی فراہمی کے لیے مناسب معاوضہ ہونا چاہیے جس سے میرے بل ادا ہو جائیں۔ ٹھیک کہا نا؟"

"میں جاؤں گی اب۔ آپ کے وقت کا شکریہ۔" وہ بنا اس کی بات کا جواب دیے مڑی۔

"رکو مس!" اس کے لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔ "آپ کو اس میٹی ملر کو دیکھنا چاہیے۔ اسے پہلے دن سے ہی مس بالڈون سے بیر تھا۔ بالکل اپنے باپ کی طرح۔"

☆☆☆

روتھ نے گرم شوگر کوکیز کو براؤن پیپر پر ٹھنڈا ہونے کے لیے پھیلایا اور اوون بند کر کے ڈاٹ کے سامنے بیٹھ گئی۔

"تو تمہیں کچھ پتا چلا؟"

"بے چاری لیلا پر کپاس سے وار کیا گیا۔ کولبی اس رات آٹھ بجے تک گھر نہیں پہنچا تھا مگر اس کا کہنا ہے کہ میٹی ملر کچھ عرصے سے لیلا کے لیے بغض رکھتی تھی۔ ہمیں اسے چیک کرنا چاہیے۔"

"گڈ ورک۔ لیلا نے ہمیں بتایا کہ ملر اسے پسند نہیں کرتا تھا لیکن ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ وہ اس کے خلاف کیوں تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں......"

"کہ میٹی، لیلا کی نوکری چاہتی تھی؟" ڈاٹ نے اس کا جملہ مکمل کیا۔

"ہاں، بالکل۔" روتھ نے ایک کوکی منہ میں رکھی۔

"کولبی کے مالی حالات خراب ہیں کیونکہ وہ جوا کھیلتا ہے۔" ڈاٹ نے پاس پڑا نیوز پیپر اٹھایا۔ "دیکھو، کل شام ایک انعامی لڑائی تھی۔ اگر کوئی کولبی کے وہاں ہونے کی ضمانت دے تو ہم اسے شک کے دائرے سے نکال سکتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لیلا نے کہا تھا۔"

"یقیناً ڈیٹکٹیو ان کرداروں کی جانچ کر رہا ہے۔" روتھ بولی۔

"امید کرتے ہیں۔" ڈاٹ نے اخبار لپیٹا۔

"میٹی مشکوک لگ رہی ہے۔"

"اور ملر خود بھی لیکن کیسے؟"

دروازے کی گھنٹی بجی۔ روتھ نے اپنے میلے ایپرن کی طرف دیکھا۔

''میں اس کا جواب دوں گی۔'' ڈاٹ کہتے ہوئے اٹھی۔

''اور اگر یہ نیا کلائنٹ ہے تو تمہیں جا کر چینج کرنا چاہیے۔'' روتھ نے اپنے حلیے کی طرف اشارہ کیا۔

ڈاٹ جلدی سے پارلر آفس میں داخل ہوئی۔ دروازے کے شیشے سے اس نے اودن طر اور اس کی بیٹی بیٹی کو دیکھا۔

کیا اس نے اور روتھ نے انہیں یہاں مدعو کیا تھا؟ ڈاٹ نے دروازہ کھولا۔

''گڈ مارننگ مسٹر طر، مس طر!''

''مس اینڈرسن!'' اس نے ہیٹ اتارا۔ ''مجھے لگا کہ مجھے آپ سے کچھ کاروباری باتیں کرنی چاہئیں۔''

''اندر آیئے۔'' ڈاٹ نے انہیں اندر بلا کر کرسیوں کی طرف اشارہ کر کے بیٹھنے کو کہا اور ایک کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ گئی۔ اتنے میں روتھ بھی کمرے میں داخل ہوئی۔

''آپ کو میری ساتھی یاد ہے مس اسکر؟'' ڈاٹ نے پوچھا۔

''مس اسکر!'' طر نے کہا۔

''ہم کیسے آپ کی مدد کر سکتے ہیں؟'' روتھ نے خوشگوار لیکن کاروباری تاثرات سے ان کی طرف دیکھا۔ بیٹی نے بات نہیں کی۔

''ہم قدرتی طور پر اپنے ادارے کی ساکھ کے بارے میں فکرمند ہیں اور مجھے اس میکسیکن ڈیٹکٹیو کی صلاحیتوں پر کچھ یقین نہیں ہے۔''

''میکسیکن ڈیٹکٹیو...... اس کی ہمت کیسے ہوئی کہ اس کی قومیت کی وجہ سے یہ رامیریز کے بارے میں برا سوچے؟'' روتھ نے ناگواری سے ہونٹ دانتوں تلے دبائے جبکہ ڈاٹ منتظر تھی کہ طر اور کیا کہے گا۔

''مجھے یقین ہے کہ ہیرام کوبی کو مس بالڈون سے شدید قسم کے مسائل تھے۔ اس نے اپنے امکانات کو روشن کرنے کے لیے قتل کیا ہوگا۔''

''کیا وہ بھی ماہر فلکیات ہے؟'' ڈاٹ نے پوچھا۔

''اپنے خوابوں میں...... لیکن وہ کافی علم رکھتا ہے۔'' طر نے بتایا۔

''کیا وہ منگل کی شام مس بالڈون کے ساتھ اکیلا تھا؟'' روتھ نے استفسار کیا۔

''مجھے ایسا لگتا ہے۔ میں اپنے دفتر میں تھا۔''

ڈاٹ نے بیٹی کی طرف دیکھا۔ ''مس طر! کیا آپ بھی کال ٹیک میں کام کرتی ہیں؟''

بیٹی نے اپنی نظریں اپنے والد کی طرف موڑ دیں۔ ''فیشن کے بعد...... لیکن میں کروں گی، جلد ہی۔''

طر کے چہرے پر ایک پُرتفاخر تاثر ابھرا۔ ''بہت ہوشیار ہے میری لڑکی۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ مس بالڈون سے پڑھ رہی تھیں؟'' روتھ نے اپنا لہجہ پُرسکون رکھا۔

''میں چاہتی تھی......'' بیٹی نے اپنی نوک دار ٹھوڑی کو اٹھایا۔ ''مجھے مرنے والوں کے بارے میں برا کہنا پسند نہیں لیکن مس بالڈون میرے ساتھ بہت سختی سے پیش آتی تھی۔ وہ مجھے اپنے قیمتی آلات کو چھونے نہیں دیتی تھی۔ وہ کہتی تھی مجھے کافی زیادہ تربیت کی ضرورت ہے۔''

طر نے میز پر دونوں ہاتھ مارے۔ ''لیکن اب وہ نہ یہاں ہے نہ وہاں۔ خیر، میں مسٹر کوبی کے خلاف تحقیقات کے لیے آپ کی خدمات لینا چاہوں گا۔ ہمیں یہ معاملہ جلد از جلد صاف کرنے کی ضرورت ہے۔ مسٹر ہیل ان واقعات سے خوش نہیں ہیں۔ اس قتل کی وجہ سے ہم انسٹی ٹیوٹ کا مستقبل خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ تو خواتین...... مجھے اپنی فیس بتائیں۔''

''جیسا کہ ہوتا ہے، ہماری ایجنسی پہلے ہی مس بالڈون کی موت کی تحقیقات کر رہی ہے۔ جیسے ہی ہم کسی نتیجے تک پہنچیں گے، ڈیٹکٹیو آپ کو آگاہ کر دے گا۔'' ڈاٹ کھڑی ہوئی۔

''تمہارا مطلب وہ شیطان؟'' طر غرایا۔

روتھ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''گڈ ڈے، مسٹر طر، مس طر!''

اودن طر کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا مگر اس نے اٹھنے میں دیر نہیں کی۔ بیٹی بھی غضب ناک تاثرات لیے اپنے باپ کے پیچھے چل دی۔

''اس کے تیور دیکھے؟'' ڈاٹ نے دروازے کی طرف دیکھا۔

''وہ نہیں جانتا ہوگا کہ ہم مردوں کے لیے کام نہیں کرتے۔''

''ہمیں مسز تاکاہاشی سے بات کرنا ہے۔'' ڈاٹ باہر کام کرتے مسٹر فرونی کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''انسٹی ٹیوٹ بند ہے۔ وہ گھر پر ہوگی۔ میں تم سے گاڑی میں ملوں گی۔''

ڈاٹ نے کوٹ اور دستانے پہنے اور اپنا ہینڈ بیگ لیتے ہوئے نکلی۔

"مسٹر فرونی!" ڈاٹ نے کہا۔ "آپ کا کام ختم ہوا؟"
"ہاں، تقریباً۔"
"پلیز، تو کیا ہمارے ساتھ مسز تا کاہاشی سے ملنے چلیں گے؟ ہمیں فوری طور پر ایک مترجم کی ضرورت ہے۔ آپ کی بیٹی اسے جانتی ہے لیکن ہم اس کے اسکول سے آنے کا انتظار نہیں کر سکتے۔"
اس نے پلکیں جھپکائیں۔ "تا کاہاشی سان کے شوہر اور میں نے ساتھ کام کیا ہے۔ میں چلوں گا۔" اس نے اپنے کام والی پتلون پر ہاتھ رگڑے۔
"شکریہ۔ میں گاڑی لے آتی ہوں۔"

☆☆☆

دروازے پر اپنے جوتے اتارنے کے بعد روتھ اور ڈاٹ، مسز تا کاہاشی کے چھوٹے کمرے میں نچلی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ مسٹر فرونی اپنی ہم وطن کا ساتھ دینے اس کے ساتھ قالین پر بیٹھ گیا۔
ڈاٹ نے مسز تا کاہاشی سے براہ راست بات کی۔ "اگر آپ چاہیں تو براہ کرم ہمیں مس بالڈون کی موت سے متعلق کل دوپہر کو کوئی مشکوک بات بتائیں۔"
مسز تا کاہاشی نے "مشکوک" لفظ پر مسٹر فرونی کی طرف رخ کیا۔ وہ جاپانی میں کچھ بڑبڑایا۔
"خاص طور پر مسٹر طر، مس طر، یا مسٹر کولبی کے بارے میں۔" روتھ نے مزید کہا۔
مسز تا کاہاشی نے سر جھکا لیا۔ اس کے دو جملے بولنے کے بعد مسٹر فرونی نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔
"یہ کہہ رہی ہیں کہ مسٹر کولبی چار کے بعد وہاں نہیں تھے۔ تب تک مس بالڈون زندہ تھی۔"
"اس کے بعد؟" ڈاٹ نے اسے جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔
"طر دوسری منزل پر اپنے دفتر میں تھا۔" باغبان نے اگلی بار توقف کے بعد ترجمہ کیا۔ "وہ بھی نیچے لیب میں نہیں جاتا۔"
مسز تا کاہاشی دوبارہ بولیں۔ اس کی نظریں ڈاٹ اور روتھ پر تھیں۔
"اس نے بیٹی طر کو واش روم میں دیکھا جو اپنے اسکرٹ کو صاف کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔" وہ بڑبڑایا۔ "اس کے ہاتھ سرخ تھے۔ تا کاہاشی سان نے سنک میں گلابی پانی دیکھا۔"
روتھ کی سانسیں تیز ہوگئیں۔ اس نے ڈاٹ کی طرف دیکھا۔
"وہ کیا وقت تھا؟" روتھ نے پوچھا۔
مسز تا کاہاشی نے سرگوشی میں جواب دیا۔
"پانچ تیس۔" مسٹر فرونی نے کہا۔ "مس طر نے تا کاہاشی سان کو نہیں دیکھا تھا۔ تا کاہاشی وہاں سے نکل کر لیب کی صفائی کرنے چلی گئی جہاں اسے مس بالڈون ملی۔"
"تو یہ بات ہے۔" ڈاٹ نے آہستہ سے کہا۔ پچھلی شام کسی نے یہ ذکر نہیں کیا تھا کہ ایک معمولی صفائی کرنے والی خاتون نے لاش دریافت کی تھی۔
دروازے پر تیز دستک ہوئی۔ مسز تا کاہاشی خوفزدہ ہوئی۔
ڈاٹ نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور دیکھا کہ ڈیٹکٹیو رامیریز اور ایک دبلا پتلا ایشیائی آدمی اس کے پیچھے کھڑا ہے۔
"مس اینڈرسن! آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟"
"ڈیٹکٹیو! ہم نے ابھی ایک عینی شاہد کا بیان سنا ہے جس میں آپ کو بہت دلچسپی ہوگی۔"

☆☆☆

اگلی صبح گلابوں کے میلے میں گلاب سے سجے ہوئے فلوٹس حیرت انگیز تھے۔
"یہ اوتو سان کے پھول ہیں۔" کیکو نے ایک فلوٹ کی طرف اشارہ کیا۔ سفید گلاب کی پنکھڑیوں میں ڈھکے ہوئے ایک دیو ہیکل بیلٹ کے پاس، سفید لباس میں وہ دونوں کھڑی تھیں۔ کیکو، ڈاٹ اور روتھ کی طرف متوجہ ہوئی۔
"تم نے کیس اتنی جلدی کیسے حل کر لیا؟"
"تم نے کہا تھا کہ پولیس کو مسز تا کاہاشی سے بات کرنی چاہیے لیکن ہم تمہارے ترجمے کا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔" ڈاٹ نے کہا۔ وہ اس کی شکر گزار تھی۔ وہ کبھی بھی کیکو کے مشورے کے بغیر مسز تا کاہاشی سے بات نہ کرتی۔
روتھ نے مزید کہا۔ "ڈیٹکٹیو کے مترجم کے ساتھ آنے کے بعد مسز تا کاہاشی نے ہمیں مس طر کی لیلا کے بارے میں کافی خوفناک اور نفرت انگیز باتیں بتائیں۔"
"مسز تا کاہاشی کی گواہی پر ہی ڈیٹکٹیو رامیریز سیدھا اسے گرفتار کرنے کے لیے چلا گیا۔"
ڈاٹ نے رامیریز کو اوون طر کے بارے میں بھی بتا دیا تھا جس نے انہیں کام دینے کی کوشش کی تھی۔ انہیں شبہ تھا کہ طر اپنی بیٹی کے ساتھ لیلا کے قتل میں شامل تھا۔
اب تک روتھ اور ڈاٹ کا ایک کامیاب ایجنسی کا خواب پورا ہو رہا تھا۔ وہ لیلا کو نہیں بچا پائے تھے لیکن "کیکو" امید کی کرن تھی۔ شاید وہ اگلی ماہر فلکیات ہو کیونکہ بیٹی طر تو یقینی طور پر اس قابل نہیں رہی تھی۔
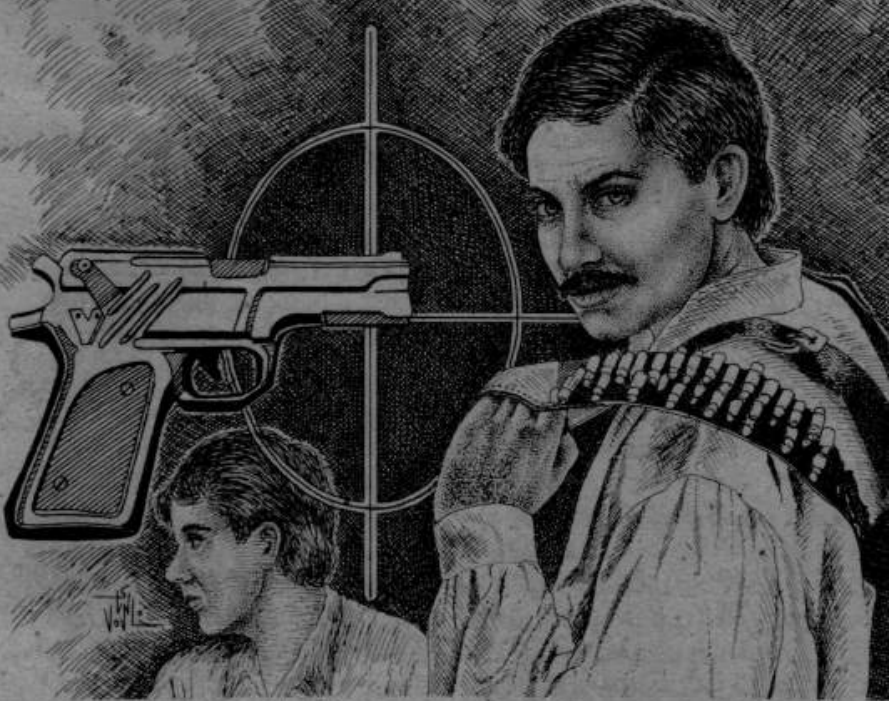
جنگباز

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط 26

مقدر کا عروج ہو یا نصیب کا زوال... جانے کن خاموش لمحوں میں زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر بھروسا کرتے ہیں... وہ جو حالات کی زنجیر میں قید بوسیدہ در و دیوار تک محدود تھا تمام تر معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے... چہروں پر شرفا کا نقاب ڈالے عبرت و مکر کے تمام حربے آزمانے اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں... سنگین ہنگاموں اور تحیر انگیز چالوں سے ناآشنا تھا... ایسا بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ داروں کی ڈوریاں الجھ کر رہ گئیں... اس کے ذہن میں قید ناآسودہ خواہشوں کا بھنور اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کایا پلٹتا چلا گیا کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

روشنیوں کا شہر کراچی...... اس نے جانے کتنے لوگوں کو اپنے دامن میں ماں کی طرح سمیٹ رکھا ہے، ان گنت داستانوں کی امین اس مہربان گود کے کسی کونے میں سہراب خان یعنی میں بھی رہتا ہوں جو ایک غریب محلے میں محبت کرنے والی ماں اور ایک سخت گیر طبیعت کے حامل باپ کا ایسا ناخلف بیٹا بھی تھا جو ہر وقت باپ کی بے جا مار پیٹ کا نشانہ بنتا رہتا۔ میری ایک بہن بھی تھی راحیلہ، مگر نہیں، بعد میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ میری بہن نہیں تھی، خالہ زاد تھی۔ بچپن میں اس کے ماں باپ ایک ناگہانی حادثے میں مر چکے تھے اور ماں نے اسے میرے ساتھ ہی پال پوس کر جوان کیا تھا۔ یہ راز صرف میری ماں اور راحیلہ کو پتا تھا۔ میں تو راحیلہ کو بچپن سے ہی سگی بہن سمجھا کرتا تھا مگر وہ بچپن سے ہی مجھے ایک بھائی کی نہیں بلکہ کسی اور ہی ”نگاہ“ سے دیکھا کرتی۔ ماں میری شادی اس سے کروانا چاہتی تھی لیکن یہ حقیقت آشکار ہونے کے باوجود بھی میرے اس جذبے میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں اب بھی اسے ایک ”بہن“ کے ہی روپ میں دیکھتا تھا۔ راحیلہ نے میرے اس برتاؤ پر بُرا منایا مگر میں اسے بُری طرح جھڑک دیتا۔ میرا باپ، ماں کو مارا پیٹا کرتا تھا۔ ایک دن ماں کو اس نے گہرا زخم دیا تو میں برداشت نہ کر پایا اور باپ کے سامنے سینہ تانے کھڑا ہو گیا۔ باپ کا یہ دیکھ کر بلڈ پریشر بڑھ گیا اور اس کی دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ وہ جہان سے کوچ کر گیا تو گھر میں سکون ہوا۔ غربت اور باپ کی سخت گیر طبیعت نے مجھے ایک حد تک جرائم کی طرف لڑھکا ضرور دیا تھا مگر چونکہ شاید میری رگوں میں ”نسلی“ خون دوڑ رہا تھا اسی لیے میں جلد ہی سنبھل گیا مگر اس ”سنبھلنے“ کی مجھے بڑی قیمت چکانا پڑی۔ میں اور میرا باپ ایک فیکٹری میں معمولی ورکر تھے۔ گلی کے محلے میں ہی تین ہم عمر لڑکے میرے یار کہلائے۔ ایک کا نام سلیم، دوسرے کا راجو اور تیسرا ماجد تھا۔ ماجد کی جوان بہن فوزیہ میری پہلی اور آخری محبت ٹھہری۔ ہم چاروں جرائم پیشہ گروہ کے آلۂ کار بن گئے۔ اقبال نامی ادھیڑ عمر شخص ہمارا ”باس“ کہلایا۔ اس کا نائب سجاد بیگ تھا۔ اسی گروہ نے ہم چار یاروں (سلیم، راجو، ماجد اور مجھے) ایک روز آنکھوں پر پٹی باندھ کر کسی نامعلوم مقام پر پہنچا دیا جہاں ہمیں لڑائی بھڑائی کی خصوصی ٹریننگ دی گئی۔ میں جسامت کے لحاظ سے چھریرا، لمبا اور مضبوط کاٹھی کا تھا۔ سلیم مناسب قد و قامت کا جبکہ راجو اور ماجد قدرے گٹھی ہوئی جسامت کے مالک تھے۔ گروہ نے ہمارے ناموں کے ساتھ عجیب و غریب قسم کے ”لاحقے“ نتھی کر ڈالے۔ میں سہراب لبو کہلایا۔ سلیم کے ساتھ ”چھالیا“ نتھی ہو گیا۔ راجو ”بوری“ ہو گیا جبکہ ماجد ”ماجا“۔ گروہ دیگر جرائم کے ساتھ بھتا خوری بھی کرتا تھا۔ ہمارے فیکٹری مالک سیٹھ سکندر سے بھتا لینے کے لیے ”باس“ اقبال نے ہمیں استعمال کیا۔ میری غیرت جاگی۔ میں نے سلیم وغیرہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ میرے ہی دشمن ہو گئے، تاہم میں نے سیٹھ سکندر کے ساتھ نمک حلال کیا اور اسے سب باتیں بتا دیں کہ بھتا نہ دینے کی صورت میں اس کی فیکٹری کو بم سے اڑا دینے کی دھمکی دی گئی ہے۔ میں نے بروقت بم کی اطلاع دے کر سیکڑوں غریب ورکروں کی جان بچالی۔ گروہ سمیت میرے تینوں یار میری جان کے دشمن ہو گئے۔ سیٹھ سکندر کی جواں سال خوب صورت بیٹی سدرہ میری ”نمک حلالی“ سے متاثر ہوئی۔ عقدہ کھلا کہ سدرہ کا ماموں یعنی سیٹھ سکندر کا سالا، سجاد بیگ ہی جرائم پیشہ گروہ کے باس اقبال کا نائب ہے۔ بعد میں اس راز سے بھی پردہ ہٹا کہ وہ سدرہ کی ماں کا سوتیلا بھائی تھا۔ وہ بھائیوں والی محبت جتا کر سوتیلی بہن کا سب کچھ ہتھیانا چاہتا تھا اور اپنے گروہ کو بھی مالی فائدہ پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اس کی پلاننگ آشکار کر دی۔ وقت تیزی سے بدلا۔ ماں مر گئی۔ ماجد عرف ماجے کے قتل کا الزام مجھ پر لگا۔ فوزیہ مجھ سے متنفر ہو گئی تھی کیونکہ بعد میں راحیلہ نے اسے حقیقت بتا ڈالی تھی۔ میں لاک اپ ہوا۔ اسی دوران کوئی ”پھوٹا خان“ نامی اجنبی میری مدد کو آیا۔ اندازہ ہوا کہ یہ گروہ کا کوئی مخالف تھا۔ اس کی مدد سے میں نے کسی طرح قانون سے رہائی پائی۔ باس اقبال، سلیم چھالیا اور راجو بوری میرے خون کی بُو سونگھتے پھر رہے تھے۔ میں راحیلہ اور فوزیہ کو لے کر کراچی سے سیالکوٹ ہجرت کرنے لگا۔ وہاں سدرہ کا کوئی مکان خالی پڑا تھا۔ ادھر سدرہ کو اپنے نام نہاد ماموں سجاد بیگ سے بھی جان کا خطرہ تھا۔ سیٹھ سکندر کے دو وفادار محمود قریشی اور مشتاق بھی تھے۔ ٹرین کراچی سے پنجاب کے لیے روانہ ہوئی اور صادق آباد میں فوزیہ اور راحیلہ سے بچھڑ کر میں بااثر ”چودھری جی برادران“ کے نرغے میں چلا گیا۔ وہاں بھولے سے میری عجیب حال میں ملاقات ہوئی۔ اس کی منگ سے چودھری شالا جی نے زبردستی شادی کر لی تھی۔ اس کا نام نادو تھا۔ ہم تینوں فرار اختیار کر گئے۔ راستے میں پولیس اور چودھری جی برادران کے حواریوں سے مقابلے میں بھولا مارا گیا۔ نادو میری ذمے داری بن گئی۔ وہ ایک عجیب لڑکی تھی۔ اسے درحقیقت کسی اور سے محبت تھی۔ اس کا نام بختیار تھا۔ بختیار راجن پور میں رہتا تھا۔ فوزیہ اور راحیلہ کو بھی میں نے کسی طرح تلاش کر لیا۔ سیالکوٹ میں ایک ماں بیٹی سے میری شناسائی ہوئی۔ وہ محلے دار تھیں۔ لڑکی نگہت اور ماں شگفتہ خاتون۔ نگہت کسی وسیم نامی لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ دونوں فائٹنگ کلب کے ممبر بھی تھے۔ عقدہ کھلا کہ شگفتہ، باس اقبال کی منکوحہ تھی اور نگہت بیٹی مگر شوہر کی مجرمانہ زندگی سے تنگ آ کر شگفتہ اپنی بیٹی نگہت کے ساتھ کراچی سے سیالکوٹ اپنے ماں باپ والے گھر میں آن بسی تھی۔ اس کی الگ کہانی تھی۔ فائٹنگ کلب کا ایک ماسٹر عرف استاد جوجی میرا دوست بن گیا۔ نگہت اب بھی باپ (اقبال) سے ملاقات کرتی تھی۔ سیالکوٹ میں اقبال چوک پر اس کے باپ یعنی باس کا بنگلا تھا۔ وہاں دو چوکیدار اور ملازم ارشد وغیرہ تھے۔ ایک خفیہ گروہ ”کالی لہر“ سے میرا ٹاکرا ہو گیا۔ یہ جادو ٹونے کرنے والا گروہ تھا۔ عدیل جو کہ جگنو نامی شخص کا بھائی تھا ان کے ہاتھوں مارا گیا۔ جگنو ایک بڑی سیاسی شخصیت کا آلۂ کار تھا۔ وہ میرا دشمن اور بعد میں دوست بن گیا۔ کالی لہر کے رانگا بابا اور میڈم بھی سے میری دشمنی عروج پر تھی اور ان کے میرے خلاف جادو ٹونے بھی۔ میرا دشمن باس اقبال بھی ان کی جادوئی ہانڈیوں کی زد میں آ کر اسپتال پہنچ گیا۔ اس کی بیٹی نگہت میری دشمن بن گئی جبکہ اس کی ماں شگفتہ خاتون

مجھے بھائی سمجھتی تھی۔ اب میری بیک وقت جنگ بازی...... باس اقبال کے نائب سجاد بیگ، چودھری جی برادران اور کالی لیر والوں کے ساتھ جاری تھی۔ میں راحیلہ کا پیچھا کرتے ہوئے رانگا بابا کے ٹھکانے پر پہنچ گیا اور اسے اٹھا کر فارم ہاؤس لے آیا۔ رانگا نے منتر پڑھنا شروع کردیے اور اچانک وہاں ہانڈیوں کی بارش ہونے لگی۔ مجھے سر پر کچھ مار کر بے ہوش کردیا گیا اور جب ہوش آیا تو وہ لوگ باور کرانے لگے کہ میں مرچکا ہوں اور میری روح ان کے قبضے میں ہے۔ عجیب عجیب شعبدہ بازیاں دکھائی گئیں، پھر مجھے حالت بے ہوشی میں قبر میں دفنا دیا گیا۔ انہوں نے کچھ کھلا کر میرے جسم کو مفلوج کردیا تھا۔ وہاں بجو نے حملہ کیا اور تب ہی غیبی مدد ہوئی اور ایک ماں بیٹی نے مجھے قبر سے نکالا۔ میری حالت دگرگوں تھی۔ پھر میری محسن میرا علاج کرنے لگی۔ ان ماں بیٹی کو گاؤں والوں نے دربدر کردیا تھا۔ وہاں کے چودھری کا بیٹا صمصار چنبیلی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ وہ وہاں آکر ہم لوگوں کو ہراساں کرنے لگا۔ اماں میرے علاج کی غرض سے خاص بوٹی لینے سرحد پار نکل گئی۔ اماں خاص بوٹی لے آئی تھی اور اس نے دوا کا سفوف اور تیل تیار کرلیا تھا۔ دوا نے مجھ پر جادوئی اثر دکھایا اور میرے اندر طاقت کا خزانہ بھر گیا۔ جنگل میں عورت کی چیخ پر میں وہاں پہنچا تو دیکھا ایک تیندوا عورت کو دبوچے ہوئے تھا۔ میں نے درندے کو ٹھکانے لگادیا۔ زخمی عورت صمصار کی ماں شمیلہ خانم تھی۔ صمصار کے گماشتوں نے اماں کی مڑھی کو آگ لگادی۔ میں انہیں تھانے لے گیا تاہم انہوں نے مجھے ہی لاک اپ کردیا۔ میں تھانے سے بھاگ نکلا۔ مجھے شمیلہ خانم نے ایک ڈاکٹر کے کلینک پر ٹھہرادیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ وہ ہمیں یہاں سے نکال کر شہر پہنچادے گا تاہم میں مطمئن نہ تھا۔ میں نے ڈاکٹر کے پاس ایک پراسرار آدمی کو دیکھا۔ جب تھوڑا تحقیق کی تو پتا چلا ڈاکٹر ہمیں پھنسانا چاہتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو گرفت میں لیا مگر وہ نکل گیا اور ہمیں مجبور کیا کہ جیسا وہ کہے، ہم کریں۔ تاہم دھینگا مشتی میں ڈاکٹر جان سے چلا گیا اور میں اماں اور چنبیلی کے ساتھ وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ میں استاد جوجی کے ٹھکانے پر آگیا۔ وہاں سے ہم کالی لیر والوں کے ایک ٹھکانے پر پہنچے تو وہاں نزاکت اور رواڑاں کی لاشیں ملیں۔ میں نے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ وہاں سے میں ایک قصائی صورت بدمعاش کو اپنے ٹھکانے پر لے آیا۔ اس پر تشدد کرکے ہم معلومات لے رہے تھے کہ وہاں ہانڈیوں کی بارش ہوگئی۔ ہم نے دشمنوں کو مار بھگایا اور قبضے میں موجود بدمعاش سے کالی حویلی کا پتا معلوم کرلیا۔ ہم کالی حویلی پہنچ گئے۔ وہاں میرا رانگا سے ٹاکرا ہوا۔ رانگا نے استاد جوجی کو شدید زخمی کردیا۔ میں نے رانگا کی ایک ٹانگ کاٹ ڈالی تاہم رانگا بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں دشمن کے ایک اور ٹھکانے پر پہنچا تاہم انہوں نے مجھے قابو کرلیا۔ میں زخمی بھی ہوگیا۔ اچانک وہاں سلیم نے حملہ کردیا۔ مجھے وہاں سے نکال لیا گیا۔ سلیم اور چودھری برادران نے مجھ سے مفاہمت کرلی تاہم اس کے پیچھے ان کا کوئی خاص مقصد تھا۔ راحیلہ بھی انہی لوگوں کے پاس تھی۔ سلیم اور میں نے راجا تیمور کو چھاپنے کی کوشش کی تاہم ہمیں ناکامی ہوئی۔ وہاں سے واپسی پر ایک جگہ ایمبولینس اور پولیس نظر آئی۔ وہ کسی لاش کو اٹھا رہے تھے۔ جگنو کو ماردیا گیا تھا۔ میں نے انتقام کی ٹھان لی۔ میں نے تیمور کو چھاپنے کا ارادہ کیا اور اس کی فیکٹری پہنچ گیا۔ وہ لوگ کوئی ''شے'' لے کر کہیں جارہے تھے۔ میں نے ان کا تعاقب شروع کردیا۔ ایک مقام پر میری گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوگیا۔ میں نے پیدل ہی ان کا تعاقب شروع کردیا۔ اچانک دوڑتے ہوئے میں گڑھے میں گرا۔ سر پر چوٹ لگنے سے بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو دیکھا راجا تیمور اور ڈرائیور ہلاک ہوچکے تھے اور کیوس سے ڈھکی شے غائب تھی۔ راجا تیمور کا ایک ساتھی زندہ میرے ہتھے چڑھ گیا۔ معلومات پر پتا چلا کہ کسی گروہ نے انہیں ہلاک کیا تھا اور بوہورگا نامی قدیم مجسمہ لے اڑے تھے۔ میں نے میڈم بھی تک پہنچنے کے لیے ان کا پیچھا کیا اور ان کے ساتھیوں کی کشتی میں سوار ہوگیا۔ ہم انڈین حدود میں داخل ہوگئے۔ بوہورگا کا مجسمہ بھی انہی کے پاس تھا۔ کشتی ایک جگہ رکی تو بھیڑیوں نے حملہ کردیا تاہم بھیڑیوں سے نمٹ لیا گیا۔ آگے چل کر ایک مگرمچھ نے ہم پر حملہ کیا اور کشتی میں صرف دو افراد بچے۔ ایک میں اور دوسری شینا۔ میں نے شینا کو الٹی سیدھی کہانی سنا کر اسے اپنے ساتھ شامل کرلیا۔ ہماری کشتی ندی کی طغیانی کے باعث تباہ ہوگئی۔ ہم ایک جگہ پہنچ گئے۔ شینا زخمی ہوگئی۔ وہاں موجود میاں بیوی نے ہماری مدد کی۔ ہم ان کے گھر آگئے تاہم وہاں مخالف گروہ کے لوگ آگئے۔ انہوں نے ہمیں پکڑ لیا تاہم میں ان کی گرفت سے آزاد ہوگیا۔ میں واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو وہاں ایک لڑکی نے مجھ پر عقب سے پستول تان لیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں یہیں رہتا ہوں۔ وہ میری طرف سے مشکوک تھی۔ ابھی میں گھر میں داخل ہوا ہی چاہتا تھا کہ ایک اجنبی شخص گرتے پڑتے باہر نکلا۔۔۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

''بب...... باس......!''

مجھے اپنے عقب سے اس اجنبی لڑکی کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس پر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا کہ اندر سے یہ گرتا پڑتا اور زخمی حالت میں برآمد ہوتا شخص اس اجنبی لڑکی کا باس تھا۔

میرا دھیان اس وقت اندر موجود دھماکے، میوزک کی ہوئی صوتی کی چیخ اور شینا کی طرف مبذول ہوچکا تھا۔ وہ شخص بھی مجھے اس طرح دوڑتا ہوا آتا دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹک گیا لیکن اس کے پیچھے شاید موت لگی ہوئی تھی۔ وہ ایک دم راستہ بدل کر بھاگا۔ میں ابھی دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ وہ موت سامنے آن کھڑی ہوئی۔ میں اسے دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔

وہ خنزیر النسل، جیکی تھا اور اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا پستول تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی پہلے تو اس کے چہرے پر حیرت اور پھر قہرناکی کے آثار نمودار ہوئے لیکن ساتھ ہی اس کا دھیان اپنے بھاگتے ہوئے شکار کی طرف بھی پلٹا تھا اور یہی مہلت میری اس جنبش کے لیے کافی تھی جو میں نے پلک جھپکتے ہی لی تھی۔

میں اس پر جا پڑا تھا۔ اس نے گولی چلادی۔ دھما کا ہوا۔ گولی برف میں دھنس گئی۔ میں اسے لیتا ہوا اندر ہی مکان میں گھس گیا۔ اسے لیتا ہوا اندر فرش پر گرا اور گرتے ہی اس کی ٹھوڑی پر مکا رسید کردیا۔ میرا گھونسا "زور آور" تھا، وجہ نامعلوم نہ تھی۔ اس کے حلق سے کراہ آمیز چیخ خارج ہوگئی۔ کمبخت بلا کا سخت جان تھا ورنہ کوئی اور ہوتا تو اس کا جبڑا ضرور ہل چکا ہوتا۔

اس کے چوٹ سہنے تک میں نے دوسرے ہاتھ کا مکا اس کے جبڑے پر رسید کردیا۔ یہ پہلے سے زیادہ زوردار تھا۔ اس بار اس کے سور جیسے تھوتھنے سے لہو ابل پڑا۔ میں اس پر پہلے ہی بہت ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ یہ ایک سنگدل اور کینہ پرور فریبی آدمی تھا۔

اندر میں نے صوبی کی سسکیاں سنیں۔ دیکھا، وہ ایک کونے میں اپنے شوہر میوخ کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے کہیں گولی لگ گئی تھی جو شاید اسی مردود جیکی کی بربریت کا ہی شاخسانہ ہوسکتی تھی۔

میوخ کے دائیں پہلو سے بھل بھل خون بہے جا رہا تھا۔ اس کے دونوں معصوم چھوٹے بچے لہولہان پڑے باپ کے ساتھ لپٹے روئے جا رہے تھے۔ ایک طرف هینا کو بھی میں نے پڑے پایا۔ نہ جانے وہ بے ہوش تھی یا پھر......

اپنے مہربان اور محسن میزبان کا یہ حال دیکھ کر میری آنکھوں میں اور خون اتر آیا۔ جیکی نے سنبھالا لینے کی کوشش کی۔ میں نے اسے چھوڑا اور اس کے قریب ہی فرش پر پڑے پستول پر جھپٹا مارا۔ عقب سے موقع تاک کر اس نے لات چلادی جو زیادہ زوردار ثابت نہ ہوئی۔ میرا پستول پر ہاتھ پڑ چکا تھا مگر اتنا زخمی ہونے کے باوجود اس نے زور آوری دکھائی اور فرش پر پڑے پڑے مچھلی کی طرح تڑپا۔ اب اس کا ایک ہاتھ بھی پستول پر آن پڑا۔

ہم دونوں میں پستول ایک دوسرے سے جھپٹنے کے لیے زور آزمائی شروع ہوگئی۔ اسی وقت نہ جانے صوبی کو کیا سوجھا۔ شاید اپنے شوہر کی حالتِ زار نے اسے زخمی ناگن بنا دیا تھا۔ وہ ایک دم چیخ مار کر اٹھی اور آتش دان کے قریب گئی۔

وہاں سے ایک جلتی ہوئی موٹی سی لکڑی اٹھائی اور غراتی ہوئی جیکی کے قریب آ کر وہ اس نے اس کے چہرے سے لگادی۔

شعلے اڑاتی انگارہ لکڑی نے جیکی کے چہرے کا حشر کر کے رکھ دیا۔ وہ کسی بیل کی طرح ڈکرایا اور ماہی بے آب کی طرح تڑپا۔ پستول میں نے قبضے میں کرلیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

صوبی کو میں نے بھڑاس نکالنے کا موقع دیا۔ صوبی نے دوبارہ اس کے چہرے پر انگارہ لکڑی رگڑ ڈالی اور اس بار جیکی کے چہرے سے ہٹائی نہیں۔ وہ اندھا ہوگیا۔ اس کی آنکھیں، چہرہ، سر کے بال خاکستر نظر آنے لگے۔ میں پستول تانے خاموش کھڑا اس خنزیر النسل کا حشر دیکھتا رہا کہ یہ صوبی پر حملہ کرنے کی کوشش کرے تو میں اس کی کوشش ناکام بنادوں۔

وہ مارے اذیت کے دیوانوں کی طرح اپنے دونوں ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا کہ کسی طرح صوبی کو دھکا دے کر خود سے پرے کرسکے اور اس کے عذاب سے جان چھوٹے مگر صوبی جیسے زخمی ناگن بنی ہوئی تھی اور پینترے بدل بدل کر اس کے چہرے پر جلتی سلگتی لکڑی کے وار کرتی رہی جس سے چنگاریاں بھی اڑتیں اور دھواں بھی۔

ایک موقعے پر اس خبیث نے صوبی کی ٹانگ پکڑ ہی لی پھر یہی وہ وقت تھا جب میری انگلی نے ٹریگر پر حرکت کی۔ گولی چلنے کا دھما کا ہوا پھر دوسرا۔ یکے بعد دیگرے میں نے اسی مردود کے پستول سے دو گولیاں فائر کیں جو ایک اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر اور دوسری اس کے سر میں داغی تھی۔ وہ تڑپا اور ٹھنڈا پڑ گیا۔

صوبی نے جیکی کی لاش پر تھوکا اور دوبارہ فرش پر نڈھال پڑے اپنے شوہر کی طرف متوجہ ہوئی۔ دروازے پر وہی اجنبی لڑکی مجھے دکھائی دی۔ وہ جانے کب سے کھڑی یہ خونریز معرکہ آرائی دیکھ رہی تھی مگر وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ہمراہ وہی زخمی شخص بھی اسی کا قدرے سہارا لیے کھڑا ایک ٹک یہ سب دیکھ رہا تھا جسے میں نے اسی مکان سے کچھ دیر پہلے گرتے پڑتے باہر نکلتے دیکھا تھا۔ وہ زیادہ زخمی نہ تھا۔

لڑکی کے دوسرے ہاتھ میں ہنوز وہی پستول دبا ہوا تھا جو اس نے مجھ پر تانا تھا۔ میں ان دونوں اجنبیوں کو صرفِ نظر کرتا ہوا میوخ کی طرف بڑھا۔ اس کے جسم میں دائیں جانب پہلو کے مقام سے خون بہے جا رہا تھا۔

صوبی خون روکنے کے اپنے سے جتن میں مصروف ہوگئی۔ وہ مجھے شوہر سے زیادہ ہمت والی محسوس ہوئی۔ جلتی ہوئی لکڑی اس نے دوبارہ آتش دان میں پھینک دی۔ میوخ

کے چہرے پر جاں کنی کے آثار تھے۔ اس دوران اجنبی لڑکی نے اس درمیانی عمر کے آدمی کو سہارا دے کر ایک کرسی پر بٹھا دیا اور پستول اپنے لباس میں اڑس لیا۔ اس کے بعد وہ بھی فرش پر پڑے زخمی میوخ کی جانب بڑھی اور اس نے کہا۔

''میں نرس ہوں۔ تمہاری مدد کرسکتی ہوں۔ گھر میں فرسٹ ایڈ موجود ہے؟'' اس نے یہ بات صوبی سے کہی تھی اور پھر میری طرف بھی دیکھا تھا۔ اس کی خوب صورت سی نشیلی آنکھوں میں میرے لیے توصیف تھی۔ صوبی اس سے باتیں کرنے لگی۔

دونوں میوخ کی زندگی بچانے کے لیے جت گئیں۔

میں نے ایک نظر کرسی پر بیٹھے شخص پر ڈالی پھر شینا کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے چہرے پر بھی مجھے خراشیں نظر آئیں۔ شاید اس مردود جیکی نے اس پر بھی تشدد کیا تھا۔ وہ زندہ تھی مگر بے ہوش۔ میں اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ کراہتے ہوئے جیسے جاگی اور مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے منع کر دیا۔

''تم کیسی ہو شینا؟''

''وہ...... وہ درندہ......؟'' اس کے کپکپاتے ہوئے لبوں سے اتنا ہی برآمد ہوا اور تب ہی اس نے ذرا گردن اُچکا کر قریب پڑی جیکی کی لاش کو دیکھا تو بے اختیار اس نے سکون کی سانس لی۔

اگلے ایک آدھ گھنٹے میں اس برف زار میں بنے چھوٹے سے گھر میں قدرے امن اور سکون نظر آنے لگا۔ میوخ کی حالت قدرے سنبھل گئی تھی۔ اسے بھی شینا کے قریب اور آتش دان کے پاس گرم لحاف اور بستر بنا کر لٹا دیا گیا تھا۔ وہ گوری لڑکی بدستور صوبی کی مدد کر رہی تھی۔ میں اس آدمی سے باتیں کرنے کے لیے اس کے قریب ایک اسٹول جیسی شے پر بیٹھ گیا۔

''تم نے ایک بہت خطرناک اور سفاک آدمی کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا کر ہم سب پر احسان کیا ہے نوجوان!'' اس شخص نے توصیفی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا میں اس بہادر نوجوان کا نام پوچھ سکتا ہوں؟''

میں نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ وہ درمیانی عمر اور خوب گٹھی ہوئی جسامت کا آدمی تھا۔ رنگت اس کی گوروں جیسی ہی تھی۔ کندھے چوڑے اور سر گول تھا۔ اس اثنا میں وہ گوری لڑکی بھی قریب آگئی۔ اس کے ہاتھ میں مرہم پٹی کا تھوڑا بہت سامان اور ایک گرم پانی کا برتن تھا۔ اس نے مسکراتی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور پھر جسے اس نے ''باس'' کہہ کر پہلے پکارا تھا، اس کی مرہم پٹی میں مصروف ہوگئی۔

میں نے اس شخص کی طرف دیکھ کر سوال کے انداز میں جواب دیا۔ ''میں تو سمجھ رہا تھا کہ اب تک تم دونوں میرے بارے میں اندازہ لگا ہی چکے ہوگے۔'' کہتے ہوئے میں نے اس خوبصورت سی گوری لڑکی کی طرف بھی دیکھا تھا۔

وہ دونوں ہی میری بات پر مسکرائے اور اس شخص کے بجائے لڑکی نے غالباً مجھے سنانے ہی کے لیے اپنے ''باس'' سے کہا (کیونکہ میں نے اسے تھوڑی دیر پہلے ''باس'' کہتے ہی سنا تھا اور کچھ حیران بھی ہوا تھا۔ تاہم پھر مجھے ان کے بارے میں کافی حد تک ادراک ہو چلا تھا)۔

''باس! کہیں یہ شیان تو نہیں؟''

''ہم...... میرا بھی یہی خیال ہے۔'' باس نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ اس کی نظریں بدستور مجھ پر ہی جمی رہیں۔

''میں شیان ہوں اور تم شاید البرٹ رمنڈ ہو اور یہ تمہاری ساتھی؟'' میں نے بھی کہہ ڈالا۔

''اچھی بات ہے، وقت کا زیاں کیے بغیر ہم نے ایک دوسرے سے سچ ہی کہہ ڈالا۔'' البرٹ دوستانہ لہجے میں مجھ سے بولا۔ اس کے بعد میں نے اور پھر انہوں نے وہ سب کچھ ایک دوسرے سے شیئر کر ڈالا جس کے بارے میں مجھے لارا اور جیکی کے نرغے میں رہتے ہوئے اور انہیں ہیلی کاپٹر میں یہاں کا رخ کرتے ہوئے معلوم ہی تھا۔

البتہ بعد کے حالات کا بھی ہم سب کو ادراک ہو ہی چکا تھا یعنی جیکی تنظیم (صحرائی عقاب) کو ہائی جیک کرنے کی بدبختی میں مبتلا ہو گیا تھا جب اسے معلوم ہوا کہ باس کا ہیلی کاپٹر کریش ہو چکا ہے۔ لارا نے تو اس کا ساتھ دیا نہ دیا البتہ جیڈ ضرور اس کے ساتھ مل گیا اور وہ یہ کنفرم کرنے کے لیے کہ آیا ہیلی کاپٹر کے کریش ہونے کے بعد باس زندہ بچا ہے یا نہیں۔ پھر جب وہ دونوں وہاں پہنچے تو پائلٹ اس حادثے میں مر چکا تھا جبکہ خوش قسمتی سے البرٹ رمنڈ معمولی زخمی ہونے کے بعد زندہ بچ گیا تھا۔ وہ ہیلی کاپٹر میں صرف پائلٹ کے ساتھ نہ تھا بلکہ اس کی جرمن محبوبہ میگی بھی اس کے ہمراہ تھی۔ خوش قسمتی سے اسے ایک خراش تک نہ آئی تھی۔

جیکی نے جب دیکھا کہ باس تو زندہ بچ گیا ہے، اس نے اسے ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ البرٹ اسے دیکھ کر خوش ہو گیا تھا کہ اس کی تنظیم کا ایک ساتھی اسے بچانے کے لیے آگیا ہے لیکن جب اس نے جیکی کو گن سیدھی کرتے دیکھا تو سن ہو کر رہ گیا۔ وہ بے بس تھا مگر میگی جو اپنے پاس

ہر وقت ایک ”ٹوٹو“ لیڈیز پسٹل رکھتی تھی (آخر کو ایک گینگسٹر کی محبوبہ تھی) اس نے جیکی پر گولی چلادی جو اس کے پستول والے ہاتھ پر لگی۔ پستول برف میں گر کر گم ہو گیا۔ میگی نے دوسرا فائر کیا مگر جیکی نہتا ہونے کے بعد بھاگا۔ میگی نے اس کا پیچھا کرنا چاہا مگر البرٹ نے روک دیا اور دونوں وہاں سے نکلے۔

لارا سے بھی ان کا ٹکراؤ ہوا لیکن میگی ہی نہیں، البرٹ بھی ان کی بدنیتی سمجھ چکا تھا۔ بہرکیف، جیکی ان کے تعاقب میں لگا رہا اور وہ کسی طرح اس مکان تک پہنچ گئے۔ جیکی بھی وہاں آن پہنچا۔ میگی باہر تھی۔ البرٹ اندر جا چکا تھا۔ میگی جانتی تھی کہ جیکی بھی اندر ہے اور وہ باس کو (اپنے محبوب کو) بچانے کی کوئی تدبیر کر رہی تھی کہ میرا اس سے سامنا ہو گیا۔

اندر جیکی اور البرٹ کے درمیان ”زور آوری“ ہوئی۔ البرٹ رمنڈو زخمی اور جیکی کے مقابلے میں کم تگڑا تھا۔ جیکی اس پر حاوی ہونے لگا۔ وہاں سے پستول ملا۔ اس دوران اس نے بوسو رگا مجسمے کے معاملے میں انتقاماً میوخ کو نشانہ بنایا اور شینا کو بھی زدوکوب کیا۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر البرٹ مکان سے بھاگ نکلا۔ باقی صورتِ حال سامنے تھی۔

☆☆☆

بظاہر اب یہ سب دوستانہ ماحول نظر آرہا تھا لیکن اس کی تہ میں دشمنی کی چنگاری دبی ہوئی تھی۔ جب تک میری ”اصلیت“ البرٹ رمنڈو، میگی اور حتیٰ کہ شینا سے بھی چھپی ہوئی تھی تب تک سب کچھ ٹھیک تھا لیکن میں جانتا تھا کہ جیسے ہی میری حقیقت ان سب پر آشکار ہوگی تب یہ سارا ”دوستانہ“ اور ”یارانہ“ پل کے پل میں ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ میں تب تک اپنی اصلیت چھپانے پر مجبور تھا جب تک اپنا مقصد نہ پالیتا۔

بہرحال ایک طوفان تھا جو ٹل چکا تھا۔ لارا، جیڈ، نرڈی اور جیکی کا شر پسند ٹولا واصلِ جہنم ہو چکا تھا۔ ان سب کی قبریں برف میں از خود بن چکی تھیں۔ شینا کی حالت تو کافی بہتر ہو چلی تھی لیکن میگی کے مطابق میوخ کو ہاسپٹلائز کرانا ضروری تھا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا وہ ایک نرس بھی تھی۔ اس نے کسی زمانے میں البرٹ کی دل سے تیمارداری کی تھی اور البرٹ نے متاثر ہو کر اسے اپنے گینگ میں شامل کر لیا تھا۔

صوبی نے بتایا کہ شہر میں اسپتال موجود ہے جو یہاں سے زیادہ دور نہیں لیکن اس کے لیے چھکڑے کا ہونا ضروری تھا۔ البرٹ اور میگی نے مجھے اگرچہ اشاروں کنایوں میں یہاں سے شینا سمیت چلنے کو کہا تھا مگر میں نے ان کی خود غرضی پر انتہائی ناگواری سے کہہ دیا تھا کہ یہ میرے محسن ہیں۔ میں انہیں اس حال میں چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتا تو انہوں نے کھلے دل سے معذرت کر لی اور پھر میگی اور میں نے ٹوٹے ہوئے لکڑی کے تختے کا اسٹریچر سا بنایا۔ اس کے نیچے ”اسکیٹ“ ٹائپ کی دو پٹیاں لگا دیں تاکہ برف میں پھسلنے میں آسانی ہو اور پھر اسے ان کے پالتو خچر کے ساتھ باندھ دیا۔ اس پر زخمی میوخ کو لٹا دیا گیا پھر میگی اور میں نے خچر کو پیدل ہی شہر لے جانے کا ارادہ باندھا تو صوبی نے اصرار کیا کہ وہ بھی ساتھ چلے گی۔

”تمہارے دو بچے چھوٹے ہیں۔ انہیں تمہاری ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارا یہاں رہنا ضروری ہے۔“

مگر وہ بضد رہی اور بولی۔ ”میں دونوں بچوں کو بھی اپنے ساتھ لے چلوں گی۔ جب تک میرا شوہر ٹھیک نہیں ہو جاتا، میں بچوں کے ساتھ وہیں تسانگ پو کے اسپتال میں ہی رہوں گی۔“

”یہ تم بالکل غلط کرو گی۔“ اس بار میگی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”تمہارے بچے چھوٹے ہیں۔ انہیں سخت سردی میں اپنے ساتھ کہاں کہاں خوار کرو گی۔ ہم پر بھروسا رکھو۔ اب سارے خطرات ٹل چکے ہیں۔ ہم تمہارے دوست ہیں، تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔“

”ہاں، صوبی!“ میں نے بھی اس سے کہا۔ ”اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ تم ادھر ہی رہو اور بے فکر رہو۔ مجھ پر تو کم از کم بھروسا رکھو جو تمہارا اور تمہارے شوہر کے احسان کا مقروض ہے۔ جو ابھی تک تمہارے ساتھ ہے۔ جب تک میوخ ٹھیک نہیں ہو جاتا، میں یہاں سے ہلوں گا بھی نہیں۔ اسپتال جانے کے بعد میوخ کی حالت یقیناً سدھر جائے گی۔ میرا وعدہ ہے، میں شہر میں کسی سواری کا بندوبست کر کے تمہیں بھی شوہر سے ملوا دوں گا مگر آج صبر کر لو۔“ میری یہ بات صوبی کی سمجھ میں آگئی۔

میگی نے خچر کی لگام سنبھالی اور میں نے اسٹریچر سنبھالا۔ سفر پیدل برف میں شروع ہوا۔ ہمیں شہر تسانگ پو پہنچنے میں پون گھنٹا صرف ہوا۔ وہاں شکر رہا کہ میوخ کی حالتِ زار دیکھ کر اسے داخل کر لیا گیا اور علاج بھی شروع ہو گیا۔

دن کا وقت تھا۔ ہم نے اسپتال انتظامیہ سے کہہ دیا تھا کہ ہمیں یہ شخص راستے میں زخمی پڑا ملا تھا اور اب ہم اس کے گھر والوں کو مطلع کرنے جا رہے ہیں جنہیں ہم جانتے ہیں..... وغیرہ۔ اس پر اگرچہ انتظامیہ کے لوگوں نے کچھ

تشکیک بھری نظروں سے ہمیں گھورا تھا مگر کچھ کہہ نہ سکے۔ باہر آئے تو میگی بولی۔ ''مسٹر شیان! ہمیں دوبارہ یہاں نہیں آنا چاہیے۔''

''وہ کیوں؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ گرم اونی ٹوپی میں اس کا دلکش چہرہ کچھ متفکر نظر آرہا تھا۔

''تم نے دیکھا نہیں یہ ہمیں شک والی نظروں سے گھور رہے تھے۔ اگر انہوں نے پولیس وغیرہ کو ہمارے بارے میں کچھ الٹا سیدھا بتادیا تو کوئی نیا مسئلہ نہ کھڑا ہوجائے۔''

''کیا یہاں غیر ملکی سیاح نہیں آتے جاتے ہوں گے؟'' میں نے کہا۔

''آتے ہوں گے لیکن ہمارا معاملہ اور ہے۔ ہم غیر قانونی طور پر یہاں موجود ہیں۔''

''میری حد تک تو بات درست ہے مگر تم اور البرٹ؟'' کہتے ہوئے میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔

''ہمارے پاس کاغذات ہیں لیکن میں تمہاری بات کر رہی تھی۔''

''تو پھر تم اپنی فکر کرو۔'' میں نے رکھائی سے کہا۔ درحقیقت میں خود ان سے پیچھا چھڑانے کے چکروں میں تھا۔ اب میرا ان سے کوئی لینا دینا نہیں تھا بلکہ پہلے بھی ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ تو جیکی اور لارا خود ہی ہمارے گلے آن پڑے تھے۔

''کیا مطلب ہے مسٹر شیان؟'' وہ ایک تیز سی نگاہوں سے مجھے گھور کر بولی۔ ''کیا تمہاری مجسمے کے معاملے میں ہم سے ڈیل نہیں ہوئی؟''

''مجسمہ غرقاب ہو چکا ہے۔ ہم اسے تلاش نہیں کرسکتے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں مسکت جواب دیا۔

''مگر تم نے ہماری مدد کرنا ہے۔'' وہ ایک دم بولی۔ ''تم جانتے ہو کہ وہ دریا کے کس مقام پر غرق ہوا۔ ہم سب نے اسے تہ سے نکالنے کا تہیہ کررکھا ہے۔''

''میں اب مجسمے والے معاملے سے بیزار بلکہ مایوس ہوگیا ہوں۔'' میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ میں جانتا تھا کہ اب وہ ایسی طاقت میں نہ تھے کہ مجھ سے دشمنی کا خطرہ مول لینے کی کوشش کرتے۔ میری طرح وہ بھی نہتے تھے اور مجبور بھی۔

ان کا وہ ٹولا جو ان کا ساتھ دے سکتا تھا، غداری میں مارا گیا تھا۔ کوئی لاسلکی رابطے کا خفیہ ذریعہ بھی ان کے پاس نہ بچا تھا جس سے وہ اپنے گروہ کے دیگر ساتھیوں سے کسی قسم کی مدد بھی لیتے۔ سردست تو چند دنوں کے لیے بالکل بھی نہیں۔

''مگر ہم بیزار نہیں ہوئے مسٹر شیان!'' میگی یک دم تنک کر بولی۔ ''ہم اسے تلاش کرکے رہیں گے اور تم نے معاہدے کے مطابق ہمارا ساتھ دینا ہے ورنہ ہم یہی سمجھیں گے کہ تم بھی کسی بدنیتی میں مبتلا ہورہے ہو۔''

''تم اور تمہارا باس البرٹ رمنڈو بھاڑ میں جائے۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔'' کہتے ہوئے میں چل دیا۔ وہ غصے میں برف پر پاؤں پٹختی ہوئی میرے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

مکان تک اس کی بک بک، جھک جھک چلتی رہی۔ گھر پہنچ کر وہ البرٹ سے سرگوشیاں کرنے لگی اور میں پریشان حال صوفی کو تسلی دینے لگا کہ اس کے شوہر کو ہم نے اسپتال داخل کرادیا ہے لہٰذا اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں، وغیرہ۔

وہ جانے پر پھر ضد کرنے لگی۔ خچر ہم ساتھ لے آئے تھے۔ میں نے میگی کو اس کے ساتھ جانے کے لیے پابند کیا تو اس نے انکار کردیا۔

''میں تھک چکی ہوں۔ اتنا پیدل تو میں آج تک نہیں چلی۔ یہ خود ہی خچر پر سوار ہوکر چلی جائے گی یا پھر تم اس کے ساتھ چلے جاؤ۔'' میری دیکھا دیکھی وہ بھی رکھائی پر اتر آئی۔ اپنے محبوب نما باس سے وہ بھی پہلے ہی میرے سلسلے میں ''بات'' کرچکی تھی اسی لیے وہ بھی مجھے کچھ ناگوار سی نظروں سے گھورنے لگا تھا۔

بات وہی تھی جس کا مجھے خدشہ تھا۔ یہاں معاملات دوستانہ نہیں بلکہ غرض وغایت کے تھے۔ یہی میں چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''چلو پھر تم دونوں یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ اور اس مکان سے مجھے تم دونوں سو فٹ کے فاصلے پر بھی نظر آئے تو میں تم دونوں کا بھی وہی حشر کروں گا جو میں تمہارے باقی چار ساتھیوں کا کرچکا ہوں۔''

''مسٹر شیان!'' البرٹ رمنڈو ایک دم اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اگر تم مجسمے کو اکیلے ہی ہڑپ کرنے کے بارے میں سوچ چکے ہو تو کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ میں کسی بھی وقت یہاں چار سے زائد ساتھی بلوا سکتا ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ راہِ راست پر آجاؤ اور مجھے کسی سختی پر مجبور مت کرو۔''

اچھا......!'' میں اس کی طرف مڑ کر دونوں ہاتھ اپنے پہلوؤں پر رکھتے ہوئے اس سے طنزیہ بولا۔ ''تو پھر تم بھی کسی خوش فہمی میں مت رہو۔ جس طرح میں نے تمہارے ان چار ساتھیوں کا حشر کیا ہے، وہ میں سب کا کرسکتا ہوں۔''

میرے ترکی بہ ترکی جواب پر البرٹ رمنڈو اور میگی

خون کے گھونٹ بھر کر رہ گئے۔ صوبی بے چاری بھی پریشان ہوگئی۔ شینا البتہ مجسمے کے ذکر پر چونک پڑی۔

"یہ لوگ کون ہوتے ہیں مجسمے کے بارے میں بولنے والے؟ شیان! کیا تم نے پہلے سے ان سے کوئی معاملہ داری کر رکھی تھی؟" شینا کی بات پر میں فکر مند سا ہوا اور بولا۔

"یہ لمبی کہانی ہے ڈیئر! بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے انہیں یہاں سے رخصت کر دوں۔" پھر میں ان دونوں کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔

"تم دونوں نے سنا نہیں...... یا میں دھکے دینے پر مجبور ہو جاؤں؟"

"تمہارا یہ ساتھی تم سے بھی غداری کر رہا ہے مس!" میگی مکاری پر اتر آئی۔ اس نے شینا کو مجھ سے بدظن کرنے کی کوشش کی۔ میرا جی چاہا اس کے ایک تھپڑ جڑ دوں لیکن میں نے ضبط سے کام لیا اور ان دونوں کو باہر کا راستہ دکھا دیا۔ دونوں مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتے ہوئے مکان سے نکل گئے۔

صوبی کو میں نے تسلی اور صبر کی تلقین کی۔ شینا نے بھی عقل مندی کا ثبوت دیا اور منتظر رہی کہ میں کیا کہتا ہوں۔

تب میں نے اسے شروع سے اب تک سب سچ بتا دیا کہ درحقیقت یہ راموہی کی غداری تھی جو ایک خطیر رقم کے لالچ میں ان سے خفیہ گٹھ جوڑ کر چکا تھا۔ میں نے اس میں راجن کو بھی شامل کر دیا حالانکہ اسی نے راموکی غداری پکڑی تھی۔ بہرکیف، میرا مقصد شینا کی اپنی طرف سے تسلی کرنا تھا، سو میں کر چکا۔ وہ مطمئن ہوگئی تاہم بولی۔

"اب دونوں کا کیا کرو گے؟"

میں جانتا تھا کہ شینا مجسمے کے بغیر اپنی منزل کا رخ کبھی نہیں کرے گی اور میری منزل بھی وہی تھی اسی لیے میں نے کہا۔

"انہیں دور جانے دو۔ ہم آج شام میں دریا کے اس مقام پر جا کر وہ مجسمہ تلاشنے کی کوشش کریں گے۔" میری بات پر شینا کا چہرہ جنگلی گلاب کی طرح کھل اٹھا۔

"لیکن تمہاری حالت؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" شینا نے کہتے ہوئے جوش میں اٹھنے کی کوشش کی مگر ایک زوردار کراہ اس کے منہ سے خارج ہوگئی۔ صوبی پریشان ہوگئی اور میں اسے سنبھالنے کو لپکا۔

"لیٹی رہو۔ تمہاری حالت ایسی نہیں کہ ہم کسی مشکل اور پُرخطر مہم پر نکل سکیں۔"

"لیکن وہ دونوں...... وہ ہمارے لیے پریشانی اور خطرہ کھڑا کر سکتے ہیں۔" شینا متفکر ہو کر بولی۔

"ان کی فکر مت کرو۔ میں انہیں سنبھال لوں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن میرا انہیں خیال کہ یہ لوگ اب زور زبردستی سے کام لیں گے۔"

"لیکن ہمارا یہاں زیادہ دیر رہنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ ہمیں نکلنا ہے اپنی منزل کی طرف، جلد از جلد۔" اس کی بات غلط نہ تھی۔

میں نے کہا۔ "تم تسلی رکھو۔ یہ مہم میں خود اکیلے انجام دوں گا۔"

"کیا؟" اس پرکشش جنگلی حسینہ کی گہری غزال آنکھوں میں امڈتی حیرت مجھے بھلی لگی۔

میں نے کہا۔ "ہاں، یہ کوئی مشکل کام تو نہیں۔ اس کے بعد میں کسی کشتی کا بندوبست کروں گا۔" شینا مجھے ستائشی اور محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی لیکن اگلے ہی لمحے اس کے حسین چہرے پر اداسی کی برفیلی شام اتر آئی۔ وہ اسی لہجے میں بولی۔

"تم یہ سب اکیلے انجام دو گے؟ کاش، میری حالت ایسی نہ ہوتی۔ تمہیں وقت لگ سکتا ہے شیان!"

"کتنا وقت لگ جائے گا؟ ایک دن، دو دن۔ کر لوں گا میں۔" اب اسے کیا معلوم تھا کہ میں نے اس سے بھی یہ جھوٹ بولا تھا کہ مجسمہ دریا برد ہو چکا ہے جبکہ وہ میں نے اسی دریا کے کنارے پر چھپا رکھا تھا۔ ہاں، کسی کشتی کا بندوبست لازمی تھا۔

صوبی اپنے شوہر کے پاس اسپتال جانے کے لیے بے چین تھی۔ میں ان حالات میں شینا کو مکان میں تنہا چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے لیے صوبی کا موجود ہونا ضروری تھا۔ صوبی میری پریشانی بھانپ گئی اور بولی کہ وہ خود بھی اپنے پالتو خچر پر سوار ہو کر جا سکتی ہے۔ یعنی دونوں بچوں کو وہ خچر پر سوار کر دے گی اور خود پیدل اس کی رسی تھامے شہر جا پہنچے گی۔

ناچار میں نے اسے اجازت دے دی۔ جاتے ہوئے وہ ایک دکھ بھری خبر بھی مجھے سنا گئی کہ اب وہ کبھی بھی مکان میں نہیں لوٹے گی۔ شوہر کی صحت یابی کے بعد وہ شہر میں ہی اپنا دوسرا ٹھکانا بنانے کی کوشش کریں گے۔ تب تک وہ اپنے ایک عزیز رشتے دار کے ہاں رہ لیں گے۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور افسوس کا اظہار بھی کہ اسے یہ سب میری وجہ سے بھگتنا پڑا۔ اس نے کوئی جواب نہ

دیا۔ دونوں بچوں کو خچر پر سوار کیا، رسی تھامی، ایک اداس اور رنجیدہ سی نگاہ اپنے گھر پر ڈالی اور اس کے بعد روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

زندگی ہر طرح سے امتحان لیتی ہے۔ کبھی خوشی دے کر تو کبھی دکھ دے کر۔ بعض دکھ عجیب ہوتے ہیں۔ اپنی کسک چھوڑ جاتے ہیں۔ صوبی اور میوخ کا اپنے دونوں بچوں سمیت اس مکان کو چھوڑ جانا یقیناً ان کے لیے تکلیف دہ فیصلہ ہوسکتا تھا مگر ان کا اب اس مکان سے دل خراب ہو چکا تھا۔

مکان میں اب شینا اور میں رہ گئے۔ میں کشتی کا بندوبست کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شینا کو جلد لوٹنے کا کہہ کر اور دروازے کو اندر سے اچھی طرح بند کرنے کی ہدایت دینے کے بعد میں باہر نکل آیا۔ سہ پہر کا وقت ہو چلا تھا۔ میں نے شینا سے یہی کہا تھا کہ میں مجسمے کی تلاش میں جا رہا ہوں لیکن درحقیقت میں کشتی کا بندوبست کرنے کے لیے نکلا تھا۔

شہر پہنچ کر میں نے اِدھر اُدھر سے دخانی کشتی کے سلسلے میں بات کی۔ یہ وہی لوگ تھے جو دریا کنارے آباد تھے۔ تسانگ پو میں کھاڑی نما مجھے ایک چھوٹی بندرگاہ نظر آئی تھی۔ میں ایک آدمی سے بھاؤ تاؤ کرنے لگا۔ شینا نے مجھے سونے کے سکوں کی صورت میں کچھ رقم دی تھی۔ اس کے پاس یہی کچھ تھا۔ روپے پیسے نہیں رہے تھے۔ وہ اس کے ساتھی گردواس کے پاس تھے۔ انڈین سمیت اس کے پاس نیپالی روپیز اور چینی ین بھی تھے۔ میں نے سونے کے ان سات سکوں کی قیمت کا اندازے سے تعین کرلیا تھا جو قریب قریب درست ہی تھا۔ سونا تو تھی ہی ایسی کرنسی کہ ہر خطے، ہر جگہ اور ہر قوم میں "چالو" سمجھی جاتی تھی۔

ایک بوڑھے آدمی سے بات چیت ہوئی۔ پتا لگا کہ یہاں زیادہ تر کشتیاں کرائے پر ہی ملتی ہیں، خریدی نہیں جاسکتیں۔ مجھے پریشانی ہوئی۔ کرائے پر کشتی لینے کا مقصد تھا کہ "بوٹ مین" کو بھی اپنے مجسمے والے راز میں شریک کار کرتے۔ مجسمے والی بات چھپا بھی لیتے تو تب بھی نہ جانے وہ بھارت اور پھر بنگلا دیش تک جانے کے لیے تیار بھی ہوتا کہ نہیں۔ جس کا امکان کم ہی تھا۔ اسی لیے میں نے زیادہ زور اسی بات پر ہی رکھا کہ دخانی انجن والی کشتی خرید ہی لوں۔

پوچھتے پاچھتے بالآخر کسی نے مجھے بتایا کہ اگر میں تسانگ پو کے شمال مشرق میں واقع ایک دس کلومیٹر دور قصبے چی چا کی جا کر کوشش کروں تو مجھے وہاں کشتی رقم کے عوض مل سکتی ہے کیونکہ اس طرف مچھیروں کی آبادی تھی اور وہاں کاریگر بھی تھے جو نہ صرف کشتیوں کی مرمت کرتے تھے بلکہ نئی کشتیاں بھی تیار کیا کرتے تھے۔

میں نے فوراً ایک خچر چھکڑے پر قصبہ چی چا کی کا رخ کیا۔ وہاں مجھے کامیابی ہوئی۔ تین سکوں کے عوض ایک چھوٹی مگر آرام دہ دخانی انجن والی کشتی مل گئی۔ وہاں سے ایک چوڑے پاٹ والی نہر بہہ رہی تھی۔ مجھے اندازہ لگانے میں چنداں دیر نہ لگی کہ اس نہر کا لنک اسی پہاڑی نالے سے تھا جدھر ہماری کشتی غرق ہوئی تھی اور اسی کے کنارے ہی میں نے جڑواں تنے والے درخت اور لانبی لانبی جنگلی جھاڑیوں کے درمیان بوہورگا کا منحوس مجسمہ چھپایا تھا۔

کچھ سوچ کر میں نے کشتی میں سوار ہو کر اسی طرف کا رخ کر ڈالا۔ کچھ دیر میں، میں مطلوبہ مقام پر پہنچ چکا تھا۔ کشتی کھے کر میں نے کنارے سے ایک اگے ہوئے درخت سے باندھ دی اور اس مقام کو تلاشنے لگا جہاں وہ مجسمہ چھپایا تھا۔

دفعتاً ہی مجھے احساس ہوا کہ کوئی میرے کہیں آس پاس موجود اور میری حرکات و سکنات پر نظر بھی رکھے ہوئے ہے۔ میں نے اسے جل دینے کا ارادہ کیا۔ مجھے شبہ تھا کہ یہ حرکت البرٹ اور اس کی محبوبہ میگی کی بھی ہوسکتی ہے۔ میں بظاہر اپنی دھن میں مست ادھر اُدھر مٹرگشت کرتا ہوا لپک کر ایک درخت کی آڑ میں جا چھپا۔

سہ پہر سے اب شام ہونے لگی۔ ہر سو اندھیرا چھانے لگا۔ میری پنڈلی میں قرولی اڑسی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اور کوئی آتشیں ہتھیار میرے پاس نہ تھا۔ میرا عزم و حوصلہ میرے پاس تھا اور سب سے بڑا ہتھیار میرا دماغ میرے ساتھ تھا۔ اللہ کی مدد تو بہرحال میرے ساتھ شاملِ حال رہتی ہی تھی۔

میں نے محتاط اور بے آواز رہتے ہوئے اس طرف تاریکی میں دیکھا۔ کھلے آسمان پر نکلے تاروں کی مدھم روشنی میں صرف چند فٹ کے فاصلے پر نظر آتا۔ مقدور بھر میں جہاں تک دیکھ سکتا تھا، میں دیکھتا رہا۔ وہی ہوا۔ قریب میں ایک آہٹ ابھری۔ یوں جیسے کوئی دبے پاؤں اور محتاط روی سے چل رہا ہو۔ ایک ہیولا نمودار ہوا پھر دوسرا۔ انہوں نے گرم ٹاپ پہن رکھے تھے جس سے ان کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ وہ دو تھے۔ قد و قامت سے مجھے وہ البرٹ اور میگی ہی لگے۔ ان کا انداز تعاقب کرنے والا تھا۔

ہیلی کاپٹر کے کریش ہونے کے بعد ان کے پاس صرف ایک ہی پسٹل تھا۔ وہ بھی میگی کے پاس...... باقی البرٹ کے پاس میں نے کوئی ہتھیار نہیں دیکھا تھا۔ یہ دونوں مجھ پر حملہ کرنے یا مجھ سے مقابلہ کرنے کی پوزیشن

میں تو ہرگز نہیں تھے۔ البتہ میرا تعاقب کر کے یہ لوگ مجسمے تک پہنچنے کی کوشش ضرور کرتے۔

میں بھی دفاعی حد تک ان سے مقابلہ کرنے کی پوری پوزیشن میں تھا۔ ان کی چال یہی تھی کہ یہ میری ''ریکی'' کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ ان کی چال اپنی جگہ کامیاب جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ یہ میرا تعاقب کرتے ہوئے آچکے تھے۔ اگر میں محتاط نہ رہتا اور مجسمہ نکال کر کشتی میں لاد دیتا تو حالات کچھ اور ہوتے۔

ابھی تو انہیں یہ معلوم ہی نہ تھا کہ میں نے بوہیورگا کا مجسمہ کس جگہ چھپا رکھا ہے۔ مجھے بہرحال گھات مل گئی تھی اور مات ملنے کی باری ان کی تھی۔ میں ان پر ہلا بولنے کی ضرورت کو محسوس نہ کرتے ہوئے فقط ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ ادھر اُدھر مجھے تلاشتے رہے۔ ایک جگہ ٹھہر کر انہوں نے آپس میں باتیں بھی کیں۔ وہ دونوں بلاشبہ البرٹ اور میگی ہی تھے۔

وہ پورے گھنٹے بھر تک ارد گرد مٹرگشت کرتے رہے۔ میں ان کے پیچھے۔ اب معاملہ الٹ ہو گیا۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہے تھے اور میں ان پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ وہ کشتی کے قریب بھی گئے۔ مجھے ڈر لگا کہیں یہ لوگ اسی میں گھات لگائے نہ بیٹھ جائیں۔ اگر تو یہ دونوں ابتدا سے ہی میرے تعاقب میں تھے تو یقیناً انہیں پتا ہوگا کہ یہ کشتی میری ہی تھی اور یقیناً ایسا ہی تھا۔ ذرا دیر بعد وہ اندر سے نکلے اور پھر ایک جگہ گھات لگا کر بیٹھ گئے۔

میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی۔ میں ان کی چالاکی سمجھ گیا۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ میں کہیں بھی تھا، اپنی کشتی کی طرف ہی لوٹ کر آؤں گا۔ میں نے مجسمے کو نکالنے کا ارادہ ترک کر دیا اور انجان بن کر گھات سے نکلا۔ میں اپنی کشتی کی طرف بڑھا اور واپسی کی طرف گامزن ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے خالی ہاتھ واپس جاتا دیکھ کر وہ بھی کنارے کنارے چلے آرہے ہوں گے۔ میں نے کشتی کھاڑی پر دیگر کشتیوں کے ساتھ لنگر انداز کر دی اور اتر آیا۔

میں مکان میں آگیا اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ شینا غائب تھی۔ میرا خیال فوراً البرٹ اور میگی کی طرف چلا گیا۔ چونکہ انہیں بھی معلوم ہو چکا تھا کہ شینا میری ساتھی ہے اور مجسمے کے بارے میں جانتی ہوگی۔ میرے جانے کے بعد انہوں نے اسے یرغمال بنا لیا اور پھر میرے تعاقب میں نکلے ہوں گے۔

یہ دو کام بیک وقت انہوں نے انجام دیے ہوں گے۔ جب تک میں کھاڑی پر کشتی کے حصول کے لیے بات کر رہا تھا، ان میں سے ایک نے شینا کو یہاں سے اغوا کرنے کی ''ذمے داری'' لی ہوگی۔ دوسرے نے میرا کھاڑی تک تعاقب کیا ہوگا۔ بعد میں دونوں مل گئے ہوں گے۔ شینا تو بے چاری پہلے ہی زخمی حالت میں تھی۔ اس نے اغوا ہوتے وقت بھلا کیا مزاحمت کی ہوگی؟ مطلب صاف تھا کہ جس وقت البرٹ اور میگی کو میں نے مکان سے بے دخل ہونے کا کہا، وہ نکل تو گئے لیکن حقیقت میں وہ پوری طرح وہاں سے ٹلے نہیں تھے۔ گھات لگا کر کہیں قریب ہی چھپ گئے ہوں گے اور بعد میں یہ گل کھلایا۔

ان کی حرکت پر میرا دماغ غصے سے بھر گیا۔ میں ان دونوں سے جھگڑنے کے موڈ میں نہ تھا لیکن اب انہیں شینا کے اغوا کی سزا دینا ضروری ہو گیا تھا۔ میں مکان سے باہر آگیا۔ تاروں کی مدھم روشنی میں برف پر نشان ثبت تھے۔ وہ تازہ تھے۔ میں ان کی راہنمائی میں محتاط انداز سے آگے بڑھتا رہا۔

البرٹ اور میگی اس وقت بے سروسامانی کی حالت میں تھے۔ مجھے ادراک تھا کہ وہ شینا کو زیادہ دور نہیں لے جا پائیں ہوں گے۔ میرا اندازہ جلد ہی درست ثابت ہوا۔ مجھے ایک سنسان سی جگہ پر ٹوٹے ہوئے لکڑی کے شکاری کیبن کے اندر روشنی جلتی نظر آئی۔ کیبن چھوٹا تھا۔ میں محتاط انداز سے اندر داخل ہوا تو شینا ایک کونے میں ایسی حالت میں پڑی نظر آئی کہ اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ قریب چھوٹا سا آتش دان روشن تھا۔ وہ ہوش میں تھی۔ میں لپک کر اس کی جانب بڑھا۔

البرٹ اور میگی کے سان و گمان میں بھی نہ ہو سکتا تھا کہ الٹا میں ان کے تعاقب میں رہتے ہوئے ان کی چال سمجھ اور ''دیکھ'' چکا تھا۔ مجھے دیکھ کر شینا کے چہرے سے ساری مردنی کافور ہو گئی۔ وہ کراہی۔ میں لپک کر اس کی جانب بڑھا اور اس کے ہاتھ پاؤں کھولے۔

''وہ...... وہ...... دونوں مجھے......'' اس نے بتانا چاہا مگر میں نے اس کے ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھ دی کیونکہ اسی وقت مجھے باہر آہٹ سنائی دی تھی۔ میں اسے تسلی دے کر پھرتی سے اٹھا اور اپنی قرولی نکال کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ میں دروازے کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔

دونوں باتیں کرتے ہوئے اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں نے شیر کی طرح پہلے میگی پر جھپٹا مارا کیونکہ میرے اندازے کے مطابق وہ مسلح تھی۔ اسے رگیدتا ہوا میں زمین

پر آر ہا اور اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر میں نے اسے ایک جچا تلا ہاتھ مار کر اناٹ غفیل کر ڈالا۔

البرٹ پہلے تو اس اچانک تھپے پر بوکھلا گیا پھر غراتا ہوا میری جانب لپکا۔ میں پہلے ہی ان دونوں پر بھرا ہوا تھا۔ جھک کر سر کی زوردار ٹکر میں نے اس کے پیٹ پر رسید کی تو وہ الٹے پاؤں اچھل کر دیوار سے ٹکرا کر نیچے گرا۔ میں تب تک اس کے سر پر پہنچ گیا اور اس کی بھی رگِ حساس مسل کر اسے دنیا و مافیہا سے بیگانہ کر دیا۔

میں نے شینا کو اٹھایا۔ اس نے کہا میں چل سکتی ہوں۔ کندھے پر اٹھانے کے سبب اس کا زخم کھل سکتا تھا لیکن اس میں بہت تاخیر ہو جاتی۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے اس طرح اٹھالیا کہ ایسا نہ ہو پائے اور پھر باہر نکل کر میں نے کھاڑی کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ یقیناً مجھے اس طرح تیز رفتاری سے دوڑتا دیکھ کر حیران ہوئی ہوگی۔

کھاڑی پر پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلے اسے اپنی کشتی میں سوار کرایا۔ اس کا انجن اسٹارٹ کیا۔ کشتی چھوٹی تھی۔ اس کا بوائلر روم بھی قریب ہی تھا۔ وہ سلگنے کے بعد میں نے وہیل تھام لیا۔ رات کے پہر اور سرد سناٹے میں ”پھٹ...... پھٹ“ کی آواز ابھری اور پھر کشتی نے اپنا سفر شروع کر دیا۔

مطلوبہ مقام پر پہنچ کر میں اترا۔ جلدی جلدی کشتی کو لنگر انداز کر کے رسی سے ایک درخت کے تنے کے ساتھ باندھا۔ اس کے بعد دوڑتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں میں نے مجسمہ چھپا رکھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے بغیر شینا تسانگ پو سے ہلے گی بھی نہیں۔ مجسمہ دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں نے کشتی ایک بار پھر درمیان میں لا کر چلانا شروع کر دی۔

شینا نے مجھے راستے کا تعین بتایا۔ ساتھ ہی اس نے کہا کہ اس پہاڑی نالے کے ذریعے دریائے بیاسی تک جانے کا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ پہاڑی نالا جو ایک طرح سے دو چھوٹی بڑی نہروں کے درمیان ”لنک نالے“ کی حیثیت رکھتا تھا وہ بڑے زور و شور سے پہاڑوں سے بہتا نیچے گرتا تھا۔ پہلے بھی اسی نالے پر ہماری بڑی کشتی ٹوٹ کر غرقاب ہوگئی تھی۔ تاہم ہماری کشتی مقابلتاً چھوٹی تھی۔ شینا نے کہا کہ میں اسے نالے کے کنارے کے بجائے درمیان میں چلانے کی کوشش کروں۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ لنک نالے میں آتے ہی کشتی پر جیسے ہلچل مچ گئی۔ دو تین جگہوں پر کشتی الٹتے الٹتے بچی۔ مجھے بھی کوئی تجربہ نہیں تھا۔ شینا زخمی ہونے کے باوجود مقدور بھر میری مدد کرتی رہی۔

ایک زوردار جھٹکے پر وہ بھی گری تھی۔ شکر رہا کہ سنبھل گئی۔ اس کا زخم نہیں کھلا۔ تب بھی وہ میری مدد کرنے سے باز نہیں آئی حالانکہ میں اسے بیٹھ جانے کا کہتا رہا۔ حقیقت تو یہی تھی کہ کشتی کو جس حساب سے جھٹکے لگ رہے تھے اور وہ بھی اوپر اور نیچے ہو رہی تھی، اسے بیٹھنے کا کب موقع مل رہا تھا۔

خدا خدا کر کے لنک نالے سے جان چھوٹی اور ہم دریائے بیاسی کے پُرسکون اور چوڑے پاٹ والی نہر میں اتر گئے۔ ہم دونوں نے سکون کا سانس لیا اور تھکے تھکے یوں بیٹھ گئے جیسے پیدل دوڑتے رہے ہوں۔ میں نے تسانگ پو کی بندرگاہ سے روانگی سے قبل کچھ زادِ راہ رکھ لیا تھا۔ شکر تھا کہ اب ہمارا سفر ایک بار پھر منزل کی طرف شروع ہو چکا تھا۔

☆☆☆

رات بدستور گہری تھی۔ ہم تسانگ پو سے دور ہو چکے تھے۔ اب البرٹ اور میکی کا خطرہ تو نہ رہا تھا لیکن خدشات اپنی جگہ ضرور تھے کہ اگر انہوں نے نفری بلالی اور کسی گھاٹ میں انہیں ”کمک“ مل گئی تو وہ ہماری تلاش میں نکلنے سے بالکل گریز نہیں کریں گے۔ تسلی صرف اسی قدر تھی کہ اتنی جلدی ان کے لیے ہمیں تلاشنا اب ممکن نہ ہوگا کیونکہ ان کا کوئی ”جاسوس“ اس کشتی میں نہ تھا جو انہیں پل پل کی خبر دیتا۔

کشتی کو معمول کی رفتار پر سیٹ کر کے میں نے کھانا پینا کھول لیا۔ ڈبل روٹی، دودھ اور پنیر نکال لیا۔ کافی کا پانی چڑھا دیا۔ ڈرائیونگ وہیل کے ساتھ ہی کچن نام کی تختوں والی جگہ تھی جس کی ایک دیوار پر ایک سلیب لگی ہوئی تھی۔ اسی پر چولہا تھا۔ یہی ہمارا رہائشی کیبن بھی تھا۔ کافی پیتے ہوئے شینا نے بتایا۔

”اس دریا سے ہمیں پوٹک نامی دریا میں اترنا ہوگا۔ وہ درحقیقت ایک معاون نہر ہے جو ہمیں بھوٹان سے گزارتی ہوئی انڈین ریاست آسام میں داخل ہونے میں مدد دے گی۔“ یہ سن کر میں کچھ تشویش کا شکار ہوا کیونکہ انڈین سیکیورٹی بھوٹان یا نیپال کے مقابلے میں کچھ سخت ہوتی تھی۔

”اس مقام پر کس ملک کی سرحدیں ہو سکتی ہیں؟“ میں نے دھواں اڑاتی گرما گرم کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔ وہ بریڈ چباتے ہوئے سلور کا مگ میری جانب بڑھا کر جواب میں بولی۔

”تبت اب رخصت ہو چکا ہے۔ ہم بھوٹان کے درمیان سے پناکھا نہر میں ازخود داخل ہو جائیں گے جو انڈین ریاست آسام کے ایک دیہاتی قصبے دیہا تک سے

ہوتی ہوئی رانگامائی (بنگلادیش) دریا پر جا گرتی ہے۔"
میں نے سلور کی کیتلی سے اس کا مگ بھرا پھر اپنے خالی ہوتے مگ میں کافی انڈیلی، ڈبل روٹی دانتوں سے توڑی اور ایک سپ لیا۔ "کتنا وقت لگ جائے گا؟ کیا بھوٹان اور بنگلادیش کے سرحدی محافظوں سے ہمارا سامنا ہوسکتا ہے؟"

"ایک گھنٹے میں ہم پنا کھا نہر کے ذریعے بھوٹان میں داخل ہوجائیں گے۔ ادھر ہی ہمیں بارڈر سیکیورٹی فورسز کے لوگوں سے مڈبھیڑ ہونے کا خدشہ رہے گا لیکن ہم اس سے پہلے ہی ایک چھوٹی سی بستی میں ڈیرا ڈال لیں گے اور وہاں کے حالات کا جائزہ لیں گے۔ ہمارے دوست قبیلے کے کچھ لوگ وہاں ہماری مدد کریں گے اور وہی ہمیں بھوٹان سے نکال کر آسام تک پہنچادیں گے پھر آگے آسام میں جیسا کہ تمہیں پہلے بتا چکی ہوں کہ دیہانگ سے ہمارا سفر رانگامائی تک شروع ہوگا۔"

"ہم۔" میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے مگر جانے کیوں میری تسلی نہیں ہورہی تھی۔ بیک وقت ایک ملک سے نکل کر دوسرے ملک میں ایک نہری نظام کے ذریعے داخل ہونا عجیب تجربہ ہی تھا مگر ان کے لیے نہیں جنہیں اس پورے "آبی جال" کا علم ہو۔ لہٰذا مجھے کچھ غیر مطمئن سا پا کر شینا مسکرا کر دوبارہ بولی۔

"فکر مت کرو۔ اب باقی کی منزل آسان ہے۔ اس راستے سے بہت کم کسی سے ہماری مڈبھیڑ ہوسکتی ہے۔ جس کا خدشہ ہے، وہ میں نے بتادیا کہ وہ خود ہی ہمارے مددگار دیکھ لیں گے۔ میں خود ایک قبائلی لڑکی ہوں۔ ہمارا زیادہ سفر انہی ڈھکی چھپی نہروں میں رہتا ہے۔ بسا اوقات تو ایسی گمنام نہریں بھی ہوتی ہیں جو نقشے میں ہی نہیں۔"

"مجھے بس ذرا بھارتی ریاست آسام کی جانب سے تشویش ہورہی تھی۔" بالآخر میں نے اپنے اندر پلنے والی سابقہ تشویش تلے کہا پھر پوچھا۔ "آسام میں کتنا طویل سفر ہمیں درپیش ہوگا؟"

"یہ وہاں کے حالات پر منحصر ہے۔" وہ بولی۔

"کیا وہاں سخت انڈین سیکیورٹی ہوگی؟"

"نہیں۔" وہ بولی۔ "آسام دراصل بھارت کی ایک متنازع ریاست ہے۔ وہاں ہمیں الفا کے گوریلوں سے سامنا ہونے کا خطرہ ہوگا۔"

"الفا......؟ یہ کیا بلا ہے؟"

"آسامی باشندے اپنے خطے کو "آزاد آسام" کی اصطلاح کے طور پر کہتے چلے آرہے ہیں جسے متحدہ محاذ آزادی آسام (فرنٹ آف آسام یونائیٹڈ لبریشن) کو مستقبل قرار دیتے ہیں۔ اسے "الفا" بھی کہا جاتا ہے جو 1979ء میں آسام کی آزادی کے لیے تشکیل دی گئی تھی۔ یہ ہندوستان کی شمال مشرقی ریاستوں میں سب سے زیادہ علیحدگی پسند تنظیم ہے لیکن یہ تحریک 1971ء سے جاری ہے۔ لبریشن فرنٹ آف آسام یعنی "الفا" کے سربراہ اور بانی کا نام اروندراج کھوا تھا۔ اب اسی کے خاندان کے دو افراد جو بھائی بہن رودی راج کھوا اور راشا کھوا نے اس تنظیم کی باگ ڈور سنبھالی ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قومی (بھارتی) حکومت آسام کے قدرتی وسائل کا استحصال کررہی ہے اور یہاں کے مقامی باشندوں کے مفاد کے لیے بہت کم کام کرتی ہے۔ علیحدگی کی اس پُرتشدد تحریک میں 1979ء سے اب تک ہزاروں افراد ہلاک ہوچکے ہیں۔ ریاست آسام گھنے جنگلوں سے بالخصوص سرسبز پہاڑیوں سے بھری ریاست ہے۔ اس لیے یہاں گوریلا جنگ آسان ہے اور اسے کنٹرول کرنا بھارتی حکومت کے لیے ہمیشہ مشکل رہا ہے۔ بھارتی حکومت نے ہمیشہ یہاں کے حالات کو بزور ظلم، قوت اور استبدادی طریقوں سے کنٹرول کرنا اپنا وتیرہ بنایا ہوا ہے۔ وہ یہاں کے باشندوں پر ظلم کے پہاڑ توڑنے سے بھی گریز نہیں کرتی لیکن بہرحال......"

شینا یہ سب بتانے کے بعد ازراہِ تشفی مجھ سے آخر میں بولی۔ "ہمیں آسامی باشندوں یا ان کے گوریلا گروپ "الفا" سے کوئی خطرہ نہ ہوگا۔ بھارتی اہلکاروں کی اور بات ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں مدد مل جائے گی۔"

اس کی بات سن کر میں قدرے تسلی سے مسکرایا۔ وہ بھی مسکرائی۔ کھانا ہم کھا چکے تھے۔ میں نے اسے آرام کا کہا اور وہیل کے قریب آگیا۔ وہ کیبن کی دیوار سے لگے چوبی "بنک بیڈ" پر دراز ہوگئی۔

ہمارا آبی سفر جاری تھا۔ دریا پُرسکون انداز میں بہہ رہا تھا۔ کوئی لنک کینال یا نہر بدلنا پڑتی تو کبھی پانی کا رخ مخالف سمت ہوجاتا تو کبھی متوازی ہوجاتا۔ اس وقت پانی مخالف سمت پر نہ تھا۔ ہوتا بھی تو کوئی فرق نہ پڑتا کیونکہ ہماری کشتی میں دخانی انجن نصب تھا۔ وہ پانی کاٹ کر آگے بڑھتا۔

لانچ مناسب رفتار سے آگے بڑھتی رہی۔ میں وہیل کے سامنے والے قدرے اونچے چوبی اسٹول پر بیٹھ رہا۔ میرے اردگرد دریا کے دونوں کناروں پر ویران اور تاریک جنگل تھا، جھاڑیاں تھیں، گھاس کے میدان بھی

تھے۔ کنٹاؤ بھی آ رہے تھے جسے کاٹتے وقت کشتی کبھی کبھی بالکل کنارے سے آن لگتی اور میں وہیل گھما کر کشتی پھر درمیان میں لے آتا۔

برف پوش پہاڑیوں کے سلسلے بہت دور ہو گئے تھے۔ اب جنگل کی اوٹ سے خشک اور کبھی ہریالی والی چٹانوں کی جھلک نظر آجاتی۔ الیکٹرک انجن والی لانچ ہو یا بھاپ کے انجن والی کشتی، دونوں میں کمپاس اور نقشے جیسی چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ شینا سے میں نے بھی کمپاس اور نقشہ سمجھنے کی کوشش کی۔ میں اسی راہنمائی میں کشتی آگے بڑھائے جا رہا تھا۔ کئی جگہوں پر "لنک ٹو لنک" آبی گزرگاہیں بھی نظر آئیں۔

شینا دو تین گھنٹے آرام کر کے جاگ گئی اور اس نے مجھے سونے کا کہا۔ نیند سے میرا بھی برا حال ہو رہا تھا۔ میں اس کی جگہ جا کر بنک بیڈ پر دراز ہو گیا۔

☆☆☆

آنکھ کھلی تو ایک خوشگواری کا احساس ہوا۔ کشتی رکی ہوئی تھی۔ انواع و اقسام کے آبی و جنگلی چرند پرند کی خوش الحانی میرے کانوں میں رس گھولتی محسوس ہوئی۔ نتھنوں سے آبی اور جنگلی خوشبو ٹکرائی۔

میں اٹھ بیٹھا۔ صبح دم بیدار تھی۔ کشتی کنارے سے لگی دکھائی دی۔ شینا نہر کے کنارے بچھی گھاس پر مجھے بیٹھی نظر آئی۔ اس کا اوپری جسم برہنہ تھا اور وہ اپنے پہلو کے زخم پر کسی جڑی بوٹی کا لیپ لگانے میں مصروف تھی۔ اس کے شباب کی تابانی دیکھ کر میں چند ثانیوں کے لیے مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ چمکتی دھوپ میں اس کے کندنی بدن پر جیسے بہار اتر آئی تھی۔

میں کشتی کے چھوٹے سے ڈیک پر آن کھڑا ہوا۔ شینا کو قدرے بہتر پا کر مجھے خوشی ہوئی کہ وہ اب صحت یاب ہونے لگی تھی۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ دریا کا پانی اب مخالف سمت پر تھا۔ یقیناً اب صبح تک کسی دوسری آبی گزرگاہ میں داخل ہو چکے تھے۔

"تم بھی یہاں آجاؤ۔ موسم بہت اچھا ہو رہا ہے۔" اس نے مجھے دیکھ کر ہانک لگائی اور ہاتھ کا اشارہ کیا۔ میں نے کشتی سے کنارے پر چھلانگ لگا دی۔ کنارے والی گھاس شاید گیلی تھی۔ میرا پاؤں رپٹ گیا اور میں لڑکھڑاتا ہوا اس کے پاس ہی جا پڑا۔

وہ نقرئی انداز میں ہنس پڑی۔ اس کے پُرشباب بدن کا قیامت خیز نظارہ میری آنکھوں کے بالکل سامنے تھا اور یہ فاصلہ اس قدر قریب تھا کہ بے اختیار جی چاہا اس سے لپٹ جاؤں۔

میں وہاں سے نظریں ہٹا کر اس کے زخم کو دیکھنے لگا جو کافی بہتر نظر آ رہا تھا۔

"ہم پنا کھا کینال پر ہیں۔" اس نے بتایا۔ اس کے بعد اس نے قریب گھاس پر رکھی مختصر سی پوشاک اٹھا کر پہن لی۔ میرے اندر کا تلاطم بھی ذرا پُرسکون ہوا۔

"اچھا۔" میرے منہ سے مسرت تلے برآمد ہوا۔ "تو کیا ہم بھوٹان میں داخل ہو چکے ہیں؟"

"ہاں۔" وہ بولی۔ "بلکہ اگلے چند گھنٹوں میں ہم انڈین ریاست آسام کی ایک آبی گزرگاہ میں داخل ہو جائیں گے لیکن اس سے پہلے ہمیں بھوٹانی سرحدی قصبے پونک میں رکنا پڑے گا۔ اس کے بعد ہمارا سفر رانگامائی کے لیے شروع ہو جائے گا۔"

شینا نے مجھے جیسے مژدہ جاں فزا سنا دیا۔ اگرچہ ابھی دو اہم مراکز سے گزرنا باقی تھا لیکن منزل مقابلتاً قریب ہو گئی تھی۔

ہم نے ایک قریبی چشمے سے پانی پیا، جنگلی پھل اور کچی سبزیاں توڑ کر کھائیں، تھوڑا آرام کیا پھر کشتی کی تھوڑی بہت "ٹھوکا ٹھاکی" کی۔ اس کے بعد اگلے پڑاؤ کے لیے روانہ ہو گئے۔

شینا کے مطابق ہمیں دوپہر تک پونک پہنچ جانا تھا۔ گویا وہاں تک ابھی ہمیں کم و بیش چار پانچ گھنٹوں تک کا سفر درپیش تھا۔ شینا نے جنگلی جڑی بوٹیوں سے اپنے زخم پر لگانے کے لیے لیپ تیار کر رکھا تھا جسے اس نے ایک بڑے سے جنگلی پتے میں لپیٹا ہوا تھا۔ اس کی حالت کافی بہتر تھی۔ وہ چہل قدمی کے انداز میں کچھ چلنے پھرنے کے قابل ہو چکی تھی۔

میں وہیل پر موجود اسٹول پر بیٹھا تھا۔ میرے عقب میں شینا بنک بیڈ پر بیٹھی تھی۔ کشتی کی چمنی سے دھواں نکل رہا تھا اور وہ اگلے دو گھنٹوں بعد دریائے پونک میں بخیر و عافیت داخل ہو چکی تھی۔ وہ چھوٹی سی بھوٹانی بستی پونک ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر تھی۔ اس دریا کا پاٹ زیادہ چوڑا نہ تھا۔ کسی اژدہے کی طرح بل کھاتا، جنگل اور سرسبز پہاڑیوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ فضا میں عجیب سی آبی اور جنگلی نباتات کی باس رچی ہوئی تھی۔ خوشگوار دھوپ نے اس پورے نہری اور جنگلی ماحول کو دلفریب بنا دیا تھا۔

ہماری دخانی کشتی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتی رہی۔ نصف گھنٹے کا سفر ہو چکا تو کشتی ایک دم جھٹکے کھانے لگی۔ میں چونکا پھر بوائلر روم کی طرف دوڑا۔ وہاں سے دھوئیں کے

بادل امڈ رہے تھے۔ بہت گڑگڑاہٹ ہو رہی تھی اور انجن جیسے ابلا جا رہا تھا۔ "شیں، شیں" کی سیٹی جیسی آواز بجنے لگی۔

میں نے گرم انجن کو بند کر دیا۔ دھواں اٹھنا کم ہونے لگا، سیٹی کی آواز مدھم ہو گئی پھر کچھ سکون ہو گیا۔ کشتی کی رفتار گھٹ گئی۔ وہ اب تیرنے لگی۔ میں نے فوراً بیچ دریا میں لنگر ڈال دیا۔ اس کے بعد میں نے پریشر چیک کیا۔ وہ اوور ہو گیا تھا۔ کوائل ائر پریشر میں خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ اسی سبب اسٹیم ڈرم متاثر ہوا۔ اگر میں انجن بند کرنے میں مزید دیر لگاتا تو انجن کو آگ لگ جاتی۔

"کیا ہوا؟" اچانک عقب سے شینا کی آواز ابھری۔ وہ بھی میرے پیچھے چلی آئی تھی۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ "انجن میں خرابی ہو گئی ہے۔"

"اوہ......!" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "انجن جل گیا ہے؟" اس نے سیاہ پڑے انجن کو دیکھا۔

"لگتا ایسا ہی ہے۔"

"تم دیکھ سکتے ہو؟"

"مجھے ایسا کوئی تجربہ تو نہیں۔" میں نے کہا۔ "بہرحال، دیکھتے ہیں۔ ذرا ٹھنڈا پڑ جائے تو کوشش کرتا ہوں۔ ابھی تو انڈے کی طرح ابل رہا ہے۔"

ہم چھوٹے سے ڈیک پر آ گئے۔ بیچ دریا میں کشتی رکی پانی کے بہاؤ پر ہلکورے لے رہی تھی۔ کافی دیر بیت جانے کے بعد میں نے انجن کا معائنہ کیا۔ سچی بات یہی تھی کہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ائر پریشر ڈائل تک سیاہ پڑ چکا تھا۔ کوئی چیز "ان بیلنس" ہو گئی تھی۔

میں نے ٹول بکس سے اوزار نکال کر انجن کی وائرنگ وغیرہ چیک کی تو وہ سب جل کر سیاہ پڑی ہوئی تھی۔

"ختم ہو گیا انجن۔" میں نے اعلان کیا۔ شینا کے چہرے پر تشویش کے آثار نمودار ہو گئے۔ وہ بولی۔ "جس سے تم نے کشتی خریدی تھی، اس نے پرانے انجن والی کشتی تمہیں فروخت کر دی ہو گی۔"

"کیا کہہ سکتے ہیں۔" میں نے کندھے اچکائے۔ "اب مجھے بھی اس کا کوئی تجربہ تو تھا نہیں۔" پھر چند لمحے توقف کے بعد شینا سے پوچھا۔

"کیا پونک پہنچ کر اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد کر سکتا ہے؟"

"ہاں، وہاں ہمیں ہر قسم کی مدد مل سکتی ہے لیکن وہاں تک جایا کیسے جائے گا؟ ابھی تو گھنٹے بھر کا سفر باقی تھا۔"

"کشتی کو چپوؤں کے ذریعے چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔" میں نے تجویز دی۔

"لیکن دریا کا پانی مخالف سمت پر ہے۔ یوں بھی تم اکیلے اس کشتی کو چپو کی مدد سے چلا بھی نہیں سکتے۔ میری حالت بھی ایسی نہیں۔ اس کشتی کو کم از کم چار افراد ہی چپوؤں سے کھے سکتے ہیں۔"

اس کی بات صحیح تھی۔ میں نے اس پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ میں نے کہا۔ "کشتی کو چھوڑ کر دریا کنارے پیدل پیدل چلتے ہیں۔"

"یہی کرنا پڑے گا لیکن......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"لیکن کیا؟" میں نے دیکھا، اس کے چہرے پر الجھن آمیز پریشانی کے آثار مترشح تھے۔ اسی لہجے میں بولی۔

"یہ سارا جنگلی علاقہ ہے۔ ہمیں پونک پہنچنے میں خاصی تاخیر ہو سکتی ہے پھر مجسمہ بھی ساتھ ہے۔"

"وہ میں اٹھا لوں گا۔ راستے میں رات پڑی تو کہیں پڑ کر سو جائیں گے۔ اس کے سوا ہمارے پاس اور کوئی چارہ نہیں ہے۔" میں ابھی اسے البرٹ وغیرہ کے خطرے سے بھی خبردار کرنے والا تھا کہ اچانک فضا میں گڑگڑاہٹ کی آواز ابھری۔

ہم دونوں نے ہی چونک کر سر اٹھا کر کھلے آسمان کی طرف دیکھا تو نیلی وسعتوں میں ایک چھوٹا طیارہ گردش کر رہا تھا۔ اس کے نیچے "فلوٹ" لگے ہوئے تھے جس کی مدد سے یہ طیارہ بہ آسانی پانی کی سطح پر بھی اتر سکتا تھا۔

طیارہ دیکھ کر ہمارے چہروں پر تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ ممکن تھا یہ طیارہ البرٹ کا ہو۔ وہ ایک عالمی گینگ کا سربراہ تھا۔ اس کے لیے ہیلی کاپٹر یا طیارہ ہائر کرنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اسے ہر قسم کی سہولیات میسر ہو سکتی تھیں۔

"خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے۔ اب سوچنے کا وقت نہیں رہا۔" کہتے ہوئے میں پلٹا۔

ضروری سامان سمیٹنے کے بعد میں نے کشتی کا لنگر اٹھایا مگر پانی کے بہاؤ کے سبب میں اسے کنارے تک لانے میں ناکام رہا۔ البتہ ایک گھماؤ والے کٹاؤ پر میں نے کشتی کو کنارے لگا کر لنگر ڈال دیا۔ اس کے بعد ہم دونوں کنارے پر اتر آئے۔ بعد میں مجسمہ بھی اتار لایا۔

"ضروری تو نہیں کہ اس طیارے میں البرٹ ہی ہو؟" شینا نے کہا۔

میں نے آسمان کی وسعتوں کی جانب دیکھا۔ طیارہ نیچی اور دائرے کی صورت میں پرواز کرتا بتدریج نیچے آ رہا تھا۔

"یہ اگر کوئی عام طیارہ ہوتا تو اب تک آگے نکل چکا

ہوتا۔ یہ لوگ وہی ہیں اور دوربین کی مدد سے ضرور انہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہوگا۔ جلدی کرو۔'' میں نے کہا۔

ہم نے جنگل کا رخ کیا۔ طیارے کی آواز قریب آتی جارہی تھی۔ وہ ایک چکر کاٹ کر دریا کے پانی پر اترنے والا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ البرٹ نے اپنے ساتھیوں کی کمک بھی منگوائی ہوگی۔ بقول لارا کے، ان کے مزید ساتھی انڈیا اور نیپال میں موجود تھے۔ شینا کے سامنے بھی میں اپنے ان دہرے تہرے خدشات کا اظہار کرچکا تھا۔ وہ بھی متوحش نظر آنے لگی۔

ہم فی الحال زیادہ دور نہیں جاسکتے تھے۔ ابھی ہمیں فوری طور پر پناہ کی تلاش تھی۔ ہم کنارے سے دور ہونے لگے۔ یوبورگا کا بدہیئت مجسمہ میں نے کندھے پر اٹھا رکھا تھا اور وہ بہت وزنی تھا۔ دیگر سامان ہمارا کچھ زیادہ نہ تھا۔ وہ شینا نے سنبھال لیا۔ ہم پہاڑیوں کی طرف آگئے۔

میرا ارادہ جلد ہی کسی محفوظ پناہ میں چھپ کر کچھ کرنے کا تھا جس کا میں لائحہ عمل تیار کرچکا تھا۔ وقت اور حالات فوری عمل درآمد کا تقاضا کررہے تھے۔

جلد ہی ایک جگہ پہاڑی درّے کے پاس ہمیں جھاڑیوں سے اٹی بڑی کھوہ مل گئی۔ میں نے پہلے اسے اچھی طرح صاف کیا۔ تسلی بھی کرڈالی کہ اندر کوئی چھوٹا موٹا جانور تو نہیں۔ اس کے بعد میں نے شینا اور مجسمے کو وہیں چھوڑا۔

''کدھر جارہے ہو؟'' شینا نے فکر سے پوچھا۔

''ان کا راستہ کھوٹا کرنے۔'' کہتے ہوئے میں تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ شینا کو میں نے سختی سے تاکید کردی تھی کہ وہ یہاں سے ہلے گی بھی نہیں اور میرا ادھر ہی بیٹھ کر انتظار کرے۔

میں دوڑتا ہوا دریا کنارے جاپہنچا۔ چھوٹا ''فلوٹنگ پلین'' دریا کے پانی میں اترا ہوا تھا اور ہلکورے لے رہا تھا۔ کشتی قریب تھی اور وہاں مجھے دو افراد اِدھر اُدھر آتے جاتے دکھائی دیے۔ میں غور سے گھات لگا کر انہیں تکتا رہا۔

فاصلہ بہت قریب تھا اور میں ان کے چہروں تک کو پہچان رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ دو افراد جو کشتی کے اندر باہر آجارہے تھے، میرے لیے اجنبی تھے لیکن جلد ہی عقدہ کھلا کہ وہ ان کے ہی آدمی تھے کیونکہ چند لمحے بعد ہی مجھے طیارے کے اندر سے ایک آدمی جو چھلانگ لگا کر کشتی میں آیا تھا، اسے دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔

وہ البرٹ تھا۔ پھر مجھے جلد ہی اس کی گرل فرینڈ میگی بھی نظر آگئی۔ وہ فلوٹ پر اچانک ہی ابھری تھی۔ شاید دوسری جانب سے نمودار ہوئی تھی پھر وہ دونوں بھی کشتی کے اندر آگئے۔ اس کے بعد البرٹ نے اپنے دو ساتھیوں سے کچھ کہا۔ انہوں نے مؤدبانہ انداز میں سر ہلائے۔ طیارے کے اندر سے دو لمبی نالوں والی گنیں نکالیں اور کشتی سے نکل کر کنارے پر آگئے۔

البرٹ نے پستول نکال لیا تھا۔ میگی ابھی خالی ہاتھ تھی۔ تاہم یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ غیر مسلح ہوگی۔ ہتھیار اس نے بھی اپنے لباس یا جیکٹ میں چھپا رکھا ہوگا۔ وہ قریب آگئے۔

''کشتی خراب ہونے کی صورت میں وہ دونوں رک گئے ہوں گے پھر ہمارا طیارہ دیکھ کر انہوں نے جنگل کی راہ لی۔ ہمیں ان کا پیچھا کرنا چاہیے۔'' البرٹ ان سے کہہ رہا تھا۔

وہ قریب آنے لگے۔ کنارے پر اس کے دونوں ساتھی جھک کر ہمارے قدموں کے نشانات دیکھنے کی کوشش میں مصروف ہوگئے۔ میرے اعصاب یکلخت تن گئے۔ ایک اور بھیانک مقابلے کا سین میری راہ تکنے لگا۔

البرٹ نے انڈیا یا نیپال سے اپنے جن دو ساتھیوں کو ''کمک'' کے طور پر بلوایا تھا، یہی دونوں چارٹر طیارہ لے کر فوراً تسانگ پو پہنچے ہوں گے اور پھر وہاں سے بغیر وقت ضائع کیے سب روانہ ہوگئے ہوں گے۔

صورتِ حال خاصی گمبھیر ہوگئی تھی۔ صحرائی عقاب کا سربراہ یوبورگا کے مجسمے کے حصول کے لیے خود میدان میں اترا ہوا تھا جس سے مجسمے کی ان کی نظروں میں اہمیت کا اندازہ بخوبی ہوتا تھا۔

وہ چاروں ہمارے قدموں کے نشانات جانچتے ہوئے بڑھنے لگے۔ ان کی یہ پیش قدمی انہیں اس کھوہ تک پہنچا سکتی تھی جدھر میں نے شینا کو مجسمے سمیت چھپا رکھا تھا۔ میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ میں نے بہ سرعت اپنی داہنی پنڈلی سے بندھی قرولی نکال لی۔ البرٹ رمنڈو کے دونوں ساتھی آگے تھے۔ البرٹ اور میگی ان کے عقب میں۔

میں نے ایک چکر کاٹا اور موت بن کر ان کے عقب میں آگیا۔ دفعتاً ایک ہولناک چیخ جنگل کے سناٹے کو دور تک چیرتی چلی گئی۔ میں ہی نہیں، وہ بھی بری طرح ٹھٹکے۔

میں اس چیخ کو پہچان گیا۔ یہ شینا کی چیخ تھی۔ میں سرتاپا لرز گیا۔ وہ کسی خطرے کا شکار ہوگئی تھی۔ یہی خیال میرے ذہن میں ابھرا۔

''یہ کیسی چیخ تھی؟'' البرٹ نے چلا کر کہا۔

''باس! اس طرف...... جلدی آؤ۔'' مذکورہ دونوں ساتھیوں میں سے ایک نے کہا۔ وہ سب اس کی سرکردگی میں

دوڑے لیکن میں نے ان سے پہلے ہی دوڑ لگادی۔
ان سے پہلے ہی میں اس کھوہ کے قریب جا پہنچا تو سامنے کا منظر دل ہلا دینے والا تھا۔ ایک نہیں، پورے تین عدد کالے تیندوے کھوہ کے دہانے کو گھیرے ہوئے تھے۔
شینا نے ایک عقلمندی یہ کی تھی کہ شاید پہلے ہی سے خطرہ بھانپتے ہوئے ایک بڑا سا پتھر کسی طرح کھوہ کے دہانے پر سرکا کر لگا دیا تھا لیکن ایک تیندوا آگے بڑھ کر اپنے دونوں اگلے پنجوں سے وہ پتھر ہٹانے کی جستجو میں مصروف تھا پھر اس کی دیکھا دیکھی دوسرا تیندوا بھی اس کی مدد کو بڑھا۔
شینا اندر سے مسلسل چیخے جارہی تھی۔ ممکن تھا وہ خوف کی کیفیت میں یا پھر تیندوؤں کو پریشان کر کے وہاں سے بھگانے کے لیے چلائے جارہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کرسکتا ہوں کیونکہ یہاں ان تینوں درندوں کے علاوہ البرٹ وغیرہ بھی موجود تھے۔ وہ چاروں الجھی ہوئی نظروں سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ میری طرح وہ لوگ بھی قریب جھاڑیوں میں دبکے ہوئے یہ تماشا دیکھنے میں محو رہے۔
میں تماشا دیکھنے میں وقت ضائع کرتا تو شینا ان بھوکے تیندوؤں کا لقمہ بن سکتی تھی اور کم از کم البرٹ وغیرہ کو اس سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی کہ وہ شینا کو موت کے منہ سے بچانے کی کوشش کرتے۔ برعکس اس کے ان کا کام ''سہل'' ہو جاتا۔
میں نے تیزی سے سوچا۔ تب ہی میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ میں نے ایک ''بیک فائر'' چال چلی اور قرولی تاک کر اپنے جسم کی پوری طاقت سے ایک تیندوے کا نشانہ لے کر اچھال دی۔ قرولی سنسناتی ہوئی لپکی اور تیندوے کے جسم میں پیوست ہوگئی۔
میں نے ابھی دونوں تیندوؤں میں سے ایک کا نشانہ لیا تھا جو کھوہ کے دہانے پر پڑے پتھر کو ہٹانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ مضروب تیندوے نے چنگھاڑ ماری اور اچھل کر پیچھے کو گرا۔ باقی دو تیندوے غراتے ہوئے بری طرح بدکے۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے تاک کر ایک بڑا سا پتھر ان جھاڑیوں کی طرف اچھال دیا جہاں البرٹ اور اس کے ساتھی دبکے ہوئے تماشا دیکھنے میں محو تھے۔
انہیں جب تک کچھ سمجھ آتی، باقی دو تیندوے پتھر کی آہٹ پر اسی طرف کو تیزی سے لپکے۔ جھاڑیوں میں ہلچل مچ گئی۔ زخمی تیندوا پہلے تو اپنے پہلو میں پیوست قرولی کو منہ مارتا تڑپتا رہا پھر غرا کر وہ بھی جھاڑیوں کی طرف لپکا۔ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ تیندوؤں کی غضبناکی ''بیدار'' کر کے میں نے ان کا رخ دشمنوں کی طرف کر ڈالا تھا۔
وہاں فائر ہوئے۔ ایک تیندوے کی آخری غراہٹ سنائی دی پھر دو تین انسانی چیخیں ابھریں۔ کھوہ خالی ہوگئی۔ میں اس طرف کو لپکا۔ پتھر ہٹایا اور شینا کو ہاتھ سے کھینچ کر نکالا پھر بجلی کی سی تیزی سے پہاڑی درّے کے عقب میں چلا گیا۔
شینا کا چہرہ خوف سے ستا پڑا تھا۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور وقت ضائع کیے بغیر اسے لیے آگے بڑھ گیا۔
باقی دو تیندوؤں نے دشمنوں کا کیا حشر کیا، کون بچا، کون چیر پھاڑ ڈالا گیا، مجھے نہیں پتا چلا لیکن ادراک اس قدر ضرور تھا کہ انہیں اپنی پڑ چکی تھی۔ میں بہرحال زیادہ دور نہیں جانا چاہتا تھا۔ جلد ہی ایک اور محفوظ پناہ گاہ دیکھ کر ہم دونوں نے وہاں ڈیرا ڈال لیا۔
''ی ی ...... یہ سب کیا ہوا تھا؟'' سکون کی کچھ گھڑیاں میسر آئیں تو شینا نے تھرائے ہوئے لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔
میں نے مسکراتے ہوئے اسے سب بتا دیا۔ وہ حیران سی ہوگئی پھر دلنشین مسکراہٹ تلے بولی۔ ''میرا تمہارے بارے میں اندازہ غلط نہ تھا۔''
''وہ کیا؟'' میں نے سوالیہ نظروں اور نیم مسکراہٹ تلے اسے دیکھا۔
''تم جنگجو ہی نہیں، ذہین اور خطرناک حد تک چالاک بھی ہو۔''
''میرے خیال میں ذہانت اور چالاکی، موقع محل اور حالات کی بھی محتاج ہوتی ہے۔ اصل بیدار مغزی ہے۔''
''بیدار مغزی؟ یہ کیا بلا ہے؟'' وہ الجھ کر بولی۔
میں مسکرا دیا پھر چند لمحے متوقف ہونے کے بعد میں نے کہا۔ ''ویسے تم نے صحیح کہا تھا۔ یہ علاقہ تو جنگلی درندوں سے بھرا پڑا ہے۔''
''ہاں، جب تم مجھے تنہا چھوڑ کر گئے تو میں نے جنگلی درندوں کی آوازیں سنیں اور احتیاط کے پیش نظر ایک بڑا سا پتھر کسی طرح سرکا کر کھوہ کے دہانے پر گھسیٹ لیا۔''
''اسی کو بیدار مغزی کہتے ہیں۔'' میں مسکرایا۔ وہ ہنسی۔ اس کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ''تم ذرا ادھر ٹھہرو، میں وہاں کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔''
میں اسے ایک بار پھر چھوڑ کر پلٹا اور اسی طرف آ گیا جدھر میں نے دشمنوں کی کمین گاہ میں تھوڑی دیر پہلے قیامت بپا دی تھی۔ وہاں مجھے کٹی پھٹی دو لاشیں نظر آئیں اور ایک لاش تیندوے کی تھی جسے گولیاں ماری گئی تھیں۔ سوئے اتفاق یہ وہی تیندوا تھا جس کے ایک پہلو میں میری اچھالی

ہوئی قرولی پیوست ہوئی تھی۔ باقی دو لاشیں البرٹ رمنڈو کے دو ساتھیوں کی تھیں جبکہ وہ خود اور میگی غائب تھے۔

باقی دو تیندوے بھی مجھے کہیں نظر نہیں آئے۔ میں محتاط انداز میں انہی جھاڑیوں کے اندر جا گھسا تو وہاں خون کے نشانات دور تک جاتے دکھائی دیے۔ شاید میگی اور البرٹ رمنڈو بھی تیندوؤں کے حملے میں شدید زخمی ہو گئے تھے۔ اب نہ جانے کدھر فرار ہوئے؟ مجھے ان کے تعاقب کی ضرورت نہ تھی۔

میں پلٹا اور سب سے پہلے تیندوے کی لاش سے اپنی قرولی کھینچ کر نکالی۔ اس کے خون آلود پھل کو اسی کے جسم سے پونچھا۔ ایک رائفل بھی پڑی نظر آئی جو میں نے اچک لی پھر واپس ہوا۔

شینا کو میں نے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اسے اب اپنی فکر کے بجائے بومبورگا کے مجسمے کی فکر ستانے لگی۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”وہ اس کھوہ میں محفوظ پڑا ہوگا۔ کچھ دیر بیت جانے دو۔ میں جا کر نکال لاؤں گا۔“ لیکن وہ بضد رہی تب میں نے کہا کہ ہمیں پھر اسی کھوہ میں ہی جا کر پناہ لینی چاہیے۔

”ہرگز نہیں۔“ اس نے ایک دم کہا۔ ”وہ کھوہ یقیناً کسی درندے کی کمین گاہ ہوگی۔ کوئی دوسرا درندہ بھی وہاں کا رخ کر سکتا ہے۔“

اس کی بات مجھے معقول لگی۔ میں جا کر اس کھوہ سے بومبورگا کا وہ منحوس مجسمہ کندھے پر ڈال کر اٹھا لایا۔ یہ مجسمہ جہاں مجھے طوق کی طرح محسوس ہوتا، وہیں راہِ منزل بھی محسوس ہوتا تھا کیونکہ اسی کی وجہ سے شینا مجھے پہلی گھاٹ تک لے جانے کے لیے مجبور تھی۔ اسی لیے مجبوراً ہی سہی، میرے لیے بھی یہ منحوس مجسمہ اتنا ہی اہم تھا جتنا کہ شینا کے لیے۔

ہم پیدل پوک نامی قصبے تک جانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ چونکہ بقول شینا کے ہی، وہ دریا کنارے آباد ایک بستی تھی۔ اسی لیے ہم کنارے سے دور ہو کر سفر نہیں کر سکتے تھے۔

اب رات پڑنے والی تھی۔ ہمیں کچھ خاص بھوک پیاس تو نہیں لگی تھی پھر بھی قریبی چشمے سے پانی پیا اور کچھ رسیلے پھل توڑ کر کھائے۔ اس کے بعد دوبارہ اپنے مختصر سے ٹھکانے میں آ کر بیٹھ گئے۔ یہ جگہ کوئی کھوہ یا غار نہ تھی۔ بس درّے کے درمیان میں ایک ایسا مقام تھا جدھر دو پہاڑیوں کے درمیان میں چھجا تھا۔ اس کے نیچے ہم دبکے ہوئے تھے۔

گن میرے ہاتھ لگ چکی تھی۔ ہتھیار کی موجودگی کچھ حوصلہ افزا تھی۔ ہم نے باری باری جاگنے اور سونے کا پلان کیا اور لیٹ گئے۔ وہ رات بخیریت گزر گئی۔ سب سے پہلے میں نے اردگرد قریب کا جائزہ لینے کے لیے تھوڑا سا گشت کیا، اس کے بعد میں واپس ٹھکانے پر لوٹ آیا۔

لمبی رات گزر چکنے کے بعد ہماری بھوک اور پیاس بیدار ہو گئی تھی۔ میں نے مجسمہ اٹھایا اور شینا کو لے کر دریا کے کنارے آ گیا۔ وہاں پہنچ کر ہم بری طرح ٹھٹک گئے۔ جلدی سے جھاڑیوں کی آڑ میں ہو کر سامنے دیکھا۔

دریا کنارے گھاس اور قدرے ریتیلی زمین پر البرٹ رمنڈو بیلچہ لیے قبر کھودنے میں مصروف تھا۔ اس کے قریب ہی ایک لاش رکھی تھی۔ گن بھی پاس ہی زمین پر پڑی تھی۔ کھودی ہوئی قبر کا ایک ڈھیر بھی لگا ہوا تھا۔ اسی ڈھیر پر ایک موٹی شاخوں سے بنائی ہوئی صلیب رکھی تھی۔

نہ جانے اس منظر میں ایسا کیا تھا کہ میں اور شینا مبہوت ہو کر یہ سب اس وقت تک خاموشی سے دیکھتے رہے جب تک کہ البرٹ نے قبر میں لاش جو بلاشبہ میگی کی تھی، اتار نہ دی اور بعد میں مٹی برابر کر کے قبر کے سرہانے وہ چوبی صلیب نہ گاڑ دی۔

”میگی! مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہاری جان نہ بچا سکا۔ تم وہ واحد لڑکی تھیں جس سے میں نے سچی محبت کی تھی۔ خداوند تمہاری روح کو سکون میں رکھے، آمین!“

وہ رو رہا تھا۔ اس نے چہرہ پونچھا۔ ایک گینگسٹر کی اس محبت کے جذبے کو دیکھ کر میرا دل بھی اداس ہوا۔ میں بھی تو مبتلائے الفت تھا اور کسی کی وفا کی پاسداری میں یہ سارا کشٹ جھیل رہا تھا۔

فوزیہ سے میں نے بھی تو سچی اور پہلی محبت کی تھی۔ میں بھی تو اس کی محبت اور تلاش میں راندۂ درگاہ تھا۔ البرٹ رمنڈو کی محبوبہ میگی بھی شاید بعد میں انہی تیندوؤں کا شکار ہو گئی تھی۔ البرٹ رمنڈو کسی طرح خوش قسمتی سے بچ گیا تھا لیکن اب وہ تنہا ہو گیا تھا۔

میں اور شینا یک ٹک اسے تکے جا رہے تھے۔ وہ ابھی تک میگی کی قبر کے نزدیک ہی کھڑا تھا۔ سوگوار، مایوس اور غمزدہ...... ایک عالمی مجرم سربراہ کو اپنی محبوبہ کے لیے اس قدر غمگین دیکھ کر مجھے حیرت تو ہوئی مگر دل تو پھر دل ہوتا ہے۔ ٹوٹ جائے تو پھر آدمی کہیں کا نہیں رہتا پھر معاملہ جب کسی کے ساتھ سچی محبت کا ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی دکھ نہیں ہوتا۔ غالباً یہی حال اس وقت البرٹ رمنڈو کا ہو رہا تھا۔

ہم خاموشی سے یہ سب دیکھتے رہے۔ وہ پھر اداسی اور پشیمانی تلے خودکلامی میں بڑبڑانے لگا۔

’’کاش، میں اس منحوس مجسمے کی تلاش میں نہ آتا۔ مجھے اس کا لالچ نہ ہوتا۔ میگی آج مجھ سے ہمیشہ کے لیے نہیں بچھڑتی۔ مائی ڈارلنگ، میگی! مجھے معاف کر دینا۔ میں اس مجسمے پر لعنت بھیج کر واپس لوٹ رہا ہوں۔ کبھی زندگی نے وفا کی اور تمہاری قبر سلامت ہوئی تو میں یہاں دوبارہ ضرور آؤں گا۔ خدا حافظ!‘‘

وہ پلٹا اور پھر دریا کی جانب بڑھا۔ وہاں ہنوز ہماری خراب کشتی لنگر انداز تھی اور اس کا طیارہ بھی پانی کی سطح پر ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ ہماری کشتی پر آیا اور پھر وہاں سے اپنے طیارے میں سوار ہوا۔ ذرا دیر بعد ہی اس کے چھوٹے سے طیارے کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز ابھری اور پھر وہ پانی میں ٹیکسی کرتا ایک طرف کو بڑھا اور پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پانی کی سطح سے فضا میں پرواز کر گیا۔

مجھے امید نہ تھی کہ صحرائی عقاب کے سربراہ البرٹ رمنڈو کی کہانی اس طور الم ناک انجام سے دوچار ہو گی۔ اچھا ہی ہوا اس مصیبت سے جان چھوٹی۔ یہ ہمارے لیے ایک اضافی مصیبت ہی تھی جو خواہ مخواہ ہی گلے پڑ گئی تھی لیکن جانے کیا بات تھی کہ میرا دل البرٹ رمنڈو کی اس طرح واپسی کو تسلیم کرنے سے قاصر ہی رہا۔ لارا کے بعد میگی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ مجھے بہرحال ان دونوں کے اس عبرت ناک انجام پر افسوس ہوا تھا۔

شینا نے ایک گہری اور افسردہ سی سانس کھینچی۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔

’’خس کم جہاں پاک۔‘‘ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

’’کیا مطلب؟‘‘ شینا چونک کر بولی۔

’’کچھ نہیں۔ مطلب میرا یہ تھا کہ اس موذی سے جان چھوٹی۔‘‘

’’کیا واقعی یہ چلا گیا ہے؟‘‘ اچانک شینا نے میری طرف دیکھ کر عجیب سے لہجے میں کہا تو میں بری طرح چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگا۔ گویا جو خیال میرے دل میں پل رہا تھا، وہی اس کے اندر بھی موجود تھا۔

☆☆☆

کشتی ناقابلِ مرمت تھی۔ ہم نے سارے خدشات کو ایک طرف ڈال کر پیدل ہی پوتک تک کا سفر شروع کر دیا۔ جیسا کہ ہم یہ فیصلہ گزشتہ شب ہی کر چکے تھے۔ دوپہر تک ہم مسلسل چلتے رہے۔ بومبورگا کا مجسمہ مجھ پر لدا رہا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے میں نے بچپن میں شاید الف لیلیٰ کی ایک کہانی پڑھی تھی جس میں ایک شخص کسی گمنام جزیرے میں بے یار و مددگار پھنس جاتا ہے اور اسے ایک لنگڑا آدمی ملتا ہے جسے وہ ازراہِ ہمدردی اپنے کاندھے پر سوار کر لیتا ہے پھر وہ اس کے ساتھ چپک کر رہ جاتا ہے۔

بومبورگا کے اس منحوس مجسمے کے ساتھ بھلا مجھے کیا ہمدردی ہو سکتی تھی۔ یہ تو میرا اپنا مفاد تھا کہ اس ذریعے سے شینا کی ہمدردی ضرور حاصل کرنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے اس ٹھکانے تک لامحالہ لیے جا رہی تھی جو میری منزل تھا۔

راہ میں شینا نے بھی میری مدد کرنا چاہی مگر میں نے انکار کر دیا۔ اس کا گہرا زخم اگرچہ اب کافی حد تک بھر چکا تھا مگر بہرحال وہ عورت ذات تھی۔ اس قدر بھاری مجسمہ اٹھانا اسے یوں میری موجودگی میں زیب نہ دیتا تھا۔ میری تو اور بات تھی۔

راستے میں ہم چھوٹے موٹے جانور شکار کر کے اسے آگ پر بھون کر پیٹ کی آگ بجھاتے، کچھ جنگلی پھل کھاتے، کسی پہاڑی چشمے سے پانی پی لیتے اور آگے بڑھ جاتے۔ ستانے کے لیے فقط ایک بار رکے تھے۔ ہم پناکھا کینال کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔

شینا ان راستوں سے آشنا تھی اسی لیے ہمیں کوئی دقت نہ ہوئی اور ہم شام ڈھلے تک پوتک نامی اس بستی میں پہنچ گئے جس کے بارے میں شینا مجھے بتا چکی تھی کہ وہاں اس کے سردار باپ آتوما کے کچھ معتقد بن رہتے تھے۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا، شینا شر دوپا قبیلے سے تعلق رکھتی تھی جو رانگامانی اور سندربن کے درمیان ایک وسیع اور گھنے پہاڑی جنگل میں آباد تھا۔ اسی قصبے کی ایک چھوٹی بندرگاہ ’’پیلی گھاٹ‘‘ کہلاتی تھی اور یہی مقام کالی لہر والوں کا اصل ٹھکانا تھا۔

شینا میری اصلیت سے ہنوز ناواقف تھی۔ اسے میں نے یہی بتا رکھا تھا کہ میں نیپال کی جیل توڑ کر بھاگا ہوا ایک قیدی ہوں اور پناہ کی تلاش میں ہوں۔ میں نے ابتدا میں اپنا نام بھی اسے غلط یعنی ’’پرتم‘‘ بتایا تھا لیکن لیڈی لارا وغیرہ کے ٹکراؤ کے بعد میرا دوسرا غلط نام ’’شیان‘‘ اس کے دھیان میں تھوڑا بہت آیا مگر میں نے اسے یہی بتایا تھا کہ میں نے دانستہ انہیں (لارا وغیرہ کو) غلط یعنی شیان بتایا تھا جبکہ شینا جان چکی تھی کہ میں مسلمان تھا۔

پوتک میں اس کے سردار باپ آتوما کے پیروکاروں نے ہماری خوب تواضع کی۔ ان کا شینا کے ساتھ اس قدر دوستانہ بلکہ مؤدبانہ رویّہ دیکھ کر مجھے آگے کی منزل آسان محسوس ہونے لگی۔ جیسا کہ شینا نے کہا تھا کہ اس آخری بھوٹانی بستی کے بعد رانگامانی تک سفر سے پہلے ہمیں بھارتی ریاست آسام سے گزرنا پڑے گا۔ اس کے بعد ہماری

منزل قریب تھی۔

دو روز ہم اس بھوٹانی سرحدی قصبے میں رہے۔ ہمارے لیے ایک چھوٹی دخانی کشتی کا بندوبست کیا جانے لگا۔ مجھے پتا چلا کہ ہمارے ہمراہ تین بھوٹانی بھی ہوں گے۔ یہ ایک اچھی بات تھی۔ ہمارا آگے کا سفر سہل تھا۔ صرف آسامی قصبے دیہا تیگ میں کچھ خدشات تھے جس کے متعلق شینا مجھے بتا چکی تھی اسی لیے تین بھوٹانی ہمارے ہمراہ کردیے گئے تھے تاکہ ''الفا'' والوں سے اگر مڈبھیڑ ہو بھی گئی تو کوئی مشکل درپیش نہ ہو۔

یہ روانگی سے ایک شب پہلے کا ذکر تھا۔ شینا اور میرے لیے ایک ہی مکان نما چھوٹی جھونپڑی تھی۔ اس میں آرام کے لیے دو گوشے تھے۔ صبح صادق ہمیں نکلنا تھا اسی لیے میں بستر میں پڑا سونے کی کوشش کررہا تھا۔ میرا بستر ایک نرم سی چھال بچھی کھاٹ پر تھا۔ میری کوٹھڑی میں مٹی کے دیے کی ہلکی روشنی ہورہی تھی۔ بیشتر لوگ اسے بجھا کر سو رہے تھے۔ میں نے بھی ایسا کرنا چاہا تو ایک دم گھپ اندھیرا ہوگیا۔ میں نے دیا دوبارہ روشن کردیا۔ بھوٹان کی اس دور افتادہ قبائلی بستی میں مشعلوں اور تیل کے دیوں کا رواج عروج پر دیکھ کر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔

نہ جانے کیا بات تھی کہ میرا دل بے چین سا ہوا جاتا۔ شینا میرے بازو والی کوٹھڑی میں تھی۔ پتا نہیں سوگئی تھی یا پھر نہیں۔ میں البتہ سونے کی جستجو میں تھا۔ جگہ، مقام اور بستر بدلنا شاید میری کم خوابی اور بے چینی کی وجہ رہی ہو۔ رات درمیانی پہر میں تھی۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا اور گہری رات۔ میرے بائیں بازو میں قدرے سرہانے کی طرف ایک کھڑکی تھی جو باہر اس جنگل بستی میں کھلتی تھی۔ وہاں سے چاندنی میں ڈوبی رات کا اداس اور سوگوار سا منظر دکھتا تھا۔

مجھے مقدور بھر باہر کے اس نظارے میں دھوئیں کی لہریں لہراتی محسوس ہوئیں۔ اس میں خوشبو تھی۔ شاید یہ جنگلی مچھروں یا درندوں سے بچاؤ کے لیے تھا یا پھر کچھ اور...... فضا البتہ خوشگوار اور پُرسکون تھی۔ دور قریب کسی جانور کے بولنے کی ہلکی آواز چھائے ہوئے سناٹوں کو چیرنے میں ناکام رہتی تو یہی مدھم آوازیں اسراریت کا احساس دلاتیں۔

اچانک میری کوٹھڑی میں آہٹ ہوئی۔ میں چونکا۔ یہ کسی کے قدموں کی آواز تھی۔ میں نے چھال کے بستر پر لیٹے لیٹے گردن تھوڑی گھما کر آہٹ کی سمت دیکھا۔ اس طرف شینا کی کوٹھڑی تھی جس کا ایک دروازہ ادھر بھی کھلتا تھا۔ وہ ایک پُراسرار سائے کی طرح دکھائی دے گئی۔ دیے

ڈیوٹی

''جان! مجھے افسوس ہے تم سے ملنے شاید اس ہفتے بھی آ نہ سکوں گا بڑی اہم مجبوری ہے!''

''جان! تمہاری مجبوری کو اب تو میں بھی سمجھنے لگی ہوں شاید اس ہفتے بھی تمہارے چیف کی بیوی تنہا ہوگی۔''

فراخ دلی

☆ گھر کی مالکن نئی متوقع ملازمہ کو یہ احساس دلانے کی کوشش کررہی تھی کہ اس کے ہاں ملازمت کرنا اس کے لیے بہت آسان ہوگا اور اس گھر میں وہ خوش رہ سکے گی۔ اپنے گھر کی بہت سی خوبیاں گنوانے کے بعد مالکن بولی۔ ''اور یہاں بچے بھی نہیں ہیں، جو تمہیں تنگ کریں۔''

☆ ''ارے بیگم صاحبہ! بچوں سے میں تنگ نہیں ہوتی...... آپ میری وجہ سے خوامخواہ فیملی پلاننگ کا تکلف نہ کیجیے......'' متوقع ملازمہ نے فراخ دلی سے کہا۔

کی مدھم روشنی میں اس کے جسمانی خطوط واضح تھے مگر چہرہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ میں نے ہولے سے پکارا۔

''شینا......!''

میری آواز سن کر وہ اندر روشنی میں آگئی پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی وہ میرے بستر کے قریب آگئی۔

''کیا میری طرح تمہیں بھی نیند نہیں آرہی؟'' میں نے ہولے سے مسکرا کر کہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے بستر پر میرے برابر میں لیٹ گئی۔ میں ایک دم سٹپٹا گیا۔ میں گنگ سا ہورہا۔ دوبارہ اس سے کچھ نہ بول سکا اور نہ وہ بولی۔

اس کے جوان پُرشباب بدن کی مہک میرے نتھنوں سے ٹکرانے لگی۔ اس کے بال میرے تکیے کے اور کچھ گھنیری لٹیں میرے چہرے پر آن پڑیں۔ ان گھنیری زلفوں کی یہ قدرتی نکہت کسی گلِ گلزار چمن سے کم نہ تھی۔ میں نے وہ دھیرے سے ہاتھ کی مدد سے ہٹائیں۔ وہ میری طرف پشت کیے ہوئے تھی۔

ابھی میں اس سے کچھ کہنے یا پوچھنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے ایک دم میری جانب کروٹ لی۔ میں پشت کے بل چت بستر پر لیٹا ہوا تھا تاہم تھوڑی سی گردن اس کی طرف

...موڑے رکھی۔

اب میری جانب کروٹ لینے کے سبب اس کا حسین چہرہ بالکل میرے سامنے اور نزدیک تھا۔ مجھے اس کی غزال چشم میں ایک عجیب سا نشہ تیرتا محسوس ہوا۔ اس کے گلاب پنکھڑی سے ہونٹ نیم وا تھے اور وہاں سے سانسوں کی بے ترتیب سنسناہٹیں کسی منہ زور جذبے کا پتا دینے لگیں۔ ان سانسوں میں مجھے جنگلی گلابوں کی باس محسوس ہوئی۔ اس کی چھاتی کا تیز تیز زیر و بم مجھے اپنے سینے پر لطیف اور ہوش اڑا دینے والے دباؤ کی طرح مدہوش کرنے لگا پھر اچانک ہی وہ جیسے بے اختیاری یا خود اختیاری تلے ''میرے سرجن'' کہتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔

یہی وہ وقت تھا جب میرے اندر ہلچل سی بیدار ہوئی اور مجھے خود پتا نہ چل سکا کہ یہ میں نے کیا، کیا تھا؟

میں نے اس کے سینے پر زور سے ہاتھ مار کر اسے کھاٹ سے نیچے دھکا دے دیا۔ وہ فرش پر گری اور ساتھ ہی اس کے حلق سے کراہ ابھری۔ میں ایک دم بستر پر اٹھ بیٹھا۔

''شینا! یہ کیا حرکت ہے؟'' میں نے ذرا سختی سے کہا۔ میں نے اپنی آواز نیچی رکھی تھی۔ وہ سنبھل کر اٹھی اور میری جانب سر اٹھا کر دیکھا پھر ہلکی سسکی لیتی ہوئی اپنے گوشے میں چلی گئی۔ میں نے بے اختیار اپنا سر جھٹکا اور کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

حالانکہ رات گئے میں بدخوابی کا شکار رہا تھا لیکن کسی پہر میری آنکھ لگ ہی گئی تھی اور صبح صادق بیدار بھی ہو گیا۔ اس کی وجہ باہر کھڑکی سے آنے والا شور تھا۔

میں نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ چند لوگ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کھاڑی کی طرف سے ہمارے جھونپڑ مکان کی جانب آتے نظر آئے۔ یہ کل سات کی تعداد میں تھے۔ چند ایک ہی مقامی محسوس ہوئے جبکہ باقی بھی انہی جیسے ہی لگے لیکن وہ لگتا ایسا ہی تھا جیسے کسی دوسری بستی یا قصبے کے ہوں۔

ان میں ایک گینڈے جیسی جسامت کا آدمی تھا۔ اس کا سر گول، گنجا اور رنگت سیاہ تھی۔ اس کا نیم برہنہ قبائلی جھلک دکھاتا بدن چمک رہا تھا پھر انہوں نے دوسری طرف کے شینا والے گوشے کا در کھٹکھٹایا۔

شینا بھی جاگ گئی تھی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ میں کسی انجانے خطرے کی بو محسوس کر کے تیزی سے اٹھا اور اپنے گوشے کے دوسری جانب کھلنے والے دروازے سے چھال اور جمع شدہ جھاڑیوں اور شاخوں کے اس ڈھیر میں جا دبکا جہاں سے چھپ کر شینا کی کوٹھری کا نظارہ بہ آسانی کیا جاسکتا تھا۔

شینا کے دروازہ کھولتے ہی میں نے دیکھا، وہ گینڈے جیسا شخص شینا کو دیکھتے ہی ادب سے سر جھکا کر کچھ بولا جسے میں نہ سن سکا۔ شینا انہیں دیکھ کر خوش نظر آنے لگی۔ میں الجھ گیا۔ یہ کیا ماجرا تھا؟ شینا نے باقی دو کو واپس لوٹ جانے کا اشارہ کیا جبکہ پانچ افراد وہیں موجود رہے۔ وہ لوگ اندر آگئے۔

میرے ذہن طباع کے کئی خانوں میں نامعلوم سے خدشات کلبلانے لگے۔ شینا کے ساتھ ان سب کا مؤدبانہ انداز اور یہی نہیں، شینا کا بھی ان کے ساتھ تحکمانہ برتاؤ بہت کچھ باور کرا دینے کے لیے کافی تھا۔

''معزز شہزادی! سردار نے ہمیں تمہاری تلاش میں بھیجا تھا۔ رانگا اور مادام چھچی (میڈم چھچی) بھی تم لوگوں کی طرف سے بہت فکرمند تھے۔'' میں نے اس گینڈے جیسی جسامت والے کو شینا سے یہ کہتے سنا تو یکلخت میرے اعصاب تن گئے۔ کانوں میں شور کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔

میں جیسے بت بنا انہیں سنتا رہ گیا کیونکہ جواب میں شینا اسے دھیرے دھیرے ان سب حالات سے آگاہ کرتی چلی گئی جو ہمارے ساتھ پیش آچکے تھے۔ گینڈے نما انسان کو شینا نے ''جبرا'' کے نام سے مخاطب کیا تھا اور باقی اس کے چار میں سے دو کو گوردن اور تیرو سے پکارا تھا۔ اول الذکر اب تک مؤدبانہ سی خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے۔

میرے ذکر پر آخر میں جبرا نے شینا سے چونک کر پوچھا۔ ''یہ پرتم یاشیان کون ہے؟ کیا واقعی وہ نیپال کی جیل سے فرار ہوا ہے؟''

جواب میں، میں نے شینا کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزرتے دیکھا۔ وہ گمبھیر لہجے میں بولی۔

''پہلے مجھے اس پر شک تھا مگر اب رات والے ایک واقعے کے بعد مجھے پورا یقین ہو چکا ہے کہ وہ بھی ہمارے دشمنوں میں سے ایک ہے۔''

میں شینا کی زبانی اپنے بارے میں یہ سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔ میرے اندر سناٹے چیخنے لگے۔ ''رات والے واقعے'' سے اس نے میری اصلیت کیسے جانچ لی تھی؟ اور ''رات والا واقعہ'' کیا تھا، وہ ہنوز میرے ذہن کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ میں تو یہی سمجھا تھا کہ اتنا عرصہ میری رفاقت، جاں نثاری پر وہ محض ایک جذباتی نشے سے گزری تھی لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ

درحقیقت وہ اپنے ایک جذباتی نشے تلے نہیں بلکہ کچھ اور ہی پرکھنے کے لیے رات کے درمیانی پہر میری کھاٹ پر آلیٹی تھی لیکن میرا اس طرح اسے دھتکار دینا اسے اپنے ”امتحان“ میں کامیاب اور مجھے ناکام کر چکا تھا۔ یعنی اگر مجھے پتا ہوتا کہ شینا کا یہ گزشتہ شب والا عمل کسی منہ زور جذبات کا پیش خیمہ نہیں بلکہ میرا امتحان لینا مقصود تھا تو میں وہی کرتا جو ایک عام آدمی ایسی ”بہتی گنگا“ میں کر ہی جاتا ہے۔

خیر، شینا میری توقع سے بڑھ کر چالاک ثابت ہوئی تھی۔ وہ اب تک میرے ہمراہ ایک مجبوری کے تحت تھی۔ گویا جس طرح میں اس سے کام نکال رہا تھا، بعین اسی طرح وہ بھی اپنا کام یعنی اپنا اور اپنے ”مقصد“ والا کام نکال رہی تھی۔

اب جبکہ منزل قریب تھی تو اس نے مجھ پر یہ کسوٹی رکھ ڈالی جس میں بلاشبہ وہ پوری تو نہیں، ایک حد تک کامیاب ہوئی تھی۔ اب جبکہ میں یہ سب دیکھ اور سن رہا تھا، مجھے فوری طور پر اپنے دفاع کے لیے مہلت اور میدان مل چکا تھا۔ بہ الفاظ دیگر یہ میرا اتفاق سے ہی، ایک پلس پوائنٹ تھا۔

”رات والا واقعہ؟“ گینڈا نما جبرا الجھ کر بولا۔

”ہاں، رات کو میں نے اسے بہکانے کی کوشش کی تھی۔“ شینا نے بتایا۔ ”وہ اگر کوئی عام آدمی ہوتا جیسا کہ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ نیپال کی جیل سے فرار ہوا ہے، فوراً مجھ پر ریجھ جاتا۔ رانگا اور مادام بھی مجھے سراب (سہراب، یعنی میں) کے بارے میں بتا چکے تھے کہ وہ صرف اپنے اہم مقصد پر توجہ رکھتا ہے اور اسے کوئی ایسی ویسی شے بہکا نہیں سکتی۔“

”یہی...... بالکل یہی نام تھا اس مورکھ کا، معزز شہزادی!“ جبرا فوراً بولا۔ ”یہ ہمارا سب سے بڑا دشمن ہے۔ تو کیا وہ تمہارے ساتھ ہے؟ اسے فوراً ہلاک کرنا ہوگا۔“

”آہستہ بولو۔ وہ ساتھ والی کوٹھری میں سو رہا ہے۔“ شینا نے کہا تو جبرا ایک دم تن کر کھڑا ہو گیا اور ساتھ ہی اس نے لمبے پھل والا چاقو اپنے ڈھیلے ڈھالے لباس سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

”دھیرج رکھو جبرا!“ شینا نے اسے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے ٹوک دیا۔ ”ابھی پوری طرح اس کے بارے میں ہمیں یقین نہیں ہے۔ میں بھی اسی غرض سے اسے پہلی گھاٹ لے جا رہی ہوں جہاں رانگا اور مادام (بھی) ہی اسے دیکھ کر تصدیق کر دیں گے۔“

”معزز شہزادی! یہ تب تک کوئی گل کھلا ڈالے گا۔“ جبرا بولا۔ خم دار پھل والا چھرا اس نے دوبارہ لباس میں اڑس لیا تھا۔

”لیکن ایک بات کی مجھے سمجھ میں نہیں آئی۔“ گوردن نامی مذکورہ ساتھی بولا پھر شینا کی طرف دیکھ کر آگے مستفسر ہوا۔ ”معزز شہزادی! پھر اس کا اصل مقصد کیا ہے؟“

”رانگا اور مادام کو ہلاک کرنا۔“ شینا کے بجائے جبرا نے جواب دیا اور شینا یہ جواب دے بھی نہیں سکتی تھی۔ ”اس مورکھ سراب (سہراب) نے رانگا کا پاکستان میں جادو ٹونے والا دھندا ختم کر ڈالا تھا بلکہ ان کے کئی اہم ساتھی بھی مار ڈالے۔ رانگا کو بھی ایک ٹانگ سے محروم کر دیا۔ مادام بھی بھی اس کے ہاتھوں مرتے مرتے بچی۔ اس کے بعد رانگا اور مادام نے بھی بعد میں سراب سے خوب انتقام لیا۔ اس کے بھی ساتھی زخمی اور ہلاک کر ڈالے۔ یہی نہیں، اس کی محبوبہ فوزیہ کو بھی قیدی بنا کر لے آئے اور بہن راحیلہ کو پہلے ہی بہکا چکے تھے۔“ جبرا اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ شینا آنکھیں پھاڑے اسے تکتی رہ گئی۔ میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔ فوزیہ کے ذکر نے مجھے جذباتی تو کر دیا تھا مگر یہاں خطرہ مین لب بام میرے گلے آن پڑا تھا۔

میں اب یہاں سے راہِ فرار کے بارے میں سوچنے لگا لیکن بھاگ کر کہاں جاتا؟ میرے لیے بہت سے مسائل کھڑے ہو سکتے تھے۔ منزل قریب تھی اور میں دور ہو جاتا۔

”ضروری تو نہیں کہ یہ وہی مورکھ سراب ہو۔“ شینا نے چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد جبرا سے کہا۔ مجھے کچھ تسلی ہوئی۔ ”میرا دل نہیں کرتا کہ پوری طرح تصدیق کیے بغیر اسے ہلاک کر دیا جائے۔ اس نے کئی خطرناک موقعوں پر میری جان بھی بچائی ہے۔“

”معزز شہزادی! اپنے مقصد کے لیے دشمن کی جان کو بھی کبھی کبھی عزیز رکھنا پڑتا ہے۔ وہی اس نے تمہارے ساتھ کیا۔ یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔“ جبرا بھیانک لہجے میں بولا۔ ”میرا تو جی کرتا ہے اسی وقت اس کی کوٹھری میں جا کر اس مورکھ کو ذبح کر ڈالوں۔“ اس کی موٹے موٹے ڈیلوں والی آنکھوں میں سفاک وحشتیں امڈنے لگیں۔

ان کا دوسرا ساتھی تیرو مشورہ دیتے ہوئے نیچی آواز میں بولا۔ ”ہم خواہ مخواہ ہی وقت ضائع کر رہے ہیں۔ معزز شہزادی کو اور نہ ہمیں اب اس مورکھ کی مدد کی ضرورت ہے۔ اسے گرفت میں لے کر ہم اس کے منہ سے سچ اگلوا سکتے ہیں۔“

اس کمبخت کا مشورہ صائب قرار پایا۔ جبرا تو چاہتا ہی یہی تھا۔ شینا نے بھی اس پر صاد کر ڈالا۔ میرے سینے کی ہلچل میں یکایک اضافہ ہو گیا۔ مجھے فوری فیصلہ کرنا تھا۔ شینا کو میرے سلسلے میں ابھی صرف شبہ ہوا تھا۔ اس کے دل و دماغ

کے کسی کونے میں ابھی تک میرے لیے شاید کوئی ہمدردی کی رمق ہو مگر جبرا اور اس کے تینوں ساتھیوں کی بات اور تھی۔ وہ ذرا بھی رسک لینے کو تیار نہ تھے۔ وہ اب پہلی گھاٹ تک شینا کے ہمراہ رہتے اور...... اب میری جگہ چھین لی تھی۔ میں اب شینا کو مزید بے وقوف نہیں بنا سکتا تھا۔

میرے بارے میں آخری فیصلہ کرتے ہی وہ سب ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے اور میری کوٹھڑی کی طرف لپکے۔ میں کھڑکی سے ہٹا اور ایک طرف کو جھاڑیوں اور جھونپڑا نما مکانوں کی عقبی دیواروں میں چھپتا چھپاتا آگے کو بھاگتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ آبادی اور کھیتوں سے بہت دور نکل کر پہاڑی جنگل میں آ گیا۔

میرا فرار اب ان کے شبہے کی تصدیق کے لیے کافی تھا۔ میری آخری منزل اب زیادہ دور نہیں رہی تھی۔ نیز مجھے راستے کا بھی علم ہو چکا تھا لہٰذا اب میں ان کے ہاتھوں بے بس نہیں ہونا چاہتا تھا۔

دیہانگ کی اس چھوٹی سی دریائی بندرگاہ کا راستہ ایک آبی گزرگاہ کی صورت میں اسی پہاڑی کے دامن سے بھی گزر رہا تھا جدھر میں نے عارضی طور پر پناہ لی تھی۔ یہاں مجھے کچھ اکا دکا کشتیاں آتی جاتی نظر آ رہی تھیں لیکن میرے ذہن میں یہاں سے کوچ کرنے کا اور ہی منصوبہ پل رہا تھا جس پر عمل کرنے کا ابھی میں نے سوچا نہیں تھا۔

دن نکلنے لگا تھا۔ دھوپ چمک رہی تھی۔ جنگل میں مختلف چرند پرند کی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ قرولی میرے پاس تھی۔ رائفل وہیں رہ گئی تھی۔ مجھے جلدی میں اسے لینا یاد نہ رہا تھا۔ شینا اور اس کے خونخوار ساتھیوں کی مدد میں پوری بستی والے میرے تعاقب میں نکل سکتے تھے۔ ایک بات کا اور مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ مجھے بومبورگا کا مجسمہ بھی ساتھ لے لینا چاہیے تھا لیکن پھر میں نے سوچا، اچھا ہی ہوا، اب مجھے اس کی کوئی ضرورت نہ تھی ورنہ بومبورگا کے مجسمے کی میرے پاس موجودگی انہیں ہر قیمت پر میرا تعاقب کرنے اور مجھے پکڑنے پر اکسائے رکھتی۔ اس طرح ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے تلاشنے کی تھوڑی بہت کوشش کر کے اور مایوس ہو کر اپنی راہ لیتے۔ مجسمہ ان کے پاس تو تھا ہی۔ میری طرف سے بھی انہیں یہی تسلی رہتی کہ میں اب بھلا یہاں سے کہاں جا سکتا تھا، وغیرہ۔

کئی باتیں میری قیاسات پر تھیں۔ تاہم عقلی دلائل بھی کچھ باور کرانے کے لیے کافی تھے۔ ایک خیال سے میں نے ذرا ستانے کے بعد دوبارہ دریا کے ساتھ ساتھ سبز پوش پہاڑیوں کی آڑ میں آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ میری مسافت لاعلم تھی، راہیں مسدود اور منزل کا اتا پتا ابھی اندھیرے میں تھا۔

شینا نے مجھے جو کچھ بتا رکھا تھا، میں اسی کے مطابق سوچ سوچ کر مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ ابھی مجھے اندازاً نصف گھنٹا ہی ہوا تھا کہ میں نے عقب میں شور کی آواز سنی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہی ہوا۔ وہ لوگ بستی کے دیگر لوگوں کے ساتھ میری تلاش میں آنے لگے تھے۔

میں نے طوفانی دوڑ لگا دی اور پل کے پل پہاڑیوں اور جنگلوں سے ہوتا ہوا دریا کے ساتھ ساتھ سفر کرتا دور نکل گیا۔ میں مسلسل کافی دیر تک طوفانی رفتار سے دوڑتا رہا تھا۔ بھاگی بوٹی کی کرامات کہیں کہیں میرے لیے بہت ساری مشکلیں آسان کرنے کا سبب بن رہی تھیں۔ بالخصوص میرے تیز رفتاری سے دوڑنے کی صلاحیت، پانی کے اندر نصف گھنٹے سے زیادہ سانس روکے پڑے رہنا اور بے مثال جسمانی قوت۔ گویا اماں جی کی بھاگی بوٹی نے مجھے واقعی "مہراب" بنا دیا تھا۔

مجھے کسی کشتی کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ بس اسی دریا کو میں نے راہنما بنا رکھا تھا جس میں اگلے دن شینا اور مجھے آسامی قصبے دیہانگ تک سفر کرنا تھا۔

ایک مقام پر مجھے دو پہاڑیوں کے درمیان مچانیں دکھائی دے گئیں۔ میں رک گیا۔ یہ غالباً بھوٹان یا پھر بھارتی ریاست آسام کی سرحدی چوکیاں تھیں۔ دریا بل کھا کر دور سے گزر رہا تھا۔ اس کا ساتھ نبھانے کے لیے مجھے بالکل کنارے پر آنا پڑتا لیکن ایسی صورت میں، میں محافظ سرحدی چوکیوں کے پہرے داروں کی نظروں میں آ جاتا جو میں نہیں چاہتا تھا۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کروں؟ شینا ہوتی تو اور بات تھی کیونکہ بقول اس کے پوٹک بستی کے کچھ لوگ ان کے ہمراہ ہوتے اور یوں ان کی چوکی محافظین سے گلوخلاصی ہوتی رہتی لیکن اب میں اکیلا کیا کرتا؟ حالات ایک دم ہی پلٹا کھا چکے تھے۔

میں جس جگہ چھپا بیٹھا تھا وہ نشیبی مقام تھا۔ میرے گرد جنگل پھیلا ہوا تھا۔ اس کے پار سبزے سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں۔ بائیں جانب دریا کا بہتا، شور مچاتا پانی۔ میں ابھی کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک گولی چلی۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خون ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

ہم سب گوڈوٹ کا انتظار کر رہے تھے۔ دراصل سرکاری طور پر اس سمندری طوفان کا نام گورڈن رکھا گیا تھا جسے میرے تین سالہ بچے نے بگاڑ کر گوڈوٹ بنا دیا تھا۔
کیریبین کے اردگرد اور بہاماس پر دھاک بٹھانے کے بعد اب یہ طوفان فلوریڈا کے شرقی ساحل کی طرف بڑھ رہا تھا اور تمام لوگ اسی خوفزدہ کرنے والی سوچوں میں تھے کہ اس کے ساحل سے ٹکرائے جانے میں کتنا وقت باقی تھا اور اس سے کتنی تباہی متوقع تھی۔
جب میرے تین سالہ بیٹے ڈیوی نے مجھ سے پوچھا کہ گوڈوٹ کب آئے گا تو ماریا اور میں دونوں ہنس پڑے۔ اتفاق یہ ہے کہ جب میں کالج میں تھا تو اسی نام کے سیموئیل بیکٹ کے ڈرامے میں ایک کردار کر چکا تھا اور اب میں نے ایک بار پھر اپنے آپ کو اس مضحکہ خیز تھیٹر کے حقیقی زندگی والے ورژن میں پایا، ریسکیو اور طوفان کی آمد کا انتظار

کچھ کردار کتنی رازوں کو ساتھ لے کر کہانی آگے بڑھاتے ہیں... ان کا تعلق بھی ایک ایسے ہی گروہ سے تھا جو جیتی جاگتی زندگیوں کے سودے کرتے اور بے خوف تماشا کرتے مگر... کوئی ایسا بھی تھا جو ان سوداگروں کا دشمن تھا اور جو ان کے ہی تماشوں کو انہی کے لیے اذیت بنانے کا ہنر جانتا تھا... اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایسا طوفان آیا جس نے ان کی بادشاہت کو ہی ختم کر ڈالا۔

طوفان زدہ

عائشہ نصیر

کرتے ہوئے۔

ڈیوی اور اس کی ماں کو میں نے اپنے والدین کے ساتھ رہنے کے لیے اوپر والے علاقے اور لینڈو بھیج دیا تھا۔ میں فائر ڈیپارٹمنٹ میں تھا اور انخلا کے فرائض میں مدد کے لیے رہنے پر رضامندی ظاہر کر چکا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک ساحلِ سمندر کے ساتھ ایک سیکشن کے لیے ذمے دار تھا۔ میرے سیکشن میں جو ولاز تھے، ان کے مالکان کا ماہانہ ٹیکس ہی میری سال بھر کی تنخواہ سے زیادہ تھا اور اچھی بات یہ تھی کہ ان سب نے گھر خالی کرنے کا حکم نشر ہونے کے بعد اپنے عالیشان گھر خالی کر دیے تھے۔ میرا کام باقیوں کو چیک کر کے اس بات کو یقینی بنانا تھا کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں اور صحیح سلامت اپنے گھروں سے نکل چکے ہیں۔ اس وقت بھی ایک آخری جوڑے کے ساتھ بات کرنے اور دیکھنے کے بعد میں اپنی فہرست کے آخری اسٹاپ کی طرف بڑھا اور یہ سب سے زیادہ پریشانی والا تھا۔ رابرٹو موتویا اورٹیز۔

اورٹیز، کیوبا کا رہنے والا تھا جو ستر کی دہائی کے اواخر میں بوٹ کے ذریعے آیا تھا۔ اس وقت کے صدر کارٹر کی طرف سے کیوبا کے باشندوں کو کیموزم کو چھوڑنے اور بلا روک ٹوک امریکا کا سفر کرنے کی اجازت ملی تو کاسترو نے اسے ایک چیلنج کے طور پر لیا اور وہی کیا جو ان حالات میں ہر چالاک لیڈر کرتا۔ اس نے اپنی جیلوں اور پاگل خانوں کے دروازے کھولے اور ان ”پناہ کے متلاشیوں“ کو لانچ پوائنٹ تک پہنچا دیا جس کا بھیانک خمیازہ جنوبی فلوریڈا آج تک بھگت رہا ہے۔

بہرحال، افواہ یہ تھی کہ نوجوان اورٹیز نے تیزی سے اپنی جگہ بنائی۔ وہ منشیات کے کاروبار میں ملوث ہو گیا اور کاروباری ذہانت کے ساتھ بے رحمی ایک اضافی خوبی تھی جس نے اس کی ترقی کی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو دور کر دیا۔ اب تقریباً چالیس سال بعد جب وہ بڑھاپے کی سرحد کو پہنچ چکا تھا، اپنی نوجوان حسین بیوی اور تین بچوں کے ساتھ سمندر کے کنارے رہتا تھا۔ اس کی یہ جاگیر اس قدر وسیع تھی کہ اس میں ایک بہت بڑا مینشن، آٹھ کاروں کا گیراج اور ایک پرائیویٹ ہینگر جس میں ہر وقت ایک ہیلی کاپٹر موجود رہتا۔ اس نے کبھی بھی باڈی گارڈز کے بغیر باہر کا سفر نہیں کیا جس کی قیادت ٹیوفیلو ہیررا نامی ایک بھاری بھرکم کیوبن کے پاس تھی۔

میں اورٹیز سے صرف ایک بار ملا تھا، تقریباً چھ ماہ پہلے جب میں نے ایل پالاسیو ڈیل مار کے ایک گھر میں ایک چھوٹے بچے کو سانس لینے میں دشواری کا سامنا کرنے والی کال کا جواب دیا تھا۔ وہ سمندر کے کنارے کسی محل جیسا تھا۔ ہم سات فٹ لوہے کے کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوئے اور اپنی گاڑی کو بجری کی لمبی ڈرائیو وے پر روک دیا۔ اس کے آدمیوں میں سے ایک ہمیں لے کر گھر کے پچھلی طرف آیا۔ شراب کے نشے میں دھت مردوں اور بکنی میں ملبوس لاطینی خوبصورت پریوں کے جھنڈ سے گزرنے کے بعد میں نے پول کے کنارے ایک چھوٹے لڑکے کو دیکھا۔ لڑکے کا چہرہ نیلا ہو رہا تھا اور اس کی سانسیں ناہموار تھیں۔

اس کے ساتھ کھڑے جسیم آدمی نے میری طرف ملتجی نظروں سے دیکھا اور میں فوراً جان گیا کہ اس کا اور اس لڑکے کا کیا رشتہ ہے۔

جب میرا ساتھی ابتدائی سوالات پوچھنے کی کوشش کر رہا تھا تو میں نے لڑکے کو اس کے باپ کے بازوؤں سے کھینچا اور اس کے پیٹ کو اپنے بازوؤں میں جکڑتے ہوئے مخصوص انداز میں دباؤ ڈالا۔ کچھ خاص فرق نہیں پڑا لیکن میں نے اپنے کندھے پر ہاتھ کی ایک بھاری گرفت محسوس کی۔ انگلیاں میرے شانے میں دھنس رہی تھیں۔ درد کی ایک تیز لہر نے مجھے چاروں طرف نظریں دوڑانے پر مجبور کر دیا۔ ایک دیوقامت سیاہ فام آدمی میرے سر پر کھڑا تھا۔ اس کے کندھے چوڑے تھے، شکل مائیک ٹائی سن سے مل رہی تھی۔ وہ کسی ناراض دیوتا کا اوتار لگ رہا تھا۔

”اس کا دم گھٹ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس کے ائروے کو صاف کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، ڈیم اٹ۔“

جسیم آدمی نے اسے کچھ کہا۔

میں ہسپانوی سمجھ گیا۔ وہ اسے کہہ رہا تھا۔ ”جانے دو۔“

دباؤ ختم ہو گیا۔ اس کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی میں نے بچے پر اپنی تکنیک دوبارہ آزمائی۔ چند لمحوں بعد لڑکے کی سانسیں چل پڑیں اور اس کی نیلی رنگت بتدریج نارمل ہوتی چلی گئی۔ خوشی کے اظہار کے ساتھ ملی جلی آوازیں ابھریں۔ بھاری بھرکم آدمی کھڑا ہوا اور بے اختیار مجھے گلے لگا لیا۔ اب وہ انگریزی میں میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔

”تم نے اسے بچا لیا۔ میں تمہارا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“

میں نے اسے یقین دلایا کہ میں نے اس پر کچھ احسان نہیں کیا اور ہم بچے کو مزید چیک اپ کے لیے ER لے جانا چاہتے ہیں۔

اس نے سر ہلایا اور بولا۔ ”میرا ذاتی معالج اور ان کا

عملہ پہلے ہی یہاں موجود ہے۔"
"آپ کون ہیں؟" میرے ساتھی نے پوچھا۔
"لڑکے کے دادا؟"
اس کے چہرے پر تناؤ بھرا تاثر ابھرا اور نرم لہجہ ایک دم سپاٹ ہو گیا۔
"میں رابرٹو مونٹویا اورٹیز ہوں۔" اس نے کہا۔
"اور میں اس کا باپ ہوں۔"
جس بڑے آدمی نے میرا کندھا پکڑا تھا، اس نے ہسپانوی میں کچھ حکم دیا اور دو لوگ میرے ساتھی کو واپس ہماری ایمبولینس کی طرف لے گئے۔ جب اورٹیز کے گارڈز کا ایک اور جوڑا میری طرف بڑھنے لگا تو اس نے ہسپانوی میں ایک جملہ کہہ کر انہیں روک دیا۔
"نہیں، یہیں رہو۔"
میں سمجھ گیا کہ وہ گارڈ سے کہہ رہا ہے کہ مجھے وہیں چھوڑ دو جہاں میں ہوں لیکن میں نے ان پر ظاہر نہیں کیا کہ میں ہسپانوی جانتا ہوں۔ میرا نظریہ ہے کہ آپ بات کرنے سے زیادہ سن کر سیکھ سکتے ہیں۔
اورٹیز کے انداز میں پھر سے گرمجوشی عود کر آئی۔ اس نے میرے شانے کو تھپتھپایا۔
"تمہارا نام کیا ہے جوان؟"
"موریسن!" میں نے کہا۔ "باب موریسن!"
اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی اور میں نے پہلی بار اس کے بائیں رخسار پر ایک زخم کا نشان دیکھا۔ یہ پتلا نشان جبڑے کی ہڈی تک چلا گیا تھا۔
"باب؟" اس نے بھویں سکیڑ لیں۔ "لیکن میں تمہیں ایک نیا نام دوں گا...... کرسٹو...... اس کا مطلب ہے، نجات دہندہ۔"
اسی وقت ایک نیا گروپ پہنچا جس کے لیڈر کے ہاتھ میں ایک سیاہ میڈیکل بیگ تھا اور اس کے پیچھے سفید نرسوں کی وردیوں میں دو خواتین تھیں۔ اس شخص نے جس نے اپنی شناخت ڈاکٹر پیریز کے نام سے کروائی، لڑکے کے گلے میں روشنی ڈالنے کے بعد مسکراتے ہوئے اسے ٹھیک قرار دیا۔
ایمبولینس کی طرف واپس جاتے ہوئے اورٹیز میرے دائیں اور اس کا باڈی گارڈ ٹیوفیلو میرے بائیں جانب تھا۔ اورٹیز نے ایک بازو میرے کندھوں کے گرد یوں رکھا تھا جیسے ہم دیرینہ دوست ہوں۔
"کرسٹو! میں ایک بار پھر تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ وہ لڑکا، میرا بیٹا، وہ میری زندگی کی روشنی ہے۔"
میں نے اسے یقین دلایا کہ میں نے جو کچھ بھی کیا وہ میری ڈیوٹی تھی۔
"اگر تم کچھ کھانے یا پینے کے لیے تھوڑی دیر ٹھہرو تو مجھے خوشی ہوگی۔"
"مجھے بھی خوشی ہوتی لیکن میں اس وقت جاب پر ہوں۔" میں نے نرمی سے اس کی دعوت مسترد کر دی۔
جب میں اور میرا ساتھی واپس اسکواڈ میں بیٹھے تو ٹیوفیلو اچانک سائڈ کی کھڑکی پر نمودار ہوا اور اپنی بڑی انگلیوں سے شیشے کو بجانے لگا۔ میں نے اسے نیچے کر دیا۔
"میں گارڈ کو فون کرتا ہوں اور اس سے کہتا ہوں کہ تمہیں جانے دو۔ تمہیں نہ رکنا ہے اور نہ ہی ایس یو سے باہر نکلنا ہے۔" وہ یوں رکا جیسے صحیح الفاظ تلاش کر رہا ہو۔ "تمہاری ایمبولینس سے...... سمجھے؟"
میں نے صرف سر ہلایا اور اسکواڈ کو گیئر میں منتقل کر دیا۔ جب ہم روانہ ہوئے تو میں نے کہا۔ "یہ ایک بڑا آدمی تھا۔"
میرے ساتھی نے کہا۔ "ٹھیک سمجھے۔ یہ ٹیوفیلو ہیریرا عرف دی ہیمر ہے۔ جانتے ہو یہ یہاں آنے سے پہلے کیوبا کی قومی باکسنگ ٹیم میں شامل تھا۔"
میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ "یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"
"تقریباً ایک سال پہلے اسے چین ایم گیمز میں باکس کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اپنے دائیں ہاتھ کو کسی ہتھوڑے کی طرح استعمال کرتے ہوئے اس نے اپنے تمام مخالفین کو دھول چٹا دی تھی۔"
"ہاں، شاید میں نے اس کے بارے میں سنا ہے۔" میں نے کہا۔
"ہاں، میرا اندازہ ہے کہ تم باکسنگ کے فین نہیں ہو۔ سب کا خیال تھا کہ یہاں آنے کے بعد ٹیوفیلو ایک باکسنگ ہیرو بن جائے گا لیکن اس کے بجائے اس نے...... رابرٹو مونٹویا اورٹیز سے رابطہ کیا۔" اس نے ایک بڑی آہ بھری۔ "میامی کے شمال کا سب سے بڑا منشیات فروش۔"
☆☆☆
چھ ماہ پہلے اس پہلی ملاقات کے بارے میں سوچتے ہوئے میں نے اپنی گرے فورڈ کراؤن اورٹیز کے گیٹ کے سامنے روکی۔ یہ ہماری "اضافی گاڑیوں" میں سے ایک تھی جو کافی پرانی تھی۔ لوہے کا گیٹ بند تھا اور مجھے دوسری طرف گارڈ کی جھونپڑی میں کوئی نظر نہیں آیا۔ میں نے کھڑکی نیچے کی، باہر جھک کر کال باکس کا بٹن دبایا۔ اس کے اوپر

ایک کیمرے کا لینس دکھائی دیا۔ چند سیکنڈ کے بعد ایک آواز آئی۔ ''کون؟''

''میں باب موریسن، کاؤنٹی فائر اینڈ ریسکیو سے ہوں۔ مجھے چیک کرنا ہے کہ آپ انخلا کے لازمی حکم کی تعمیل کر رہے ہیں۔''

''ہونہہ۔''

میں نے چڑتے ہوئے اپنی بات دہرائی، اس امید پر کہ کیمرا میری اس جھنجلائی ہوئی شکل کو ضرور کیچ کرے گا۔ میرے پاس ایک چھوٹی فائر اینڈ ریسکیو شیلڈ تھی لیکن میں اسے کیمرے کے سامنے نہیں دکھانا چاہتا تھا، اس ڈر سے کہ وہ سوچیں گے کہ میں پولیس والا ہوں۔ یہ ایک اچھا خیال نہیں تھا، وہ بھی تب جب آپ کسی معروف منشیات فروش کے دروازے پر کھڑے ہوں۔

''اندر بتاؤ کہ میں باب موریسن ہوں۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔ ''کرسٹو!'' میں نے وہ نام لیا جو اورٹیز نے مجھے دیا تھا، یہ سوچ کر کہ اگر وہ اندر موجود ہو۔

کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ سمندری طوفان آنے والا ہے؟ یا شاید وہ اتنے سخت جان تھے کہ انہیں پروا نہیں تھی۔ بہر حال یہ تو گورڈن کے پہنچنے پر ہی پتا چلتا کہ اصل سخت جان کون ہے۔

میں جو وہاں کھڑا سورج کی شعاعیں اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا، اچانک موسم کو بدلتے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مشرقی سمت سے اٹھنے والی سرد ہوا اتنی تیز تھی کہ میں لڑکھڑا گیا۔ موسم کے تیور یکا یک خطرناک ہوتے ہوئے اس بڑے خطرے کی طرف اشارہ کر رہے تھے جو صرف چند سو میل دور تھا۔ آخر کال باکس میں اسپیکر سے ایک اور آواز گونجی۔

''کرسٹو! کیا یہ تم ہو، میرے دوست؟''

''یہ میں ہوں، مسٹر اورٹیز! مجھے اندر آ کر آپ سے بات کرنا ہے۔''

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''سی، سی۔ اندر آجاؤ۔''

آہنی گیٹ آہستہ آہستہ کھلا اور میں نے گاڑی اندر داخل کی۔ پچھلی بار سے لے کر اب تک وہاں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، سوائے محافظ کتوں کے جوڑے کی عدم موجودگی کے، جسے پچھلی بار ہم نے گراؤنڈ میں گشت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے گھر کے سامنے والی سرکلر ڈرائیو میں گاڑی پارک کی۔ ڈرائیو وے کے ساتھ ڈولفن پر سوار لڑکے کے مجسمے سے ایک آرائشی فوارہ گر رہا تھا۔

جب میں باہر نکلا تو ایک بڑے سائے نے سورج کی روشنی روک دی۔ میں نے اوپر دیکھا۔

ٹیوفیلو۔

اس کی سیاہ آنکھیں دو سیاہ سنگِ مرمر کی طرح مجھے گھور رہی تھیں۔ میں اس کی بلیک شرٹ سے جھانکتی اس خطرناک گن کو بھی دیکھ سکتا تھا۔

سامنے کا دروازہ کھلا اور اورٹیز باہر نکلا۔ اس نے ٹین پولو شرٹ اور خاکی ڈاکرز پہن رکھے تھے۔ مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

''کرسٹو، میرے دوست۔'' اس نے کہا۔

میں اس کی طرف قدم بڑھا رہا تھا جب ٹیوفیلو نے اچانک مجھے پیچھے سے پکڑ کر جھٹکا دیا اور مجھے میری کار سے لگاتے ہوئے میری تلاشی لینے لگا۔ اس کے ہاتھ مجھے یوں محسوس ہو رہے تھے جیسے وہ باکسنگ کے دستانے پہن کر مجھے تھپتھپا رہا ہو۔

اورٹیز ہسپانوی میں کچھ بڑبڑایا لیکن ٹیوفیلو نے اپنی تلاشی جاری رکھتے ہوئے کوئی جواب نہیں دیا۔

ٹیوفیلو نے اپنی چیکنگ ختم کی اور پیچھے ہٹ گیا۔

اورٹیز نے دوبارہ کچھ کہا تھا۔

''ضرور، باس!'' اس نے سر جھکایا۔

اورٹیز چند لمحے سخت تاثرات لیے اس ٹیوفیلو نامی دیو کو گھورتا رہا پھر میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے اس نے مجھے اپنا ہاتھ پیش کیا۔

''کرسٹو! ٹیوفیلو تمہارے ساتھ جس بدتمیزی کے ساتھ پیش آیا، اس کے لیے معذرت۔ یہ صرف مجھے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ اس کا کام ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کے باڈی گارڈ کی فرض شناسی قابل تعریف ہے لیکن میں بھی یہاں اس لیے ہوں کہ میں کاؤنٹی کے تمام باشندوں کو محفوظ رکھ سکوں، یہ میرا کام ہے۔''

ایسا لگتا تھا کہ میری بات سے اورٹیز تھوڑا پریشان ہو گیا تھا۔

''انخلا کا حکم......'' میں نے مزید وضاحت کی۔ ''یہ کل نکلا تھا۔ سمندری طوفان کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہر ایک کو علاقہ خالی کرنا چاہیے۔''

''اوہ...... اب سمجھا۔'' وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں میرے دوست! میں نے پہلے ہی اپنے خاندان کو بھیج دیا ہے۔ میں نے اپنے محافظ کتوں کو بھی ایک کینل میں رکھا ہے تاکہ پانی بڑھنے پر وہ ڈوب نہ جائیں۔''

"گڈ۔" میں نے سر ہلایا۔ "لیکن آپ اب بھی یہاں ہیں، ساتھ ہی آپ کا عملہ بھی......" میں نے جملے کو ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ جلدی سے بولا۔ "ہم دن کے آخر تک روانہ ہو جائیں گے۔ مجھے یہاں کچھ صفائی کرنا تھی۔"

میں اس "صفائی" کا مطلب تو نہیں سمجھا لیکن اپنا خدشہ ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ "تب تک شاید زیادہ وقت نہ بچا ہو۔"

اورٹیز نے کندھے اچکاتے ہوئے ایک مسکراہٹ کے ساتھ میری وارننگ کو ہوا میں اڑا دیا اور اپنے وسیع و عریض گھر کی طرف اشارہ کیا۔

"مجھے یقین ہے کہ ہم یہاں طوفان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس گھر کی تعمیر بہت مضبوط ہے اور میرے پاس جنریٹر بھی ہے۔"

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ اٹھایا اور بات جاری رکھی۔

"تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم جلدی ہی روانہ ہوں گے۔ میرے پاس ایک آٹوموبل ہے جو سیلاب زدہ سڑکوں میں سے گزر سکتا ہے۔ آؤ، آؤ۔ میں تمہیں دکھاتا ہوں۔"

اس نے میرا بازو پکڑا اور مجھے آٹھ کاروں والے بڑے گیراج تک لے گیا۔ عمارت کے الارم باکس میں ایک کوڈ دباتے ہوئے وہ میری طرف متوجہ ہوا اور مسکرایا۔

اوور ہیڈ گیراج کا دروازہ اوپر کی طرف اٹھا اور میں نے وہاں ایک کیموفلاج ملٹری ہموی کو پارک دیکھا۔

"زبردست ہے نا؟"

میں اس سے بحث نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اتنا اونچا لگ رہا تھا کہ سیلاب زدہ سڑکوں پر دوڑ سکے۔ میں جانتا تھا کہ ملٹری گریڈ ہمویز نے خاص طور پر ایگزاسٹ سسٹم کو بڑھایا تھا جس کی وجہ سے وہ کئی فٹ گہرے پانی میں سے بھی گزر سکتے تھے لیکن پھر بھی وہ ایک جوا کھیل رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر خطرات کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس بحث کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ وہ بس اپنا بڑا سا سر ہلا رہا تھا۔

ٹوفیلو کئی فٹ دور کھڑا اپنے چہرے پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ لیے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اورٹیز اس کی طرف متوجہ ہوا اور کہا۔ "فروٹ باکس لے آؤ۔"

ٹوفیلو کی نظریں اورٹیز سے میری طرف چلی گئیں اور دوبارہ اپنے باس کی طرف۔ وہ ایک گہرا سانس لے کر گھر کے اندر چلا گیا۔

"میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں کرسٹو!" اورٹیز نے کہا۔ "تمہاری بہادری کے لیے کہ تم اس طوفان میں باہر نکلے۔"

میں نے اسے بتایا کہ یہ ضروری نہیں ہے لیکن اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور سر ہلایا۔

"نہیں۔ تم اپنے گھر والوں کے لیے لے جاؤ، حمیان۔"

اس سے پہلے کہ میں مزید احتجاج کرتا، ٹوفیلو ایک بڑا ڈبا اٹھائے باہر آیا، میری گاڑی کی طرف بڑھا اور ایک ابرو اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"مسٹر اورٹیز!" میں نے کہا۔ "اس کی واقعی کوئی ضرورت نہیں۔"

"یہ زیادہ کچھ نہیں، بس فروٹ ہیں۔" اس نے میرے گال پر تھپکی دی۔

آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ میں بحث کرنے میں اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں اور ٹرنک کھولنے کے لیے کار تک پہنچا۔ ڈھکن کھلا اور ٹوفیلو نے باکس کو اندر رکھا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہوئے میں نے اپنی وارننگ کو دہرایا کہ طوفان چند گھنٹوں میں یہاں پہنچ سکتا ہے اور اس سے پہلے انہیں باہر نکلنا ہوگا۔

"اور کیا؟" اورٹیز نے کہا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ "تم مجھے کیوبا واپس بھیج دو گے؟"

اس مذاق پر میں مسکرانے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکا۔ میں اورٹیز کی ہٹ دھرمی سے اتنا جھنجلایا ہوا تھا کہ میں نے مرکزی دروازے سے باہر نکلتے ہی میرے پیچھے آنے والے سیاہ کیڈلاک کو نوٹس ہی نہیں کیا۔

میں دو بلاکس آگے آ چکا تھا اور گھروں کے اگلے سیٹ کی طرف جانے کی تیاری کر رہا تھا جس کی مجھے جانچ کرنا تھی۔ جب میری نظر اپنے پیچھے کیڈلاک کی ونڈ شیلڈ میں سرخ اور نیلی روشنیوں پر پڑی۔

ونڈ شیلڈ کے ذریعے میں سامنے والی نشستوں پر ڈاڑھی والے دو سفید فام آدمیوں کو دیکھ سکتا تھا۔ میرا پریشان ہونا فطری تھا۔ میں نے اپنا ریڈیو مائیکروفون پکڑا۔

"ٹوئنٹی ون ٹو بیس۔" میں نے کہا۔ "کیا تم مجھے سن رہے ہو؟"

"تھین فور ٹوئنٹی ون۔" چیف کی آواز آئی۔ اس نے ایک ڈسپیچ کے علاوہ باقی سب کو گھر بھیج دیا تھا۔ وہ خود ریڈیو پر موجود تھا اور خود کمانڈ سینٹر چلا رہا تھا۔ "کیا چل رہا ہے؟"

میں نے کیڈلاک کو اپنی گاڑی کے ارد گرد جھولتے ہوئے دیکھا۔ وہ مجھے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے

اسے اپنی پوزیشن بتائی اور کہا کہ یہاں ایک سیاہ کیڈلاک ہے جس میں پولیس کی ایمرجنسی لائٹس مجھے پریشان کر رہی ہیں۔ میں نے مزید کہا کہ وہ لوگ مجھے پولیس والے نہیں لگ رہے۔

کیڈلاک اب میرے برابر آچکا تھا۔ پسنجر سائڈ سے ایک مضبوط بازو باہر نکلا۔ یقینی طور پر وہ یہی چاہتا تھا کہ میں گاڑی روک دوں لیکن سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ میں ایسا کرتا، بنا یہ جانے کہ وہ کون لوگ تھے یا ان کے ذہنوں میں کیا تھا۔

میرے ریڈیو پر ایک اور آواز آئی۔ ”ٹوینٹی ون فرام تھرٹی ون۔“

میں اس کال سائن کو جانتا تھا۔ یہ جیری ویلچ تھا، شیرف کا ڈپٹی۔ وہ اس علاقے میں ڈیوٹی پر موجود دو پولیس اہلکاروں میں سے ایک تھا۔

میں نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن چیف اور جیری دونوں کی آوازیں غلط ملط ہونے لگیں اور ریڈیو ٹریفک معطل ہوگئی۔

اسی وقت کیڈلاک اچانک میرے سامنے آگیا۔ اگر میں فوراً بریک نہ لگاتا تو تصادم یقینی تھا لیکن اس اچانک بریک لگانے پر جو شدید جھٹکا مجھے لگا، میں اچھلا اور سیٹ بیلٹ کی وجہ سے دوبارہ اپنی سیٹ پر گر گیا۔ چند گہری سانسیں خارج کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک، بڑا داڑھی والا آدمی میری کھڑکی کے پاس کھڑا مجھے گن دکھا رہا تھا پھر اس کا بایاں ہاتھ آگے بڑھا اور کھینچ کر میرا دروازہ کھول دیا۔ گن کا بیرل میری ناک سے اب تقریباً ایک انچ کے فاصلے پر تھا۔

”گاڑی سے باہر۔“ اس نے کہا۔ ”ابھی۔“

”مجھے اسے پارک میں ڈالنے دو۔“ میں نے کہنا شروع کیا لیکن اس نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر اگنیشن بند کر دیا۔ گھبراہٹ میں میری سیٹ بیلٹ بھی نہیں کھل رہی تھی جب اس نے مجھے گاڑی سے باہر گھسیٹا۔

”فیڈرل ایجنٹس۔“ اس نے کار کے دروازے سے میرا سینہ دباتے ہوئے کہا۔ ”اپنے ہاتھ کار کے اوپر رکھو۔“

شاید طوفان آنے کو تھا۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ جسم کو چھیدتی محسوس ہو رہی تھی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ میں چیخنے میں کامیاب ہوگیا۔

”ہم فیڈرل ایجنٹس ہیں۔“ ایک اور آواز آئی۔ میں نے اس طرف اپنا سر موڑا۔ اس کا دوسرا ساتھی ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھول کر باہر نکل رہا تھا۔

”وہ کہاں ہے؟“ داڑھی والا آدمی تلاشی کے انداز میں میرا جسم ٹٹولنے لگا جبکہ اس کے دوسرے ساتھی نے میری کار کو پارک کرنے کے بعد اگنیشن سے چابیاں نکالیں اور جا کر ٹرنک کھولا۔

”کون ہو تم لوگ؟“ میں چلایا۔ ”میں کاؤنٹی فائر اینڈ ریسکیو کے لیے کام کرتا ہوں۔“

”اوہ ہاں، اس باکس کو ریسکیو کرنے کی کوشش کر رہے ہو جو اورٹیز نے تمہیں دیا؟“ میرے پاس کھڑا داڑھی والا طنزیہ لہجے میں بول اٹھا۔

”باکس؟“ وہ یقیناً کسی دوربین سے اورٹیز کے گھر پر نظر رکھے ہوئے تھے ورنہ انہیں کیسے پتا چلتا۔ اس خیال کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اورٹیز نے کہا تھا یہ صرف پھل ہیں لیکن کیا ہوتا اگر اس باکس میں کچھ اور نکل آتا؟

ٹرنک پر موجود آدمی نے چاقو نکالا اور اس باکس کو کافی آسانی سے کھول دیا۔

”ہے......“ میں نے کہا۔ ”کیا تمہیں اس کے لیے وارنٹ کی ضرورت نہیں ہے؟“

میرے ساتھ کھڑا آدمی میرا جبڑا پکڑ کر غرایا۔ ”کیوں......اب تم ہمیں قانون سکھاؤ گے۔“

”جیمیسن!“ کار کے عقب میں موجود آدمی چلایا۔ ”خود کو قابو میں رکھو۔“

”لیکن......“ جیمیسن نے کچھ کہنا چاہا۔

”لیکن ویکن نہیں۔“ دوسرے نے کہا۔ ”لڑکے سے دور رہو، تم آؤٹ آف کنٹرول ہو رہے ہو۔“

اس کے سخت لہجے اور جیمیسن کے حکم کی تعمیل نے مجھے بتا دیا کہ ان میں باس کون ہے۔

جیمیسن نے میرا جبڑا چھوڑا تو میں نے کار کے ٹرنک پر رکھے باکس کو دیکھا۔ چاقو نے باکس کو سیل کرنے والے ٹیپ کے ٹکڑے کر دیے تھے۔

یا خدا! کیا ہوگا اگر اس میں سے کچھ اور نکلا؟ میں کیسے امید رکھ سکتا ہوں کہ اندر کچھ بھی غیر قانونی نہ ہو۔ آخر کار یہ ایک منشیات فروش کا تحفہ تھا اور اگر ایسا ہوا تو میں انہیں کیسے قائل کروں گا کہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

میں نے گاڑی کے عقبی حصے میں موجود جیمیسن کے ساتھی کو کچھ بڑبڑاتے ہوئے سنا۔ اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ اب وہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔

”پھل ہیں۔“ اس نے بہ آوازِ بلند کہا۔

میرے ساتھ کھڑے جیمیسن نے بھی زیرِلب کئی گالیاں نکالیں۔ پتا نہیں ان گالیوں کا مخاطب میں تھا، اورٹیز تھا یا پھر یہ باکس۔ اس سے پہلے کہ کوئی مزید کچھ بول پاتا، ہوا کے دوش پر سرسراتی پولیس کے سائرن کی آواز نے ہم سب کو چونکا دیا۔ میں مڑ کر دیکھنے لگا۔

یہ کاؤنٹی شیرف کی گاڑیوں میں سے ایک تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں سڑک کنارے اسکواڈ کار روکتے جیری وینچ باہر نکلا۔ ہمارے اس سائڈشو پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر واضح تشویش ابھر آئی۔ کاؤنٹی میں ہماری مشترکہ ملازمت کے علاوہ ہم ایک دوسرے سے زیادہ واقف نہیں تھے لیکن پھر بھی اس وقت اسے دیکھ کر میں نے اندرونی خوشی محسوس کی۔

"یہ ہمارا آدمی ہے باب موریسن! کاؤنٹی کے لیے کام کرتا ہے۔" جیری قریب آیا۔

"ہاں...... یہ ہمیں بتا چکا ہے۔" میری گاڑی کے پاس کھڑے آدمی نے جواب دیا پھر اس نے چاقو کو جوڑ کر بند کیا اور ہمارے پاس آگیا۔

"معذرت مسٹر موریسن!" اس نے کہا۔ "میں اسپیشل ایجنٹ کوپر، ڈی ای اے ہوں۔ یہ میرا پارٹنر ہے، ایجنٹ جیمیسن!" میں نے کوپر سے ہاتھ ملایا اور جیمیسن کو دیکھ کر صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

کوپر نے کہا۔ "ہم اس گھر کی نگرانی کر رہے تھے جس پر تم ابھی موجود تھے۔ ہم نے دیکھ لیا تھا تم کچھ لے کر جا رہے ہو۔"

"تو تم نے مجھے اسی لیے روکا؟" میں نے پوچھا۔ "تم نے یہ نہیں سوچا کہ میں اتنا بے وقوف ہوں گا کہ کوئی غیر قانونی چیزیوں کھلے عام اپنی گاڑی میں لے کر جاؤں گا؟" میرے لہجے میں تلخی آئی۔

اس سے پہلے کہ کوپر جواب دیتا، اس کا ساتھی آگے جھک کر میرے سامنے آیا۔ اس کی ڈاڑھی میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔

"ہمارے ساتھ ہوشیاری مت کرنا موریسن! خاص طور پر ایک مشہور منشیات فروش کے ساتھ دوست دوست کھیل کر تو بالکل نہیں۔"

اس کے منہ سے باسی کافی اور سگریٹ کی بو آرہی تھی۔ میں تھوڑا پیچھے ہٹا۔ "تم کیا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہو؟"

جیمیسن نے غصے سے اپنی مٹھی بھینچی لیکن کوپر اور وینچ دونوں نے پہنچ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

"دیکھو......" جیری نے کہا۔ "میں اس آدمی کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ یہ کسی غیر قانونی کام میں ملوث نہیں۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں۔"

کوپر نے جیمیسن سے کہا۔ "گاڑی میں واپس جاؤ۔ ابھی۔"

جیمیسن نے ناراض نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر پیر پٹختے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف چل دیا۔

کوپر میری طرف پلٹا۔ "دیکھو موریسن! مجھے افسوس ہے لیکن ہم کئی مہینوں سے اورٹیز کے پیچھے ہیں۔ یہاں اس

کے آپریشن کے بارے میں کوئی لیڈ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بغیر کسی وقفے کے کئی گھنٹے کام کر رہے ہیں۔"

"یہ ایک بہانہ ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ سچ ہے باب!" جیری نے تائید میں سر ہلایا۔ "یہ لوگ کافی عرصے سے اورٹیز کی نگرانی پر ہیں۔"

کوپر نے کہا۔ "ہم پر اوپر سے بہت پریشر ہے۔ ہمیں یہ اطلاع ملی تھی کہ اورٹیز کچھ حرکت کرنے والا ہے۔ ہمیں یقین نہیں ہے کہ اس کے مینشن کے باہر اس سمندری طوفان میں اس کا پلان کیا ہوگا۔ اسی لیے جب ہم نے تمہیں دیکھا تو ہم نے فطری طور پر فرض کر لیا......" اس نے بقیہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ "تو تمہارے پاس سرچ وارنٹ کے ساتھ اس کے گھر میں گھسنے کے ٹھوس ثبوت نہیں ہیں؟"

کوپر نے سر ہلایا۔ "اس وقت تو نہیں۔ کمانڈ نے ہمیں سمندری طوفان کی وجہ سے رکنے اور واپس آنے کا حکم دیا لیکن ہم جانتے ہیں کہ ہم نتائج کے کافی قریب ہیں۔" اس نے کیڈلاک کی طرف دیکھتے ہوئے جیمیسن کو انگوٹھا دکھایا۔ "اور ٹونی اپنی فیملی کے لیے فکرمند ہے۔ وہ لیک ورتھ میں ہیں اور اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ ان کے پاس جا پائے۔"

"تم جانتے ہی ہو گے کہ یہ کیسا ہوتا ہے۔ تم بھی تو اپنی فیملی سے دور ہو، ہے نا باب؟" جیری نے کہا۔ اس نے اپنے چوڑے جبڑوں والے چہرے پر بھاری بھرکم مونچھیں بھی رکھ چھوڑی تھیں۔

"ٹھیک ہے، میں اس کی بدتمیزی کو اس کی پریشانی سے تعبیر کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

کوپر نے مسکرا کر ایک بار پھر ہاتھ بڑھایا۔ "ویل، تھینک یو۔"

"لیکن میں چاہوں گا کہ اب تم مجھے میرا کام کرنے دو اور ریکارڈ کے لیے بتا دوں کہ میں نے اورٹیز کے بیٹے کو تقریباً چھ ماہ قبل دم گھٹنے سے بچایا تھا۔ اس کے بعد سے یہ دوسری بار ہے جب میں نے اسے دیکھا یا اس سے بات کی ہے۔ ہم دوست نہیں ہیں اور آج میں صرف یہ دیکھنے گیا تھا کہ اس نے گھر خالی کیا یا نہیں۔ مجھے تو پتا بھی نہیں تھا کہ اس باکس میں کیا ہے۔"

کوپر نے ڈبے کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا اگر میں ان میں سے ایک دو سنترے لے لوں؟ لیک ورتھ تک کافی لمبی ڈرائیو ہے اور راستے میں کوئی ریسٹورنٹ نہیں۔"

میں نے قہقہہ لگایا۔ "مجھ پر احسان کرو اور پورا باکس لے لو۔"

☆☆☆

میں نے دوپہر کا بقیہ حصہ اور شام کے اوائل تک اسپتال اور دو نرسنگ ہومز کے آخری انخلا میں مدد کی۔ جب میں فارغ ہوا تو میں بھوکا تھا اور خواہش تھی کہ میں ان میں سے کچھ سنترے اور کیلے کھا لوں۔ ساتھ ہی ساتھ میں امید کر رہا تھا کہ جیمیسن اپنے بے ہودہ رویے کی وجہ سے کسی نہ کسی حادثے کا شکار ضرور ہو۔

ہیڈکوارٹر میں چیف اور ایک دو MRE میرے منتظر تھے۔ میں بیٹھ گیا۔ چیف نے مجھے اور فائر فائٹرز کے باقی عملے کو گورڈن کی پیش رفت کے بارے میں آگاہ کیا۔

"اب یہ سو میل سے بھی کم دوری پر ہے مگر اس کی رفتار کافی تیز ہے تو امکان ہے کہ یہ آدھی رات کے بعد کسی وقت ساحل سے ٹکرائے گا۔"

ہم چاروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہم پہلے بھی اس سے گزر چکے تھے اور جانتے تھے کہ کیا توقع کرنی ہے۔

"بدقسمتی سے......" چیف نے جاری رکھا۔ "ہمیں سن شائن ٹول وے پر ساحل پر آنے والے ان بے وقوفوں کی تلاش میں رہنا پڑے گا جنھوں نے انخلا کے احکامات پر دھیان نہیں دیا۔ ایک بار اگر یہ طوفان یہاں پہنچ گیا تو آپ سب جانتے ہیں کہ کیا ہوگا۔"

رینڈولف نے کہا۔ "میں اس سے پہلے بھی ایسے طوفان میں گھر سے نہیں نکلا۔"

وہ فائر ریسکیو کا ہمارا سب سے نیا اور سب سے کم عمر ممبر تھا اور اس کی حالت دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ اسے ابھی میدانِ جنگ کے اگلے مورچوں پر مارچ کرنے کے احکامات دیے گئے ہیں۔

"سب کے لیے کچھ نہ کچھ پہلی بار ہی ہوتا ہے۔" چیف نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب بھی کچھ کہہ نہیں سکتے۔ یہ اپنا رخ بدل کر شمال کی طرف بڑھ سکتا ہے لیکن بہرحال ہمیں ہر قسم کے حالات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

میں اپنے ہاسٹل میں گیا اور ماریا کو کال کرنے کے لیے اپنا سیل فون نکالا۔ وہ شاید میرے فون کی منتظر تھی کیونکہ اس نے دوسری گھنٹی پر جواب دیا۔

"اس وقت حالات کیسے ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"ہم ٹھیک ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "تم اپنا بتاؤ باہر تم ہو۔"
"میں بھی ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔ "طوفان اب بھی سمندر میں ہے۔ شاید یہاں تک نہ پہنچ سکے۔"
"مجھے اس پر شک ہے۔ میں خبریں دیکھ رہی ہوں۔" اس نے کہا۔ "وہاں سب کچھ کیسا ہے؟"
"فی الحال حالات قابو میں ہیں۔" میں نے کہا۔
"ڈیوی کیسا ہے؟"
"وہ ٹھیک ہے، سو رہا ہے لیکن اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ جب تم فون کرو تو اسے جگادوں......رکو۔"
میں اسے پس منظر میں اپنے بیٹے سے بات کرتے ہوئے سن رہا تھا۔ اسے جگانے کا خیال اچھا نہیں تھا لیکن میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ کسی بھی چیز سے بڑھ کر، میں ان کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔
میرے بیٹے کی اونگھتی ہوئی آواز لائن پر آئی۔ "کیا کر رہے ہیں ڈیڈی؟ آپ کہاں ہیں؟"
"کام کر رہا ہوں ڈیوی!" میں نے کہا۔ "طوفان کا انتظار کر رہا ہوں۔"
"گوڈوٹ؟" اس نے پوچھا۔
"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں گوڈوٹ کا انتظار کر رہا ہوں۔"
ماریا فون پر واپس آئی۔ "تمہیں کب تک نیچے رہنا پڑے گا؟"
"آہ، زیادہ دیر نہیں۔" میں نے جھوٹ بولا۔
"اپنا خیال رکھنا باب! پلیز۔" وہ سنجیدہ بھی تھی اور پریشان بھی۔ "خدا تمہاری حفاظت کرے۔"
مجھے امید تھی کہ وہ کرے گا۔
اس طرح کے حالات میں اگر ممکن ہو تو آرام کرنا چاہیے۔ لہٰذا چیف نے مشورہ دیا کہ ہم سب سونے کی کوشش کریں۔ وہ کمانڈ پوسٹ پر رہے گا۔
وہ ایک اچھا لیڈر تھا اور ہم جانتے تھے کہ اگر حالات خراب ہوئے تو وہ ہمارے ساتھ موجود ہوگا۔ میں اپنی تنگ چارپائی پر دراز ہوا اور کمبل اپنے اوپر کھینچ لیا۔ اگرچہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ آدھی رات کے قریب آندھی اور بارش آگئی۔ ہماری سنڈر بلاک عمارت پر بجتی بوندیں ہمیں یہاں تک سنائی دے رہی تھیں۔ اسی دوران الارم بھی بجنے لگے اور پھر بجلی چلی گئی۔ ہم چند لمحے اندھیرے میں بیٹھے رہے جب جنریٹر چلنا شروع ہوا۔
کالز مسلسل آرہی تھیں۔ شیرف کے محکمے کو پانی دے پر پھنسی ہوئی موٹر سائیکلوں کی اطلاع ملنا شروع ہوئی۔ میں نے سنا کہ جیری ویچ کو پاور لائنز ڈاؤن ہونے کی کال پر بھیج دیا گیا۔ ہم بھی تیار تھے۔ اپنے گو بیگ چیک کیے اور مدد کے لیے باہر جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ مجھے ایک گاڑی کی تلاش کے لیے روانہ کیا گیا جو گرے ہوئے درختوں کی وجہ سے سڑک سے ہٹ گئی تھی۔
میں اپنی کراؤن وک میں داخل ہوا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ آسمان سے بارش دھاروں کی صورت برس رہی تھی۔ میں نے وائپرز آن کیے اور خواہش کی۔ "کاش میرے پاس اور تیز کی ہوتی۔"
بجلی مکمل طور پر بند تھی اور بارش سے اور مشکل ہو رہی تھی، یہ دیکھنے کے لیے کہ سڑکوں پر پانی کے بڑھتے ہوئے گڑھے کتنے گہرے ہیں۔ میں نے اپنے کاؤنٹی کے معمولی بجٹ پر لعنت بھیجی۔ ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے ہمیں مناسب ساز و سامان فراہم نہیں کیا گیا تھا۔ ہمارے پاس فائر ٹرک تھے لیکن ہم اسے باہر نکالنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے جب تک کہ حالات واقعی بدتر نہ ہوں۔
ابھی کے لیے مجھے صرف اپنے کراؤن وک پر گزارہ کرنا تھا جس کی ونڈ شیلڈ پر کھجور کے درخت سے کئی شاخیں آکر گریں اور میں اچھل پڑا۔ میری ہیڈ لائٹس میرے سامنے والی اسٹریٹ کو روشن کرنے میں عملی طور پر غیر موثر لگ رہی تھیں۔ میں نے مائیک پکڑا اور ہیڈ کوارٹر کال کی۔ صورت حال کے بارے میں اپ ڈیٹ مانگی۔
ڈسپیچر نے کہا۔ "آخری اطلاع ہمارے پاس پیلا سیوڈیل مارے تقریباً سو گز دور سڑک سے ملی تھی۔" اس نے طوفان کے پیش نظر چیف سے اپنی ذمے داریاں سنبھال لی تھیں۔
چوراہے کے قریب پہنچ کر سڑک کا جائزہ لینے کے لیے میں نے اپنی اسپاٹ لائٹ کا استعمال کیا اور مجھے ساحل سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر سیاہ ایس یو وی دکھائی دی۔
لہریں خطرناک حد تک قریب آرہی تھیں، اس پر تیز ہوا اور بارش۔ میرے لیے دیکھنا ناممکن تھا کہ گاڑی میں کوئی موجود ہے یا نہیں۔ شاید سمندری طوفان اسے وقت سے پہلے ہی ریت میں دفن کر رہا تھا۔ میں وہاں سے واپس روانہ ہوا۔
مائیک اٹھاتے ہوئے میں نے جیری ویچ کو فون کیا کہ میں علاقے میں ہوں اور پوچھا کہ کیا اسے کسی مدد کی

ضرورت ہے؟ اس نے جواب نہیں دیا۔

میں اگلی کال پر جانے کے لیے تیار تھا جب مجھے دور سے کسی روشنی کی ٹمٹماہٹ دکھائی دی۔ جوں جوں میں اس کے قریب پہنچا، میں نے پہچان لیا۔ میں پہلا سیو ڈیل مار سب ڈویژن میں پہلے گھر کے قریب پہنچ رہا تھا۔ رابرٹو مونٹویا اور ٹیز کا گھر۔

''تمام یونٹس توجہ دیں۔'' ریڈیو پر ڈسپیچر کی آواز آئی۔ ''جنریٹر میں ایندھن بھرنے کے لیے بیس کو عارضی طور پر بند کیا جا رہا ہے۔''

''لعنت ہے۔'' میں بڑبڑایا۔ ایسے ہنگامی حالات میں جنریٹر میں کم از کم دس سے بارہ گھنٹے تک چلنے کے لیے ڈیزل ہونا چاہیے تھا۔ کسی نے اسے یا تو نکال دیا تھا یا اسے بھرنا بھول گیا تھا۔

جب میں اورٹیز کے گھر کے سامنے جڑواں ستونوں کے قریب پہنچا تو اس کے فولادی بڑے گیٹ کو چوپٹ کھلا پایا اور اس سے آگے گھر کے رہائشی حصے میں بھی روشنی تھی۔ اورٹیز نے اپنے جنریٹر کے بارے میں شیخی ماری تھی۔ وہ روشنی کی وضاحت کر سکتا تھا لیکن اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ جا رہا ہے۔ تو وہ اب تک گیا کیوں نہیں؟

میں اسی ادھیڑ بن میں تھا پھر سوچا مجھے خود ہی جا کر اس سے بات کرنی چاہیے۔ میں نے کراؤن وک کو کھلے گیٹ سے اندر داخل کیا۔ ڈرائیو وے میں سامنے ایک اور گاڑی کی ٹیل لائٹس نظر آ رہی تھیں۔ اس کے درمیان کے حروف میں POLICE، 3130 لکھا ہوا تھا۔

جیری ویلچ کی کار۔ وہ یہاں کیا کر رہا تھا؟ میں نے اس کی اسکواڈ کار کے ساتھ گاڑی روکی اور اس میں اپنی ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ گاڑی خالی تھی۔ چارجنگ ہولڈر سے اپنی ٹارچ اور کام کنسول سے اپنا پورٹیبل ریڈیو نکالتے ہوئے جیسے ہی میں نے کار کا دروازہ کھولا، طوفانی چنگھاڑتی ہوا مجھے اڑا لے جانے لگی۔ میں نے بہ مشکل کار کا دروازہ بند کیا اور ریڈیو کو اپنی جیب میں جتنی گہرائی تک گھسا سکتا تھا، گھسا دیا۔

کاروں کے درمیان سامنے والے دروازے تک جاتے ہوئے میں یہی سوچ رہا تھا کہ جیری یہاں کیا کر رہا ہے؟ اس کی طرف سے آخری اطلاع یہی تھی کہ وہ رکی ہوئی گاڑی کے مسافروں کو محفوظ مقام تک پہنچا رہا ہے۔ کیا اس نے یہاں کوئی ایسی چیز دیکھی جس پر بھی توجہ کی ضرورت تھی؟ شاید اورٹیز نے گھر نہیں چھوڑا تھا۔ اگر وہ اب بھی یہاں تھا تو میں اس سے اس کی ہموی ادھار لے لوں گا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں پینتالیس ڈگری کے زاویے پر ہوا کے مخالف چل رہا ہوں۔

دروازے پر پہنچتے ہی میں نے اس پر تابڑ توڑ مکے برسائے۔ بارش اور ہواؤں کے باعث وہ شاید ہی میری دستک سن پاتے۔ کسی نے جواب نہیں دیا۔ میں نے دوبارہ دروازہ بجایا، اس بار پہلے سے بھی زیادہ شدت سے۔ بارش میرے چہرے پر آبشار کی صورت میں بہہ رہی تھی۔ یہ ٹھنڈے شاور میں کھڑے ہونے کی طرح تھا۔ میں جیری کا نام پکارتے ہوئے زور سے چیخا۔ تب ہی اچانک دروازہ اندر کی طرف سے کھلا اور کمرے کی تیز روشنیوں نے چند سیکنڈ میری آنکھوں کو چکاچوند کیا۔ اسی وقت کسی نے بازو نکال کر مجھے اندر کھینچا۔

میں نے مزاحمت نہیں کی کیونکہ آندھی اور بارش میرے چیتھڑے اڑانے کے درپے تھی۔ میں بازو چھڑانا چاہتا تھا لیکن اس نے میرا بازو موڑتے ہوئے مجھے گرا کر میرا سینہ فرش سے ٹکرا دیا۔

''ہے...... آرام سے۔ کیا کر رہے ہو؟'' میں چلایا۔ ''میں کاؤنٹی فائر اینڈ ریسکیو کے ساتھ ہوں۔ کیا آفیسر ویلچ یہاں ہے؟''

جب میں نے اس آدمی کو دیکھنے کے لیے اپنا سر موڑا تو پتا چلا کہ وہ نیلے اسٹیل کی کسی آٹو براو راست میرے چہرے پر تانے ہوئے ہے۔

''ہلنا مت۔'' اس نے کہا۔

اور میں ساکت ہو گیا۔

''اوہ...... ہیل......!'' ایک جانی پہچانی آواز آئی اور تب ہی میری نظر جیری پر پڑی۔ اس کی بھوری وردی بھیگی ہوئی تھی اور اس کے آگے وہ دو فیڈرل ایجنٹس جنہوں نے شام میں مجھے روکا تھا، ہاتھ پیچھے بندھے اپنے گھٹنوں پر بیٹھے نظر آئے۔ ان کے چہرے زخمی تھے اور ٹیو فیلو پچاس کیلیبر کا ایک بڑا ڈیزرٹ ایگل پکڑے ان کے سامنے موجود تھا۔ مسکراہٹ سے ملتی جلتی کوئی چیز اس کے ہونٹوں پر تھی اور وہ معمول سے زیادہ خطرناک لگ رہا تھا۔

یہ منظر بھی کوئی زیادہ خوشگوار نہیں تھا لیکن اگر بات یہاں تک رہتی تو...... کیونکہ اس کے پیروں کے پاس ہی ایک اور شخص پڑا تھا اور اس کے ہاتھ بھی اس کے پیچھے رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ اس کا سینہ ہل رہا ہے یعنی وہ زندہ تھا البتہ خون کا ایک تالاب اس کے سر کے گرد جمع تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کئی سیکنڈ لگے کہ فرش پر پڑا یہ

زخمی بے بس شخص رابرٹو موٹو یا اور ٹیز ہے۔

”لعنت ہو تم پر باب!“ جیری وینچ نے مجھ پر جھکتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ تمہیں یہاں آنے کی ضرورت کیوں پڑی؟“

میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن یہ صورتِ حال دیکھ کر میری زبان گنگ ہو چکی تھی۔ انجانے میں، میں نے خود ہی اپنی موت کے جال میں قدم رکھ دیا تھا۔

”مٹالو۔“ ٹیوفیلو نے کہا۔

اس کا مطلب تھا ”اسے مار ڈالو۔“ میں نے دوسرے کیوبن آدمی کو اپنا پستول میری طرف تانتے دیکھا اور خود کو اس گولی کے لیے تیار کر لیا جو کسی بھی لمحے میری کھوپڑی پاش پاش کر دیتی۔

تب ہی جیری نے چیخ کر کہا۔ ”نہیں۔“

”تم اسے اس طرح نہیں مار سکتے۔ تم نہیں کر سکتے۔ ہم اس بات کے متحمل نہیں ہو سکتے کہ ان کی لاشیں گولیوں کے سوراخوں کے ساتھ ملیں۔ ان میں دو ایجنٹ اور ایک کاؤنٹی فائر مین ہے۔ وہ ہمیں پاتال سے بھی کھود نکالیں گے۔“

مجھے یقین نہیں تھا کہ ٹیوفیلو، جیری کی بات سمجھا یا نہیں مگر اس نے میرے سر پر منڈلاتے اس خوفناک صورت کیوبن کو انتظار کرنے کا اشارہ کیا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ جیری، ٹیوفیلو کے ساتھ کب سے ملا ہوا تھا یا اس کا محرک کیا تھا مگر وہ واقعی بڑے لوگ تھے اور اتنے ہی سفاک بھی۔ ٹیوفیلو بھی اور ٹیز کی منشیات کی سلطنت پر قبضہ جمانے کے لیے کئی خون کی ندیاں بہا سکتا تھا۔

”تم غلطی کر رہے ہو۔“ کوپر نے کہا۔ ”ایجنسی کو معلوم ہے کہ ہم کہاں ہیں۔ وہ راستے میں ہوں گے۔“

ٹیوفیلو نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر اس کے بائیں ہاتھ کی مٹھی بھنچی اور پوری قوت سے کوپر کے جبڑے پر پڑی۔

میں نے جیری کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھا لیکن وہ مجھ سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ اس نے اپنی ہتھکڑیاں نکالیں اور آگے بڑھ کر میرے ہاتھوں میں ڈالنے لگا۔

”تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”باب!“ اس نے سرگوشی کی۔ ”میں معافی چاہتا ہوں لیکن تمہیں صرف تعاون کرنا ہے۔“

”تعاون...... کس لیے؟“

یوں لگ رہا تھا جیسے وہ رونے کو تیار ہے۔ ”جیسا کہ میں نے کہا، مجھے افسوس ہے۔“

”ہاں، لگ رہا ہے کہ تمہیں کتنا افسوس ہے۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”بس، اپنا منہ بند کرو اور یاد رکھو کہ تھوڑی دیر پہلے میں نے ہی تمہاری جان بچائی ہے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

مجھے منہ بند رکھنے کا اس کا مشورہ ماننا پڑا مگر یہ بھی سچ تھا کہ یہ ایک عارضی مہلت تھی۔ ٹیوفیلو پاگل نہیں تھا کہ کسی بھی گواہ کو زندہ چھوڑ دیتا۔ ٹیوفیلو نے اپنی پتلون کی جیب سے بلیڈ نکالا اور اور ٹیز کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھا۔ اب وہ اس سے ہسپانوی میں کافی نرمی سے بات کر رہا تھا مگر اور ٹیز نفی میں سر ہلاتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا کہ اچانک ٹیوفیلو نے ہاتھ میں پکڑے بلیڈ سے اس کے کان پر وار کیا۔

اور ٹیز کی چیخ کسی ذبح کیے جانے والے بکرے سے مشابہ تھی۔ میرے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔ شاید مجھے قے ہونے والی تھی۔

ٹیوفیلو نے بلیڈ کو اور ٹیز کے کان کے دوسرے حصے پر لگاتے ہوئے اگلے وار کے لیے خود کو تیار کیا۔ شاید وہ اسے جڑ سے اکھاڑنا چاہتا تھا۔

”رکو...... رکو...... بتاتا ہوں...... بتا رہا ہوں۔“ اور ٹیز اسے باز رکھنے کے لیے حلق کے بل چلایا۔

ٹیوفیلو نے بلیڈ اپنی پتلون کی جیب میں واپس رکھا اور اپنے باس کو بازو سے پکڑ لیا۔ کھڑے ہوتے ہوئے وہ اور ٹیز جیسے بھاری بھرکم آدمی کو اتنی آسانی سے اٹھا رہا تھا جیسے وہ کسی بچے کو اپنے پاؤں پر اٹھا رہا ہو۔

”ان پر نظر رکھنا وینچ!“ اس نے کہا اور اپنے ساتھی کیوبن کے ساتھ اور ٹیز کو گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے گیا۔

میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔

”جیری! مجھے کھولو۔“ میں نے کہا۔ ”چلو نکلو یہاں سے۔“

اس نے جواب نہیں دیا۔

”جیری، پلیز! وہ ہمیں مار ڈالیں گے۔“

”وہ ٹھیک کہہ رہا ہے وینچ!“ کوپر نے کہا۔ تھوڑی دیر پہلے جبڑے پر کھائے گئے ٹیوفیلو کے وزنی گھونسے کی بدولت اس کی آواز کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔ ”ایسا مت کرو۔“

اس نے پھر بھی کچھ نہیں کہا۔

”تم لوگ اپنی انرجی ضائع کر رہے ہو۔“ جیمیسن نے نفرت سے کہا۔ ”یہ ایک غدار ہے۔“

”لعنت ہو تم پر جیری! تم ایک پولیس والے ہو۔“ میں رونے کے قریب تھا۔

”بہت دیر ہو چکی ہے باب!“ اس نے کہا۔ اس کی

آواز ٹوٹی ہوئی تھی۔ ”بہت دیر ہوگئی۔“
مایوسی میں، میں نے اسٹیل ہتھکڑیوں سے زور آزمائی کی۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں اپنی بیوی اور بیٹے سے دوبارہ کبھی نہیں مل پاؤں گا۔
تقریباً پانچ منٹ کے بعد وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئے۔ ٹیوفیلو، اورٹیز کو گھسیٹتے ہوئے اور دوسرا کیوبن ایک بڑا سوٹ کیس لے کر جا رہا تھا۔ میں صرف سوچ سکتا تھا کہ اس کے اندر کیا تھا۔ اورٹیز اب بندھا ہوا نہیں تھا لیکن اس کی حالت خستہ تھی۔ وہ ٹیوفیلو کی گرفت میں اسکول کے ایک چھوٹے سے بچے کی طرح لگ رہا تھا۔
ٹیوفیلو میرے پاس آیا اور اورٹیز کو فرش پر دھکیلتے ہوئے اسے ایک لات ماری۔
”انہیں ایک ساتھ کف کرو۔“ وہ ویلچ کی طرف متوجہ ہوا۔
”کیا؟“ ویلچ نے کہا۔
”ہم اسے صرف سیف کھولنے کے لیے لے گئے تھے۔“ اس کے لہجے میں سراسر حقارت تھی۔ ”اب ان دونوں دوستوں کو ایک ساتھ کف کرو۔“
”مگر کس کے لیے؟“ ویلچ کراہا۔
”بس کردو۔“ ٹیوفیلو نے اس کی طرف دیکھا۔ ”جو میں کہتا ہوں، مجھے اس پر سوال سننے کی عادت نہیں۔“
موٹے ویلچ نے اپنے پستول کی بیلٹ پر لگی ہوئی چابیوں کا گچھا نکالا۔ گھٹنے ٹیکتے ہوئے میری دائیں کلائی سے اورٹیز کے دائیں بازو کو ایک ساتھ ہتھکڑی لگا دی۔ اورٹیز کا ہاتھ خون سے لتھڑا ہوا تھا بلکہ اس کی پوری پولو شرٹ ہی۔
”جاکر ہموی نکالو۔“ ٹیوفیلو اپنے ساتھی سے مخاطب تھا۔
’وہ اب نکلنے والے تھے تو کیا ہم اسی طرح بندھے رہتے؟‘ میں نے دہشت زدہ ہوکر سوچا۔
”چلو۔“ ٹیوفیلو، ویلچ کی طرف متوجہ ہوا۔ ”انہیں باہر لے چلو۔ سوئمنگ پول کی طرف۔“
ویلچ کا منہ کھلا رہ گیا۔ ”ارے...... ایک منٹ، کس کے لیے؟“
”کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ مجھ سے کبھی سوال مت کرنا؟“ ٹیوفیلو لمبائی میں کم از کم اس سے آدھا فٹ لمبا تھا۔ ”تم کہتے ہو کہ گولی نہیں مار سکتے تو انہیں پول میں پھینک دو۔“
”لیکن......“ ویلچ ہکلایا۔ ”میں نہیں کرسکتا۔“
ٹیوفیلو نے گہرا سانس لیا لیکن پھر اپنی بائیں ہتھیلی کو نرمی سے ویلچ کے کندھے پر رکھ دیا۔ ”میں جانتا ہوں۔ تمہارے دوست کی وجہ سے یہ مشکل ہے۔“
میں نے ویلچ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے امید تھی کہ وہ بغاوت کرے گا لیکن ٹیوفیلو پھر بولا۔
”میں راؤل کو یہ کرنے کے لیے کہتا ہوں۔“ اس نے اپنے ساتھی کا نام لیا۔ ”بس انہیں یہاں سے نکالنے میں اس کی مدد کرو۔“
ویلچ چند سیکنڈ کے لیے بے حرکت رہا پھر سر ہلایا۔
ٹیوفیلو ہنسا۔ ”اور جلد ہی تم بہت امیر آدمی ہو گے، امیگو۔“
دوسرے کیوبن بھی ہنس پڑے۔ پتا نہیں انہیں ٹیوفیلو کی بات سمجھ آئی بھی تھی یا پھر وہ صرف اس لیے ہنس رہے تھے کیونکہ ان کا باس ہنس رہا تھا۔
ٹیوفیلو نے دوبارہ اپنے ساتھی سے ہسپانوی میں کچھ کہا تھا۔ اس کی طرف متوجہ ہوا اور دوبارہ ہسپانوی میں بولا۔
”ان سب کو مار ڈالو۔“
”اس پولیس والے کو بھی؟“ راؤل نے پوچھا۔
”ہاں، اسے بھی۔“ ٹیوفیلو کے چہرے پر ایک کمینی مسکراہٹ تھی۔ اسے اندازہ بھی نہیں ہوگا کہ میں ہسپانوی سمجھ سکتا ہوں۔
”تم اس سے کیا کہہ رہے ہو؟“ ویلچ نے پوچھا۔
”میں نے اسے کہا ہے کہ کسی بھی گواہ کو زندہ نہ چھوڑنے کا حکم دیا ہے۔“ ٹیوفیلو نے کہا۔
ویلچ نے سر ہلایا۔
”اب جاؤ میرے دوست!“ ٹیوفیلو نے انگریزی میں ویلچ سے کہا۔ ”راؤل مدد کرے گا۔“
ویلچ نے میری طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ ”مجھے افسوس ہے باب!“
میں نے سوچا: ’اتنا افسوس نہیں جتنا اب تمہیں ہوگا۔‘
راؤل نے دروازہ کھولا اور ویلچ ہم چاروں کو دھکیلنے لگا۔ میرا دماغ تیزی سے دوڑ رہا تھا کہ میں کس طرح ویلچ کو بتاؤں کہ ٹیوفیلو نے ابھی ابھی ہمارے ساتھ اسے بھی مارنے کا حکم دیا ہے۔
جب ہم باہر نکلے تو آسمان سے برستے پانی کی چادر نے ہمیں ڈھانپ لیا۔ اورٹیز اپنے تباہ شدہ دائیں ہاتھ کو اپنے سینے سے لگائے ہر قدم کے ساتھ اپنے پاؤں گھسیٹ رہا تھا۔ اسے بھی اچھی طرح احساس تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔
راؤل نے کوپر اور اس کے ساتھی کو سوئمنگ پول کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا۔ اس نے جیمیسن کی گردن پکڑلی اور اس کے چہرے پر تھوک دیا یا کم از کم خوفناک ہوا میں

اس کی کوشش کی پھر اپنی مٹھی پیچھے کی اور بھرپور قوت سے اس کے چہرے پر گھونسا مارا۔ بے چارہ جیمیسن پوری طرح سے ان کے رحم وکرم پر تھا اور پٹ رہا تھا۔

شام میں اس کے بُرے رویے کے باوجود اب مجھے اس پر ترس آرہا تھا مگر یہ بھی سچ تھا کہ تھوڑی دیر میں میری حالت بھی اس جیسی ہی ہونے والی تھی۔

آخرکار کوپر چیخ پڑا۔ ”اسے چھوڑ دو تم، کمینو۔“

راؤل نے اب بے ہوش جیمیسن کو چھوڑا اور کوپر کو پیٹنا شروع کر دیا۔

”خدا کے لیے جیری!“ میں چلایا۔ ”کچھ کرو، اسے روکو۔“

راؤل نے توقف کیا اور وینچ کی طرف دیکھا کہ آیا وہ مداخلت کا ارادہ رکھتا ہے یا نہیں۔ اسے بے حس و حرکت دیکھ کر مسکرایا اور اپنے گھونسے جاری رکھے۔

”جیری! اسے روکو ورنہ تم بھی مارے جاؤ گے۔“ میں ہانپ رہا تھا۔ ”تھوڑی دیر پہلے ٹیوفیلو نے تمہیں بھی مارنے کے لیے کہا تھا۔“

وینچ کی رنگت اڑ گئی۔ ”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ اس نے کہا۔

اس کے پاس اب بھی گن تھی اور میں جانتا تھا کہ اس کا استعمال ہی اس ظلم و بربریت کو روکنے کی واحد امید تھی اور ساتھ ہی ہمارے بچنے کا واحد موقع بھی۔

”میں ہسپانوی سمجھتا ہوں بے وقوف!“ میں نے کہا۔ ”میں نے اسے کہتے ہوئے سنا۔“

”باب ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ اورٹیز نے مزید کہا۔

”ایا کاسا، کوبارڈے، کوچن......“ راؤل پر چیختے میں نے ہر وہ ہسپانوی لفظ بولا جو میرے ذہن میں آیا۔

کوپر کو اس ساتھی کے پاس پھینکتے ہوئے راؤل نے میری طرف دیکھا اور پھر اورٹیز اور پھر وینچ کی طرف۔

اس کی آنکھوں میں کچھ چمکا۔ اس نے اپنی کمر سے پستول نکالا اور بنا وقت ضائع کیے وینچ پر ایک فائر داغا۔ وینچ نے کافی تیزی سے حرکت کی تھی مگر گولی سے تیز پھر بھی نہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ اس کے سینے میں سوراخ کرنے کے بجائے وہ اس کے کندھے میں لگی اور اسے اتنا موقع ملا کہ اس نے اپنا ریوالور نکالتے ہوئے راؤل پر گولی چلا دی۔ ایک بار، دو بار، تین، چار، پانچ بار۔

راؤل نے بھی پول میں گرنے سے پہلے آخری بار گولی چلائی اور ایک بڑے چھپاکے سے پول میں گر گیا۔ پانی راؤل کے خون سے تیزی سے سرخ ہو رہا تھا۔

وینچ میرے نزدیک گر چکا تھا۔ اورٹیز اور میں جلدی سے اس کے پاس گئے۔ اس کے بیلٹ سے کی رنگ نکالتے ہوئے میں ہتھکڑی کی چابی ڈھونڈنے لگا۔

”جلدی کرو، جلدی کرو۔“ اورٹیز کا لہجہ ہیجان خیز تھا۔

جیسے ہی چابی میرے ہاتھ لگی، میں نے سلاٹ میں ڈال کر گھمائی اور ہتھکڑی کا نچلا حصہ میری کلائی سے ہٹ گیا۔

میں اورٹیز کی کلائی چھڑانا چاہتا تھا لیکن وہ مجھ سے دور ہو گیا۔ چہرے پر خطرے اور دہشت کے تاثرات لیے وہ میرے پیچھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، ٹیوفیلو کھلے دروازے سے باہر قدم رکھ رہا تھا اور اس کے ہاتھ اپنی کمر سے ڈیزرٹ ایگل کو کھینچ رہے تھے۔

میں جانتا تھا کہ میرے پاس صرف چند سیکنڈ تھے۔ اپنی ٹانگوں پر کھڑے ہوتے ہوئے میں نے اپنے آپ کو پوری قوت کے ساتھ اس کی سمت پھینکا۔ اس کے بڑے جسم سے ٹکرانا دھات کے دروازے سے ٹکرانے کے مترادف تھا لیکن میں اس کے چوڑے سینے سے ٹکرانے کے بعد اسے لیتا ہوا شیشے کے بند دروازے سے گھر کے اندر جا گرا۔ سوئی کی طرح کے شیشے کے ہزاروں ٹکڑے میں نے اپنے چہرے، بازوؤں اور سینے میں اترتے محسوس کیے۔

زمین پر گرتے ہی ٹیوفیلو نے مجھے دور دھکیل دیا۔ اس کا دایاں ہاتھ ڈیزرٹ ایگل تک پہنچا جو چند فٹ کے فاصلے پر پڑا تھا۔ میں نے اس کی کلائی پکڑی اور پوری طاقت سے کھینچنے لگا۔ اس کا بازو بہ مشکل ہلا لیکن میں گن حاصل کرنے کی اس کی پیش رفت کو روکنے میں کامیاب رہا۔

اسی وقت اس کی بائیں مٹھی میری کنپٹی سے ٹکرا گئی اور جیسے سیاہی کے آسمان میں پھوٹتی روشنیوں نے لمحہ بھر کے لیے میری بینائی کو گرہن لگا دیا۔ میں بہ مشکل اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہوئے اس طرف لپکا جو بازو لمبا کیے گن اٹھانے ہی والا تھا۔ مجھے اور کچھ نہیں سوجھا تو میں نے گن کو لات ماردی اور وہ اڑتا ہوا کیبنٹ کے نیچے غائب ہو گیا۔

میں کسی ایسی چیز کو تلاش کرنے کے لیے سیدھا ہوا جسے میں بطور ہتھیار استعمال کر سکوں۔ میرے دائیں پہلو پر ہتھوڑے کا وار ہوا۔ میرے حلق سے بے ساختہ ایک چیخ نکلی۔ ٹیوفیلو اپنے پیروں پر تھا اور اس کے ہتھوڑے جیسے مکے نے میری ایسی کم تیسی کر دی تھی۔

میری ٹانگیں بے جان ہو گئیں، میں ہل نہیں پا رہا تھا۔

اس نے مجھے دوبارہ مارا۔ اس بار اس کا گھونسا میرے

چھرے پر پڑا۔ میں گھٹنوں کے بل اس کی بلند و بالا شخصیت کو دیکھ رہا تھا۔ شاید میرے پھیپھڑے پھٹ چکے تھے۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بے رحمی سے مسکرایا۔

''باس کہاں ہے؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

اچانک کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اسی وقت آسمانی بجلی چمکی اور اس روشنی میں، میں نے ٹوٹے ہوئے گلاس وال کے فریم میں ایک اور شخص کو دیکھا۔

''تمہارا گیم ختم ہوا ٹیوفیلو!'' میں نے کہا۔

اس جسیم کیوبن نے اپنی چپٹی اور بے تاثر آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ''کون ہے؟''

ایک فائر ہوا اور ٹیوفیلو آگے کی طرف لڑکھڑا گیا۔ اس کا جسم ہلکے ہلکے جھٹکے لے رہا تھا۔ اس نے مڑ کر دروازے میں اورٹیز کو اپنے دائیں ہاتھ میں وچیچ کا ریوالور پکڑے ہوئے دیکھا۔

اورٹیز نے دوبارہ ٹریگر کھینچا اور میں نے کلک کے کھوکھلے پن کی آواز سنی۔ یہ خالی تھا۔

ٹیوفیلو نے ایک قہقہہ لگایا اور اس کی طرف بڑھنے لگا۔

''چکڈو۔'' اس نے کہا۔ ''اور اب کیا......''

اورٹیز نے ٹریگر دبانا جاری رکھا مگر دوبارہ کوئی گولی ٹیوفیلو کا قصہ پاک کرنے نہیں نکلی۔

خالی دروازے سے میں نے دیکھا کہ ایک سیاہ آسمان عجیب طرح سے سرخ رنگ کی روشنی سے رنگا ہوا ہے اور پھر ایک عفریت نما دیو قامت بگولا، اس کی گونج قریب آنے والی مال بردار ٹرین کی گرج کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ میں خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹنے لگا۔

جیسے ہی ٹیوفیلو، اورٹیز تک پہنچا، طوفانی بگولا ابھی پوری شان سے اورٹیز کے مضبوط ولا سے ٹکرایا۔ ان کے پیچھے کی پوری دیوار ایک دہاڑ کے ساتھ غائب ہوگئی۔ سوٹ کیس فرش سے اٹھا اور پلاسٹک میں لپٹی ہوئی سفید چیز کے دو کلو سائز کے پیکٹ ہوا کے اس بھنور میں گھومنے لگے۔ اورٹیز اور ٹیوفیلو غائب ہو چکے تھے۔ میں پوری شدت سے کسی چیز کو پکڑنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ اس خوف سے کہ گھومتے ہوئے بگولے کے یہ بھنور مجھے بھی نہ نگل لیں۔

پھر یہ جتنا اچانک آیا تھا، اتنا جلدی چلا بھی گیا۔

میں باہر کی طرف رینگنے لگا اور بارش کے پردے میں گھورتا رہا۔ یہ جاننے کی کوشش کرتے ہوئے کہ آیا کوپر اور جیمیسن ابھی تک پول سے باہر تھے...... کہ ایک زوردار دھماکے سے چھت میرے سر پر آگری اور میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

میری آنکھ اسپتال میں کھلی۔ انہوں نے کہا کہ انہوں نے مجھے ملبے کے نیچے پایا۔ بظاہر گورڈن آخری لمحے میں ساحل سے شمال کی طرف ہٹ گیا تھا اور واپس سمندر کی طرف جا رہا تھا۔ بتایا ہوا نے دو چھوٹے بگولوں کو جنم دیا تھا جن میں سے ایک اورٹیز پراپرٹی پر رقص کرنے آنکلا۔ ریسکیو عملے نے دیکھا کہ دو الٹی ہوئی کاؤنٹی گاڑیاں اپنے اطراف میں اکھڑے ہوئے درختوں اور اورٹیز کے فرنٹ یارڈ کی لمبی ڈرائیو وے کے درمیان کھڑی ہیں۔ پھر میرے پورٹیبل ریڈیو کی پریشان کن آواز جس نے کسی حد تک معجزانہ طور پر بیٹری کو اتنی دیر تک برقرار رکھا کہ وہ مجھے سن سکیں۔ انہیں میری پوزیشن کا پتا چلا اور چھت کے شہتیر ہٹا کر مجھے باہر نکالا گیا۔

انہوں نے کوپر اور جیمیسن کو گھر کے تباہ شدہ فوئر میں دیکھا۔ ان کے ہاتھ اب بھی ان کی پیٹھ کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ معجزانہ طور پر ان دونوں کو راؤل کے مارے گئے گھونسوں کے علاوہ زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں۔

راؤل اور وچیچ کی لاشیں انہیں پول کے نچلے حصے میں ملیں جبکہ ٹیوفیلو اور اورٹیز کہیں نہیں ملے تھے۔ نہ زندہ، نہ مردہ۔

میری چوٹوں میں ایک ٹوٹی ہوئی ٹانگ، ٹوٹی ہوئی پسلیاں، پھٹے ہونٹ اور مجموعی طور پر کئی چھوٹے بڑے زخم شامل تھے جس کی وجہ سے انہوں نے مجھے خواب آور ادویات کے زیر اثر رکھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں کتنی دیر تک بے ہوش رہا لیکن جب میں بیدار ہوا تو ماریا ہمارے بیٹے کو پکڑے میرے بستر کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ شاید وہ دعا مانگ رہی تھی۔

ڈیوی کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ خوشی سے چلایا۔

''ڈیڈی...... !''

ماریا نے بھی اپنی آنکھیں کھول دیں۔ بھری ہوئی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے وہ بے اختیار مجھ پر جھکی۔

''آپ کہاں تھے ڈیڈی؟ کیا کر رہے تھے۔'' میرا بیٹا پوچھ رہا تھا۔

میں مسکرایا اور اسے جواب دیتے ہوئے راحت کی لہر محسوس کی۔ ''انتظار۔'' میں نے کہا۔ ''میں بس یہیں تھا اور گوڈوٹ کا انتظار کر رہا تھا۔''

⌘⌘⌘

اصفہان سے دو میل دور اور بحیرۂ کیسپین سے تقریباً بجانب شمال سمنان نامی ایک تاریخی شہر آج بھی موجود ہے۔ یہ آٹھویں صدی ہجری میں بہت زیادہ شہرت رکھتا تھا۔ یہاں آلِ سامان کے عہدِ حکومت میں ایک ریاست وجود میں آئی تھی۔ احمد سامان نے اپنے وزیر سید تاج الدین بہلول کو اپنے نائب کی حیثیت سے عراق اور خراسان کا حکمراں بنادیا تھا۔ تاج الدین نے سمنان کو اپنا دارالحکومت بنایا اور تقریباً چار سو سال تک یہ خاندان حکومت کرتا رہا۔

سمنان (ایران) کا شہزادہ اور سلطان بچپن ہی سے کچھ تلاش کررہا تھا۔ کھیلنے کودنے کی عمر میں یہ شخص اپنے اندر ڈوب کر سراغ زندگی پانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس دیار سے اس دیار تک معلوم نہیں کیا ڈھونڈتا رہا اور آخر کار وہ وہاں پہنچ گیا جہاں پہنچنا اس کا مقدر تھا۔ بنگال اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنے لگا اور جونپور اس کی وجہ سے محترم قرار پایا۔ ملکوں ملکوں اور شہروں شہروں گھومنے والا یہ سیاح ہم میں آج بھی زندہ اور موجود ہے۔ اس کے حالات اور سوانح، اس کی باتیں، اس کے واقعات اور پُرلطف، پُرسوز اور پُرمعنی کلمات، جن میں ایک جہانِ معانی پوشیدہ ہے۔ گداز اور پُراثر کلام اور اعمال کا یہ جہانگیں ان جہانگیروں کا جہانگیر قرار پایا جنہیں فرماں روائی پر ناز تھا۔

تختِ شاہی چھوڑ کر فقیری اختیار کرنے والے ایک برگزیدہ بندے کی سوانح حیات

سید اشرف جہانگیر سمنانی

ضیا تسنیم بلگرامی

اسی خاندان میں سید ابراہیم نامی ایک متقی اور پرہیزگار حکمراں کے گھر میں 707ھ میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ بچے کی ماں خدیجہ بھی اپنے زہد و تقویٰ میں کوئی جواب نہیں رکھتی تھیں۔ باپ نے بچے کو دیکھا، گود میں لیا اور کانوں میں اذان دی۔ پورے سمنان میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ حکومت کا وزیر شیخ رکن الدین علاء الدولہ سمنانی بچے کو دیکھنے آیا اور اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس بچے کی پیشانی پر جو کچھ لکھا تھا، علاء الدولہ کو صاف نظر آ رہا تھا کیونکہ علاء الدولہ وزیر ہونے کے ساتھ ساتھ منصبِ ولایت پر بھی فائز تھے۔ سالوں پہلے حکمراں ابراہیم نے یہاں ایک خانقاہ سکا کیہ تعمیر کرائی تھی اور اس کا نظم و نسق اپنے وزیر علاء الدولہ کے سپرد کر دیا تھا۔ انہوں نے کشف کے ذریعے بچے کا مستقبل دیکھ لیا تھا لیکن حکمراں باپ کو یہ نہیں بتا سکے کہ یہ بچہ بڑا ہو کر سمنان کے بجائے ایک جہان پر روحانی حکومت کرے گا۔

حکمراں ابراہیم نے جب کئی بار یہ محسوس کیا کہ ان کا صوفی علاء الدولہ نومولود پر خصوصی توجہ دیتا ہے تو پوچھا۔ ”شیخ علاء الدولہ! آخر اس نومولود میں وہ کون سی خاص بات ہے جس نے تمہیں اس کا گرویدہ کر دیا ہے؟“

شیخ علاء الدولہ نے جواب دیا۔ ”جنابِ والا! اب میں اس کے لیے آپ کو کیا بتاؤں۔ یہ بہت ہی بھاگوان اور نجات دہندہ ہے۔ اس کا نام آپ نے کیا رکھا ہے؟“

حکمراں ابراہیم نے کہا۔ ”اشرف۔ سید اشرف۔“

شیخ علاء الدولہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ بے ساختہ کہا۔ ”خوب! بہت خوب۔ آپ نے نام بھی بہت اچھا رکھا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ نام آپ نے نہیں، کاتبِ تقدیر نے رکھا ہے۔ بہرحال یہ اشرف ہے اور اشرف ہی رہے گا۔“

جب بچے نے سات سال کی عمر میں قرآن پاک کو اپنے سینے اور حافظے میں محفوظ کر لیا تو یہ خبر جس نے بھی سنی، دنگ رہ گیا۔ اس کے بعد اس بچے نے مروجہ نصاب کے مطابق معقولات اور منقولات کا مطالعہ بھی کیا اور اہلِ سمنان کو اور زیادہ حیرت زدہ کر دیا۔

یہ اپنی عمر کے پندرھویں سال میں داخل ہوئے تو یک بیک باپ کی طبیعت خراب ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ باپ کو یقین ہو گیا کہ اب وہ اچھے نہیں ہوں گے۔ انہوں نے اپنے بیٹے اشرف کو بلایا اور انہیں سمجھانا شروع کر دیا۔ ”بیٹے اشرف! میں کسی بھی لمحے ایک ایسے سفر پر روانہ ہو جاؤں گا جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔ میرے بعد سمنان کی حکومت تم کو ہی سنبھالنا ہوگی۔ اگر تم مستقبل کے فرماں روا ہوتے تو میں یہ کہتا ہوا اس دنیا سے چلا جاتا کہ بیٹا! ہمیشہ اپنے اعمال پر نظر رکھنا اور اپنے نفس کا محاسبہ کسی دشمن کی طرح کرتے رہنا لیکن ایک فرماں روا سے اتنی سی بات نہیں کہی جا سکتی۔ تمہیں اپنے نفس کے ساتھ اپنی رعایا کا محاسبہ بھی کرتے رہنا بہت ضروری ہے۔ عدل و انصاف کسی حکمراں میں اگر بخوبی نہ ہو تو وہ جہنمی ہے۔ کسی کا حق نہ مارنا، کسی پر ظلم نہ کرنا۔ نہ تو خود کسی پر ظلم کرنا، نہ کسی اور کو کرنے دینا۔“

ابھی نصیحتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ باپ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ محل میں ایک کہرام برپا ہو گیا مگر سید اشرف خاموش رہے، نہایت باوقار انداز میں۔

کسی نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے سید اشرف! آپ روتے کیوں نہیں؟ یہ آپ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، ایسا ہے کہ آپ اس پر آنسو بہائیں۔ جب سے انسان یہاں آیا ہے، یہ رسم جاری ہے۔ آپ صبر کریں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون...... مگر ہمیں یہ ضرور بتائیں کہ آپ کو دولتِ صبر اتنی زیادہ ملی کہاں سے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”آپ نے مجھ سے جو سوال کیا ہے، اب میں اس کا کیا جواب دوں؟ میں روتا کیوں نہیں؟ اگر میں رو رہا ہوتا تو شاید مجھ سے یہ پوچھا جاتا کہ میں روتا کیوں ہوں؟ مجھے جس صدمے سے دوچار ہونا پڑا ہے وہ ایسا ہے کہ اس سے کوئی گھر محفوظ نہیں۔ ایک دن ہمیں بھی جانا پڑے گا پھر اس پر آنسو کیوں بہائے جائیں؟“

اب آپ کے سامنے جو فوری مسئلہ تھا، وہ یہ تھا کہ آپ کو فوراً ہی سمنان کی حکومت سنبھالنا تھی۔ فرار کی کوئی راہ نہیں تھی۔ چنانچہ آپ نے سمنان کی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔

کارکنانِ مملکت نے ایک پندرہ سالہ نوآموز کو اقتدار پر فائز دیکھا تو ان میں من مانی کا شوق پیدا ہوا۔ تجربہ کار عہدیداروں نے یہ سوچا کہ ابھی سالوں یہ نوجوان اس لائق نہیں ہوگا کہ عمر رسیدہ اور لائق لوگوں کو اپنے قابو میں رکھ سکے چنانچہ یہ لوگ اپنی سی کرنے لگے۔

ایک دن سید اشرف اپنی فوج کا معائنہ کر کے محل کی طرف واپس جا رہے تھے کہ ایک بڑھیا بازار میں سے اچانک

نمودار ہوگئی اور ان کی طرف بڑھی۔ لوگوں نے اس بڑھیا کو روکنا چاہا مگر آپ نے انہیں منع کر دیا اور کہا۔ ”اسے آنے دو، اسے مت روکو، آنے دو۔“

جب وہ بڑھیا بالکل پاس آگئی تو آپ نے اس سے پوچھا۔ ”خاتون! کیا بات ہے؟ آپ پریشان کیوں ہیں؟“

عورت نے ان سپاہیوں کی طرف دیکھا جو نوجوان سلطان کی خدمت میں اس کی حفاظت کی خاطر کھڑے ہوئے تھے۔ عورت نے کہا۔ ”کیا میں ان سپاہیوں کی موجودگی میں وہ سب کچھ کہہ دوں جو آج صبح صبح میرے ساتھ پیش آیا ہے؟“

آپ نے فرمایا۔ ”ہاں ہاں، میں پوچھ رہا ہوں۔ میں نے آپ کو اپنے پاس کیوں بلایا ہے؟“

عورت نے ایک بار پھر سپاہیوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”کیا یہ سپاہی میرے دشمن نہیں ہو جائیں گے؟ کیا میں شکایت کرنے کے بعد ان سپاہیوں کے شر سے محفوظ رہ سکوں گی؟ شکایت کرنے سے پہلے میں اس کی یقین دہانی چاہتی ہوں۔“

آپ نے اس عورت کو یقین دلایا۔ ”میں کہہ رہا ہوں کہ آپ کو جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کسی خوف کے بغیر کہہ دیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے ساتھ پورا پورا انصاف ہوگا۔“

بوڑھی عورت نے کہا۔ ”میرا معاملہ بالکل سیدھا سادہ ہے۔ آپ سنیں گے تو اسے بالکل معمولی بات سمجھیں گے لیکن وہ میرے لیے بہت اہم ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”آپ بتائیں تو سہی کہ بات کیا ہے؟“

بڑی بی نے جواب دیا۔ ”میں ایک غریب عورت ہوں۔ میں نے اپنے کھانے کے لیے دہی رکھ چھوڑا تھا۔ اچانک آپ کا ایک سپاہی اندر داخل ہوا اور پوچھا۔ ”گھر میں کچھ کھانے کو ہے؟“ میں نے جواب دیا۔ ”تھوڑا سا دہی رکھا ہے، وہ بھی اپنے لیے۔“ سپاہی نے وہ دہی زبردستی لے لیا اور کہا۔ ”یہ اپنے لیے کا کیا مطلب ہے؟ میں سپاہی ہوں۔ کیا تو میرا مقابلہ کر سکتی ہے؟“

بڑی بی اتنا بتا کر زار و قطار رونے لگی، کہا۔ ”جنابِ والا! میں بوڑھی ہوں اور بہت کمزور ہوں۔ میں مرد نہیں ہوں۔ کیا ایک سپاہی زیادہ طاقتور اور بااختیار ہوتا ہے اور حکومت کا ملازم ہونے کی وجہ سے ان کو زیادہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ میں جاننا چاہتی ہوں اور آپ سے انصاف چاہتی ہوں۔“

آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ غصے کو دبانے کی کوشش کر رہے تھے، پوچھا۔ ”کیا آپ اس سپاہی کو پہچان سکتی ہیں؟“

بڑی بی نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں، میں ضرور پہچان سکتی ہوں۔“

”آپ نے اسی وقت سپاہیوں میں اعلان کر دیا کہ وہ سپاہی خود بخود میرے سامنے حاضر ہو جائے جس نے ایک بڑی بی کے گھر میں زبردستی گھس کر اس کی اجازت کے بغیر اس کا دہی کھا لیا۔ اگر وہ سپاہی خود حاضر نہیں ہوگا تو اس کو بڑی بی شناخت کر لیں گی اور اس حال میں وہ اور زیادہ سزا کا مستحق قرار پائے گا۔“

اس اعلان کے کافی دیر بعد ایک سپاہی ڈرا سہما حاضر ہو گیا۔ آپ نے بڑی بی سے پوچھا۔ ”دیکھیے، پہچانیے، کیا یہی وہ سپاہی ہے جس کے خلاف مقدمہ پیشِ عدالت ہے؟“

بڑی بی نے اس سپاہی کو پہچان لیا اور جواب دیا۔ ”ہاں، یہی وہ سپاہی ہے جس نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔“

آپ نے سپاہی سے کہا۔ ”کیا تو اپنے جرم کا اقرار کرتا ہے؟“

سپاہی نے جواب دیا۔ ”ہاں، مجھ سے یہ غلطی سرزد ہو گئی ہے مگر میں حکومت کا سپاہی ہوں اور یہ بڑی بی محض رعایا۔ میں زیادہ عزت دار ہوں اور مستحقِ الطاف و اکرام ہوں۔ ذرا سی دہی کی شکایت سے میری بڑی بے عزتی ہوئی ہے اس لیے حضورِ والا اس بڑھیا کو عبرتناک سزا دے کر دوسروں کو بتا دیں کہ رعایا کا کوئی اور ادنیٰ شخص اس قسم کے مقدمات آپ کی عدالت میں نہ لائے۔“

آپ نے غصے میں فرمایا۔ ”خوب، غلطی تو نے کی، جرم تجھ سے سرزد ہوا اور سزا مظلوم کو دی جائے۔“

اس کے بعد آپ نے دوسرے سپاہیوں کی موجودگی میں اس سپاہی کو شاہی ملازمت سے نکال دیا اور ظلم اور بددیانتی کے جرم میں قید خانے میں ڈال دیا اور فوج میں اعلان کر دیا کہ اگر آئندہ کسی نے ایسی حرکت کی تو اس سے زیادہ عبرتناک سزا دی جائے گی۔

اس واقعے نے آپ کے عدل و انصاف کو ہر طرف مشہور کر دیا۔ جن لوگوں کا خیال تھا کہ یہ ناتجربہ کار، نوآموز نوجوان کیا حکومت کرے گا اور کیا رعب و دبدبہ رکھے گا، وہ سب خوفزدہ ہو گئے اور ہر شخص اپنی جگہ مستعد اور چوکس ہو گیا۔ ہر طرف امن و امان کا دور دورہ ہو گیا، لوٹ کھسوٹ اور چوری ڈکیتی کا خاتمہ ہو گیا۔

آپ کی ان خصوصیات اور اوصاف کے پیشِ نظر آپ کے ایک عقیدت مند نے آپ کے عہدِ معدلت کا یوں اظہار کیا ہے۔
بدورانِ عدلش ہمہ روزگار...... گلستاں شدہ عدل او رود بار
(اس کے دورِ عدل میں ساری دنیا اس کے عدل کی نہر سے سیراب ہو کر گلستان بن گئی)
زہے عدل و انصاف آں دادگر...... کہ بر میش گرگے نہ بندد کمر
(اس کے انصاف کا یہ عالم تھا کہ بھیڑیا بکری کی طرف آنکھ بھی نہیں اٹھاتا)
اگر فیل بر فرق مورے گزر...... کند مور بر فیل آرد نظر
(اگر ہاتھی چیونٹی کے اوپر سے گزرے تو چیونٹی اس کو خبردار کرتی ہے)
کہ ایں دورِ سلطانِ اشرف بود...... چناں ظلم تو بر سرِ من رود
(کہ یہ سلطان اشرف کا دور ہے تو کس طرح یہ ظلم مجھ پر کرنے کی ہمت کرتا ہے)

☆☆☆

یہ خبر نزدیک و دور مشہور ہو گئی تھی کہ ایک پندرہ سولہ سالہ نوجوان سمنان کا حکمراں ہو گیا ہے۔ دشمنوں کے منہ میں پانی بھر آیا اور وہ دندانِ آز تیز کرنے لگے۔ مخبروں اور جاسوسوں نے انہیں یہ ناقص اور مبہم خبریں پہنچائیں کہ یہ نوجوان اندرونِ ملک تو امن و امان بحال رکھ سکتا ہے اور اپنی رعایا کو قابو میں رکھ سکتا ہے لیکن اس کا میدانِ جنگ کا کوئی تجربہ نہیں۔ ایک دشمن قوت نے سمنان پر چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آپ کو یہ وحشت اثر خبر ملی تو ذرا بھی نہیں گھبرائے اور جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ چنانچہ جب دشمن اپنی فوج کے ساتھ آپ کے علاقے کے سامنے نمودار ہوا تو وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ آپ اپنی فوج کے ساتھ وہاں پہلے سے موجود تھے۔

دشمن کو اپنے مخبروں اور جاسوسوں پر سخت غصہ آیا اور اس نے انہیں طلب کر کے خاصا ذلیل کیا۔
ایک مخبر نے پوچھا۔ ”حضورِ والا کا یہ غصہ کیوں؟ کیا یہ ناچیز اس کا سبب معلوم کر سکتا ہے؟“
دشمن بادشاہ نے جواب دیا۔ ”تم لوگوں نے تو سید اشرف نوجوان کی بابت ہمیں یہ خبر دی تھی کہ وہ بالکل ناتجربہ کار نوجوان ہے اور اسے میدانِ جنگ کا کوئی تجربہ نہیں لیکن یہاں میں کیا دیکھ رہا ہوں؟“
مخبر نے کہا۔ ”جنابِ والا! ہم نے آپ کو جو خبر دی تھی، وہ غلط نہیں تھی۔ ہم اس وقت اور یہاں بھی یہی کہیں گے کہ سمنان کا نوجوان حکمراں جنگ کا کوئی تجربہ نہیں رکھتا۔ ابھی ذرا دیر بعد جنگ ہو گی تو حضرت کو بھی اس کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔“
بادشاہ نے اپنی فوج کے قلب سے نکل کر آپ کی فوج کی ترتیب پر غور کیا تو پریشان ہو گیا۔ میمنہ، میسرہ اور قلب کو دیکھنے والے یہ خوب سمجھ سکتے تھے کہ کسی ماہر اور مشاق کی ہی قیادت میں یہ ترتیب دیکھی جا سکتی ہے۔ بادشاہ نے اپنے مخبروں اور جاسوسوں سے پوچھا۔ ”دوستو! معلوم نہیں کیوں میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں اس سے یہی اندازہ ہو رہا ہے کہ ہم کسی ناتجربہ کار سے نبرد آزما نہیں ہو رہے ہیں، ہمارا مدِ مقابل نہایت سورما اور لائق سپہ سالار ہے۔ ہم نے یہاں آ کر سخت غلطی کی ہے۔ خدا ہمیں ذلت سے بچائے۔“
آپ نے اپنے دشمن سے کہلوایا۔ ”ہم جنگ نہیں چاہتے کیونکہ جنگ میں بندگانِ خدا کا لہو خواہ مخواہ بہہ جاتا ہے۔ تم خود لڑنے آئے ہو۔ مجبوراً ہم بھی میدانِ جنگ میں آ گئے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم واپس چلے جاؤ۔“
دشمن بادشاہ نے اس پیغام کا غلط مطلب لیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ شاید یہ نوجوان حکمراں اس سے خوفزدہ ہو گیا ہے۔ اب بادشاہ کا صبر و سکون رخصت ہو چکا تھا اور وہ حملہ کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا چنانچہ اس نے فوراً ہی طبلِ جنگ بجوا دیا اور ایک بھیانک مگر فیصلہ کن جنگ کا آغاز ہو گیا۔ آپ نے اپنی فوج کو اس انداز میں لڑانا شروع کر دیا کہ چند گھنٹوں میں دشمن کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس نے بہتری اسی میں دیکھی کہ وہاں سے راہِ فرار اختیار کرے۔ آپ فاتح اور کامران واپس آ گئے۔
آپ کی اس فتح نے آس پاس دبدبہ بٹھا دیا اور دشمن خوفزدہ ہو گئے۔
آپ نے ایک گوشے میں جا کر خدا کا شکر ادا کیا اور دیر تک سجدے میں پڑے رہے۔
ایک طرف تو امورِ ملکی تھے اور دوسری طرف فرائض و سنن اور واجبات نوافل تھے۔ ان میں سے کسی کے ترک کر دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ سخاوت کا یہ حال تھا کہ کوئی سائل مایوس اور خالی ہاتھ نہیں واپس جاتا تھا۔
قرب و جوار کے فقراء اور صاحبانِ کشف آپ کے پاس کھنچے چلے جا رہے تھے۔ وہ آپ سے ملتے تو بڑی خوشی اور

فرحت محسوس کرتے۔

ان دنوں شیخ عبدالرزاق کاشانی اپنے علم و فضل میں بے مثل تھے۔ آپ ان کے پاس گئے اور خواہش ظاہر کی کہ میں آپ سے پڑھنا چاہتا ہوں۔

شیخ کاشانی نے جواب دیا۔ ''میں آپ کو شاگرد بنا کر بڑی خوشی محسوس کروں گا۔''

چنانچہ آپ ان کے حلقۂ درس میں بیٹھ گئے۔ شیخ کاشانی نے نصوص الحکم کی شرح لکھی تھی اور شیخ محی الدین ابن عربی کے نظریات اور مسئلہ وحدت الوجود پر گہری نظر رکھتے تھے۔ آپ نے یہ سب انہی سے سمجھا اور حاصل کیا۔ یہیں حضرت اویس قرنی کے بارے میں آپ نے پڑھا اور ان پر ایک بے خودی اور نشہ سا طاری ہو گیا۔ بادشاہت ڈگمگانے لگی۔ آپ کے اندر جو کچھ دبا ہوا تھا، اب وہ آہستہ آہستہ ابھرنے لگا اور عود کرنے لگا۔

آپ نے اپنے چھوٹے بھائی محمد اعرف سے کہا۔ ''اعرف! تجھ کو بادشاہت کیسی لگتی ہے؟''

چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔ ''بہت اچھی لگتی ہے۔ بادشاہت کے کیا کہنے۔ حاکم بن کر رہنا اور دوسروں پر حکومت کرنا — اس میں بڑا نشہ ہے، بڑا مزہ ہے۔ کیا کہنے بادشاہت کے لیکن آپ نے یہ سوال مجھ سے کیوں کیا؟''

آپ نے فرمایا۔ ''میں بادشاہت سے بیزار ہو رہا ہوں۔ اس وقت میں اپنی زندگی کے پچیسویں سال میں داخل ہو چکا ہوں۔ جب میں نے حکومت سنبھالی تھی، اس وقت پندرہ سال کا تھا۔ گویا میرے دورِ حکمرانی کو دس سال بیت چکے ہیں۔ ان دس سالوں میں، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حکومت میرے مزاج سے لگا نہیں کھاتی۔ میں اس سے چھٹکارا پانا چاہتا ہوں۔''

چھوٹا بھائی حیرت سے یہ باتیں سنتا رہا پھر پوچھا۔ ''لیکن بھائی! حکومت کی مثال کمبل جیسی ہے۔ آپ اسے چھوڑنا چاہیں گے مگر حکومت آپ کو نہیں چھوڑے گی۔''

آپ نے فرمایا۔ ''حکومت میرے لیے کمبل نہیں ہو سکتی۔ میں اس کو حقیر شے کی طرح چھوڑ دوں گا۔ اس کو ٹھوکر مار دوں گا۔ میرے اندر، وجود میں ایک آتش فشاں مچل رہا ہے۔ یہ بادشاہت اس میں جل کر بھسم ہو جائے گی۔''

چھوٹے بھائی نے پوچھا۔ ''آپ اگر اس سے کنارہ کش ہو جائیں گے تو پھر اس کو سنبھالے گا کون؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''تم سنبھالو گے۔ تمہیں حکومت کا شوق بھی ہے اور میرے بعد تمہی اس کے حقیقی حقدار بھی ہو۔''

چھوٹے بھائی کے جسم میں خوف کی لہر سی دوڑ گئی، کہا۔ ''لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔ حکومت آپ ہی کو مبارک۔ میں آپ کی سرپرستی میں تو بہت کچھ کر سکتا ہوں مگر تنہا اکیلا میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اعرف! یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ یہ کم ہمتی کی باتیں تمہیں بالکل زیب نہیں دیتیں۔''

چھوٹے بھائی کی آنکھیں بھیگ گئیں، کہا۔ ''نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اپنے آپ میں اتنی ہمت نہیں پا رہا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''مت گھبراؤ۔ جب ذمے داریاں پڑیں گی تو ہمت بھی آ جائے گی اور صلاحیتوں میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ مت گھبراؤ، مت پریشان ہو۔''

چھوٹے بھائی اعرف نے کہا۔ ''بھائی صاحب! آپ ماں کے پاس چلیے۔ میں انہیں بتاؤں گا کہ آپ کتنا خطرناک قدم اٹھانے والے ہیں۔ میں ماں سے کہوں گا وہ ایسا نہ ہونے دیں۔''

آپ نے چھوٹے بھائی کی بات مان لی اور اس کے ساتھ ماں کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت ماں ظہر کی نماز سے فارغ ہی ہوئی تھیں۔ دونوں بیٹوں کو خلافِ توقع ایک ساتھ اپنے سامنے دیکھ کر چکرا گئیں۔ آپ سے پوچھا۔ ''اشرف! خیریت تو ہے؟ کیسے آنا ہوا؟ کوئی خاص بات؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہم دونوں اس وقت آپ سے ایک اہم بات کرنا چاہتے ہیں۔''

ماں نے پوچھا۔ ''کیا مطلب؟''

چھوٹے بھائی نے کہا۔ ''ماں! میں آپ سے استدعا کروں گا کہ آپ ان کی بات ہرگز نہ مانیں۔''

ماں نے کہا۔ ''وہ بات تو مجھے معلوم ہو پھر غور کروں گی کہ اس کو مانا جائے یا نہ مانا جائے۔''

چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی سے کہا۔ ''بھائی صاحب! آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، کہہ دیں۔ دیر نہ کریں۔''

آپ نے ماں سے کہا۔ ''ماں! میں ایک عرصے سے دنیا اور کاروبارِ دنیا پر غور کر رہا ہوں۔ میں یہاں کیا کرنے آیا تھا اور کن کاموں میں الجھ کر رہ گیا ہوں۔ میں اپنی زندگی کے ان ایام اور لمحات پر شرمندہ اور خجل ہوں جو میں نے علائق دنیوی

میں جتلا رہ کر گزار دیے۔ اب میں اس دلدل سے نکلنا چاہتا ہوں۔ اب میں اس میں مزید نہیں رہ سکتا۔''
ماں سنبھل کر بیٹھ گئیں اور پوچھا۔ ''سید اشرف! تم کہنا کیا چاہتے ہو، ذرا کھل کر کہو۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''ماں! اب میں حکومت سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ اب میں خود کو بادشاہت کے لائق نہیں محسوس کرتا۔''
ماں نے پوچھا۔ ''اگر تم حکومت سے کنارہ کشی اختیار کرلو گے تو پھر اسے سنبھالے گا کون؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''محمد اعرف...... اس میں اتنی صلاحیتیں ہیں کہ آپ کو، رعایا کو اور تاج و تخت کو مایوس نہ کرے۔''
ماں نے کہا۔ ''لیکن یہ نہیں ہوسکتا۔ بڑے بھائی کی موجودگی میں چھوٹے بھائی کو تاج و تخت کا مالک بنا دیا جائے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔''
آپ نے بڑے کرب اور آہ و زاری سے کہا۔ ''ماں! میری بات مان لیجیے۔ میں آپ کو خدا اور اس کے رسول کا واسطہ دوں گا کہ مجھے مایوس نہ کیجیے۔ اب اگر میں حکومت سے چمٹا بھی رہوں گا تب بھی اس طرح کام نہیں کرسکوں گا جس طرح دس سال سے کرتا چلا آرہا ہوں۔''
ماں سر جھکائے کچھ سوچتی رہیں پھر فرمایا۔ ''اچھا اگر تم کنارہ کشی پر مصر ہی ہو تو ایسا کرو کہ تاج و تخت اپنے چھوٹے بھائی اعرف کے حوالے کردو اور کچھ عرصہ اس کے مشیر بن کر اس کی مدد کرتے رہو۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''میں یہ کام بھی نہیں کرسکوں گا۔ اگر مجھے یہی کرنا پڑے گا تو پھر میری دستبرداری سے فائدہ کیا ہوگا۔ میں نہ تو حکومت کروں گا اور نہ ہی اپنے چھوٹے بھائی کو اپنی آراء اور مشوروں سے مدد دوں گا۔''
ماں نے پوچھا۔ ''آخر کیوں؟ اس کی کوئی خاص وجہ؟ تم مشورے کیوں نہیں دے سکو گے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ میں اس ملک کو ہی چھوڑ رہا ہوں۔ میرا گوہر مقصود ہندوستان میں ہے۔ میں وہاں چلا جاؤں گا اور آپ ہی بتائیں کہ میں وہاں سے کس طرح مشورے دوں گا۔''
ماں نے روتے ہوئے کہا۔ ''تو تم ہم سب کو اور اس ملک کو بھی چھوڑ دو گے؟ تم نے اتنا بڑا فیصلہ ہمیں بتائے بغیر ہی کرلیا۔ یعنی اب ہماری آنکھیں تمہیں دیکھ بھی نہیں سکیں گی؟''
آپ نے فرمایا۔ ''ماں! میں جو کچھ بھی کرنے والا ہوں یا کرنے جارہا ہوں، اس میں اسلام اور اس کے پیروکاروں کا فائدہ ہے۔ میں ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ کرنا چاہتا ہوں۔ اس دین کو اس ظلمت کدے میں پہنچا دینا ہی ہمارا بہت بڑا کارنامہ ہوگا اور میں یہ کام کرکے رہوں گا۔''
ماں نے سوگوار آنکھوں سے بیٹے کی طرف دیکھا اور رندھے گلے سے جواب دیا۔ ''بیٹے اشرف! جب تم نے ایک فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں تمہیں کس طرح فیصلہ بدلنے پر مجبور کرسکتی ہوں۔ تم کہتے ہو کہ ہندوستان میں تم اسلام پھیلاؤ گے، وہاں تبلیغ و اشاعت کرو گے، یہ اتنا واضح اور بڑا مقصد ہے کہ میں تمہیں روک بھی نہیں سکتی۔ تمہیں منع بھی نہیں کرسکتی۔ تم محمد اعرف کو سب کچھ سمجھا اور بتا دو۔ اس کے بعد تم چلے جانا۔''
ماں کی اجازت نے آپ کو اتنا خوش کردیا کہ آپ کا ایک ایک عضو اور رُواں رُواں کیف و سرور میں محسوس ہورہا تھا۔ آپ نے اپنے بھائی کو تربیت دینی شروع کردی اور آہستہ آہستہ حکومت سے کنارہ کشی اختیار کرنے لگے۔
جب یہ معلوم ہوگیا کہ آپ حکومت سے بالکل ہی کنارہ کشی اختیار کرچکے ہیں تو آپ کو اندر بلوا لیا گیا۔ ماں آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتی تھیں۔
آپ اندر چلے گئے۔ ماں نے انہیں دیکھتے ہی بحالتِ از خود رفتگی کہا۔ ''بیٹے! یہاں سے کب جارہے ہو؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''میرے یہاں کے سارے ہی کام ختم ہوچکے ہیں۔ اب میں کسی بھی دن یہاں سے چلا جاؤں گا۔''
ماں کو رونا آیا چلا جارہا تھا۔ انہوں نے بمشکل پوچھا۔ ''جب تم یہاں سے چلے جاؤ گے تو ہماری ملاقات کیونکر ہوا کرے گی؟ میں تمہیں کس طرح دیکھ پاؤں گی؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''ماں! آج آپ کیسی مایوسی کی باتیں کررہی ہیں۔ آپ تو بڑی حوصلے والی ہیں۔ میں پہلے تو کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ مجھ سے اس قسم کی باتیں کریں گی۔''
ماں نے کہا۔ ''بیٹے اشرف! تو بیٹا ہے اور میں ماں ہوں۔ ماں کے جذبات اور احساسات دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔''

آپ نے فرمایا۔ ”ماں! میں کل چلا جاؤں گا۔ کل اسی وقت۔“
ماں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، تم چلے جاؤ۔ میں اپنے سینے پر صبر کی سل رکھ لوں گی۔ اللہ تمہیں کامیاب کرے۔“
آپ نے ماں کے قدموں میں سر رکھ دیا اور رونے لگے۔ ماں نے ان کے سر کو اپنی گود میں رکھ لیا اور کہا۔ ”کل تم ایک عام آدمی کی طرح یہاں سے نہیں جاؤ گے۔ تم اس ملک کے بادشاہ رہ چکے ہو۔ یہاں کی ہر چیز تمہاری تابع فرمان تھی۔“
آپ نے پوچھا۔ ”آپ مجھے تنہا نہیں جانے دیں گی؟ یعنی؟ پھر میں کس طرح جاؤں گا؟“
ماں نے کہا۔ ”فوج تمہارے ساتھ ہوگی اور یہ فوج سمنان کی حدود تک تمہارے ساتھ رہے گی۔ جو بھی تمہیں یہاں سے جاتے دیکھے گا، کم از کم وہ یہ تو محسوس کرے گا کہ اس ملک کا تاجدار اور اس ملک کا فرماں روا ان سے جدا ہو رہا ہے۔“
آپ نے کہا۔ ”اس کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں تھی لیکن میں آپ کی بات ٹال بھی نہیں سکتا۔ جیسی آپ کی مرضی۔“
ماں نے اسی شام کو اپنے چھوٹے بیٹے محمد اعرف سے کہہ دیا کہ کل بارہ ہزار کا لشکر اشرف کے ساتھ ساتھ سفر کرے گا اور یہ سفر سمنان کی حدود تک جاری رہے گا کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ سمنان کے لوگ بعد میں یہ کہیں کہ سید اشرف اس ملک کا یوں ہی بے اثر اور کمزور بادشاہ تھا۔ وہ جب سمنان سے ہندوستان گیا تو اس کے ساتھ کوئی بھی نہ تھا۔ وہ تنہا تھا، اکیلا تھا۔
محمد اعرف نے جواب دیا۔ ”ماں! آپ مجھے جو بھی حکم دیں گی، میں بجا لاؤں گا۔ کیا آپ مجھ کو اس جگہ اپنا اور بھائی صاحب کا تابعدار نہیں محسوس کر رہی ہیں؟ میں آپ کا غلام اور بھائی صاحب کا خادم ہوں۔“
ماں نے فرطِ محبت میں کہا۔ ”میں تیرے احساسات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ خدا تجھے ہمیشہ اتنا ہی وفادار رکھے۔“
دوسرے دن بارہ ہزار کا لشکر آپ کے لیے تیار کھڑا تھا۔ رعایا کو بڑا دکھ تھا۔ لوگ ہچکیوں سے رو رہے تھے۔ ماں کسی سے نظریں نہیں ملا رہی تھیں۔ خانقاہ سکاکیہ سے علاء الدولہ بھی آ گئے۔ انہوں نے آپ سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”سید اشرف! جب آپ پیدا ہوئے تھے، میں نے اسی دن اس دن کی خبر دے دی تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ آپ کیا ہیں۔“
آپ نے پوچھا۔ ”میرے بزرگ...... میرے مشفق! آپ یہ تو بتائیں کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا یا نہیں؟“
شیخ علاء الدولہ نے جواب دیا۔ ”آپ اور ناکامی...... اس کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آپ ایک خوش قسمت ترین انسان ہیں۔ اب میں اور کیا کھل کے بتاؤں۔“
سمنان کے علماء، فقراء اور اعیانِ سلطنت اور بارہ ہزار فوج، یہ سب آپ کے ساتھ چلنے لگے۔ ماں نے بطورِ خاص کہا۔ ”بیٹے! ہمیں کچھ پتا نہیں کہ اب ہم ایک دوسرے کو کبھی دیکھ بھی سکیں گے یا نہیں۔ بہرحال تم کوشش کرنا کہ میں تمہیں ایک بار پھر دیکھ لوں۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”ماں! آپ یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ کم از کم اس وقت تو آپ مجھے سوگوار نہ کریں۔“
ماں نے جلدی جلدی آنسو پونچھے اور زبردستی مسکرانے کی کوشش کرنے لگیں۔
اسی عالم میں آپ نے فارسی کے چند شعر پڑھے۔

ترک دنیا گیر تا سلطاں شوی
محرم اسرار باجاناں شوی
برگزر از خواب و خور مردانہ وار
تا براہِ عشق چوں مرداں شوی

دنیا کو چھوڑ کر سلطان بنو اور اسرارِ جاناں کے راز دار بنو۔ کھانے اور سونے سے کنارہ کشی اختیار کر لو تاکہ عشق کے مردِ میدان قرار پاؤ۔
سمنان کی حدود ختم ہوتی جا رہی تھی۔ آپ نے آہستہ آہستہ فوجیوں کو واپس بھیجنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ جیسے ہی اپنے ملک کی حدود سے باہر نکلے، سارے سپاہی ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ وہ خود جس گھوڑے پر سوار تھے، انہیں وہ بھی گراں گزر رہا تھا۔ جنگلوں، پہاڑوں، دروں اور دشوار گزار وادیوں کو عبور کرتے ہوئے ملتان کے قریب اوچھ میں داخل ہو گئے۔ اوچھ میں داخل ہوتے ہی کسی فقیر نے آپ سے گھوڑا مانگ لیا۔ آپ نے وہ گھوڑا اس کی نذر کر دیا۔
اوچھ میں حضرت جہانیاں جہاں گشت موجود تھے۔ سید اشرف ان کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا۔ ”حضرت! میں بہت دور سے پیاسا آیا ہوں۔ میری پیاس بجھا دیجیے۔“

جہانیاں جہاں گشت نے فرمایا۔ ”میں جو کچھ کرسکتا ہوں، ضرور کروں گا۔“ اور اس کے بعد انہوں نے سید اشرف کو بہاء الدین زکریا ملتانی کے پوتے شیخ رکن الدین ابوالفتح سے ملوا دیا اور کہا۔ ”آپ ان سے علم معرفت حاصل کرسکتے ہیں۔“

آپ نے ان دونوں سے علوم معرفت حاصل کیے۔ یہ اوچھ میں رہ تو گئے تھے مگر ان کا دل یہاں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ کہیں اور جانے کے لیے بے چین تھے۔ کہاں؟ اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ آخر ایک شب آپ زاروقطار روئے اور اللہ سے درخواست کی کہ اب مجھے کہاں جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں میری قطعی راہنمائی فرما۔

دعا کے بعد آپ نے نیم غنودگی میں محسوس کیا کہ کوئی آپ سے کہہ رہا ہے۔ ”اے اشرف اتم حرمین کی زیارت کے لیے روانہ ہو جاؤ۔ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔“

آپ نے بیدار ہوتے ہی سفر کی تیاری شروع کردی اور دونوں بزرگوں کو صاف صاف بتا دیا کہ وہ حرمین جا رہے ہیں۔

جہانیاں جہاں گشت نے پوچھا۔ ”واپسی کب تک ہوگی؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”اس کا کوئی پتا نہیں۔ جب بھی واپسی کی اجازت مل جائے گی، واپس آجاؤں گا۔“

آپ وقت ضائع کیے بغیر سرزمین حجاز میں داخل ہو گئے۔ وہاں ہر طرف بہشتِ بریں کی خوشبوئیں آرہی تھیں۔ اس وقت سرزمین حجاز مہک رہی تھی۔ یہاں دنیا بھر کے مشائخ آئے ہوئے تھے۔ آپ ان سے ملے اور جو کچھ بھی ان سے حاصل کرسکتے تھے، حاصل کرتے رہے۔ مکہ معظمہ میں امام عبداللہ یافعی موجود تھے۔ آپ ان سے ملے اور کہا۔ ”حضرت! میں ایک بے چین روح کو اپنے سینے میں قید کیے یہاں تک آگیا ہوں۔ براہِ کرم آپ جو کچھ بھی دے سکتے ہوں، مرحمت فرما دیجیے۔“

حضرت یافعی نے اس مختصر قیام کے دوران جو کچھ دیا، وہ بہت کچھ تھا۔ حرمین کی زیارت کے بعد آپ سیر و سیاحت کرتے ہوئے برصغیر کی طرف واپس ہوئے۔ دہلی میں سلطان محمد تغلق تاج و تخت سنبھال چکا تھا۔ اس بار آپ نے اوچھ کے بجائے دہلی کا رخ کیا۔ دہلی میں شیخ المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کا طوطی بول رہا تھا اور ان کے سجادۂ رشد و ہدایت پر شیخ نصیر الدین چراغ دہلی متمکن تھے۔ آپ نے حضرت چراغ دہلی سے سلسلۂ چشت کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی کوشش کی۔

آدھی رات کے بعد کسی نے آپ کو حکم دیا۔ ”سید اشرف! اوچھ واپس جاؤ۔ یہ کہاں چلے آئے؟ کیا جہانیاں جہاں گشت کو تم نے فراموش کردیا؟“ چنانچہ آپ ایک بار پھر اوچھ تشریف لے گئے۔

جہانیاں جہاں گشت نے انہیں دیکھتے ہی خوشی کا اظہار کیا اور پوچھا۔ ”کہاں چلے گئے تھے تم سید اشرف؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”دہلی...... لیکن وہاں مجھے حکم دیا گیا کہ اوچھ واپس جاؤں۔ چنانچہ میں آپ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہو گیا۔“

مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے فرمایا۔ ”تم میرے پاس جب تک چاہو رہو لیکن جو کچھ تم چاہتے ہو، وہ یہاں سے نہیں، کہیں اور سے تمہیں ملے گا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”حضرت! میں آپ کی خدمت میں اس وقت تک رہوں گا جب تک آپ میری مذکورہ اور مطلوبہ جگہ تک راہنمائی نہیں فرما دیں گے۔ میں آپ کی نوازشوں کا منتظر ہوں۔“

مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے انہیں دوبارہ فیوض پہنچانے کی کوشش کی اور انہیں اپنی نمائندگی کا منصب عطا کردیا۔

آپ کے دل میں معلوم نہیں کس طرح بنگال کا خیال پیدا ہو گیا۔ ان دنوں بنگال کے پنڈوہ نامی شہر میں شیخ علاء الدین گنج نبات کا غیر معمولی شہرہ تھا اور ان کے پاس دور دور سے لوگ پہنچتے رہتے تھے۔ آپ نے ان کا ذکر مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے کیا اور وہاں جانے کی اجازت طلب کی۔ انہوں نے اجازت دے دی اور فرمایا۔ ”سید اشرف! تمہیں جو کچھ ملے گا، وہیں سے ملے گا۔“

چنانچہ آپ حضرت مخدوم سے اجازت حاصل کرتے ہی بنگال کے لیے روانہ ہو گئے۔

راہ میں دہلی پڑا تو یہاں بھی آپ نے مختصر قیام کیا۔ جب یہاں سے چلے تو بازار سے گزرتے ہوئے آپ نے بڑا شور و غل سنا۔ ایک بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ ہر طرف چیخ پکار برپا تھی۔ ہر چھوٹا بڑا، بوڑھا، جوان بھاگنے میں مشغول تھا۔ کوئی کسی سے کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا، بس بھاگ رہا تھا۔ آپ نے ایک شخص کو روکنا چاہا اور اس کو شانوں سے پکڑ لیا اور پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ یہ افراتفری کا عالم کیوں ہے؟“

اس شخص نے ایک جھٹکا دے کر خود کو چھڑا لیا اور چیخ کر کہا۔ ”بھاگو، یہاں کھڑے کیوں ہو۔ موت ہمارے تعاقب میں ہے۔“

آپ نے ایک دوسرے شخص کو مضبوطی سے پکڑ کر کھڑا کر دیا اور پوچھا۔ "کیا بات ہے، یہ بھگدڑ کیوں مچی ہوئی ہے؟"
یہ شخص خود کو چھڑا نہیں سکا۔ رونے لگا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "جناب! آپ بھی بھاگیے اور مجھے بھی چھوڑ دیجیے۔ ایک مست ہاتھی ہم سب کا پیچھا کر رہا ہے اور وہ ادھر آرہا ہے۔"
آپ نے اس شخص کو چھوڑ دیا اور پوچھا۔ "کہاں ہے وہ ہاتھی؟"
وہ شخص دوبارہ بھاگنے لگا اور اپنے پیچھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ ادھر سے آرہا ہے۔"
آپ نے دیکھا واقعی ایک بدمست ہاتھی ان کی طرف بھاگا چلا آرہا تھا۔ اس ہاتھی نے ایک گھڑسوار کو ماتھے کی ٹکر سے دور پھینک دیا۔ اس کے بعد اس نے ایک بند دکان کے دروازے کو اپنی پیشانی کی ٹکر سے توڑ پھوڑ دیا۔ اندر آدمی چھپے ہوئے تھے، وہ بھی مارے گئے۔ آپ کو بڑا دکھ پہنچ رہا تھا اور بجائے بھاگنے کے آپ اس ہاتھی کی طرف بڑھے۔
لوگوں نے شور مچایا۔ "نوجوان مارا گیا۔"
آپ نے اس ہاتھی کی راہ میں کھڑے ہو کر بہ آوازِ بلند فرمایا۔ "او بدبخت! اللہ کی مخلوق کو بے سبب و بے گناہ کیوں ہلاک کر رہا ہے؟"
ہاتھی زور سے چنگھاڑا۔ ایسا لگا جیسے اس کو مار لگائی گئی ہے اور پھر لوگوں نے یہ دلچسپ منظر بھی دیکھا کہ ہاتھی آپ کے پاس سے گزرتے ہوئے اپنی سونڈ کو بطرزِ سلام اپنی پیشانی پر رکھے گزرا چلا گیا۔ اس کے بعد اس نے کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچایا اور فیل بانوں نے اس پر قابو پالیا۔ اس واقعے کا دہلی کے بازاروں اور گلی کوچوں میں بڑا چرچا ہوا اور لوگوں نے اس نوجوان کو بہت تلاش کیا مگر یہ نوجوان انہیں نہیں ملا کیونکہ وہ دہلی سے پنڈوہ روانہ ہو چکا تھا۔
جب آپ پنڈوہ کے قریب پہنچے تو دیکھا شہر کے باہر بہت سارے لوگ جمع ہیں۔ آپ ان کے قریب پہنچے تو اس ہجوم میں سے ایک عمر رسیدہ شخص نکلا اور آپ سے پوچھا۔ "تم سید اشرف سمنانی ہو؟"
انہوں نے جواب دیا۔ "ہاں، میں ہی سید اشرف سمنانی ہوں۔"
ان بزرگ نے انہیں اپنے گلے سے لگالیا اور کہا۔ "اور میں ہوں علاء الدین۔ میں تمہارا کئی دن سے انتظار کر رہا ہوں۔"
آپ کی خوشی کی کوئی حد نہ تھی کیونکہ ان کے مطلوب و مقصود، ان کے پیر مرشد حضرت علاء الدین گنج نبات اپنے مریدوں اور ارادت مندوں کے ساتھ ان کے استقبال کے لیے شہر سے باہر آگئے تھے اور اب وہ ان کے گلے لگے ہوئے تھے۔
علاء الدین گنج نبات نے کہا۔ "سمنانی شہزادے! میں تمہارا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔"
آپ نے جواب دیا۔ "اور میں خود بھی آپ سے ملنے کے لیے بہت بے چین تھا اور اس وقت میں بہت خوش ہوں کہ آخر کار میں نے آپ کو پالیا اور آپ کے قدموں میں رہ کر کچھ حاصل کر سکوں گا۔"
حضرت گنج نبات نے فرمایا۔ "سید اشرف! تم نے سمنان کی حکومت کو لات ماردی اور میں حاکم بنگالہ، جملۃ الملک کا وزیر اعظم تھا لیکن میں نے وزارت کو لات ماردی اور درویشی اختیار کی۔ کرسیِ اقتدار پر گلیمِ درویشی کو ترجیح دی۔"
آپ نے خدا کا شکر ادا کیا اور حضرت گنج نبات نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنی سکھ پال (از قسم فینس ایک سواری) کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ چلو۔ میری سکھ پال حاضر ہے۔"
آپ کو نہایت شفقت اور خلوص سے خانقاہ لے جایا گیا۔ یہاں آپ کی جو خاطر تواضع کی گئی، اس نے وطنِ سمنان کی یاد تازہ کر دی۔ غریب الوطنی کا احساس جاتا رہا۔ آپ نے بے اختیار یہ شعر پڑھا۔

چہ خوش باشد کہ بعد از انتظارے
بر امیدے رسد امید وارے

(کیا خوشی کا مقام ہے کہ انتظار کی طویل مدت کے بعد ایک امیدوار اپنی امید کو پورا ہوتے دیکھے)
شیخ علاء الدین نے آپ کو اپنے حلقۂ ارادت میں داخل فرمالیا۔ یہاں چند دنوں ہی میں جو کچھ دیکھنے میں آیا وہ دوسری جگہوں سے ذرا مختلف تھا۔ آپ نے دیکھا یہاں عبادت اور ریاضت کے ساتھ دنیاوی محنت اور مشقت بھی ہوتی تھی۔
آپ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ وہ روزانہ خشک لکڑیوں کا گٹھر اپنے سر پر لاد کر خانقاہ میں لاتا اور اس کے بعد دوسری خدمات انجام دیتا۔ آپ کو اس نوجوان پر ترس آتا لیکن دم نہ مار سکے کیونکہ انہیں صاف صاف بتا دیا گیا تھا کہ یہاں یہ بات پسند نہیں کی جاتی کہ کوئی شخص خانقاہ میں رہے اور محض مصلے اور خانقاہ کا ہو کر رہ جائے۔ ہر شخص کو مخلوق کی خدمت بھی کرنا

چاہیے۔ جہد و عمل کے بغیر انسان مکمل نہیں ہوتا۔
ایک دن معلوم ہوا کہ بنگال کا وزیر اعظم خانقاہ کی زیارت اور حضرت شیخ گنج نبات کی قدم بوسی کو آ رہا ہے۔ مریدوں کو اس خبر سے بڑی خوشی ہوئی۔ بنگال کا وزیر اعظم آیا۔ شیخ نبات نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اسی وقت وہ نوجوان بھی لکڑیوں کا گٹھر سر پر رکھے خانقاہ میں داخل ہوا۔ وزیر اعظم نے اس نوجوان کو اور نوجوان نے وزیر اعظم کو دل میں اتر جانے والی نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ ”نور الحق! تو نے یہ کیسی روش اختیار کر رکھی ہے؟“
نور الحق کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور جواب دیا۔ ”اس میں خرابی کیا ہے، محنت کر رہا ہوں۔“
وزیر اعظم نے پوچھا۔ ”کب سے؟ یہ محنت کب سے کر رہے ہو؟“
نور الحق نے جواب دیا۔ ”آٹھ سال سے۔“
وزیر اعظم نے پوچھا۔ ”تم کچھ اور کیوں نہیں کرتے؟“
نور الحق نے جواب دیا۔ ”میرے سپرد یہی ذمے داری کی گئی ہے۔“
وزیر اعظم نے نور الحق کا ہاتھ پکڑ لیا اور شیخ نبات کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ ”نور الحق! تم میرے ساتھ چلو۔ میں باوا جان سے تمہاری سفارش کروں گا۔ وہ کوئی نسبتاً آسان خدمت تم سے کیوں نہیں لیتے؟“
نور الحق نے جواب دیا۔ ”آپ میری سفارش نہ کریں۔ کہیں وہ مجھ سے ناراض نہ ہو جائیں۔“
وزیر اعظم نے نور الحق کا ہاتھ پکڑ کر شیخ نبات کی خدمت میں پیش کر دیا اور درخواست کی۔ ”باوا جان! نور الحق پر رحم فرمائیں اور ان کے سپرد کوئی آسان خدمت کر دیں۔“
آپ کو وزیر اعظم کے طرزِ تخاطب پر حیرت ہو رہی تھی۔ ایک مرید سے پوچھا۔ ”یہ پیر مرشد کو باوا جان کیوں کہہ رہا ہے؟“
مرید نے جواب دیا۔ ”آپ نہیں جانتے؟ حیرت ہے۔ وزیر اعظم آپ کا بڑا بیٹا ہے اور نور الحق چھوٹا بیٹا۔“
آپ نے جواب میں جو کچھ سنا تھا، اس پر یقین نہیں آ رہا تھا مگر اب جوان تینوں کی شکلیں ملائیں تو ان میں حیرت انگیز مشابہت محسوس کر لی۔
انہوں نے سنا، شیخ نبات وزیر اعظم سے پوچھ رہے تھے۔ ”کیا نور الحق نے تجھ سے بات کی تھی؟“
وزیر اعظم نے جواب دیا۔ ”نہیں تو۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ جب میں نے خود ہی نور الحق کو اپنے سر پر لکڑیوں کا گٹھا لاتے دیکھا تو پوچھا کہ تم یہ کام کب سے کر رہے ہو؟ جواب ملا آٹھ سال سے۔ تب میں نے خود ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ میں نور الحق کی آپ سے سفارش کروں۔“
شیخ گنج نبات نے نور الحق سے پوچھا۔ ”کیا تم اس خدمت سے گھبرا گئے ہو؟“
نور الحق نے جواب دیا۔ ”نہیں تو باوا جان! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں تو بہت خوش ہوں۔“
شیخ نبات نے فرمایا۔ ”اچھا تو کل سے یہ خدمت کسی اور کے ذمے کر دوں گا۔ اب تم پنگھٹ چلے جایا کرنا۔ صبح سے شام تک وہاں موجود رہنا اور یہ دیکھنا کہ بوڑھی عورتیں پانی کے گھڑے پنگھٹ کی پھسلن میں لے کر چلتی ہیں تو پھسل کر گر پڑتی ہیں۔ تم ان ضعیف خواتین کے گھڑوں کو پھسلن سے پاک حصوں تک پہنچا دیا کرنا۔ بس یہی کارِ خیر صبح سے شام تک تمہیں انجام دینا ہے۔“
اس کے بعد حضرت شیخ نبات نے وزیر اعظم سے کہا۔ ”میں نے تیری سفارش پر یہ آسان خدمت نور الحق کے سپرد کر دی ہے۔ خدا اس پر رحم فرمائے لیکن آئندہ تم اس خانقاہ میں نہیں آؤ گے اور اگر آؤ گے تو ہم درویشوں کے معاملات میں دخل بالکل نہیں دو گے۔“
وزیر اعظم نے جواب دیا۔ ”بہتر ہے۔ میں اس کا خاص طور پر خیال رکھوں گا۔“
وزیر اعظم کے چلے جانے کے بعد انہوں نے اپنے مریدوں سے کہا۔ ”خبردار، جو آئندہ تم لوگوں نے اس وزیر کو اندر آنے دیا۔ وہ کسی اور مسلک کا ہے اور میں کسی اور مسلک کا ہوں۔ ہم دونوں میں زمین آسمان کا فرق حائل ہے اس لیے میں اگر چاہوں تب بھی اس خلیج اور اس فرق کو پاٹ نہیں سکتا، دور نہیں کر سکتا۔ اب آئندہ اس کو اندر مت آنے دینا۔“
شیخ گنج نبات نے دیکھا سید اشرف ان کے سامنے خاموش کھڑے ہیں۔ جملہ مریدوں کو رخصت کر کے ان سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے سید اشرف! میری کوئی بات ناگوار گزری؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”حضرت! آج جو کچھ مجھے معلوم ہوا ہے اس پر میں حیران بھی ہوں اور غمزدہ بھی۔ نور الحق آپ کے صاحبزادے ہیں لیکن میں اس سے لاعلم رہا۔ آپ ان سے اتنی سخت محنت لیتے تھے۔ یہ سب کیا ہے؟“

شیخ گنج نبات نے فرمایا۔ ”سید اشرف! خدمت میں عظمت ہے۔ مخلوق کی خدمت کرو، خالق راضی رہے گا۔ حقوق اللہ کا خیال کرنے والے تو بہت مل جائیں گے مگر حقوق العباد کا خیال رکھنے والے کہاں ہیں۔ نور الحق میرا بیٹا ہے لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ یہ صرف مصلے اور تسبیح کا ہو کر رہ جائے۔ اس کو محنت اور مشقت کرنی چاہیے۔ جب میں اپنے بیٹے سے یہ کام لے سکتا ہوں تو تم لوگوں کو بھی انہی خدمتوں اور مشقتوں پر لگا سکتا ہوں۔ رہ گئی یہ بات کہ میرا ایک بیٹا وزیر اعظم ہے تو میرے لیے اس میں خوشی کی کوئی بات نہیں۔ جس شے کو میں نے بڑی حقارت سے ٹھکرا دیا تھا، میرے ایک بیٹے نے اس کو قبول کر لیا۔ شاید وہ خانقاہ کا آدمی نہیں ہے۔“

اب آپ کے دل میں حضرت گنج نبات کی عظمت اور عزت بہت زیادہ گھر کر چکی تھی۔ آپ رونے لگے۔ آنسوؤں سے دونوں رخسار تر کر لیے اور کہا۔ ”خدا مجھے بھی آپ کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔“

☆☆☆

آپ نے اس خانقاہ میں چار سال گزارے اور حضرت گنج نبات کی کوششوں اور توجہ سے بہت کچھ حاصل کر لیا۔ ان کے پیر مرشد ان سے اس قدر خوش تھے کہ بعض مرید رشک اور بعض حسد محسوس کرنے لگے تھے۔

ایک دن حضرت گنج نبات نے آپ سے کہا۔ ”سید اشرف! میں تم سے بہت خوش ہوں۔ بولو، کیا مانگتے ہو مجھ سے؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”مجھے اس دربار سے اب تک جو کچھ ملا ہے، بے طلب اور بے خواہش ملا ہے۔ اب میں اپنی زبان سے کیا عرض کروں۔ جو دینا ہو، عنایت فرما دیں۔“

حضرت گنج نبات نے فرمایا۔ ”میں نے تجھے جہانگیر کا لقب دیا۔ تُو جہانِ ولایت کا جہانگیر ہے۔ سید اشرف جہانگیر۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ سید اشرف! اب تم جہانگیر ہو۔“

آپ کو یہاں سے جو کچھ بھی مل رہا تھا، بے حد و حساب تھا چنانچہ انہوں نے اپنے احساسات کو اس طرح ظاہر کیا۔

مرا از حضرتِ پیرِ جہاں بخش
خطاب آمد کہ اے اشرف جہانگیر
کنوں گیرم جہانِ معنوی، را
کہ فرماں آمد از شاہم جہانگیر

(مجھ کو اپنے پیر جہاں بخش کی طرف سے خطاب جہانگیر عطا ہوا۔ اب میں جہانِ معنوی کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لیتا ہوں کیونکہ میرے بادشاہ کا یہ فرمان ہے کہ میں جہانگیر ہوں)

حضرت گنج نبات نے اس خطاب کے ساتھ ہی ایک خرقہ بھی دیا اور فرمایا۔ ”سید اشرف جہانگیر! آج میں تمہیں وہ خرقہ دے رہا ہوں جو مجھے اپنے بھائی مرشد سراج الدین سے عطا ہوا تھا۔ انہیں یہ خرقہ حضرت نظام الدین اولیاء سے ملا تھا۔“

انہوں نے اس خرقہ کو احترام اور عقیدت سے قبول فرمایا۔

دوسرے دن حضرت گنج نبات کے مریدوں نے یہ افسوسناک منظر دیکھا کہ سید اشرف ایک درویش سے معروف گفتگو ہیں اور جب یہ درویش جانے لگا تو آپ نے حضرت نظام الدین کا خرقہ اس کو دے دیا۔

مریدوں کو یہ بات گراں گزری۔ ایک مرید نے آپ سے پوچھا۔ ”سید اشرف! یہ شخص کون تھا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ایک درویش، ایک فقیر، کیوں؟ اس سوال کا مطلب؟“

مرید نے پوچھا۔ ”یہ فقیر آپ سے کیا کہہ رہا تھا؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”وہ پریشان تھا اور کہہ رہا تھا کہ میری کچھ مدد کرو چنانچہ میں نے خرقہ اسے دے دیا۔“

ایک دوسرا مرید بولا۔ ”جناب عالی! آپ نے یہ اچھا نہیں کیا۔ جب یہ بات پیر مرشد کو معلوم ہوگی تو وہ آپ سے ناراض ہو جائیں گے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ میں اپنے پیر مرشد کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہوں۔“

ان مریدوں نے آپ کے پاس سے اٹھ کر حضرت گنج نبات سے باتیں شروع کر دیں۔ ایک مرید نے رک رک کر

انگ انگ کر عرض کیا۔ ''حضرت! یہ سید اشرف کیسے آدمی ہیں؟''
انہوں نے جواب دیا۔ ''بہت اچھے، بہت لائق اور بہت معقول ہیں سید اشرف۔ کیوں، کیا بات ہے؟''
مرید نے پوچھا۔ ''اور پیر مرشد! وہ خرقہ جو آپ نے انہیں عنایت فرمایا تھا اور شاید وہ خرقہ حضرت نظام الدین اولیاء کا عطا کردہ تھا، اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''
پیر مرشد نے جواب دیا۔ ''وہ گراں قدر خرقہ صرف سید اشرف ہی کے شایانِ شان تھا۔ میں نے اسے سید اشرف کے حوالے کر دیا۔ حق بہ حقدار رسید۔ یہ اسی کا حق تھا میرے پاس۔ کیوں، کیا کوئی بات؟''
مرید نے عرض کیا۔ ''حضرت! خاص بات یہ ہے کہ سید اشرف نے وہ خرقہ ایک ایسے فقیر کے حوالے کر دیا جس کی روزی مانگ تانگ کے کھانا بتائی جاتی ہے۔''
پیر گنج نبات نے کہا۔ ''پھر تمہیں کیا؟ اس نے اگر ایسا کیا ہے تو اس میں اس کا کوئی نہ کوئی تشفی آمیز اور اطمینان بخش جواب اور جواز بھی موجود ہوگا کیونکہ میں یہ نہیں مان سکتا کہ سید اشرف کوئی ایسا کام بھی کر سکتا ہے جس کا کوئی جواز ہی نہ ہو۔''
ایک مرید نے کہا۔ ''حضرت! ایسا کرنے میں کون سا مقصد کارفرما تھا؟ میرا خیال ہے ان سے اس سلسلے میں بات ضرور کی جائے۔ دیکھتے ہیں وہ اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔''
حضرت گنج نبات نے اجازت دے دی اور کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ وہ جو جواب بھی دے گا، مدلل اور دل میں گھر کرنے والا جواب ہوگا۔''
کئی مریدوں نے پوچھا۔ ''تو پھر ہم لوگ جائیں ان کے پاس اور اس کی وجہ معلوم کریں؟''
حضرت گنج نبات نے اجازت دیتے ہوئے مزید فرمایا۔ ''میں نے کہہ تو دیا کہ تم سید اشرف کے پاس جاؤ اور تمہارے سوالوں کا جو جواب تمہیں ملے، اس سے مجھے بھی مطلع کر دو۔''
یہ مرید یہاں سے اٹھ کر آپ کے پاس پہنچے اور کہا۔ ''سید اشرف! ہم سب پیر مرشد سے مل کر آپ کے پاس آئے ہیں۔ پیر مرشد کو کسی نے یہ بتا دیا ہے کہ آپ نے حضرت نظام الدین اولیاء والا خرقہ کسی فقیر کو دے دیا۔ پیر مرشد کو اس خبر سے بڑا دکھ پہنچا اور وہ پوچھ رہے ہیں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟''
آپ نے ان سے پوچھا۔ ''میں آپ کے سوال کا جواب تو بعد میں دوں گا، پہلے آپ لوگ میرے ایک سوال کا جواب دے دیجیے۔''
ایک مرید نے پوچھا۔ ''کون سا سوال؟ کیجیے سوال۔ ہم ضرور جواب دیں گے۔''
آپ نے پوچھا۔ ''مجھے یہ بتائیے کہ لباس عین پیر ہے یا غیر؟''
مریدوں نے خوب سوچ کر جواب دیا۔ ''لباس عین پیر کس طرح ہو سکتا ہے، وہ تو غیر ہوتا ہے۔''
آپ نے فرمایا۔ ''جب آپ لوگ خود یہ اتفاق فرما رہے ہیں کہ لباس غیر ہوتا ہے، عین پیر نہیں ہوتا، تب پھر یہ سمجھو کہ میرے پیر کی نظر چونکہ غیر پیر پر نہیں ہو سکتی اس لیے میں ان کی اتباع اور پیروں میں غیر پیر پر نظر کیوں کروں؟ میں اپنے پیر کا تابع ہوں۔ میں اپنے پیر سے فیض حاصل کرتا ہوں، کسی کے خرقے سے نہیں۔ اس لیے میں نے وہ خرقہ ایک ضرورت مند کو دے دیا۔''
مریدوں نے آپ کا جواب حضرت گنج نبات تک پہنچا دیا۔ وہ اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور انہیں دعا دیتے ہوئے فرمایا۔ ''اے اللہ! سید اشرف کے علم و معرفت اور کردار میں ترقی اور خوشبو عطا فرما تاکہ اس خوشبو سے شرق و غرب معطر ہو جائیں۔''
حضرت گنج نبات اٹھ کر آپ کی طرف گئے۔ اس وقت آپ لباس پہن چکے تھے اور کمربستہ ہو رہے تھے۔ انہوں نے باہر ہی سے پوچھا۔ ''سید اشرف! کیا کر رہے ہو؟''
انہوں نے جواب دیا۔ ''خدا کے لیے کمربستہ ہو رہا ہوں پیر مرشد!''
پیر مرشد نے فرمایا۔ ''سید اشرف! کمر باندھتے ہو تو ایسی مضبوط باندھو کہ بیچ میں کچھ باقی نہ رہے۔''
انہوں نے جواب میں عرض کیا۔ ''پیر مرشد! میں نے آرزوئے نفس کو اپنے دل سے نکال دیا ہے اور جب تک میں زندہ ہوں، اس کے خلاف نہیں ہوگا۔''

پیر مرشد نے خوش ہو کر نعرہ بلند کیا۔ ''مبارک ہو عزیز من، مبارک ہو۔''
چنانچہ ساڑھے چھ سال حضرت گنج نبات کی خانقاہ میں رہنے کے بعد انہیں حکم دیا گیا۔ ''فرزند اشرف! تمہیں میں نے اپنی استعداد بھر تعلیم دی، اب تم ولایتِ جونپور جاؤ اور خلقِ خدا کی راہنمائی کرو۔''
پیر مرشد کی ہدایت اور حکم کے بعد آپ محمد آباد تشریف لے گئے۔ محمد آباد سے ظفر آباد گئے اور مسجد ظفر خاں میں فروکش ہوئے۔ یہاں شیخ صدر الدین، حاجی چراغ ہند سے ملاقات کی۔ حاجی چراغ ہند یہاں کے ممتاز بزرگ تھے۔ ظفر آباد سے بھنڈوڈ تشریف لے گئے اور کچھوچھہ کا نام روح آباد رکھ دیا۔ یہاں جو خانقاہ تعمیر ہوئی آپ نے اس کا نام کثرت آباد اور اپنے مخصوص حجرے کا نام وحدت آباد رکھ دیا۔
یہاں سے آپ اودھ تشریف لے گئے۔ لکھنؤ میں بھی قیام فرمایا۔ اودھ کے ایک منصب دار سیف خان نے درخواست کی کہ میں ملازمت چھوڑ کر درویشی اختیار کرنا چاہتا ہوں اس لیے آپ مجھے اپنے حلقۂ ارادت میں داخل فرمالیں۔
آپ نے جواب دیا۔ ''سیف خان! تمہیں اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ نے تم جیسوں کے لیے فرمایا ہے کہ وہ لوگ ایسے ہیں کہ دنیا کا ہر کام کرتے ہیں اور خدا کی یاد سے غافل بھی نہیں ہوتے۔''
اس کے بعد آپ کنتور تشریف لے گئے۔ سنجولی نامی گاؤں کی جامع مسجد میں آپ نے نمازِ جمعہ ادا کی۔ یہاں ایک ملا نے آپ کی قدر و منزلت کو حسد سے دیکھا اور آپ کو علمی بحث میں الجھانے کی کوشش کی۔ اس نے آپ سے پوچھا۔ ''حضرت! کیا آپ بتائیں گے کہ بندے کو اپنے فعل پر اختیار ہے یا نہیں؟ اگر ہم یہ کہیں کہ اختیار ہے تو ہم قدری کہلائیں گے اور اگر عدم اختیار کا اقرار کیا جائے تو ہم جبری کہلائیں گے۔ اب آپ یہ بھی بتائیں کہ ان دونوں کے درمیان کیا ہے اور ہمارا عقیدہ کیا ہونا چاہیے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''اختیار صوری ہے اور جبر معنوی۔''
ملا نے کہا۔ ''آپ کا جواب واضح نہیں ہے اور میں اسے جواب نہیں مانوں گا۔''
آپ نے قدرے ترشی سے فرمایا۔ ''تیری زبان ابھی چل رہی ہے، تو باز نہیں آئے گا۔ اچھا تو لے، میں اس کا علاج کیے دیتا ہوں۔''
لوگوں نے یہ عجیب و غریب منظر دیکھا کہ ملا کے دونوں ہونٹ تو ہل رہے ہیں مگر آواز نہیں نکل رہی۔ اس کی آواز سلب کی جا چکی تھی۔ ملا کی شکل دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ سرتاپا رحم کی درخواست بنا کھڑا تھا۔ اس واقعے نے چاروں طرف تہلکہ مچا دیا۔ کچھ دیر بعد ملا کی بوڑھی ماں گرتی پڑتی آئی اور آپ سے رحم کی درخواست کرنے لگی اور بولی۔ ''حضرت رحم۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ یا پیر! بھیک دے۔''
آپ کو اس پر رحم آگیا اور اسے دعا دی۔ ''اے اللہ! مجھے اس بدنامی سے بچا کہ میں نے اس کی قوتِ گویائی سلب کرلی ہے۔ لوگ سمجھیں گے تو گیا کہیں گے۔ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں اس کی قوتِ گویائی بحال فرمادے۔''
کچھ دیر بعد ملا کی قوتِ گویائی بحال ہوگئی مگر اب زبان میں لکنت پیدا ہو چکی تھی اور یہ لکنت زندگی بھر باقی رہی۔

☆☆☆

آپ نے چار بار عرب، فلسطین، شام، فارس، روم اور ماوراء النہر کا سفر کیا۔
کہتے ہیں کہ جب آپ کوہِ طور پر پہنچے تو شیطان آپ کے سامنے آگیا۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ ''تُو نے حضرت آدمؑ کو سجدہ کیوں نہیں کیا؟''
شیطان نے جواب دیا۔ ''میں عاشقِ ثابت قدم اور موحد ہوں۔ میں نے اپنے رب سے یہ عہد کیا تھا کہ میں شرک نہیں کروں گا اور اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ نہیں کروں گا پھر آدم کو سجدہ کیوں کرتا؟''
آپ نے فرمایا۔ ''افسوس کہ تو اس راز سے واقف نہیں کہ محبوب اپنے عاشق کو جو حکم بھی دے، اس کی تعمیل لازم اور فرض ہو جاتی ہے۔ جس خدا سے تو نے یہ عہد کیا تھا کہ تو شرک نہیں کرے گا، اسی خدا نے تجھ کو یہ حکم دیا تھا کہ تو آدمؑ کو سجدہ کرے۔''
دورانِ سفر آپ شیراز بھی تشریف لے گئے اور حافظ شیرازی سے بھی ملاقات کی۔ واپسی میں سمنان بھی گئے۔ اپنے حکمراں بھائی سے ملاقات کی۔ بھائی نے گلے لگ کر آنسو بہائے اور کہا۔ ''بخدا! یہ تاج و تخت آج بھی آپ ہی کا ہے۔ آپ جب چاہیں اسے واپس لے سکتے ہیں۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''میں تاج و تخت کے لیے نہیں آیا۔ ادھر آیا تو سوچا تم سے اور والدہ صاحبہ سے ملاقات کرلوں۔''

بھائی کی ہچکیاں جاری ہوگئیں، بولا۔ ”بھائی صاحب! ماں کا تو انتقال ہو چکا۔ وہ آخری وقت تک آپ کو یاد کرتی رہیں۔“ آپ بھی رونے لگے۔

چند دن سمنان میں رہ کر ماوراء النہر روانہ ہو گئے۔ اسی سفر میں نقشبندیہ سلسلے کے بانی حضرت بہاء الدین نقشبند سے بھی ملاقات کی۔ واپسی میں درویشوں کی ایک جماعت آپ سے ملی۔ ان لوگوں نے آپ سے طرح طرح کے سوالات کیے۔ آپ انہیں نہایت مناسب اور معقول جواب دیتے رہے۔

ایک درویش نے کہا۔ ”یہ آپ سیر و سیاحت میں کیوں رہتے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہم دنیا سے دل نہیں لگاتے اسی لیے آتش زیر پا کی طرح کسی جگہ رکتے نہیں، مستقل حرکت میں رہتے ہیں۔“

ایک درویش نے کہا۔ ”حضرت! رزق جو مقرر ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جو مقدر ہے وہ تو ملے گا ہی پھر اس کے لیے پھرنے پھرانے کی کیا ضرورت ہے؟“

آپ نے فرمایا۔ ”خود سے کون پھرتا ہے؟ خدا پھرواتا ہے، بندہ پھرتا ہے۔ اس سے مفر کہاں۔“

جب یہ درویش چلے گئے تو آپ نے فرمایا۔ ”یہ عجیب درویش تھے۔ ان کو سفر میں طلبِ رزق کے سوا کوئی فائدہ ہی نظر نہیں آتا، خوب۔“

آپ بھوکا رہنا بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں آپ نے فرمایا۔ ”اگر صرف بھوکا رہنے سے کوئی شخص کامل ہو جاتا تو ہندوستان کے سارے جوگی قطب الاقطاب ہوتے۔ بھوکے پیاسے رہنے کو کرامت سمجھنے والے لوگ شہرت کے شوقین ہوتے ہیں اور نفس کی آرزوؤں کی خوراک بن جاتی ہے۔“

اسی طرح آپ نے گوشہ نشینی کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔ ایک بار آپ نے حضرت عمرؓ کا یہ قول دہرایا کہ بُری صحبت کے مقابلے میں گوشہ نشینی میں بڑی راحت ہے۔

جب آپ کی عمر پورے سو سال کی ہوگئی اور 808ھ کا آغاز ہوا، محرم کا چاند نظر آیا تو چاند دیکھ کر آپ بے حد خوش ہوئے۔ آپ نے ابتدائی دس دن اپنے دوستوں کے ساتھ قرأت اور قرآن میں صرف کر دیے۔ عاشورے کے دن آپ کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی مگر پھر سنبھل گئی۔ مرید اور آپ کے دوست بہت خوش ہوئے اور آپ کی صحت اور درازیٔ عمر کی دعائیں مانگی گئیں۔ اس موقع پر آپ نے فرمایا۔ ”میں لمبی عمر، مزید عمر نہیں چاہتا۔ اب صرف آرزوئے وصال ہی رہ گئی ہے۔ مناسب یہی ہے کہ دوست، دوست سے مل جائے۔“

پھر اچانک دوبارہ طبیعت خراب ہوگئی۔ بیس محرم سے تئیس محرم تک آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ آپ اٹھے اور مریدوں کے ساتھ باہر نکل کر مولسری کے ایک درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرا مرقد ہے۔ میری آخری آرام گاہ۔ اسے تم سب یاد رکھنا۔“

لوگ رونے لگے۔

27 محرم کی صبح آپ امامت نہیں فرما سکے اور اسی موقع پر آپ نے اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں سے کہا۔ ”دیکھو، میری وفات پر غم نہ کرنا۔ جو لوگ حق پر قائم رہیں گے وہ مجھ کو اپنے سے بہت قریب پائیں گے۔“

اس کے بعد یہ آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔

وہ آواز جو سمنان سے بلند ہوئی تھی، عرب، شام، فلسطین، روم، ماوراء النہر، پاکستان، گجرات، دکن، بنگال اور اودھ میں متواتر گونجتی رہی۔ اس آواز نے ہزاروں کی کایا پلٹ دی اور اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے دین کا شیدائی بنا دیا۔ یہ آواز تو خاموش ہوگئی لیکن اس کی بازگشت آج بھی سنائی دے رہی ہے۔

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر اس کا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

ماخذات

لطائف اشرفی از: مخدوم اشرف اکیڈمی۔ حیات غوث العالم از: محدث اعظم ہند۔
حیات مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی از: سید وحید اشرف۔

خونی دلدل

سید احتشام

کبھی کبھی انسان انمول جانوں پر معمولی رقم کو اہمیت دیتا ہے اور یہ خیال تک نہیں آتا کہ یہ رقم بھی اس کے کسی کام نہ آئی تو کیا کرے گا... قدرت کی چکی اسی کو تو کہتے ہیں... خون چاہے ظالم کا ہو یا مظلوم کا... اپنا نشان ضرور چھوڑتا ہے... چاہے قتل دلدل ہی میں کیوں نہ ہوا ہو۔

پرانے کاروبار میں نئے حریف کی بدقسمتی اور ایک حاسد کا انجام

ویران و بیابان اوزارکس (Ozarks) کے انتہائی دور افتادہ پُرہول، گھنے اور تاریک جنگلات کے درمیان گھرا ہوا، بلیک ریور کا اداس اداس سا دلدلی علاقہ دنیا بھر کے زہریلے کیڑے مکوڑوں کی جنت ہے۔ اس کی گود میں دلدلی گیس، چاندی جیسی رنگت کی چکنی مٹی، سیلاب اور دور دور تک بکھرے ہوئے مٹھی بھر خاندان پلتے ہیں جن کی گزر اوقات ماہی گیری، شکار اور دام میں پھنسے ہوئے جانوروں پر ہوتی ہے۔ یہاں کے مرد چوکس، محتاط اور بے حد سخت کوش ہیں۔ عورتیں مہربان لیکن خشک مزاج ہیں۔ مسکراہٹ بھی ان کے ہونٹوں کو چھو کر نہیں گزرتی۔ بچے ذہین لیکن گھبرائے گھبرائے سے اور کھیل کے دوران بھی چوکنا رہتے ہیں۔

میزوری (Missouri) کا یہ دلدلی علاقہ چالیس مربع میل پر محیط ہے اور اس کے چپے چپے میں سیلاب کے ناقابلِ گزر پانی، عماراتی لکڑیوں کے اشجار اور کٹے پھٹے راستوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ پرپیچ "بلیک ریور" ہی واحد گزرگاہ ہے اور چپو اور والی کشتیاں اب بھی نقل و حمل کا بہترین ذریعہ ہیں۔

☆☆☆

وہ مئی کا ایک گرم ترین دن تھا۔ آلف گیریٹ چیدہ

سحر نمودار ہونے سے پہلے ہی بیدار ہو گیا اور دلدل پر چھائی ہوئی کہر کے چھٹنے کا انتظار کرنے لگا پھر اپنی کشتی میں سوار ہو کر ندی کے بہاؤ کے رخ روانہ ہو گیا۔ وہ کئی گھنٹے کے بعد اسی مقام پر پہنچا جہاں ندی خم کھاتی تھی۔ یہاں خشک زمین کا ایک ٹکڑا تھا۔ اس نے کشتی کنارے کھڑی کی اور کیمپ لگا کر کافی تیار کرنے لگا۔ کافی پینے کے بعد اس نے مچھلی کے شکار کا ساز و سامان نکال لیا اور کسی مناسب مقام سے آغاز کرنے کے خیال سے ارد گرد نظریں دوڑانے لگا۔ پھر اسے ایک ایسی جگہ تو مل گئی لیکن اس کے ساتھ کچھ اور چیزیں بھی ملیں۔ دریا کے کنارے اس کے بھورے رنگ کے پانی کی پہنچ سے دور ایک انسانی کھوپڑی دھنسی ہوئی تھی اور اس کے پہلو میں دھوپ سے سنولایا ہوا ایک انسانی ڈھانچا پڑا تھا جس سے نیلی قمیص اور پتلون کے چیتھڑے لپٹے ہوئے تھے، نیز پیروں میں گھٹنوں تک کے ربر بوٹ تھے۔

گیریٹ دلدلی علاقے کے دیگر باشندوں کی طرح مضبوط دل گردے کا مالک ضرور تھا لیکن وہ موت کو پسند نہیں کرتا تھا۔ خاص طور سے ایسی موت کو جس کا شکار ہو کر انسان ڈھانچے میں کسی کیچڑ میں پڑا ہو۔ اس نے کافی دیر کے بعد اپنا ساز و سامان سمیٹا اور کشتی میں سوار ہو کر بٹلر کاؤنٹی کے مقام "پوپلر بلف" کی جانب روانہ ہو گیا جو قریب ترین آبادی تھی اور جہاں وہ قانون کے محافظ سے رابطہ قائم کر سکتا تھا۔ اس نے عجلت سے کام نہیں لیا۔ لے بھی نہیں سکتا تھا۔ حالیہ سیلاب نے زبردست تباہی مچائی تھی اور یہ آبی گزرگاہ بے حد دشوار گزار ہو چکی تھی۔ جگہ جگہ کیچڑ تھا، درخت گرے ہوئے تھے اور بہاؤ کافی تیز تھا۔ اسے دو جگہ رک کر کیمپ لگانا پڑا تب وہ اگلی صبح پوپلر بلف پہنچ سکا۔

☆☆☆

شیرف ہوگ نے اپنے ملاقاتی کا جائزہ لیا۔ "بیٹھ جاؤ۔" وہ چیخا۔ "کیا تم نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہے؟"

"بھوت تو نہیں، البتہ ایک انسانی ڈھانچا دیکھا ہے، شیرف!" گیریٹ نے جواب دیا اور ساری بات اس کے گوش گزار کر دی۔

شیرف نے اس کا بیان سنا اور پھر فون پر کورونر گرو ور اور ڈپٹی شیرف ولیم کو اس سنگین واقعے سے مطلع کر دیا۔ دونوں نصف گھنٹے میں وہاں پہنچ گئے۔ گیریٹ نے کورونر کے بے داغ سوٹ، سفید قمیص اور ٹائی کو کن انکھیوں سے دیکھا اور سر ہلانے لگا۔ شیرف انہیں اپنی کار میں سوار کر کے منزل کی طرف روانہ ہو گیا لیکن وہ لوگ دو چار میل سے آگے نہ جا سکے۔ وہاں سڑک ختم ہوتی تھی۔ گیریٹ نے انہیں اپنی کشتی میں سوار کیا جو وہاں سے کچھ فاصلے پر لنگر انداز تھی اور چپوار چلانے لگا۔ اس کے گٹھے ہوئے بازو سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ وہ لوگ راستے میں دو مرتبہ خیمہ زن ہوئے اور جب ندی کے خمیدہ مقام تک پہنچے تو تاریکی ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ وہ اپنے ساتھ لالٹین اور ٹارچ لے کر آئے تھے، اس کے باوجود انہیں وہ جگہ ڈھونڈنے میں خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

"وہ رہا۔" اچانک گیریٹ نے چیخ کر ایک طرف اشارہ کیا اور کشتی کنارے لگا دی۔ وہ سب اتر پڑے۔ ڈپٹی ولیم لالٹین کی روشنی میں کھوپڑی کا معائنہ کرنے لگا۔ کورونر بھی اس پر جھک گیا۔ کھوپڑی کی ناک کا دایاں حصہ پیشانی سمیت غائب تھا۔

"یہ کسی کلہاڑی کا کام ہے۔" گرو ور نے کہا۔ "کوئی بہت ہی تیز اور وزنی کلہاڑی ہوگی۔" اس کے بعد وہ ڈھانچے کی جانب متوجہ ہوا اور اس کی ٹانگوں اور بازوؤں کا معائنہ کرنے لگا۔ "ایک غیر محتاط اندازے کے مطابق اسے مرے ہوئے چھ ماہ ہو چکے ہیں۔" اس نے خیال آرائی کی۔ "ایک سال بھی ہو سکتا ہے۔ سیلاب کے پانی اور کیچڑ نے اس کا ستیاناس کر دیا ہے۔ ماہرین کو بھی حتمی رائے قائم کرنے میں دشواری ہوگی۔" اس نے اپنی بات مکمل کی۔

شیرف ہوگ ڈھانچے کے چیتھڑوں اور بوٹ میں دلچسپی لینے لگا۔ اس نے بوٹ اٹھا کر دیکھا۔ یہ بڑے سائز کا تھا پھر وہ گیریٹ کی جانب مڑا۔

"کیا تم کسی ایسے شخص کے بارے میں جانتے ہو جو لاپتا ہو؟" اس نے استفسار کیا۔ "کوئی ایسا شخص جس کے پیر خاصے بڑے ہوں؟"

گیریٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایسے بے شمار لوگ ہیں جن سے میں چھ ماہ یا اس سے زیادہ عرصے سے نہیں ملا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ لاپتا ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "لوگوں سے اکثر ملاقات نہیں ہوتی۔ ایک بات اور بھی ہے۔ ضروری نہیں کہ بوٹ کے سائز سے یہ ظاہر ہو کہ اس کے مالک کے پیر بڑے ہیں۔ اس علاقے میں بوٹ خاصے مہنگے ہیں۔ میں ایک جوڑا برسہا برس تک استعمال کرتا رہا ہوں۔ یہاں کوئی بوٹ کے سائز کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا۔"

یہ ایک اچھا نکتہ تھا۔ ایسا نکتہ جو آفیسروں کا ڈھیر سارا وقت ضائع ہونے سے بچا سکتا تھا۔ گیریٹ نے انہیں بتایا کہ اس کا کیبن وہاں سے چند میل کی دوری پر واقع تھا اور

اس کے قرب و جوار میں دیگر تین خاندان بستے تھے۔ وہاں سام طر اور اس کا بیٹا باروے رہتے تھے۔ پھر جارج جو ایک خاموش طبع شخص تھا لیکن خشک مزاج نہیں تھا۔ وہ تنہا رہتا تھا اور پھر ریڈ لائن ڈچ میں بھی رہتا تھا۔

"ریڈ لائن ڈچ میں؟" شیرف نے حیرت سے دہرایا۔ "یہ کیسا نام ہے؟"

گیریٹ نے تھکے تھکے انداز میں شانے اچکائے۔ "کوئی بھی اس کا نام نہیں جانتا۔ اجنبی ہے۔ پردیسی کہہ لیں۔ وہ اس علاقے کا باشندہ نہیں ہے۔"

"کیا حال ہی میں تمہاری اس سے ملاقات ہوئی تھی؟" شیرف نے پوچھا۔

"میں نہ تو اس سے ملتا ہوں، نہ بات کرتا ہوں اور نہ ہی میرا ایسا کوئی ارادہ ہے۔" گیریٹ نے جواب دیا۔ "میں اس سے کبھی نہیں ملا۔"

شیرف نے گیریٹ کے ان تینوں پڑوسیوں سے ملنے اور گفتگو کرنے کا ارادہ کرلیا۔ ڈپٹی ولیم نے نشاندہی کی کہ وہ مقام جہاں کھوپڑی اور ڈھانچا ملا تھا، وہ مقام اس قدر ویران، سنسان اور دور افتادہ ہے کہ وہاں صرف وہی شخص پہنچ سکتا ہے جو اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہو ورنہ اجنبی تو بالکل بھٹک جائے۔ درحقیقت کوئی اجنبی اندر جانے کی جرأت کر ہی نہیں سکتا۔ اس انتہائی خطرناک دلدلی علاقے کے بعض حصوں کو دریافت کرنے کی کوشش میں بے شمار لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور بعض ہمیشہ کے لیے لاپتا ہو گئے تھے۔

اس خوفناک ڈھانچے اور کھوپڑی کو ایک چادر میں لپیٹ دیا گیا جو کورونر اپنے ساتھ لایا تھا۔ پھر گیریٹ انہیں اپنی کشتی میں سوار کرکے اپنے کیبن میں لے آیا جہاں شیرف نے عارضی طور پر اپنی تفتیش کا آغاز کردیا۔ سب سے پہلے اسے گیریٹ کے پڑوسیوں سے پوچھ گچھ کرنا تھی اور ناکامی کی صورت میں اس دلدل کے چاروں طرف بکھرے ہوئے گھروں کے دروازے کھٹکھٹاتے ہوئے دائرۂ تفتیش کو وسیع کرنا تھا۔ اسے بہرحال ایک بات کا یقین تھا کہ اس شخص کی موت حادثاتی نہیں تھی۔ کھوپڑی جس انداز سے ٹوٹی تھی، اس سے ثابت ہوتا تھا کہ اس پر کوئی درخت یا وزنی شے نہیں گری تھی بلکہ کسی تیز دھار کلہاڑی سے اس پر وار کیا گیا تھا جس سے دایاں حصہ بالکل اڑ گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ کھوپڑی کے دوسرے حصے بھی غائب تھے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ اس شخص کو کہیں اور قتل کیا گیا تھا اور لاش یہاں لاکر پھینک دی گئی تھی۔ ممکن ہے قاتل نے اسے قبر کھود کر دفن کردیا ہو اور سیلاب کے پانی نے اس کی قبر کو اکھاڑ پھینکا ہو۔

☆☆☆

گیریٹ کے کیبن میں رات گزارنے کے بعد کورونر گرو ور لاش کی باقیات سمیت پوبلر بلف روانہ ہوگیا جبکہ ڈپٹی ولیم اور شیرف ہوگ، سام طر سے ملنے پہنچ گئے جو گیریٹ کا قریب ترین پڑوسی تھا۔ سام طر اور اس کا بیٹا باروے جو سولہ سال کا تھا، ایک کمرے پر مشتمل ایک انتہائی گندے اور زبوں حال کیبن میں رہتے تھے۔ یہ کمرا بیک وقت خواب گاہ، ڈرائنگ روم، اسٹور، کچن اور ورک روم کا کام دیتا تھا۔ یہیں شکار کیے ہوئے جانوروں کی کھالیں اتاری جاتی تھیں اور موسمِ سرما میں کھانے کے لیے مچھلیاں محفوظ کی جاتی تھیں۔

دونوں باپ بیٹے اپنے ملاقاتیوں کو دیکھ کر پلکیں جھپکانے لگے۔ غالباً ایک طویل عرصے کے بعد کوئی ان سے ملنے آیا تھا۔ سام طر نے ان سے مصافحہ کیا اور ایک جگ میں مشروب لے آیا لیکن آفیسروں نے اس کی میزبانی قبول نہیں کی۔

"ماجرا کیا ہے، شیرف ہوگ؟" اس نے خود مشروب کا ایک گھونٹ بھر کر پوچھا۔ "کیا ایک ایماندار شکاری کو تنگ کرنے کے لیے قانون کا کوئی نیا لغتی جال لائے ہو تاکہ یہ ذریعۂ معاش بھی چھن جائے؟"

"نہیں، نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔" شیرف نے اسے یقین دلایا اور پھر اسے اس انسانی ڈھانچے سے آگاہ کیا۔

جواب میں طر نے بے پروائی سے شانے اچکائے اور اپنے بیٹے پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ بیٹا مسکرایا۔

"بس، اتنی سی بات ہے؟" طر تمسخر آمیز لہجے میں بولا۔ "شیرف! تم نے محض اس کی خاطر یہاں آنے کی زحمت کیوں کی؟ ہر سال درجنوں غیر ملکی دلدل کے اطراف چکر لگاتے رہتے ہیں اور ان میں سے بے شمار لاپتا ہوجاتے ہیں۔ وہ مرجاتے ہیں اور ان کی لاش کا بھی پتا نہیں چلتا لیکن آج ایک لاش مل گئی ہے تو قانون کو اتنی سرگرمی دکھانے کی ضرورت نہیں۔"

شیرف اس کی باتیں صبر و سکون سے سنتا رہا اور پھر اس نے طر کو تفصیل سے آگاہ کیا۔ طر کے اشتیاق میں اضافہ ہوگیا۔ "پھر کسی نے اسے قتل کیا ہوگا۔" اس نے دھیمے لہجے میں تسلیم کیا۔ "لیکن اس لاش کو دفن کردینا چاہیے تھا۔ یہ کسی شہری کے لیے کوئی لاش چھپانے کے لیے بہترین جگہ ہے۔"

میری مراد شہر میں قتل ہونے والے سے ہے۔''
''مگر! کوئی بھی شہری اس دلدل سے ہو کر وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔'' شیرف نے کہا۔ ''اور تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو۔''
''ہاں۔ بے شک وہ نہیں پہنچ سکتا۔'' مگر نے اتفاق کیا۔ ''لیکن یہاں کے کسی باشندے کی راہنمائی میں ضرور پہنچ سکتا ہے۔''
شیرف اور ڈپٹی شیرف اس کی اس تھیوری سے متاثر نہیں ہوئے۔ ''کیا تم کسی ایسے شخص کے بارے میں جانتے ہو جو لاپتا ہو؟'' شیرف نے پوچھا۔
''جارج اور گیریٹ کے سوا میرا کوئی پڑوسی نہیں ہے۔'' وہ بولا۔ ''اور میں اتنا مصروف رہتا ہوں کہ ان دونوں میں سے کسی سے بھی پچھلے چھ ماہ سے نہیں مل سکا۔''
''اور ریڈ لائن ڈچ مین کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''
مگر کا جسم تن گیا۔ اس نے زمین پر تھوک دیا۔ ''وہ پردیسی...... اسے ہمارے دلدلی علاقے میں منتقل ہونے کا کیا حق پہنچتا ہے؟''
''کبھی تمہاری اس سے بات ہوئی؟''
''نہیں۔''
''کیا تم اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟ اس کا اصلی نام...... اس کے رشتے دار......؟''
''سنا ہے کہ وہ کوئی بھگوڑا ہے۔ قانون سے بچنے کے لیے یہاں آ گیا تھا۔'' مگر نے جواب دیا۔ ''بہرحال وہ جارج کے سوا کسی سے نہیں ملتا۔ سنا ہے ان دونوں میں گاڑھی چھنتی ہے۔''

☆☆☆

جارج کا کیبن دریا کے اس پار تھا۔ ادھر ہی جدھر سے ڈھانچا ملا تھا۔ وہ تنہا رہتا تھا اور اس نے ایک کتا، کئی بلیاں اور پنجرے میں کئی چڑیاں پال رکھی تھیں جن کا وہ بے حد شوقین تھا۔ وہ پچھلے بیس برسوں سے اپنے ننھے سے کیبن میں رہ رہا تھا۔ ماہی گیری کے علاوہ اسے باغبانی کا بھی شوق تھا اور وہ کبھی بذریعہ کشتی باغبانی کا ساز و سامان فروخت کرنے پوپلر بلف کے چکر لگایا کرتا تھا۔ شیرف ہوگ اور ڈپٹی ولیم وہاں پہنچے تو انہیں اس کا کیبن خالی ملا۔ انہوں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ کھانے کی پلیٹیں دھلی ہوئی تھیں، بستر بچھا ہوا تھا، فرش صاف تھا۔
''بہت صفائی نظر آ رہی ہے۔'' ڈپٹی شیرف ولیم نے تبصرہ کیا۔ ''لگتا ہے روانگی کے وقت وہ عجلت میں نہیں تھا۔''

اس کی کشتی غائب تھی۔ شیرف نے نوٹ کیا کہ کلہاڑی بھی غائب تھی جو جانوروں کو دام میں پھنسانے کے کام آتی تھی۔ کیبن کو دیکھ کر یہ گہرا تاثر ملتا تھا کہ صاحب خانہ کو گئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ بہ مشکل ایک ہفتہ ہوا ہوگا۔ یہ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ وہ لاش جارج کی نہیں تھی لیکن اس بات کا بھی امکان تھا کہ کسی نے اسے قتل کر دیا ہو اور قاتل نے اس کے کیبن پر قبضہ جما لیا ہو۔ یہ صفائی ستھرائی اس امر کی غماز تھی۔ کیبن کا جائزہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوا۔ وہ دونوں وہاں سے نکل کر ریڈ لائن ڈچ مین کے کیبن کی جانب روانہ ہو گئے جو وہاں سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ راہ میں شیرف ہوگ نے ایک حقیقت کی جانب اشارہ کیا۔
''ولیم! تم نے غور کیا؟ یہاں میلوں تک کسی عورت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ مگر، گیریٹ، جارج اور ڈچ مین، سب تنہا رہتے ہیں۔ اگر کوئی عورت ہوتی تو اس قتل کا محرک ہو سکتی تھی۔''
''پھر؟''
شیرف پُرخیال انداز میں اپنی ٹھوڑی کھجانے لگا۔ ''چونکہ کوئی عورت نہیں ہے لہٰذا ہمیں کوئی دوسرا محرک تلاش کرنا پڑے گا اور لاش کی شناخت کے بعد یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔ یہاں کے لوگ ایک دوسرے سے سال چھ مہینے تک نہیں ملتے۔ کسی کے پاس ایسی کوئی قیمتی شے نہیں جو دوسروں میں حرص پیدا کرے اور ان کی آپس میں بنتی بھی ہے۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے لیے اپنی جان نچھاور کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے۔'' وہ بولا۔
لیکن مسئلہ اس پردیسی ریڈ لائن ڈچ مین کا تھا جس سے یہ سب نفرت کرتے تھے۔ صرف جارج ہی ایسا تھا جس نے نفرت کا یہ حصار توڑ کر اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا لیکن کہیں اس دوستی میں ریاکاری تو شامل نہیں تھی؟ کہیں اسے صفحۂ ہستی سے مٹانے کی سازش؟ اگر یہی بات تھی تو قاتل نے اپنے پڑوسیوں سے سختی سے اپنا منہ بند رکھنے کی تاکید کی ہوگی اور یہ سب اس سازش میں شریک ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ یہ لوگ اتنے غریب تھے کہ کوئی لالچ میں انہیں قتل نہیں کر سکتا تھا لیکن یہ بات اس پردیسی کے متعلق نہیں کہی جا سکتی تھی۔ ممکن ہے اس کے پاس خطیر رقم یا کوئی قیمتی شے ہو۔ اس کے بغیر کسی پردیسی کو عملی طور پر لوٹنے کی کوئی وجہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

شیرف ہوگ اور ولیم، ڈچ مین کے کیبن پہنچے۔ فوراً ہی ان کی توجہ دو چیزوں نے اپنی جانب مبذول کر لی۔

دوسرے کیبنوں کے برعکس اس کے شگافوں میں کنکریٹ بھر کراسے پختہ کیا گیا تھا اور دروازے پر ایک بڑا سا قفل لٹک رہا تھا۔ کسی غریب آدمی کو قفل لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہاں، امیر اپنے دروازے کو مقفل کر کے اپنے زود رنج پڑوسیوں کو مشتعل کر سکتا ہے۔ اس ویران علاقے میں قفل کا کوئی تصور نہیں تھا لہٰذا اس قفل نے پردیسی کی دولت کے بارے میں بے ضرر افواہوں کا در کھول دیا ہوگا۔

ہوگ نے قفل کا معائنہ کیا اور پھر کھڑکیاں تلاش کرنے لگا لیکن وہاں سرے سے کوئی کھڑکی تھی ہی نہیں۔ کیبن کے مالک کی واپسی تک اندر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہ امر دونوں کے لیے خاصا پریشان کن تھا کیونکہ ممکن ہے ڈچ مین ایک روز یا ایک ہفتہ یا ایک مہینے تک نہ لوٹتا۔

''میں ہر قیمت پر اندر جا کر اچھی طرح اس کیبن کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔'' شیرف نے کہا اور کسی شے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑانے لگا۔

ڈپٹی ولیم مسکرایا اور پھر وہ کیبن کی دیوار سے لگے ہوئے لکڑیوں کے انبار کی طرف بڑھ گیا جس پر ایک ہتھوڑا رکھا ہوا تھا۔ اس نے وہ ہتھوڑا اٹھالیا اور قفل پر ضرب لگائی۔ اسے مایوسی نہیں ہوئی۔ قفل ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ ہوگ نے اس سے ہتھوڑا لے کر قفل پر شدید ضرب لگائی اور قفل کھل گیا۔

''اب اندر چلیں۔'' وہ بولا۔

دونوں اندر داخل ہو گئے۔ میز، کرسیاں، بستر، برتن، پیالے، غرض یہ کہ ہر شے گرد سے اٹی ہوئی تھی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ کیبن مہینوں سے خالی تھا۔ مزید یہ کہ چولہے میں کٹی ہوئی لکڑیاں تھیں، بستر پر تہ شدہ کمبل، نعمت خانے میں اشیائے خورونوش کا وافر اسٹاک موجود تھا اور چمنی کے پائپ صاف تھے۔ ان پر پالش بھی کیا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا صاحب خانہ موسم سرما میں کیبن چھوڑ گیا تھا اور یہ مئی کا مہینا تھا۔ گویا چھ ماہ ہو گئے تھے۔ وہ انسانی ڈھانچا بھی اتنا ہی پرانا تھا۔ گوشت کو ہڈی چھوڑے ہوئے اتنا عرصہ ہو چکا تھا۔

''یہی ہے۔'' ڈپٹی ولیم نے تیز لہجے میں کہا۔ ''میرے خیال میں ہم صحیح راہ پر لگ گئے ہیں۔ اگر وہ مرا نہ ہوتا تو اتنے عرصے تک اپنے کیبن سے غائب نہ رہتا۔''

''اور قفل؟''

''یہ بہت آسان ہے۔'' ڈپٹی نے جواب دیا۔ ''قاتل نے کیبن کو مقفل کر دیا تھا تاکہ راز افشا نہ ہو۔ کوئی شخص بھی، کوئی پڑوسی بھی کسی کے گھر کا قفل نہیں توڑ سکتا۔''

''اور جارج کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' شیرف

قربانی

کامیاب کاروباری باپ نے بیٹے سے کہا ''جب میں تمھاری عمر کا تھا، روزانہ سولہ سولہ گھنٹے کام کیا کرتا تھا۔''

بیٹا بولا ''مجھے آپ پر فخر ہے ابا۔ اگر آپ اتنے جوش اور اتنی لگن سے کام نہ کرتے تو آج مجھے روزانہ سولہ سولہ گھنٹے کام کرنا پڑتا۔''

سخت سسرال

پانی کا ایک قطرہ کسی جگہ لگاتار ٹپکتا رہے تو آخر کار وہ ایک مضبوط چٹان میں بھی سوراخ کر دیتا ہے لیکن جلد باز لہریں زور شور سے آتی ہیں اور چٹان سے گزر جاتی ہیں اور ان کا نشان تک پیچھے نہیں رہتا۔

سخت سسرال...... کسی بھی دلہن کے لیے چٹان کے مانند ہوتی ہے...... مگر اس کا صبر... بہرحال اس چٹان کو توڑ ہی دیتا ہے۔

از: منور شہزادی، گوجرانوالہ

نے پوچھا۔

''واضح رہے کہ ہم ابھی اس سے نہیں مل سکے ہیں۔'' ڈپٹی نے جواب دیا۔ ''فرض کرو کہ قاتل ڈچ مین نہیں بلکہ جارج ہے، اس طرح سوچو...... ڈچ مین کو جارج نے قتل کیا اور پھر اس کے کیبن سے اپنا کیبن بدل لیا۔ گیربٹ یا سام طر سال چھ مہینے میں آتے ہوں گے۔ انھیں بہلانا اس کے لیے زیادہ مشکل نہیں ہوا ہوگا۔''

شیرف ہوگ اور ڈپٹی شیرف ولیم اگلے چوبیس گھنٹے تک نہایت بے چینی سے ڈچ مین کے لوٹنے کا انتظار کرتے رہے لیکن اسے نہ لوٹنا تھا، نہ وہ لوٹا۔

☆☆☆

شیرف نے اپنے اگلے اقدام کا لائحہ عمل تیار کر لیا تھا۔ اسے ڈچ مین کے کیبن سے کسی جان کلس مین کے نام سے آئے ہوئے چار خطوط ملے تھے۔ فریسندہ کا نام مسز ایما کلس مین تھا اور پتا تھا...... لبا ڈی ایونیو، سینٹ لوئس، میزوری...... خطوط بڑے دلچسپ تھے اور ان میں زیادہ تر گھریلو باتوں کا ذکر تھا جس سے پتا چلتا تھا کہ مسز ایما، جان کی سالی تھی۔

شیرف ہوگ نے اسے ٹیلی گرام بھیجا جس کا اس نے فوراً جواب دیا۔ اس وقت اس کا پوپلر بلف آنا ممکن نہ تھا لہٰذا وہ اپنی بیٹی ایلا کو بھیج رہی تھی۔

ایلا پہنچ گئی۔ شیرف نے اسے اپنے شبہے سے آگاہ کیا۔ ''میں جانتا ہوں کہ صرف ڈھانچا دیکھ کر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔'' وہ بولا۔ ''لیکن شاید تم کسی طرح ہماری مدد کرسکو۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ تمہارے انکل نے بھی دانت بنوایا تھا؟''

''اوہ ہاں۔'' وہ چیخ پڑی۔ ''انکل جان نے ایک سال پہلے سامنے کے دو دانت نکلوا کر نئے دانت بنوائے تھے۔''

شیرف نے اسے وہ کھوپڑی دکھائی۔ ''یہ رہے دو دانت۔''

''یہی ہیں۔'' وہ بے ساختہ بول پڑی۔ ''وہ سامنے کے دو دانت جو انہوں نے بنوائے تھے۔''

اسے اپنے انکل کے جوتے کا سائز بھی یاد تھا اور یہ ہوبہو اس ربر بوٹ کا سائز تھا۔ اس نے جان کے بیلٹ کے بکل پر کھدا ہوا مخصوص ڈیزائن بھی پہچان لیا۔ شیرف کے لیے اتنا ہی کافی تھا اور جہاں تک کورونر کا تعلق تھا، کورونر کی جیوری کا پینل بیٹھا اور اس کے ممبران نے جان کی موت کی تصدیق کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ اسے کسی نامعلوم شخص نے قتل کیا ہے۔

☆☆☆

پولیس کو ایلا کی زبانی جان کلس مین عرف ریڈ لائن ڈچ مین کے بارے میں بعض دلچسپ باتیں معلوم ہوئیں۔ یہ ساٹھ سالہ پراسرار شخص اوزار اور ڈائی میکر کی حیثیت سے سینٹ لوئس میں پچیس سال تک کام کرچکا تھا اور اس عرصے میں اس نے خاصی رقم جمع کرلی تھی پھر جب اس نے یہ محسوس کیا کہ اب آرام کرنے کا وقت آگیا ہے تو اپنے پیشے کو خیرباد کہہ کر صرف ایک شوق پال لیا جس کی اسے آرزو تھی یعنی شکار اور ماہی گیری۔

''اور وہ رقم؟'' شیرف نے قتل کے محرک کو سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا وہ خطیر رقم لے کر آیا تھا؟''

''اوہ، نہیں۔'' ایلا نے جواب دیا۔ ''انہوں نے ساری رقم سینٹ لوئس کے بینک میں جمع کرادی تھی اور مما انہیں ہر ماہ گزارے کے لیے معقول رقم بھیجتی رہتی تھیں۔''

''کیا تمہارے انکل عورتوں میں دلچسپی لیتے تھے؟''

''وہ تنہا تھے۔'' ایلا بولی۔ ''ان کی کوئی خاتون دوست نہیں تھی۔ وہ سینٹ لوئس میں بھی کبھی کسی خاتون کے ہمراہ نظر نہیں آئے۔''

☆☆☆

اب شیرف کو جارج کی طرف سے پہلے سے زیادہ فکر ہوگئی تھی۔ وہ اس شخص سے گفتگو کرنے کے لیے بہت بے چین ہوگیا تھا جو جان کا واحد دوست ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنے ڈپٹی شیرف ولیم کے ہمراہ جارج کے کیبن پہنچ گیا اور وہاں ایسے کاغذات ڈھونڈنے لگا جس سے اس کا سراغ لگ سکتا تھا۔ انہیں پوپلر بلف کے پتے پر بھیجے گئے کئی بل ملے۔ کچھ ایسے کاغذات بھی ہاتھ لگے جن سے ان افراد کا پتا چلتا تھا جن سے اس کے کاروباری تعلقات تھے۔

شیرف نے ان سب سے رابطہ قائم کیا اور اس کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ وہ پچھلے کئی ماہ سے پوپلر بلف اپنے معمول کے دورے پر نہیں آیا تھا۔ ایک سبزی فروش نے بہرحال ان کی راہنمائی کی۔ اس نے بتایا کہ ایک مرتبہ جارج نے اسے اپنے ایک رشتے دار کے بارے میں بتایا تھا جو ارکنساس میں کارننگ کے مقام پر رہتا تھا۔ شیرف نے فوراً کارننگ کی پولیس سے بذریعہ تار رابطہ قائم کیا اور انہوں نے جلد از جلد اس کا پتا چلانے کا وعدہ کرلیا۔ اس کے چوبیس گھنٹے کے اندر جارج اس شہر میں اپنے رشتے دار کے ہاں مل گیا اور اسی رات پوپلر بلف لوٹنے پر رضامند ہوگیا۔

وہاں لوٹنے پر اسے شیرف ہوگ کے دفتر میں تفتیش کاروں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے یقین دلایا کہ وہ اب تک جان کے قتل سے لاعلم تھا۔ اس کے چہرے سے حیرت اور صدمے کی کیفیت ہویدا تھی۔ وہ سچ مچ بے حد حیرت زدہ لگ رہا تھا۔

''ہاں، ہاں...... وہ میرا دوست تھا۔'' وہ پُرزور لہجے میں بولا۔ ''ہم ساتھ ہی شکار کرتے تھے اور مچھلیاں پکڑتے تھے۔ ہم نے بے شمار شامیں گپ شپ کرنے میں گزاردی تھیں۔ ہم ساتھ بیٹھ کر شراب پیتے تھے لیکن کبھی اتنی نہیں پی کہ مدہوش ہوجاتے۔''

''پھر کس کے پاس اسے قتل کرنے کی وجہ تھی؟'' شیرف نے پوچھا۔

''میرے پاس نہیں تھی، شیرف!'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ میرا بہترین دوست تھا۔ اس پورے دلدلی علاقے میں وہ میرا واحد دوست تھا۔ وہ مجھ پر بھروسا کرتا تھا۔''

''کیا تم پچھلے موسم سرما میں اس سے ملنے گئے تھے؟''

جارج ایک لمحے کے لیے ہچکچایا۔ ''میں پچھلے موسم سرما میں کارننگ میں تھا۔'' وہ بولا۔ ''اگر جان اس عرصے میں قتل ہوا ہے تو میں یقیناً شک سے خارج قرار پاتا ہوں۔ میں یہ کام نہیں کرسکتا تھا۔ میں فروری میں واپس آیا تھا، سیلاب

کے فوراً بعد۔ تم میرے کہے ہوئے ایک ایک لفظ کی چھان بین کر سکتے ہو۔"

"تمہاری کلہاڑی کہاں ہے؟" اچانک شیرف پوچھ بیٹھا۔ "ہم نے اس کی تلاش میں تمہارے کیبن کا گوشہ گوشہ چھان مارا لیکن کلہاڑی ہمیں کہیں نہیں ملی۔"

"کسی نے چرائی ہوگی۔" جارج بڑبڑایا۔

"اب رہنے بھی دو جارج!" شیرف نے اسے جھڑکا۔ "بتاؤ، کلہاڑی کہاں ہے؟"

"سردیوں میں جان عمارتی لکڑی کاٹنے کے لیے مانگ کر لے گیا تھا۔" وہ بولا۔ "وہ جانتا تھا کہ میں کارننگ جارہا ہوں۔ میں نے اسے عاریتاً دے دی تھی لیکن جب میں واپس آیا تو وہ مجھے اطراف میں کہیں نظر نہیں آئی۔"

"تم نے جھوٹ کیوں بولا؟"

وہ خفت سے مسکرانے لگا۔ "اگر وہ میری کلہاڑی سے قتل کیا گیا ہو تو میرا کیا بنے گا؟ مجھے کیا معلوم اس دوران وہ کلہاڑی کس کے استعمال میں رہی۔"

طویل جرح کے باوجود شیرف ٹھنڈے دل و دماغ کے مالک جارج کو اس کے موقف سے ایک انچ بھی نہ ہٹا سکا چنانچہ تفتیش مکمل ہونے تک اسے زیرِ حراست ہی رکھا گیا۔

☆☆☆

جارج نے کسی قسم کی پریشانی یا بوکھلاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا لیکن اسی رات جب وہ کلہاڑی بازیافت ہوگئی جو اس نے جان کو عاریتاً دی تھی اور اس کے کیمیاوی معائنے سے یہ ثابت ہوگیا کہ اس پر انسانی خون موجود ہے تو اس کے رویے میں تبدیلی آگئی۔ وہ کلہاڑی مقتول کے گھر سے ملی تھی۔

"میں نے اپنے دوست کو قتل نہیں کیا۔" وہ برہمی سے بولا۔

"پھر بتاؤ، کس نے کیا؟" شیرف نے پوچھا۔

اس کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ "سام ملر سے بات کرو۔" اس نے ناگواری سے کہا۔ "وہ تمہیں ایک دو باتیں بتا سکتا ہے۔"

"جان کے قتل کے بارے میں؟"

"تمہارا مطلب ہے اس نے اسے قتل کیا ہے؟" ڈپٹی شیرف ولیم نے سوال کیا۔

"میں نے یہ کب کہا؟" وہ الٹا سوال کر بیٹھا۔ "لیکن ملر کے پاس ایک ایسی چابی ہے جو جان کے دروازے کے قفل میں لگتی ہے۔"

"تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟"

"کیونکہ خود میں نے ایک ماہ پہلے اسے جان کے کیبن میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک چابی نکال کر قفل پر آزمائی تھی۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ میں اسے دیکھ رہا تھا۔"

شیرف ہوگ، ڈپٹی شیرف ولیم کے ہمراہ سام ملر کے ہاں جا دھمکا۔ ان پر نگاہ پڑتے ہی ملر نے بُرا سا منہ بنایا۔ "معلوم ہوتا ہے جارج کو اپنے کیے کا پھل مل رہا ہے۔" وہ گہرے تفکر سے بولا۔

شیرف کے کان کھڑے ہوگئے لیکن اس نے قفل کی چابی کے بارے میں کچھ پوچھنے سے احتراز کیا۔ "ہاں۔" وہ بولا۔ "اور اس کے پاس کوئی خاص محرک بھی نہیں تھا۔"

"بہت ہی معمولی محرک، شیرف!" اس نے آگاہ کیا۔ "صرف ساڑھے سات ڈالرز۔"

شیرف کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی لیکن اس نے اپنی کیفیت کو کمال ہوشیاری سے چھپالیا۔ "گویا تمہیں یہ بات معلوم ہے؟" اس نے چالاکی سے پوچھا۔ "ہے نا؟"

"بات پھیل ہی جاتی ہے۔"

"گویا تم باقی باتیں بھی جانتے ہو؟"

"گمشدہ پرس کے بارے میں؟"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ پرس غائب ہے؟" شیرف نے تیز لہجے میں پوچھا۔ "ہم گمشدہ پرس یا رقم کے بارے میں نہیں جانتے۔ میرے خیال میں تم خود اپنے ہی جال میں پھنس گئے ہو، ملر!"

ملر اصرار کرتا رہا کہ اس نے سنا تھا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ شیرف نے اس کے کیبن کی تلاشی لی تو کچن کے دروازے کے ایک شگاف میں سے مقتول کا پرس اور اس میں رکھے ہوئے ایک ڈالر والے سات بوسیدہ نوٹ برآمد ہوئے۔ ساتھ ہی اس کی کرسی پر رکھی ہوئی چابی جان کے قفل میں فٹ آگئی۔

"وہ پردیسی تھا۔" ملر غرایا۔ "وہ یہاں ایماندار لوگوں کو تنگ کرنے آیا ہی کیوں تھا؟ مجھے تو ایسا لگا تھا کہ تم ایسے لوگوں سے چھٹکارا پاکر خوش ہوگے۔"

اس کی منفی سوچ نے اس کے ضمیر کو سلا دیا تھا لیکن جب وہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہوا تو اس منفی سوچ نے اس کی کوئی مدد نہیں کی۔ اسے فوراً جان کلس مین کا قاتل قرار دیتے ہوئے عدالت نے تیس سال قید کی سزا سنادی۔

⌘⌘⌘

انسان اگر غور کرے تو سمجھ لے گا کہ بہتا پانی ہو یا گزرا وقت... دونوں ہمیشہ زندگی کی روانی کو ظاہر کرتے ہیں... اب چاہے کتنی رکاوٹیں اور تکالیف آجائیں مگر زندگی رکتی نہیں ہے... لیکن... اسے جب یہ حقیقت سمجھ آئی تو اتنی دیر ہوچکی تھی کہ زندگی کی رعنائیاں بھی دم توڑ گئیں... انتہائی مختصر ساتھ... اور اتنا گہرا احساس... وہ اپنی جگہ چھوڑنے کو تیار نہیں تھی مگر... اس کے جگر گوشے کی تکلیف نے اسے ہر احساس سے بیگانا کردیا کیونکہ جس کی خاطر وہ زندہ تھی... اسی کی بے بسی کو کیسے نظر انداز کردیتی... اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے جب نہ صرف نظریہ بلکہ نظر کا انداز بھی بدلا تو سچائی نے بڑے دلفریب انداز میں خود کو ظاہر کیا... پھر کیسے وہ اپنے رب کا شکر ادا نہ کرتی۔

چاہتوں کی چاشنی اور رشتوں کی تلخیوں کے درمیان
جینے والے ایک خوبصورت تعلق کی خاطرداریوں کی داستان

دوسرا آدمی

ناہید سلطانہ اختر
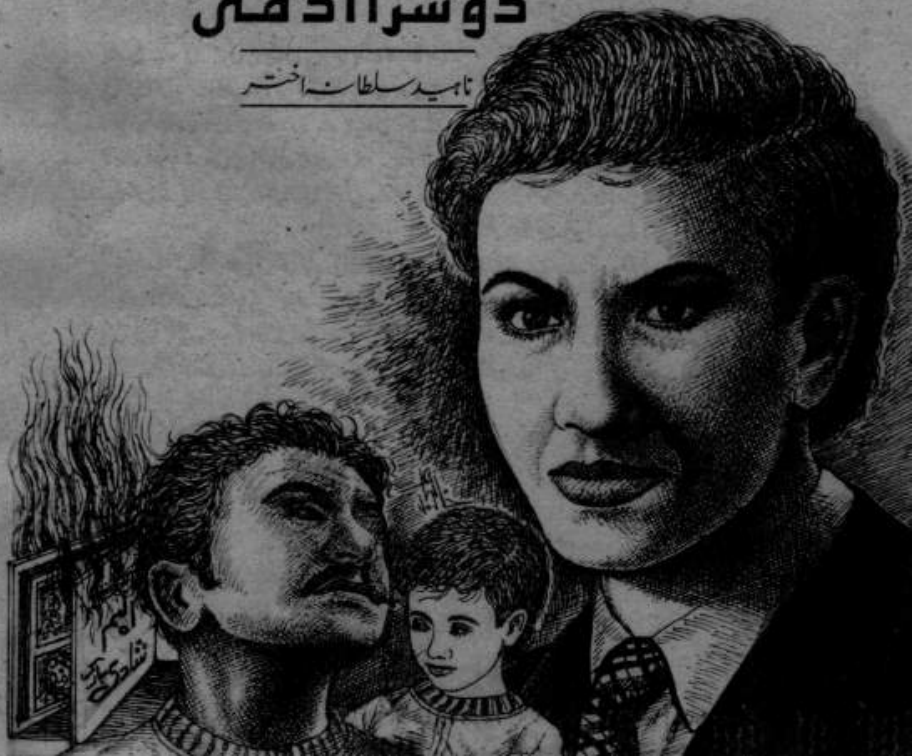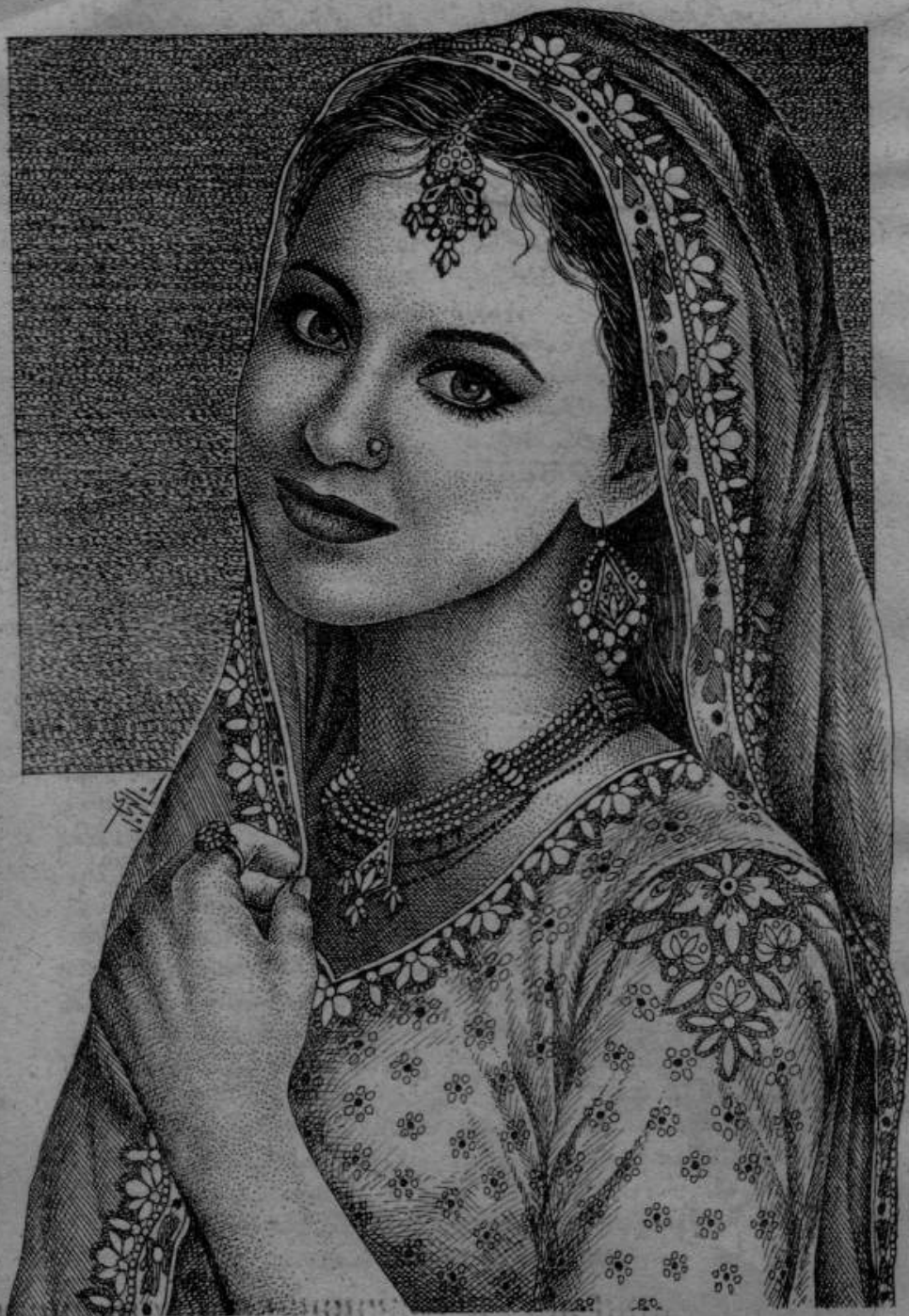
بصیرہ اس رات بہت بے چین رہی تھی۔ ننھا فراز جسے دنیا میں آئے چالیس دن بھی پورے نہ ہوئے تھے، اس کے پہلو میں گدیلے پر لیٹا اپنی ننھی منی آنکھوں سے مسلسل چھت کو تکے جا رہا تھا۔ نہ سوتا تھا، نہ روتا تھا۔ بصیرہ کو خوف آنے لگا۔ پہلے تو اس نے ایسا نہیں کیا تھا، سوتا یا پھر روتا...... اور سونے کے دوران بھی مسکراتا، کبھی منہ بسورنے لگتا۔

لیکن اس رات تو وہ آنکھیں بند کر کے نہ دے رہا تھا۔ جاگنا مسئلہ نہ تھا لیکن اس کا مسلسل چھت کو تکے جانا بصیرہ کو حیران بھی کر رہا تھا، پریشان بھی۔ اتنا چھوٹا سا بچہ جو تک سوتا اور تک جاگتا تھا، مسلسل جاگ ہی رہا تھا اور وہ بھی مسلسل چھت کو گھورتے ہوئے۔

تہجد کے وقت اماں جاگیں تو انہوں نے بصیرہ کو جاگتے اور بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''اماں! آج منے کو نہ جانے کیا ہوا ہے۔ رات بھر نہ سویا ہے، نہ رویا ہے۔ دودھ بھی منہ میں نہیں لے رہا۔ مسلسل چھت کو تکے جا رہا ہے، آنکھیں چھت سے ہٹ ہی نہیں رہیں اس کی۔ ایسا تو اس نے پہلے کبھی نہیں کیا۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ جن بھوت کا سایہ نہ ہو گیا ہو اس پر۔''

''اللہ نہ کرے۔'' اماں بولیں۔ ''اسی لیے کہتی ہوں مغرب سے پہلے اس کا ایک ایک کپڑا الگنی سے اتروا لیا کرو۔''

''ماسی سے اتروا تو لیتی ہوں اماں! دیکھیں ذرا، ٹکٹکی باندھے چھت کو گھورے جا رہا ہے۔''

''وضو کر کے آتی ہوں، آیۃ الکرسی پڑھ کر دم کرتی ہوں۔ تم پریشان مت ہو۔''

اماں وضو کر کے آئیں اور منہ ہی منہ میں آیۃ الکرسی پڑھ کر فراز پر پھونکا۔

''لیٹو...... سو جاؤ۔''

''میرا دل گھبرا رہا ہے اماں! آپ یہیں بیٹھ جائیں۔''

''میں تہجد پڑھ لوں پھر آ کر بیٹھتی ہوں، پریشان مت ہو۔ بچہ نیا نیا عالم ارواح سے اس دنیا میں آیا ہے۔ اس کے ننھے سے دل کی وہی جانے۔ کیا پتا عالم ارواح کی یاد میں ہو۔''

''آپ اور ڈرا رہی ہیں مجھے۔''

''اوہو، اس میں ڈرنے کی کیا بات۔ انسان عالم ارواح ہی سے تو اس دنیا میں آتا ہے۔''

''اچھا، آپ تہجد پڑھ لیں پھر یہیں آ کر بیٹھیں۔ میری تو ساری رات آنکھوں میں کٹی ہے۔''

''پگلی ہو تم۔'' اماں نے پیار سے کہا۔

اماں تہجد کی نماز پڑھ کر تسبیح ہاتھ میں لیے کرسی کھینچ کر اس کے بیڈ کے نزدیک بیٹھ گئیں۔ ''تم سو جاؤ، میں بیٹھی ہوں۔''

بصیرہ لیٹ گئی۔ رات جاگتے گزاری تھی۔ اماں کی موجودگی سے اطمینان ہوا تو ذرا دیر میں آنکھ لگ گئی۔ پتا ہی نہ چلا کب فجر کی اذان ہوئی، کب اماں نماز کے لیے اٹھ کر گئیں۔ صبح کو جب اس کی آنکھ کھلی تو اماں کے ساتھ دوسری کرسی پر شاہنواز اس کا دیور بھی بیٹھا تھا۔ وہ چونک کر دوپٹا سنبھالتی اٹھ بیٹھی۔

''تم...... تم کب آئے شان؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''تھوڑی دیر ہوئی۔'' اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''اچانک!''

''ہاں۔''

''خیریت؟''

شاہنواز نے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

''بے جی تو ٹھیک ہیں؟''

''ہاں۔''

''تو پھر؟''

شاہنواز نے اماں کو یوں دیکھا جیسے ان سے مدد کا طلب گار ہو۔ اماں اٹھ کر بصیرہ کے پاس آ بیٹھیں اور اسے گلے سے لگا کر بلک بلک کر رونے لگیں۔ بھائی اور بھابی بھی کمرے میں آ گئے۔

''کیا ہوا ہے اماں...... مجھے بتائیں کیا ہوا ہے...... شان......؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے شاہنواز کو دیکھا۔ اس نے سر جھکا لیا۔

''کیا ہوا ہے؟'' وہ ہیجان میں آ گئی اور ایک ایک کو دیکھنے لگی۔

''بھائی......'' شاہنواز گھٹی گھٹی آواز میں فقط اتنا ہی کہہ پایا۔

''کس کا بھائی...... کون سا بھائی...... کیا ہوا ہے اماں؟'' وہ وحشت زدہ ہو رہی تھی۔

شاہنواز کرسی سے اٹھ کر اس کے بیڈ کے نزدیک آ کھڑا ہوا۔

''ایاز بھائی چلے گئے۔''

''کہاں...... کہاں چلے گئے؟'' اس نے بے ساختہ چونک کر شاہنواز کو دیکھا۔ اماں نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹا اور دوبارہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

''رات اچانک ان کی طبیعت خراب ہوئی۔ ہم اسپتال لے گئے...... دل کا دورہ تھا...... ڈاکٹروں نے

کوشش کی مگر بھائی کو نہ بچا سکے۔'' شاہنواز نے گھٹی گھٹی آواز میں بتایا۔

''آہ...... آہ......'' اس کی درد بھری آہ نے اماں کا سینہ چیر دیا۔ وہ اماں کے بازوؤں میں جھول گئی۔

''صبر کریں بھابی! اللہ کی رضا یہی تھی۔'' شاہنواز نے دلدوز لہجے میں کہا۔

''کیوں...... کیوں تھی اللہ کی یہ رضا؟'' وہ بلکنے لگی۔

''نہ میرا بچہ...... نہ میری بیٹی...... ایسی بات نہیں نکالتے زبان سے۔'' اماں بولیں۔

''اماں!'' اس نے روتے ہوئے ماں کو دیکھا۔ ''اماں! یہ کیا ہو گیا...... میری رات ہی تو بات ہوئی تھی ان سے...... آج انہوں نے آنا تھا...... چلے کیوں گئے؟''

''ظہر کے وقت تدفین ہے۔ میں آپ کو لے جانے کے لیے آیا ہوں۔'' شاہنواز نے کہا۔ ''ظہر سے پہلے پہنچنا ہے۔ ہمیں جلدی نکلنا ہو گا۔''

''انہوں نے تو فراز کو دیکھا بھی نہیں۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''اللہ کی مرضی...... اسے دیکھنے ہی کے لیے تو آئے تھے۔ فلائٹ لیٹ نہ ہوئی ہوتی تو وہ رات ہی کو یہاں آ جاتے۔ آج آنا تھا انہیں یہاں۔''

اماں نے ایک سرد آہ کھینچی اور اس کے سر کو بوسہ دے کر اٹھنے کا قصد کرتے ہوئے بولیں۔ ''اٹھ میرا بچہ...... تیاری کر۔'' بھائی اور بھابی اسے دلاسا دینے لگے۔

''بھائی...... بھابی......!'' وہ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگی۔

شاہنواز بیڈ کے دوسری جانب جا کر بھتیجے کو دیکھنے لگا جو ساری رات چھت سے آنکھیں لگائے رکھنے کے بعد اب سو رہا تھا۔

بعد میں وہ دنوں سوچتی رہی کیا مہینے بھر کی ننھی سی جان کو اس شب اس سانحے کا الہام ہو گیا تھا جس نے بصیرہ کے دل کو تمام زندگی اس احساس سے دوچار رکھا تھا کہ اس کے بیٹے کا باپ اسے ایک مرتبہ بھی اپنے سینے سے لگائے بغیر ہی دنیا سے چلا گیا تھا۔

☆☆☆

ایاز، بصیرہ کے والد کی دور کی ایک رشتے دار کا بیٹا تھا جو لاہور میں مقیم تھیں۔ برادری ایک تھی لہٰذا شادی، غمی کے موقع پر بصیرہ کے گھر والوں سے جو راولپنڈی میں رہتے تھے، ایاز کے گھر والوں کا ملنا جلنا رہتا تھا۔ ایاز کی والدہ کی ایاز کے لیے بصیرہ پر کافی عرصے سے نظر تھی۔ ایاز ان کے تین بیٹوں میں...... سب سے بڑا تھا۔ انجینئرنگ یونیورسٹی سے ڈگری یافتہ تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد کچھ عرصہ لاہور ہی میں ملازمت کرتا رہا تھا پھر مڈل ایسٹ چلا گیا۔

بصیرہ اکلوتے بھائی کی اکلوتی بہن تھی۔ دونوں کی عمروں میں اچھا خاصا فرق تھا۔ بھائی کے بعد دو بہنیں شیر خوارگی میں ہی مر گئی تھیں۔ بصیرہ پیدا ہوئی تو بھائی کی عمر آٹھ نو سال کے لگ بھگ تھی۔ بصیرہ اور بھائی دونوں میں بہت پیار تھا مگر بھائی کی شادی کے بعد اس محبت میں کمی آ گئی تھی۔ بھابی ان عورتوں میں سے تھیں جو شوہر کو اپنی ملکیت سمجھتی ہیں اور اس کی ساری توجہ اپنے اور اپنے بچوں کے لیے مخصوص جانتی ہیں۔

بصیرہ نے بی اے کے بعد بی ایڈ کیا تھا اور ایک سرکاری اسکول میں ملازمت کر رہی تھی۔ والدین راولپنڈی کے قدیمی رہائشی تھے۔ ایاز کی والدہ جنہیں بصیرہ اپنے بڑے بیٹے ایاز کے لیے پسند تھی۔ ایاز کی ملازمت ہوتے ہی انہوں نے بصیرہ کے لیے ایاز کا رشتہ دے دیا تھا۔ بصیرہ کے والد اس وقت حیات تھے۔ انہوں نے رشتہ منظور کر لیا۔ تقریباً دو سوا دو سال منگنی رہی۔ اس دوران ایاز کو بیرون ملک ملازمت کا موقع ملا تو وہ باہر چلا گیا۔ سالانہ چھٹی پر گھر آیا تو گھر والوں نے اس کی شادی کی تیاری کر رکھی تھی۔

شادی کے بعد بصیرہ پنڈی سے لاہور آ گئی۔ ملازمت سے اس نے کچھ عرصے کی رخصت لے رکھی تھی۔ سرکاری ملازمت کو بنا سوچے سمجھے ترک کر دینا عقلمندی نہ ہوتی۔ ایاز بھی چند سال بیرونِ ملک ملازمت کر کے واپس آنا چاہتا تھا اور یہیں کوئی کاروبار جما کر اپنے گھر والوں کے ساتھ ہی رہنے کا خواہشمند تھا۔ پردیسیوں کے دل کی لگی کوئی ان سے پوچھے۔ پیسا تو مل جاتا ہے، اپنوں کی قربت کو ترستے ہیں۔ شادی کے بعد تو اس نے زیادہ عرصہ پردیس میں نہ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ بصیرہ کو اپنے گھر والوں اور دوستوں کا یہ مشورہ نہایت صائب لگا کہ اسے ملازمت چھوڑنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ سرکاری ملازمت ملنا مشکل، ترک تو کسی بھی وقت کی جا سکتی ہے۔ سسرال والے اپنے ہی تھے۔ ایاز کے واپس جانے کے بعد انہوں نے کشادہ دلی سے کام لیتے ہوئے کہہ دیا کہ وہ اگر پنڈی میں ہی اپنی ملازمت جاری رکھنا چاہے تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ جب تک ایاز پردیس میں ہے، وہ چھٹی پر اس کے پاکستان آنے پر اپنی ملازمت سے رخصت لے کر لاہور آ جا سکتی ہے بصورتِ دیگر ایاز بھی پنڈی جا سکتا تھا۔ اپنوں میں رشتے ناتے ہوں

اور دل کشادہ ہو تو یونہی راستے بنائے جاتے ہیں۔ ایاز کے جانے کے بعد بصیرہ ملازمت سے اپنی رخصت ختم ہونے پر پنڈی آگئی۔

بصیرہ کی شادی کے چار پانچ ماہ بعد ابا اچانک چل بسے۔ ایاز افسوس کے لیے ہفتہ بھر کی چھٹی لے کر پاکستان آیا تو بصیرہ امید سے ہوگئی۔ چند ماہ بعد سالانہ چھٹی پر گھر آیا تو بصیرہ کا اتنا خیال رکھا کہ وہ اپنی قسمت پر نازاں ہوگئی۔ ایاز تین بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور بصیرہ اس کے پہلے بچے کی ماں بننے جارہی تھی۔ ایاز کے گھر میں سبھی خوش تھے۔ بڑے اور کماؤ بیٹے کی پہلی اولاد تھی۔ اس کی پیدائش سے پہلے ہی گھر میں خوشی کا سماں تھا۔

بصیرہ کے ہاں بیٹے کی ولادت نے اس خوشی کو دو چند کردیا۔ پہلی اولاد اور وہ بھی بیٹا۔ ایاز کی والدہ بصیرہ کو چھٹی نہلانے تک بہو اور پوتے کے ساتھ رہیں۔ نومولود کا نام فراز، ایاز نے اپنے نام کے وزن پر خود تجویز کیا۔ روزانہ دو دو، تین تین مرتبہ بصیرہ کو ویڈیو کال کرتا اور بیٹے کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا۔ آفس میں چند لوگوں کے چھٹی پر گئے ہونے کے باعث وہ فوری طور پر چند دن کی چھٹی لینے سے بھی قاصر تھا تاہم اس نے ویک اینڈ کے ساتھ تین دن کی چھٹی کی درخواست دے رکھی تھی۔ انتظامیہ نے وعدہ کیا تھا کہ چھٹی پر گئے پہلے فرد کے واپس آتے ہی وہ اسے اپنے نومولود بیٹے کو دیکھنے کے لیے گھر جانے کی چھٹی دے دیں گے۔ باس خود بھی پردیسی تھا اور دو بچوں کا باپ۔ وہ پہلی بار باپ بننے کی ایکسائٹمنٹ سے بخوبی آگاہ تھا۔ چھٹی ملنے پر ایاز گزشتہ شام ہی دبئی سے لاہور پہنچا تھا۔ پہلے اپنے گھر والوں سے مل کر پنڈی جانا چاہتا تھا۔ تین چار دن بیوی اور بچے کے پاس رہ کر اسے پھر لاہور واپس آکر دبئی جانا تھا۔ فلائٹ لیٹ نہ ہوتی تو وہ پچھلی رات ہی لاہور میں اپنے گھر والوں سے مل کر پنڈی کے لیے نکل جاتا۔ فلائٹ شاید اسی لیے لیٹ ہوئی کہ اس کا اپنا وقت پورا ہوچکا تھا۔ رات کو اچانک طبیعت خراب ہوئی۔ چھوٹے دونوں بھائی اسے ڈاکٹر کے ہاں لے گئے۔ اس نے چیک اپ کے بعد فوری طور پر اسپتال لے جانے کو کہا۔ دل کا دورہ تھا۔ اسپتال پہنچتے پہنچتے طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔ رات کو بارہ سوا بارہ بجے دوسرا دورہ پڑا۔ ڈاکٹروں نے جان بچانے کی پوری کوشش کی مگر وقت پورا ہوچکا تھا۔ ہر کوشش اکارت گئی۔ رات کے پچھلے پہر بصیرہ کو جو چلّے میں تھی اور شوہر کی آمد کی منتظر اس سانحے کی خبر فون پر سنانے کے بجائے اسے جاکر خبر سنانا اور تدفین میں شرکت کے لیے لاہور لانا بہتر سمجھا گیا۔

ایاز سے چھوٹا بھائی شاہنواز اسے لے جانے کے لیے آیا تھا۔ سفر لمبا تھا اور وقت کم۔ فوری نکلنا ضروری تھا۔ بصیرہ پر جو گزر رہی تھی، اس کا دل ہی جانتا تھا۔ ایسی افتاد کا تو اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔ شادی کے بعد اس نے گنے چنے دن ہی تو گزارے تھے شوہر کے ساتھ۔ اس سے بھی زیادہ دکھ کی بات یہ تھی کہ ایاز اپنے نومولود بیٹے سے ملے بغیر ہی دنیا سے چلا گیا تھا۔ ننھے فراز کو دیکھ دیکھ کر بصیرہ کا دل کٹا جارہا تھا۔ ننھی سی عمر میں وہ یتیم ہوگیا تھا۔

پنڈی سے لاہور تک کے سفر میں بصیرہ رو رو کر بے حال ہوگئی۔ اسے ایاز کے ساتھ گزارے دن یاد آرہے تھے۔ ساتھ مختصر تھا مگر بھرپور۔ مستقبل کے لیے ایاز کے کتنے بہت سے خواب تھے۔ کچھ عرصہ پردیس میں گزار کر معقول جمع پونجی کے ساتھ مستقل وطن واپسی اور یہیں کوئی کاروبار کرکے اپنے گھر والوں کے ساتھ رہنا اس کی سب سے بڑی خواہش تھی۔

”میں فیملی اورینٹڈ بندہ ہوں یار! اپنے گھر والوں سے مجبوری میں دور ہوں۔ دبئی میں میرا ذرا دل نہیں لگتا۔ رات کو جب میرے روم میٹس لمبی تان کر سو جاتے ہیں، میں باہر بیٹھ جاتا ہوں۔ ہماری بلڈنگ کے پیچھے ایک میدان ہے۔ اس میدان کی مٹی نے میرے نہ جانے کتنے آنسو پی رکھے ہیں۔“ ایاز نے اس سے کہا تھا۔

”آپ واپس آجائیں...... میری جاب ہے...... آپ کوئی چھوٹا موٹا بزنس سیٹ کرلیجیے گا۔ گزارہ ہوجائے گا۔“ اس نے ایاز سے کہا تھا۔

”بس تھوڑا عرصہ اور گزارنا ہے، پھر آجاؤں گا۔ پہلے بے جی کی یاد بے چین رکھتی تھی...... تم سے شادی کے بعد تو دن رات تمہارا ہی خیال رہتا ہے۔“

وہ دھیرے سے ہنس دی تھی۔ ”کام کا کیا ہوتا ہوگا۔“

”بندۂ مزدور ہوں یار! حسرت موہانی نے کہا تھا نا...... ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی...... یک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی...... تو اپنا حال یہ ہے...... ہے تم سے محبت بھی نوکری کی پابندی بھی...... یک طرفہ تماشا ہے تمہارے عاشق کی طبیعت بھی۔“

”ارے ارے، آپ تو شاعری بھی کرلیتے ہیں۔“

”تک بندی...... میری جان!“ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

پھر جب اس نے اپنے امید سے ہونے کی خبر اسے فون

پر سنائی تو وہ جھوم اٹھا تھا۔ ''فوراً اسکول سے چھٹی لے لو۔''

''کیوں بھئی؟'' اس نے حیرانی سے کہا تھا۔

''تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔''

''جناب! ماں بننے والی عورتیں چارپائی نہیں پکڑ لیتیں...... دنیا جہان کے دھندے نمٹاتی ہیں۔''

''تم ان سب عورتوں سے مختلف ہو۔''

کیا مختلف ہوں؟''

''ایاز احمد کی جان ہو تم۔''

اس کی پریگنینسی کے دوران بے جی چار پانچ مرتبہ لاہور سے پنڈی آئیں۔ کبھی منجھلے بیٹے شاہنواز اور کبھی چھوٹے گلفراز کے ساتھ...... جب آتیں اس کے لیے مقوی غذائیں اور آنے والے مہمان کے لیے چھوٹے چھوٹے کپڑوں، بچھونوں اور کھلونوں کے ساتھ...... اور درمیانی وقفے میں بھی کسی آنے جانے والے کے ہاتھ کچھ نہ کچھ بھجواتی رہتیں۔ بے جی پہلے بیٹے کی پہلی اولاد دیکھنے اور ایاز کے دونوں بھائی چچا بننے کے خیال سے بہت خوش تھے۔ فراز پیدا ہوا تو بے جی اس کے چھٹی نہانے تک لاہور سے پنڈی آ کر اس کے پاس رہیں...... شاہنواز اور گلفراز دونوں بھتیجے کی پیدائش پر بہت خوش تھے۔ ایاز بیٹے کا نام پہلے ہی تجویز کر چکا تھا۔ ''صاحبزادے تشریف لائے تو ان کا نام فراز ہوگا اور بیٹی ہوئی تو نصیرہ۔'' اس نے کہا تھا۔

''نصیرہ کا مطلب؟''

''معاون...... مددگار...... دوست...... یار! دوست ہوگی وہ ہم دونوں کی۔ ہم اس سے روایتی ماں باپ والا رعب داب نہیں رکھیں گے۔ اس کے دوست بن کر رہیں گے۔ یہاں میرا ایک دوست کہتا ہے...... بیٹی کے دوست بن جاؤ تو وہ آپ کا فخر بن جاتی ہے۔''

''بیٹے کا دوست بننے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''اس نے تو ہمارا جگر بن کر رہنا ہے یار!''

ایاز کو بیٹے کی پیدائش کی خبر دی گئی تو اس کا بس نہ تھا اڑ کر دبئی سے پنڈی پہنچ جاتا۔ ''مجھے دکھاؤ۔'' اس کی آواز دلی خوشی کی مظہر تھی۔ ویڈیو کال پر جب اسے نومولود بیٹے کو دکھایا گیا تو وہ بے تابی سے موبائل اسکرین کو چومتا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''یار! میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی اور میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی نہیں سکتا۔''

''دیکھ تو رہے ہیں۔'' بصیرہ نے اس کا دل رکھنے کی کوشش کی۔

''یہ دیکھنا بھی کوئی دیکھنا ہے۔ میں اسے گود میں لے کر پیار کرنا چاہتا ہوں...... اسے اپنے سینے سے لگانا چاہتا ہوں...... ہیل تو دبئی!''

''ہیں ہیں ہیں...... دبئی تو آپ کو روزگار دے رہا ہے...... پیسے دے رہا ہے۔''

''کس قیمت پر؟''

''آپ بتائیں کس قیمت پر؟''

''تم سے دوری کی قیمت پر...... اس خوشی کے موقع پر اپنوں کے ساتھ نہ ہونے پر۔''

''ان شاء اللہ اکٹھے بھی ہوں گے۔''

''چھٹی لینے کی کوشش کرتا ہوں...... ویک اینڈ کے ساتھ تین چار دن کی بھی مل گئی تو فوراً ٹکٹ کٹاؤں گا۔''

چھٹی ملنے پر وہ بہت مسرور تھا۔ اس نے بصیرہ کو فون کیا۔ ''بس پہنچا تمہارے اور اپنے بیٹے کے پاس۔'' اس نے فون پر کہا تھا۔

سیٹ بک ہو جانے کے بعد اس نے بصیرہ کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا تھا۔ ''پہلے لاہور جاؤں گا...... وہاں سے بے جی کو ساتھ لے کر اسی رات پنڈی۔''

مگر موسم کی خرابی کی وجہ سے پرواز دیر سے پہنچی تھی۔ وہ حسب وعدہ رات کو نہ آ سکا...... اسے تو لمبے سفر پر نکل جانا تھا...... بصیرہ سے ملے بغیر...... بیٹے کو بنفس نفیس دیکھے بنا۔

بصیرہ کے دل میں رہ رہ کر ہوک اٹھتی اور وہ تڑپنے لگتی۔ اماں کے دلاسے بھی کام نہ دے رہے تھے۔

لاہور پہنچے تو ایاز کا گھر لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ جس جس کو خبر ملی تھی، دوڑا چلا آیا تھا۔ ایاز! خدیجہ کا بیٹا ایاز! اتنا سوہنا جوان! ایاز مر گیا! اپنے پرائے سب دلگیر تھے...... جوان اور ناگہانی موت۔ سبھی رو رہے تھے...... بصیرہ پہنچی تو عزاداروں کی توجہ کا مرکز بن گئی...... ایسی خوبصورت جوان لڑکی اور بیوگی!

''ایاز! تم تو اپنے بیٹے سے ملنے آئے تھے...... ملے بغیر ہی چلے گئے۔'' بصیرہ تڑپ رہی تھی۔

لوگ گئے اور ایاز کو مٹی کے سپرد کر آئے۔

بصیرہ کی ساس ایک ہی دن میں نچڑ سی گئی تھیں۔ شاہنواز اور گلفراز بھی بے اندازہ رنج میں تھے۔ ننھے فراز کو کبھی دادی اپنے سینے سے لگا کر بلکنے لگتیں، کبھی چچا اپنی بانہوں میں لے کر حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگتے۔ کبھی کوئی رشتے دار اسے ترحم سے دیکھنے لگتا...... اس ننھی سی جان کو کیا معلوم کہ اس نے کیا کھو دیا تھا...... مگر نہیں

بصیرہ کو یقین تھا کہ وہ معصوم جان باخبر تھی...... جانتی تھی کہ اس نے کیسا انمول رشتہ کھو دیا تھا...... پچھلی رات اس کا سو کر نہ دینا اور مسلسل چھت سے آنکھیں لگائے رہنا بے معنی نہ تھا۔

☆☆☆

اماں چہلم تک بصیرہ کے ساتھ رہیں پھر واپس راولپنڈی چلی گئیں۔ بصیرہ کو عدت پوری ہونے تک سسرال میں ہی رہنا تھا۔ ملازمت سے اس کی میٹرنٹی لیو کے ساتھ ہی عدت لیو بھی شروع ہو گئی تھی۔ ایاز نے تو اس کی پریگننسی شروع ہوتے ہی ملازمت سے استعفا دے دینے کو کہا تھا۔

''کیوں؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''کیونکہ بچہ پالنا ایک فل ٹائم جاب ہے۔''

''اماں ہیں نا اسے پالنے کو۔''

''واہ بھئی! بچہ تمہارا اور اسے پالیں تمہاری اماں...... بڑی زیادتی والی بات ہے کہ اپنے بچوں کو پالنے کے بعد وہ بچوں کے بچے بھی پالیں...... بے جی کہتی ہیں ان کے جسم سے اب تک ہم تین بیٹوں کو پالنے کی تھکن ہی نہیں گئی...... نہیں بھئی، اپنا بچہ ہم خود ہی پالیں گے۔''

''آپ ہوتے کب ہیں یہاں؟''

''آ جاؤں گا یار...... بس تھوڑے پیسے کما لوں اپنے بزنس کے لیے۔''

''جب تک آپ مستقل طور پر یہاں نہیں آ جاتے، میں بھی جاب جاری رکھوں گی۔''

''بچہ اگنور ہوگا۔''

''نہیں ہوگا...... بائی دی وے کوئی نام بھی سوچا آپ نے؟''

''بالکل سوچا ہے...... بیٹی دی اللہ نے تو اس کا نام ہوگا نصیرہ اور بیٹا ہوا تو فراز...... کیا خیال ہے؟''

''اکیلے اکیلے سوچ کر اب میرا خیال کیا پوچھتے ہیں۔''

''تم میرے ساتھ تھیں نا یار!''

''کب...... کہاں؟''

''میرے دل میں۔''

اسے خبر تھی بھلا کہ بیٹا ہوگا اور وہ اسے دیکھے بغیر ہی دنیا سے چلا جائے گا؟

بے جی اور دونوں دیور اس کا اور بچے کا بہت خیال رکھ رہے تھے۔ مرے بیٹے کی نشانی تھی۔ بے جی فراز کی ہمہ وقت دیکھ بھال کرتیں۔ شاہنواز اور گلفراز اسے اٹھائے اٹھائے پھرتے۔ ذرا روتا تو پریشان ہو جاتے۔

''بے جی! ذرا دیکھیں تو یہ کیوں رو رہا ہے؟'' بے جی سے کہتے۔ بے جی بھی اس کا ننھا سا پنڈا چھو کر دیکھتیں کہ کہیں بخار تو نہیں۔ کبھی اس کا پیٹ دھیرے دھیرے ٹٹول کر درد کا مقام ڈھونڈنے کی کوشش کرتیں، کبھی مونڈھوں کو ہولے ہولے گھما پھرا کر اور دھیرے دھیرے دبا کر دیکھتیں کہ کہیں مونڈھا تو نہیں اتر گیا۔ کبھی اس کے کان کا معائنہ کرتیں۔ بصیرہ کو ہدایت کرتیں کہ خود لیٹ کر اسے کبھی فیڈ نہ کرے کہ اس سے بچے کے کان میں تکلیف کا اندیشہ ہوتا ہے۔ رات کو اسے اپنے اور بصیرہ کے درمیان لٹا کر بڑی مسہری پر بصیرہ کے پاس ہی سوتیں اور فراز جونہی ذرا سی آواز نکالتا فوراً اٹھ بیٹھتیں۔

''آ ایاز آ جا...... فراز تجھے بلا رہا ہے۔'' اپنی آغوش میں دھیرے دھیرے جھکولے دیتے ہوئے وہ محزون لہجے میں کہتیں۔ ایاز نے بھلا کہاں آنا تھا۔ وہ تو وہاں چلا گیا تھا جہاں جانے والے کبھی پلٹ کر نہیں آتے...... اور ان کے پیچھے رہ جانے والے ان سے دوبارہ ملنے کی راہ نہیں رکھتے۔ فراز تو باپ سے ایک بار بھی نہیں مل پایا تھا۔ بصیرہ دل ہی دل میں سوچتی، اب ایاز سے نہ جانے کتنے قرنوں بعد دوبارہ ملنا ہوگا۔

مگر صدمہ کتنا ہی بڑا، کیسا ہی روح فرسا کیوں نہ ہو، رفتہ رفتہ اس کی شدت میں کمی آ ہی جاتی ہے...... اور صدمہ جتنا شدید ہو، اسی قوت سے صبر کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے کی طاقت بھی مل جاتی ہے رب کی طرف سے۔ بصیرہ کے لیے فراز کا ننھا سا وجود زندگی کی ڈور کو مضبوطی سے پکڑے رہنے کا سبب بن گیا تھا۔

☆☆☆

ان بے کیف دنوں میں اس نے بے جی کی اجازت سے اپنی شادی کے رنگین اور کامدار ریشمی جوڑے ایک ایک کر کے کبھی کسی کو، کبھی کسی کو بانٹنا شروع کر دیے۔ اس کا دل ہی نہ چاہتا تھا خوش رنگ کپڑے پہننے کو...... بننے سنورنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ وہ اجڑ گئی تھی۔ اس کے ذاتی تصرف کا بیشتر سامان تو میکے ہی میں تھا کہ شادی کے بعد بھی اس کا زیادہ وقت قیام تو ملازمت کے باعث وہیں رہتا تھا لیکن بہت سی چیزیں سسرال میں بھی تھیں۔ شادی کے جوڑوں اور جوتوں کی ایاز کی کزنز میں تقسیم کے ساتھ ایک روز اس نے اپنی استعمال شدہ کانچ کی رنگین چوڑیوں اور کڑوں کے گچھے، آرٹیفیشل جیولری اور استعمال شدہ کاسمیٹکس ایک چنگیر میں رکھ کر گھر کے دروازے کے باہر کوڑا دان کے ساتھ رکھ دیں کہ صفائی والی آئے گی تو خوش ہو کر لے جائے گی...... مگر شاہنواز جس سے وہ عدت میں ہونے کے

باعث پردہ کررہی تھی، اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر اندر آنے کی اجازت طلب کرکے اندر آگیا۔ بصیرہ نے اپنے دوپٹے سے گھونگٹ کاڑھ لیا تھا۔

''آپ نے یہ ساری چیزیں ٹوکری میں ڈال کر دروازے کے باہر کیوں رکھ دیں؟'' شاہنواز نے پوچھا۔

''کام والی کو دینے کے لیے۔'' وہ دل گرفتگی سے بولی۔

''جی نہیں۔'' وہ قدرے سخت لہجے میں بولا اور چنگیر میں رکھی چیزوں کو دیکھتے ہوئے دوبارہ گویا ہوا۔ ''یہ چیزیں آپ کے استعمال میں رہی ہیں...... گھر کے دروازے پر انہیں یوں رکھ کر ان کی بے توقیری نہ کریں۔''

''سوری شاہنواز...... امیں نے سوچا مجھے تو اب یہ سب استعمال کرنا نہیں...... چھوٹی چھوٹی استعمال شدہ چیزیں کزنز کو دیتے ہوئے بھی اچھا نہیں لگے گا...... صفائی والی لے جائے گی...... جوان عورت ہے، خوش ہو کر استعمال کرلے گی۔''

''میں واپس اٹھا لایا ہوں...... دوبارہ دروازے کے باہر مت رکھیے گا۔'' اس نے چنگیر بصیرہ کے نزدیک رکھتے ہوئے کہا۔

''چیزوں کے بیکار پڑے رہنے اور ضائع ہونے سے بہتر ہے کہ کوئی انہیں استعمال کرلے۔''

''کوئی کیوں...... بھائی کی یادوں کی خوشبو لپٹی ہے ان چیزوں میں۔''

بصیرہ کا جی بھر آیا...... الفاظ گم ہوگئے...... زبان ساتھ چھوڑ گئی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

شاہنواز نے اپنی دونوں آنکھیں دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور پہلی انگلی سے دبالیں۔ چند ثانیے دل گرفتگی کے عالم میں کھڑا رہا پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا تیزی سے چلا گیا۔

بے جی اس کے رونے کی آواز سن کر منظر میں در آئی تھیں اور چنگیر اس کے پاس رکھے دیکھ کر سمجھ گئی تھیں کہ شاہنواز نے اس سے بھی وہی کہا ہوگا جو وہ اس کے پاس آنے سے قبل ان سے کہہ آیا تھا۔

''یہ کیا ہے بے جی؟'' اس نے باہر سے چنگیر اٹھانے کے بعد گھر میں آنے پر چنگیر میں رکھی چیزوں کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''بصیرہ کا سامان ہے جو وہ اب استعمال نہیں کرنا چاہتی...... صفائی والی لے جائے گی۔''

''یہ......!'' اس نے چنگیر میں رکھی چیزوں پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''ان میں سے بہت سی چیزیں وہ ہیں جو بھائی دبئی سے لائے تھے...... انہیں صفائی والی کو نہیں دینا چاہیے۔''

''تمہاری بھابی استعمال جو نہیں کرسکتی اب...... بیکار پڑی رہنے سے بہتر ہے کوئی استعمال کرلے۔''

''کیوں نہیں استعمال کرسکتیں وہ خود؟''

''بیٹا! بیوہ ہوگئی ہے وہ...... عورت سنگار اپنے مرد کے لیے کرتی ہے...... بیوہ عورت کو سنگار زیب نہیں دیتا۔''

وہ چند ثانیے خاموش کھڑا رہا پھر چنگیر لیے بصیرہ کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ عدت کے دوران بصیرہ دونوں دیوروں سے پردے میں تو تھی مگر ایک ہی گھر میں رہنے کے باعث ضرورتاً پردے کی آڑ میں بات کرلیتی تھی مگر شاذ و نادر ہی۔

بصیرہ کو روتے دیکھ کر بے جی اس کے نزدیک بیٹھ گئیں اور اسے گلے لگاتے ہوئے بولیں۔ ''شان کوئی سخت بات کر گیا ہو تو دل کو نہ لگانا۔ بھائی کی موت نے اسے بہت دکھی کر رکھا ہے۔ پہلے والا شان رہا ہی نہیں...... ایاز سے بہت پیار تھا اسے۔ دونوں اوپر تلے کے تھے۔ لڑتے جھگڑتے بھی تھے مگر ایک دوسرے پر جان بھی دیتے تھے۔ دوستوں کی طرح صلاح مشورہ رہتا تھا دونوں میں۔ اس کے جانے سے یہ بہت اکیلا ہوگیا ہے۔ فراز سے بھی بہت پیار کرتا ہے مگر وہ جو ایاز والی بات تھی، وہ اور ہی تھی۔''

''ایاز کیوں چلے گئے بے جی؟'' بصیرہ بلکنے لگی۔

''اللہ کی مرضی۔'' بے جی بھی رونے لگیں۔ ''اللہ کی مرضی کے آگے انسان بے بس ہے...... ماں ہوں میں...... سارا دن ایاز میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے...... بچپن سے جوانی تک...... اور اس رات تک جب وہ گیا ہے...... اس کی ایک ایک بات یاد آتی ہے مجھے...... میرا دل، دل نہیں رہا، پھوڑا بن گیا ہے جس میں پل پل ایاز کی یادوں کی ٹیسیں اٹھتی ہیں...... مگر صبر کرتی ہوں...... صبر کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں میری بچی...... بندہ اپنے کسی پیارے کے بچھڑنے پر کتنا ہی روئے پیٹے، آخر کو صبر کرنا پڑتا ہے۔''

''مجھے صبر کیوں نہیں آتا بے جی؟''

''آجائے گا...... وقت بڑے سے بڑا صدمہ بھلا دیتا ہے۔ ابا جی تو میں بہت چھوٹی تھی تبھی فوت ہوگئے تھے...... ماں جی مریں تو میں سوچتی تھی اب میں بھی ان کے بغیر زیادہ دن نہیں جی سکوں گی مگر اللہ بخشے تمہارے سسر نے اس دکھ کو بٹایا۔ بھائی گیا تو میں کہتی تھی بس اب کیا جینا...... مگر ایاز کے ابو نے میرا دل ہاتھ میں لیا۔ ایاز کے ابو جس دن گئے تو مجھے لگتا تھا دنیا اب ختم ہے...... مگر اب تک جی رہی ہوں...... ایاز

میرا دل تھا...... میری پہلی اولاد...... اس کی کون سی بات ہے جو مجھے یاد نہیں...... وہ میری روح تھا...... میں نے بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں بیٹھی رہوں گی اور وہ چلا جائے گا...... چلا گیا...... چلا گیا میرا بچہ۔'' بے جی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ بصیرہ نے انہیں اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ ایاز کی موت کے صدمے نے اسے اور بے جی کو دردِ مشترک کی زنجیر میں باندھ دیا تھا۔

چنگیر اس نے سامان سمیت الماری کے اوپر رکھ دی۔

☆☆☆

فراز پر بے جی اور دونوں چچا جان چھڑکتے۔ بے جی اپنی ناتوانی کے باوجود اس کے چھوٹے چھوٹے کام کرنے میں راحت محسوس کرتیں، اسے گود میں لیے پھرتیں، لوریاں دیتیں۔ شاہنواز اس کی ضرورتوں کا بھرپور خیال رکھتا۔ دودھ کا ڈبا اور پیمپرز پیکٹ لا کر رکھ دیتا۔ شہراز یونیورسٹی سے آنے کے بعد اس کو سینے سے لگائے پھرتا۔ یوں لگتا جیسے ایاز سے اپنی محبت ان تینوں نے فراز کو منتقل کر دی تھی۔

بے جی کہتیں۔ ''فراز کو سینے سے لگا کر میرے وجود میں ٹھنڈک سی پڑ جاتی ہے۔ یہ میرے ایاز کی نشانی ہے۔''

بصیرہ دل ہی دل میں سوچتی کہ عدت ختم ہونے کے بعد جب وہ اپنے میکے چلی جائے گی تو وہ تینوں فراز کو کتنا مس کریں گے۔ اسے جانا تو تھا۔ نوکری وہیں تھی۔ اب تو اسے فراز کے لیے جینا تھا، اس کی خاطر نوکری جاری رکھنی تھی۔

پرنسپل نے اسے پُرسہ دینے کے لیے فون کیا تو اس کی ہمت بندھانے کو بولیں۔ ''مس بصیرہ! میں آپ کا دکھ محسوس کر سکتی ہوں۔ تین چھوٹے بچے تھے میرے جب میرے ہسبینڈ کا انتقال ہوا۔ میں جاب کر رہی تھی...... والدین تھے نہیں...... بہن بھائیوں کی اپنی اپنی زندگی تھی، اپنے اپنے مسائل...... میں نے اپنے بچوں کو ماں ہی نہیں، باپ بھی بن کر پالا۔ الحمدللہ تینوں پڑھ لکھ گئے۔ بیٹی بیاہ کر امریکا چلی گئی۔ ایک بیٹا فرانس میں ہے، دوسرا میرے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ شکر ہے رب کا، عزت سے گزر گئی۔ اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر میں کہہ سکتی ہوں ملازمت کرنے والی عورت کا شوہر مر جائے تو وہ آدھی بیوہ ہوتی ہے۔ زندگی کی گاڑی ایک پہیے پر ہی کھینچ لے جاتی ہے۔''

''بہت مشکل آزمائش ہے میڈم! میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایاز کا اور میرا ساتھ اتنا مختصر ہوگا۔'' بصیرہ رونے لگی۔

پرنسپل نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ''میں آپ کو ایک بات بتاؤں مس بصیرہ! ہم کہنے کو کہہ دیتے ہیں کہ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا ہوگا لیکن حقیقی امر یہ ہے کہ ہم اپنے پیاروں کو کھو دینے کے خوف سے ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں اور اللہ مجھے یہ کہنے پر معاف کرے کہ ہم میں سے اکثر لوگ اسی خوف سے اللہ کو یاد بھی کرتے ہیں۔ کبھی ماں باپ کی درازیِ عمر کے لیے دعائیں تو کبھی شوہر کی سلامتی کے لیے گڑگڑانا۔ کبھی اولاد کی عافیت کے لیے نوافل تو کبھی بھائی بہنوں کو کھو دینے کے خوف سے سجدے۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں میڈم! ایاز کی سلامتی اور خیر و عافیت کے لیے میں روزانہ نفلیں پڑھا کرتی تھی۔ شاید میری دعاؤں میں اثر نہیں تھا۔'' وہ پھر اپنے رونے پر قابو نہ رکھ سکی۔

''ایسا نہیں ہے مس بصیرہ! اللہ کے ہر کام، ہر فیصلے میں کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے۔''

''میڈم! ایاز کے اتنی جلدی اور اتنے اچانک چلے جانے میں کیا حکمت ہو سکتی ہے؟''

''خدا کی حکمت وہی جانے...... بیٹا کیسا ہے؟'' پرنسپل نے موضوع بدل دیا۔

''ٹھیک ہے میڈم! اسی نے مجھے، اپنی دادی اور چچاؤں کو بہلا رکھا ہے۔'' بصیرہ کا لہجہ بھی بدل گیا۔

''جیسے جیسے بڑا ہوگا اور بہلاتا جائے گا آپ سب کو۔''

''مائی فادر لیس چائلڈ۔''

''دنیا کی تاریخ میں اکثر بڑی شخصیات اپنے بچپن ہی میں باپ کی شفقت سے محروم رہی ہیں۔''

''مجھے تسلی دینے کا شکریہ میڈم!''

''نہیں نہیں...... یہ تو میرا فرض تھا بصیرہ! رشتے داروں سے زیادہ تو ہم ایک ساتھ کام کرنے والے ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی ہوتے ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔''

''او کے مس بصیرہ! ٹیک کیئر۔''

☆☆☆

عدت کے دوران اماں دو مرتبہ اس سے ملنے کے لیے آئیں اور دو چار دن ٹھہر کر واپس چلی گئیں۔ اماں ایک آدھ دن کو بھی اپنے کسی بھائی، بہن یا بھانجے، بھتیجے کے ہاں چلی جاتیں تو بھائی بے چین پھرتے تھے۔ بار بار فون کرتے اور پوچھتے۔ ''کب لینے آؤں؟''

''آ جاؤں گی ایک آدھ دن رک کر۔'' اماں کہتیں۔

''رکا مت کریں، بس مل کر دن کے دن گھر واپس آ جایا کریں۔'' بھائی کہتے۔

"کیوں بھئی...... ہمارا بھی کچھ حق ہے۔" اماں کے رشتے دار اپنا حق جتاتے۔

"گھر ویران ہو جاتا ہے اماں کے بغیر۔" بھائی کہتے۔

بھائی کو اماں سے بے حد محبت تھی۔ اماں تھیں ہی پیار کیے جانے کے لائق۔ کیا اپنے، کیا پرائے، سب اماں کے دیوانے۔ بڑھاپے میں بھی حُسن جھلکتا تھا چہرے پر۔ لہجہ نہایت دھیما، لوگوں کو بے حساب پیار بانٹنے والی۔ بصیرہ کو اماں سے یہ ساری خوبیاں ملی تھیں۔ کیا خاندان، کیا اسکول کے ساتھی اور شاگرد، سب اس کے مداح رہتے تھے۔

ایاز نے شادی کے بعد اس سے کہا تھا۔ "بے جی نے جب مجھے بتایا کہ وہ تم سے میرا رشتہ کرنے لگی ہیں تو میں نے ان سے کہا تھا...... میں تو اس لڑکی کو زیادہ جانتا بھی نہیں...... بے جی نے کہا...... میں اس لڑکی کو بچپن سے دیکھتی آ رہی ہوں۔ اس کی ماں کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ ساری برادری میں دھوم ہے اس کے اخلاق اور سلیقے کی...... بیٹی ماں پر ہی ہوگی...... میں نے کہا ضروری نہیں...... بے جی نے مجھ پر آنکھیں نکالیں اور بولیں...... زیادہ سیانا نہ بن...... ماں تیرے لیے کوئی غلط فیصلہ کرے گی بھلا۔"

وہ چپ ہوا تو بصیرہ نے پوچھا۔ "اب کیا خیال ہے جناب کا بے جی کے فیصلے کے بارے میں؟"

"بہت، بہت، بہت خوش ہوں میں بے جی کے فیصلے سے۔"

بے جی کے فیصلے سے خوش ہونے والا چلا گیا تھا۔

کیسا عجیب تھا زندگی اور موت کا چکر...... ایک معما، ایک گتھی، ایک سربستہ راز...... سمجھ میں نہ آنے والا۔ کتنی پیاری ہستیاں جن سے انسان اپنی جان سے بڑھ کر محبت کرتا ہے، زندگی سے دامن چھڑا کر موت کی وادی میں اتر جاتی ہیں۔

بصیرہ کا ذہن ان دنوں لامتناہی اور لایعنی سوچوں کا منبع بنا ہوا تھا۔

بے جی کا عقیدہ تھا کہ ہر جمعرات کو مُردوں کی روحوں کو اپنے اپنے گھر جانے کی اجازت ملتی ہے۔ روحیں آتی ہیں، ہم انہیں نہیں دیکھ سکتے مگر وہ ہمیں دیکھتی ہیں۔ نہایت عقیدت سے وہ ہر جمعرات کو کھانے پر فاتحہ دلاتیں اور کسی غریب، مسکین کو دے دیتیں۔ بصیرہ کے دل کی بے قراری کو قرآن حکیم میں اللہ کے وعدے سے سکون ملتا...... نیک اعمال والے جنت کی پُر بہار فضاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ ہوں گے۔

☆☆☆

عدت ختم ہونے سے دو دن پہلے اماں، بھائی کے ہمراہ لاہور پہنچ گئیں۔ نوکری کی مجبوری نہ ہوتی تو شاید وہ کچھ عرصہ اور وہیں رہ لیتی مگر عدت کی رخصت ختم ہونے پر اسے اسکول میں حاضری دینی تھی۔ نوکری اب اسے اپنے لیے تو جو کرنا تھی سو تھی، فراز کی پرورش اور پڑھانے لکھانے کے لیے تو امر لازم بن گئی تھی۔ وہ کسی کی دستِ نگر بن کر نہیں رہنا چاہتی تھی۔

بے جی اداس تھیں کہ فراز ان سے دور چلا جائے گا۔ دبی زبان سے انہوں نے بصیرہ سے اپنا تبادلہ پنڈی سے لاہور کرا لینے کو کہا تھا مگر ٹرانسفر ہتھیلی پر سرسوں لگا لینے والی بات نہیں تھی۔ کئی کئی سال بھی لگ جاتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ وہ اماں کے ساتھ بھائی کے گھر میں رہنا زیادہ بہتر سمجھتی تھی۔ سسرال میں تو دو جوان دیور تھے۔ آج نہیں تو کل ان کی شادی بھی ہونی تھی۔ آنے والی بہوویں اس کے اور اس کے بچے کے ساتھ نہ جانے کیسا سلوک کرتیں۔ عافیت میکے میں رہنے ہی میں تھی۔ بھائی اچھا تھا۔ بھابی ویسی ہی تھیں جیسی عام طور پر ہوتی ہیں۔ البتہ اماں کا سہارا بہت بڑا تھا۔ ان کے ہوتے اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔

اس نے اماں اور بھائی کے ساتھ جانے کی تیاری کر لی۔ تقریباً دو ماہ بعد تعلیمی اداروں میں موسم گرما کی لمبی تعطیلات شروع ہونی تھیں۔ بے جی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر نہایت لجاجت سے کہا۔ "چھٹیوں میں یہیں آ جانا میرا بچہ...... میں شاہنواز یا گلفراز کو بھیج دوں گی تمہیں یہاں لانے کے لیے۔ ہمت ہوئی تو میں خود بھی آ جاؤں گی۔"

"میں خود آ جاؤں گی بے جی...... آپ کو تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں۔"

"تکلیف کیسی؟ تم میرے سب سے پیارے اور سب سے تابعدار بیٹے کی آخری نشانی اپنی گود میں رکھتی ہو۔ تمہاری جگہ میرے دل میں ہے۔"

"آپ کی محبت ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ سمر ویکیشن سے پہلے کسی ویک اینڈ کے ساتھ دو تین دن کی کیجوئل لیو لے کر فراز کو آپ سے ملوانے کے لیے لے آؤں۔"

"خوش رہو۔"

شاہنواز اور گلفراز بھی اداس تھے۔ شاہنواز نے فراز کے لیے بہت سا سامان خرید کر بصیرہ کے سامنے لا رکھا اور روانگی والے دن ایک لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ رکھ لیں اور اپنے یا فراز کے لیے کسی معاملے میں تنگی مت اٹھائیے گا۔"

"اس میں کیا ہے؟" اس نے لفافے کا ملفوف جانتے

ہوئے بھی تجاہل عارفانہ سے کہا۔
''کچھ پیسے ہیں۔''
''نہیں...... اس کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس پیسے ہیں۔''
''ہوں گے...... مگر میری خوشی ہے کہ آپ یہ رکھ لیں۔''
''میں...... میں خرچ کر سکتی ہوں شان!''
''مجھے معلوم ہے...... پھر بھی۔'' شاہنواز نے مستقل لفافہ اس کی طرف بڑھائے رکھا۔
''اچھا دیکھو...... پہلی اور آخری بار۔ مجھے اپنی جاب سے اتنے پیسے ملتے ہیں جو میری اور فراز کی ضروریات کے لیے بہت ہوں گے۔''
''مجھے اس سے بھی انکار نہیں۔''
''تو پھر اس کی کیا ضرورت ہے؟''
''ایک ٹوٹے دل کی تسلی سمجھ لیجیے۔ بھائی سے مجھے کتنی محبت تھی۔ کاش کوئی پیمانہ ہوتا اسے ناپنے کا...... اور آپ پہلی اور آخری بار کی شرط نہ لگائیے...... ساری زندگی تابعدار رہوں گا۔'' دونوں ہاتھ جوڑے وہ نہایت دل گرفتہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

بصیرہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی لفافہ اس کے ہاتھ سے لینا پڑا۔

روانگی کے وقت بے جی اسے اور فراز کو گلے لگا کر ایسی بلک بلک کر روئیں کہ بصیرہ کو جانا مشکل لگا۔ مجبوری نہ ہوتی تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ بے جی کے پاس رک جاتی۔

☆☆☆

وقت جیسے ایک ہی مقام پر ٹھہر گیا تھا۔ اداسی پنجے گاڑ کر اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی۔ زندگی یکسانیت کا شکار...... فجر کے وقت جاگنا، نماز، قرآن مجید کی تلاوت...... اماں کے ساتھ ہلکا پھلکا ناشتا...... اسکول جانے کے لیے تیاری اور جانے سے پہلے فراز کی ضرورت کی ہر شے اماں کی دسترس میں رکھ کر جانا۔ اماں کا دم بہت غنیمت تھا۔ صبح سے دوپہر تک وہی فراز کی دیکھ بھال کرتیں۔

بصیرہ قدرے خود غرضی سے دعا مانگتی۔ ''اللہ پاک! فراز کے بڑا ہونے تک اماں کو کچھ نہ ہو۔'' یعنی فراز بڑا ہو جائے تو پھر کچھ بھی ہو جائے۔ تھی نا صاف خود غرضی۔

فراز بڑا ہو رہا تھا۔ ریسپانس دینے لگا تھا۔ ہاتھ پاؤں چلاتا اور غوں غاں کرتا۔ بصیرہ کو دیکھتے ہی اس کے ننھے سے وجود میں گویا بجلی بھر جاتی...... زور زور سے ہاتھ پاؤں مارتا، مسکراتا۔ اس کی منی منی آنکھیں قمقموں کی طرح جگمگاتیں۔

اماں کہتیں۔ ''بچہ اپنی ماں کو اس کی خوشبو سے پہچانتا ہے۔'' بصیرہ کو لگتا تاریں جڑی تھیں اس کے دل سے فراز کے ننھے سے دل تک۔ اسکول میں اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی انجام دہی کے دوران بھی اسے بار بار فراز کا خیال آتا۔ بہرحال اماں کے ہونے سے اسے یہ اطمینان رہتا تھا کہ فراز محفوظ ہاتھوں میں تھا۔ تجربے سے گزرنے پر بصیرہ کو دوسروں کی مشکل کا احساس بھی ہو رہا تھا۔

امینہ اس کی کولیگ، دو چھوٹی بچیوں کی ماں تھی۔ بصیرہ نے ایک روز اس سے پوچھا۔ ''جب تم اسکول میں ہوتی ہو تو بچیوں کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟''
جواب ملا۔ ''بڑی بیٹی چھوٹی بہن کی دیکھ بھال کرتی ہے۔''
بصیرہ نے پوچھا۔ ''بڑی کتنی بڑی ہے؟''
امینہ نے جواب دیا۔ ''اگلے ماہ تین سال کی ہو جائے گی۔''
بصیرہ نے حیرانی سے پوچھا۔ ''اور چھوٹی؟''
جواب ملا۔ ''پانچ ماہ کی۔''
بصیرہ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ''دو سال کی بچی پانچ ماہ کی بہن کی دیکھ بھال کیسے کر لیتی ہے؟''
امینہ مسکرائی مگر دکھ سے بولی۔ ''کمرا لاک کر کے آتی ہوں۔ دو فیڈرز تیار کر کے رکھ دیتی ہوں۔ بڑی کو سمجھا دیا ہے کہ چھوٹی بہن روئے تو اسے بوتل پلا دینا...... وہ پلا دیتی ہے۔''
بصیرہ نے حیرت سے سنا۔ ''اور اگر بڑی روئے تو؟''
امینہ پھر دل گرفتگی سے مسکرائی۔ ''شاید روتی ہو مگر اس کے لیے میں دودھ کی بوتل کے ساتھ بسکٹ اور پانی کا مگ بھی رکھ آتی ہوں۔ کبھی پیا ہوتا ہے، کبھی گرایا ہوتا ہے۔''
تو یہ بھی کام کرنے والی ماؤں کی دل بیتی۔
ایسے میں بصیرہ اماں کا ہونا نعمت الٰہی نہ سمجھتی تو کیا سمجھتی؟

☆☆☆

اواخر اپریل میں اس نے ویک اینڈ کے ساتھ تین دن کی اتفاقی رخصت لی اور سسرال میں کسی پیشگی اطلاع دیے بغیر بس کے ذریعے لاہور پہنچ گئی۔ اپنے گھر والوں کو اس نے منع کر دیا تھا کہ بے جی یا ایاز کے بھائیوں میں سے کسی کو خبر نہ دی جائے۔ زندگی اب اللہ کے سہارے آپ ہی گزارنا تھی...... فراز کی سنگل پیرنٹ بن کر...... سو صرف فراز کے ساتھ ایک شہر سے دوسرے شہر سفر کی مشق ہونا لازم تھی۔ وقت اور حالات انسان کو یونہی سکھاتے ہیں۔ بقا کا راستہ جاننے کے لیے تجربے کی گھاٹی سے گزرنا لازم۔

بصیرہ کو فراز کے ساتھ پہلی بار سفر کرنے میں تھوڑی سی مشکل تو ہوئی مگر جب سسرال پہنچی تو بے جی کی خوشی دیکھ کر سفر

کی ساری مشکل بھول گئی۔

”بتا دیتیں بیٹا! شان یا کل تمہیں لینے آجاتے۔“

”بھائی کہہ رہے تھے میں چھوڑ آتا ہوں لیکن میں نے کہا مجھے اکیلے بھی تو سفر کی عادت ہونی چاہیے۔ ویسے اکیلی بھی کیوں، بے جی آپ کا پوتا تو میرے ساتھ تھا نا۔“

”جیتا رہے...... میرے ایاز کی نشانی۔“ بے جی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”اب یہ چار دن آپ کے پاس رہے گا، آپ ہی کے پاس سوئے گا۔“

”چار دن کیوں...... پانچ دن۔“

”پانچویں دن تو واپس جانا ہوگا بے جی!“

بے جی پوتے کو بے تابانہ چومنے لگیں۔ ”اسے سینے سے لگا کر ٹھنڈ پڑ جاتی ہے میرے سینے میں۔“ انہوں نے فراز کو سینے سے لگاتے ہوئے بصیرہ سے کہا۔ ”بچہ پالنا آسان نہیں۔ ماں کی نیند بھی پوری نہیں ہوتی۔ اب تم دو چار دن آرام کرو۔“

شاہنواز اور گلفراز بھی بھتیجے کو دیکھ کر بہت خوش تھے لیکن اس بار وہ اپنے ساتھ شاہنواز کے رویے میں نمایاں تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ وہ اس سے نظریں ملا کر بات کرنے سے کترا رہا تھا۔ بے جی فراز کی ہمہ وقت دیکھ بھال کے ساتھ اس کا بھی گھر آئے مہمان کی طرح خیال رکھتیں۔ کل وقتی ملازمہ کو بصیرہ سے کوئی کام نہ کرانے کی ہدایت تھی۔ بے جی بصیرہ سے پوچھ کر اس کی پسند کا کھانا پکواتیں...... آج حلیم بنے گا، بصیرہ کو پسند ہے...... کل یخنی پلاؤ، بصیرہ شوق سے کھاتی ہے۔ بصیرہ کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ اس گھر میں اتنی محبت اور توقیر ملنا تھی تو وہ شخص کیوں چلا گیا جو اس محبت اور توقیر کی وجہ بنا تھا۔

بے جی نے اس کے لیے ان سلے کپڑوں کے کئی جوڑے اور آتی گرمی کے لیے لان کے سلے سلائے جوڑے خرید کر رکھے ہوئے تھے۔ فراز کے لیے کپڑے تھے، کھلونے تھے، دودھ کے ڈبے، بخار اور پیٹ کے درد کی دوائیں۔

بے جی اس سے تمام وقت ایاز کی باتیں کرتی رہتیں۔ کبھی اس کے بچپن کی یادیں...... کبھی لڑکپن کی شرارتیں...... کبھی خاندان کے لیے احساسِ ذمے داری کا بیان...... کبھی اس کی جوانی کے قصے...... کبھی بیرونِ ملک جانے کے بعد فون پر اس کی باتیں یاد کرنا...... کبھی اپنی شادی کی تیاریوں میں اس کا جوش و خروش۔

”گھر کے دروازے سے گلی کے آخری مکان تک اس نے چراغاں کرا دیا تھا اپنی شادی پر۔“

بصیرہ کو یاد تھا۔ اسے رخصت کرا کے پنڈی سے لاہور آنے کے بعد جب پھولوں سے سجی کار رات کے وقت گلی میں داخل ہوئی تو ساری گلی جگمگا رہی تھی۔

”کہتا تھا...... بس تھوڑے دن کی بات ہے بے جی! واپس آجاؤں گا...... پھر بصیرہ بھی یہیں ہوگی۔ جاب چھڑوا دوں گا اس کی۔“

بصیرہ کے دل میں درد کی ایک لہر اٹھی۔ اس سے بھی تو وہ یہی کہتا تھا۔ ”یار! تمہارے بغیر دل نہیں لگتا پردیس میں۔ اب میں فیملی کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں...... اپنوں سے دور بھی کوئی زندگی ہے بھلا۔“

☆☆☆

لاہور سے پنڈی واپسی کے لیے بصیرہ کا بس سے واپسی کا پروگرام تھا۔ جب وہ لاہور آرہی تھی، بھائی نے اسے لاہور چھوڑ کر آنے اور پھر واپس لے آنے کی بھی آفر کی تھی مگر اس نے شکریے کے ساتھ منع کر دیا تھا۔ بھائی تو خیر اپنا تھا بھابی غیر خاندان سے تھیں۔ عدت کے بعد بھائی کے گھر میں رہنے کے دوران اسے تھوڑے ہی عرصے میں اندازہ ہو گیا تھا کہ بھابی اس سے خواہ مخواہ ہی اکھڑی اکھڑی رہنے لگی تھیں۔ کوئی وجہ نہ ہوتے ہوئے بھی منہ بنائے رکھتیں۔ اسی لیے بصیرہ، بھائی کو شاذ ہی اپنی کسی ضرورت کے سلسلے میں تکلیف دیتی تھی۔

پنڈی واپسی کے لیے اس نے گلفراز سے بس پر سیٹ بک کرانے کے لیے کہا تو بے جی بولیں۔ ”میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گی۔“

”بے جی! میں آئی بھی تو اکیلی ہی...... اور اکیلی کہاں...... آپ کا پوتا تھا نا میرے ساتھ۔ بھائی بہت کہہ رہے تھے میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں، واپس بھی لے آؤں گا۔ میں نے منع کر دیا۔“ اس نے میکے کا بھرم رکھنے کی کوشش کی حالانکہ بھائی نے صرف ایک دفعہ کہا تھا۔

”یہاں سے میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گی اور وہ بھی چھوٹے بچے کے ساتھ بس میں۔“

”کچھ نہیں ہوتا بے جی۔ چھوٹا سا تو سفر ہے۔ بس میں بیٹھو اور کھڑکی سے باہر دیکھتے دیکھتے ادھر سے لاہور اور ادھر سے پنڈی آجاتا ہے۔“

”شاہنواز تمہیں چھوڑ کر آئے گا۔“

”ارے نہیں بے جی! اس بے چارے کو تکلیف کیوں دیں۔ اسے بھی تو کل اپنے آفس جانا ہوگا۔“

"ہاں تو کیا ہوا، مرد ہے، چار پانچ گھنٹے جانے کے اور اتنا ہی وقت واپسی کا۔ تمہیں چھوڑ کر واپس آجائے گا۔"

"میں چلی جاؤں گی بے جی۔"

"مجھے پتا ہے چلی جاؤ گی۔ تم نے کون سا یہاں رکنا ہے میرے پاس۔"

"جاب کی مجبوری ہے بے جی!"

"ہاں...... یہی مجبوری میرے بچے ایاز کی بھی تھی۔ اب یہ سوچ کر دل بہت دکھتا ہے میرا کہ اس نے پردیس میں نہ جانے کتنی تکلیف اٹھائی ہوگی۔ شاید وہاں بھی طبیعت خراب ہو جاتی ہو اس کی۔ کبھی بتایا ہی نہیں اس نے۔" بے جی رونے لگیں۔

بصیرہ کا دل بھی ٹیسیں دینے لگا۔

"گرمی کی چھٹیوں میں پھر آؤں گی بے جی!"

بے جی نے اسے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔ "تم آجاتی ہو تو مجھے تھوڑی تسلی ہو جاتی ہے۔ فراز کو سینے سے لگاتی ہوں تو میرے سینے میں ٹھنڈ پڑ جاتی ہے۔ مجھے ایاز کی خوشبو آتی ہے اس سے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ چھٹیاں ہوتے ہی میں اسے آپ کے پاس لے آؤں گی۔"

"اب کی بار اکیلے نہ آنا۔ مجھے فون کر دینا۔ میں شاہنواز کو بھیجوں گی تمہیں لانے کے لیے۔ ہو سکتا ہے خود بھی اس کے ساتھ آجاؤں تمہاری امی سے ملنے کے لیے۔"

"آپ اپنا بہت خیال رکھا کریں بے جی!"

"اب تو بس ایک ہی خیال رہتا ہے کہ کب اپنے ایاز سے ملوں گی۔"

"بے جی! شان اور گل کی خاطر اپنا خیال رکھا کریں۔ میں دیکھتی ہوں دونوں آپ کے چہرے کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ ذرا چہرے سے تکلیف ظاہر ہو تو بے چین ہو جاتے ہیں۔"

"سوچتی ہوں ایاز کی برسی ہو تو شاہنواز کی شادی کردوں۔ گھر میں کوئی تو ہو جس سے آدمی بات کر سکے۔ لڑکے دونوں چلے جاتے ہیں۔ میں اکیلی بیٹھی رہتی ہوں۔ کوئی آگیا تو خیر، ورنہ خاموشی۔"

"میں چھٹیوں میں آپ کے پاس آرہی ہوں بے جی! شان کے لیے کوئی اچھی سی لڑکی دیکھیں گے۔"

"چھٹیاں کب شروع ہوں گی؟"

"یکم جون سے۔"

"بس جس دن تم کہو گی، شان تمہیں لینے آجائے گا۔"

"میں خود آجاتی لیکن جیسے آپ کی خوشی۔"

شاہنواز اسے بذریعہ کار پنڈی واپس پہنچانے گیا۔ وہ فراز کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھی اس کی دیکھ بھال میں لگی رہی۔ شاہنواز زیادہ وقت خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ دونوں کے درمیان زیادہ تر بے جی کے بارے میں ہی ہلکی پھلکی بات چیت رہی۔ ایاز کا تذکرہ بھی ہوا...... رنج اور درد کے ساتھ۔

"میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ بھائی اتنی جلدی اور اچانک چلے جائیں گے۔ میں انہیں ریسیو کرنے ائرپورٹ گیا تو بہت خوش تھے۔ مجھ سے پوچھنے لگے تم نے میرا بیٹا دیکھا...... میں نے کہا جی، دیکھا ہے...... کہنے لگے، کیسا ہے...... میں نے کہا ہینڈسم باپ کا بیٹا کیسا ہوگا...... ہنسنے لگے پھر بولے...... دل خوش کر دیا یار!"

"یار تو جیسے ان کا تکیہ کلام تھا...... میری اماں کو بھی یار کہہ دیا کرتے تھے...... اور مزے کی بات یہ کہ اماں کہتی تھیں انہیں ایاز کے منہ سے اپنے لیے بھی یار سننا اچھا لگتا ہے۔"

"بھائی بہت پیارے انسان تھے۔ ابو کے بعد انہوں نے ہم دونوں بھائیوں کو باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ وہ ایک اچھا بیٹا اور اچھے بھائی تھے۔"

"اچھے شوہر بھی۔" بصیرہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"یہ گواہی تو ظاہر ہے آپ ہی دے سکتی ہیں۔"

"فراز بڑا ہوگا تو اس کے پاس ان کے لیے کہنے کو کیا ہوگا؟"

"بھائی کے لیے ہم سب کی گواہی۔"

بصیرہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ گاڑی کی کھڑکی سے باہر تاحد نظر لق و دق بیابان راستے کو دیکھتے ہوئے اس کا دل بے تحاشا دکھنے لگا۔

☆☆☆

زندگی ایک ہی ڈگر پر چل رہی تھی۔ نہایت یکسانیت تھی۔ صبح سے رات تک ایک ہی روٹین۔ امید کا ایک ننھا سا دیا فراز تھا جو اسے جینے کا حوصلہ دیے رکھتا۔ بصیرہ کے لیے وہ زندگی کا دوسرا نام تھا۔ صبح اس کے اسکول جانے سے دوپہر کو گھر واپسی تک اماں اس کی دیکھ بھال کرتیں۔ اسکول سے واپسی کے بعد وہ زیادہ تر اسی کے پاس ہوتا۔ شام کو کچن میں جاتی تو اماں اسے سنبھالتیں۔ بھابی بخشنے والی نہیں تھیں۔ شام کو کچن کا تمام کام انہوں نے بصیرہ کی شادی سے پہلے بھی اسی پر ڈال رکھا تھا۔ عدت کے بعد پھر وہی معمول ہو گیا۔ بھابی شام کو اکثر میاں اور بچوں کے ساتھ کبھی اپنے میکے اور کبھی ادھر ادھر سیر و تفریح کے لیے نکل جاتی تھیں۔ بھابی گھر میں بھی

ہوتیں تو شام کو بھولے سے بھی کچن میں کوئی کام نہ کرتیں۔ بے چاری اماں ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تفسیر بنی بصیرہ کی مصروفیت اور بھابی کی خود غرضی اور رعونت پر کڑھتے جاتیں۔

بصیرہ کے مستقبل کی فکر اماں کے دل کو گھن کی طرح لگی رہتی۔ جوان تھی۔ پہاڑ سی زندگی سامنے تھی۔ بچے کا ساتھ تھا۔ بھاوج کا رویہ اللہ معافی...... ایاز کی موت کے بعد بصیرہ کے میکے آبیٹھنے پر بھابی اس کی ایک ایک حرکت پر دشمن کی طرح نظر رکھتی تھیں۔ کسی وجہ سے اسکول سے واپسی میں اسے ذرا دیر ہو جاتی تو بڑبڑانے لگتی تھیں۔

"نکلی ہوں گی کہیں اپنی سہیلیوں کے ساتھ...... کام سے بچنے کے لیے گھر آنے کو دل تھوڑی چاہتا ہے اس کا...... بچہ پالنے کو ماں جو بیٹھی ہے...... شرم نہیں آتی بچے کو بوڑھی ماں پر ڈال دیا ہے...... سسرال میں ایسی آزادی کہاں ملتی...... وہاں تو دو روٹیاں دینے سے پہلے چار باتیں سنائی جاتیں......"

اماں کا دل تو بہت کڑھتا مگر گھر کے سکون کی خاطر ان سنی کر جاتیں۔ بصیرہ کو بھی نہ بتاتیں کہ اس کا دل دکھے گا۔ بھائی کے بچے بھی جو بصیرہ کی شادی سے پہلے اور شادی کے بعد بھی اس کے آگے پیچھے رہتے تھے، اب دور دور رہتے اور اماں کو فراز سے لاڈ پیار کرتے دیکھ کر ان کی نگاہوں سے ناگواری جھلکتی۔

"تمہاری دادو کو تو اب فراز کے سوا کوئی اور دکھائی ہی نہیں دیتا۔" اماں نے ایک روز بہو کو اپنے بچوں سے کہتے سنا۔

اگرچہ اماں بصیرہ کا دل برا ہونے کے خیال سے بہو کی بہت سی باتیں اور بہت سی حرکتیں اسے نہ بتاتی تھیں مگر بصیرہ بچی نہ تھی۔ بھابی اور بچوں کے اکھڑے اکھڑے رویے کو خوب سمجھتی تھی۔ شکر تھا کہ اماں ابھی بیٹھی تھیں۔ اللہ نہ کرے نہ ہوتیں تو کون فراز کو سنبھالتا اور وہ اپنی ملازمت کیسے جاری رکھ پاتی۔ اماں کے ہونے سے اسے بڑا سہارا تھا۔ بھائی بھی ایسے برے نہ تھے مگر ہر شریف آدمی کی طرح بیوی سے دب کر رہتے تھے۔ ذرا دیر کو ماں بہن کے پاس آبیٹھتے تو بیگم کو بہت برا لگتا۔ فوراً کوئی کام یا کہیں آنا جانا یاد آجاتا۔ کسی بچے کو قاصد بنا کر بھیجتیں۔

"بابا! ماما آپ کو بلا رہی ہیں۔"

"جاؤ بیٹا! دیکھو تمہاری بیگم کیا کہہ رہی ہیں۔" گھر کا سکون برقرار رکھنے کو اماں اپنے جائز حق سے دستبردار ہو جاتیں اور بھائی کچھ جھینپے جھینپے اٹھ کھڑے ہوتے۔ اماں کے بغیر تو بھائی کے گھر میں بصیرہ کا گزارہ مشکل ہی ہوتا۔

☆☆☆

موسم گرما کی تعطیلات شروع ہوتے ہی بے جی نے شاہنواز کو اسے لینے بھیج دیا۔ بصیرہ نے جانے کی تیاری کر رکھی تھی۔ تعطیلات وہ بے جی کے ساتھ ہی گزارنا چاہتی تھی۔ اماں بھی یہی بہتر سمجھتی تھیں کہ کچھ دنوں کو وہ بھائی کے گھر میں بھابی کے پیدا کردہ حبس زدہ ماحول سے نکل جائے۔

راستے میں شاہنواز نے اس سے کہا۔ "آپ نے اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ سوچا؟"

اس نے دبی دبی سی سرد آہ کھینچی۔ "سوچنا کیا ہے...... انسان کا سوچا کب پورا ہوتا ہے۔ ہوتا وہی ہے جو خدا چاہتا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں مگر انسان سوچتا تو پھر بھی ہے۔"

"تمہارے بھائی کے بعد...... میرے پاس سوچنے کو کچھ نہیں رہا۔"

"حادثہ کتنا ہی شدید ہو...... زندگی کھلی کتاب کی طرح آپ کے سامنے ہوتی ہے اور آپ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے پڑھنے اور ورق الٹنے پر مجبور ہوتے ہیں۔"

"میرے لیے اب پڑھنے کو کچھ نہیں رہا۔ تمہارے بھائی کے بعد تمام اوراق سادہ ہیں۔"

"ایسا نہیں...... فراز کے عنوان سے ایک نیا باب شروع ہو چکا ہے۔"

بصیرہ نے جھک کر اپنی گود میں سوئے ہوئے فراز کو چوما۔ "اسی کے لیے جینا چاہتی ہوں اب۔"

"اپنے لیے بھی جینا چاہیے...... حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ساتھ حقوق النفس کی ادائیگی بھی لازم ہے۔ اپنی ذات کا بھی حق ہے انسان پر۔"

وہ چپ رہی۔

کچھ دیر وہ بھی خاموش رہا پھر اسی نے اس خاموشی کو توڑا۔ "ایک بات کہوں آپ سے؟"

"کہو۔"

"میں سادہ سا بندہ ہوں...... بات کو گھما پھرا کر کرنے کی عادت نہیں۔" وہ چند ثانیے توقف میں رہا۔ "آپ کی زندگی میں بھائی کی جگہ لینے کی بات تو نہیں کر سکتا میں...... ان کی جگہ تو شاید کوئی بھی نہ لے سکے...... لیکن...... بے جی کی خوشی اور فراز کے مستقبل کی خاطر اگر میں...... آپ کے ساتھ چلنے کی درخواست کروں تو......؟"

بصیرہ کے وجود میں سر سے پاؤں تک سنسنی دوڑ گئی۔

وہ کچھ دیر چپ رہا پھر بولا۔ "میں معذرت نہیں کروں گا کیونکہ میرے خیال میں، میں نے کوئی معیوب بات نہیں کی ہے۔"

"معیوب نہیں تو معقول بھی نہیں۔" وہ دھیرے سے بولی۔
"کیوں؟" اس نے چونک کر پوچھا۔
"تمہیں اور گل کو میں نے ہمیشہ چھوٹے بھائیوں کی طرح دیکھا ہے۔"
وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد گویا ہوا۔ "آپ کسی سفر پر اس یقین کے ساتھ جا رہے ہوں کہ راستہ صاف ستھرا، روشن اور رکاوٹوں کے بغیر ہے لیکن اچانک کوئی ایسا موڑ آجائے کہ پتا چلے آگے راستہ دشوار ہے...... نشیب و فراز ہیں، گھاٹیاں ہیں، رکاوٹیں ہیں...... آپ منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی اور راہ دیکھتے ہیں کہ نہیں؟"
"اسی مقام پر ٹھہرا بھی تو جاسکتا ہے۔"
"یہ جمود ہے...... قنوطیت ہے...... زندگی حرکت کا نام ہے۔"
"میرے لیے زندگی ایک ہی مقام پر ٹھہر گئی ہے۔"
"فراز کے لیے کیوں ٹھہرے؟"
"وہ بڑا ہوگا تو اپنے لیے راستہ ڈھونڈ لے گا۔"
"اسے کسی راہنما، کسی راہبر کی ضرورت تو ہوگی۔"
"خدا راستہ دکھائے گا۔"
"بے شک! اس کی راہبری کے تو ہم سب محتاج ہیں۔" اس نے توقف کیا۔ "فراز میرے بھائی کی اولاد ہے۔ جتنا مجھے پیارا ہے اس سے کہیں زیادہ بے جی کو ہے۔ جب آپ فراز کے ساتھ لاہور میں ہوتی ہیں تو بے جی بھائی کا غم کچھ بھول جاتی ہیں لیکن آپ کے جانے کے بعد ان کی اداسی اور بے چینی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ بات بات پر وہ فراز کو یاد کرنے لگتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں آپ اور فراز مستقل طور پر بے جی کے پاس رہیں تاکہ ان کے صدمے کی شدت میں افاقہ ہو۔"
"نہیں...... جو تم چاہتے ہو، وہ ممکن نہیں ہے۔"
بقیہ سفر زیادہ تر خاموشی میں گزرا۔

☆☆☆

لاہور پہنچنے پر بصیرہ نے بے جی کو منتظر پایا۔ فراز کو انہوں نے بے تابی سے اپنے سینے سے لگالیا اور دیر تک اسے اپنی آغوش میں رکھا۔ بصیرہ کے لیے اب بھی وہی کمرا مخصوص تھا جو ایاز کے زمانے میں ہوا کرتا تھا اور ایاز کی موت کے بعد بھی اسی کے قیام کے لیے مخصوص چلا آ رہا تھا۔ کمرے میں فراز کے لیے پالنا بھی آگیا تھا۔ نرم نرم بچھونے اور رنگ برنگے کھلونے بھی سجے تھے۔
بے جی نے بصیرہ کو بتایا۔ "یہ ساری تیاری فراز کے لیے اس کے چچا شان نے کی ہے۔ گل نے بھی اس کا ہاتھ بٹایا ہے۔ دونوں ایسے لگے تھے جیسے ایاز کا بیٹا نہیں، خود ایاز گھر آ رہا ہو۔"
بصیرہ کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ ایک بھائی کا گھر تھا جہاں فراز سے اماں کے روکھے سوکھے پیار کو بھی ناگواری سے دیکھا جاتا تھا اور ایک یہ گھر جہاں فراز کے لیے اس کی دادی اور چچاؤں کی آنکھوں میں محبت کے سوتے پھوٹتے دکھائی دیتے تھے۔
بے جی نے بصیرہ کے لیے لان کے کئی جوڑے سلوا کر رکھے ہوئے تھے۔ اس کے کمرے میں دو عدد نئے جوتے بھی موجود تھے۔ "بے جی! آپ نے یہ سب کیوں کیا؟" اس نے کہا تو بے جی بولیں۔
"تم میرے سب سے پیارے بیٹے کی بیوی ہو۔"
بصیرہ کا دل بھر آیا۔ "اب تو بیوہ ہوں بے جی!" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔
بے جی نے اسے اپنے گلے لگالیا۔ دونوں روتی رہیں۔ درد مشترک تھا اور دل حساس...... ورنہ ایسے بے حس لوگ بھی تو ہوتے ہیں جنہیں مرنے والے سے وابستہ رشتوں کی پروا ہوتی ہے نہ ان کا احترام۔
اس بار اس نے بے جی کو پلنگ پر بٹھا دیا اور امورِ خانہ داری خود سنبھال لیے۔ بے جی لاکھ منع کرتیں مگر وہ کام سے ہاتھ نہ ہٹاتی۔
"میں مہمان تھوڑی ہوں بے جی!" وہ خوشدلی سے کہتی۔ فراز دن بھر بے جی کے پاس ہوتا۔ چچا آتے تو گود میں اٹھائے پھرتے۔
"آپ نے کیا سوچا؟" ایک روز شاہنواز نے اس سے پوچھا۔
"کس بارے میں؟" وہ انجان بن گئی۔
"میں نے لاہور آتے ہوئے آپ سے جو بات کی تھی۔"
"نہیں شان!"
"کیوں؟"
"رشتے جیسے ہیں، انہیں ویسے ہی چلنے دو۔"
"میں فراز کو تحفظ دینا چاہتا ہوں جو شاید اسے کوئی اور نہ دے سکے۔"
"کسی اور کا بھی سوال نہیں۔"
"کب تک؟"
وہ چپ رہی۔
"آج وہ چھوٹا ہے، آپ کی گود تک ہے۔ کل بڑا بھی ہوگا۔ اسے ایک ایسے ہاتھ کی ضرورت ہوگی جو اس کا ہاتھ اپنے

ہاتھ میں لے کر اسے زندگی کے راستے پر چلنا سکھا سکے۔ تب آپ کو یقیناً ایک پارٹنر کی ضرورت محسوس ہوگی۔"

"نیور اینڈ ایور شان!" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "ایاز کے بعد میں وہ دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر چکی ہوں۔"

"میں اس بند دروازے پر دستک دے رہا ہوں۔"

"میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی مجھے ایسے مقام پر لے آئے گی جہاں مجھے اپنے آپ سے شرم محسوس ہونے لگے گی۔" بصیرہ روہانسی ہوئی۔

شاہنواز چند ثانیے خاموش کھڑا رہا پھر مڑا اور چلا گیا۔

☆☆☆

بصیرہ کا خیال تھا بات صرف اس کے اور شاہنواز کی حد تک ہی ہوگی مگر بے جی بھی اس معاملے سے آشنا نکلیں۔

"تم نے شاہنواز کو انکار کیوں کر دیا؟"

اس نے چونک کر بے جی کو دیکھا۔

بے جی دھیمے لہجے میں بولیں۔ "میری اپنی خواہش بھی یہی ہے۔"

وہ دم بخود تھی۔

"تمہارے اور فراز کے یہاں ہونے سے میرے دل کو تسلی رہے گی۔"

وہ چپ تھی۔

"بیٹا! کیوں انکار کرتی ہو؟" بے جی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے لجاجت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بولنے سے قاصر تھی۔

"بولو بیٹی!"

"بے جی......!"

"ہاں، ہاں۔"

"میں نے شان کو ہمیشہ بھائی کی حیثیت دی ہے۔"

"جانتی ہوں......مگر کسے معلوم تھا کہ ایاز اچانک چلا جائے گا۔ شان سے تمہارا نکاح ہو جائے تو میں اس اطمینان کے ساتھ مر سکوں گی کہ ایاز کے بعد اس کی بیوی اور بیٹا کہیں نہیں گئے......ہمارے ہی پاس ہیں۔"

"بے جی! رشتے جیسے ہیں انہیں ویسے ہی رہنے دیا جائے تو اچھا ہے۔"

"میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ سب کچھ ویسے ہی رہے گا۔ تم راضی ہو جاؤ تو فراز کو باپ کی کمی محسوس نہیں ہوگی۔ شان اسے باپ کی طرح محبت دے گا۔"

"پلیز بے جی......! مجھے ایسی بات پر مجبور نہ کریں جسے نہ میرا دل مانتا ہے، نہ ذہن قبول کرتا ہے۔"

"مان جاتیں تو ہم سب کے لیے اچھا تھا۔ تمہارے گھر والوں سے میں خود بات کر لیتی۔"

"نہیں بے جی!"

بے جی نے مایوس ہو کر خاموشی اختیار کر لی۔ انہیں دل گرفتہ دیکھ کر بصیرہ کو دکھ ہوا مگر شاہنواز جسے وہ بھائی کی حیثیت سے دیکھتی رہی تھی، اسے ایاز کے متبادل کے طور پر قبول کرنا اسے کسی صورت گوارا نہ تھا۔

موسم گرما کی تعطیلات لاہور میں گزار کر وہ پھر پنڈی چلی گئی۔ شاہنواز اسے جیسے لینے کے لیے آیا تھا، ویسے ہی واپس چھوڑنے کے لیے بھی آیا۔

روز و شب پھر پہلے کی سی مصروفیت میں گزرنے لگے۔ بلاناغہ نہ سہی، ہر دوسرے دن وہ بے جی کو فون کرنا نہ بھولتی۔

"تم نے کچھ سوچا؟" ایک روز بے جی نے پھر پوچھا۔

"بے جی! کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر شان کی شادی کر دیں۔ گھر میں رونق اور آپ کی تنہائی دور ہو جائے گی۔"

"لڑکیاں تو کئی ہیں، خاندان میں بھی اور خاندان سے باہر بھی۔ میں چاہتی تھی تم مان جاتیں تو اچھا تھا۔ شاہنواز کی خواہش بھی یہی ہے۔"

"میں بار بار انکار کر کے شرمندہ ہوتی ہوں بے جی!"

بے جی خاموش رہیں۔

پھر ایک دن بے جی نے اسے بتایا کہ انہوں نے شاہنواز کو خاندان ہی کی ایک لڑکی سے رشتہ کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔

"بہت مبارک ہو بے جی! اللہ آپ کو بہت خوشیاں دکھائے۔"

"سچ کہوں......ایاز کے بعد تو مجھے کوئی خوشی خوش نہیں کرتی۔ دل میں غم جیسے بیٹھ ہی گیا ہے۔"

"میں آپ کا دکھ محسوس کر سکتی ہوں۔ ایاز کے بعد مجھے خود بھی یہی لگتا ہے جیسے غم دل میں بیٹھ گیا ہے۔ فراز کے لیے جی رہی ہوں بس۔"

"خدا تمہاری مامتا ہمیشہ ٹھنڈی رکھے۔"

☆☆☆

سرمائی تعطیلات میں شاہنواز کی شادی میں شرکت کے لیے بصیرہ کو پھر لاہور جانا پڑا۔ اس بار اسے فراز لینے کے لیے آیا تھا۔ بلاوا اماں اور بھائی، بھابی کے لیے بھی تھا مگر اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ان کی وجہ سے بھائی بھابی کو بھی عذر کا بہانہ مل گیا۔ بصیرہ کا جانا تو ضروری تھا۔

دوران سفر فراز نے کہا۔ "شان بھائی کی شادی تو

ہورہی ہے مگر وہ خوش نہیں ہیں۔''
''کیوں بھلا؟'' بصیرہ نے تجاہل عارفانہ سے کہا۔
''پتا نہیں۔'' گھمراز نے بھی تجاہل برتا حالانکہ وہ شاہنواز کے خوش نہ ہونے کی وجہ جانتا تھا۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے وہ بے خبر بھی کیسے ہوسکتا تھا۔
''شاید بڑے بھائی کی کمی کی وجہ سے۔'' بصیرہ نے قصہ چکانے کی کوشش کی۔
موسم سرما کی تعطیلات کے ساتھ بصیرہ نے پندرہ دن کی مزید رخصت لے لی تھی۔ شادی کا گھر تھا، اسے کچھ دن تو وہاں ٹھہرنا تھا۔
لاہور پہنچی تو بصیرہ نے فراز کو بے جی کے سپرد کیا اور ان کے تمام کام اپنے ذمے لے لیے۔ گھر میں مہمانوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔ شادی کی رسمیں شروع ہونے کو تھیں۔
''اب بھی سوچ لیں۔'' شاہنواز نے موقع دیکھ کر اس سے کہا۔
''کیا......!'' وہ ہکا بکا اس کا منہ دیکھنے لگی۔
''میں اب بھی انکار کرسکتا ہوں۔''
بصیرہ کانپ گئی۔
''کیسی بات کرتے ہو۔'' اس نے شاہنواز کو معترض نگاہوں سے دیکھا۔ ''اس لڑکی کے جذبات کا کچھ خیال کرو۔''
''اور میں......! میرے جذبات کا خیال؟ بولیں...... میں بھائی کی میراث کا وارث بننا چاہتا تھا۔ ان کے بیٹے کو اپنا بیٹا بنا کر رکھنا میری دلی خواہش تھی۔ آپ نے...... آپ نے میرے جذبات، میری فیلنگز کا خیال ہی نہیں کیا۔''
''ایک لڑکی اپنے بہت سے خوابوں، امیدوں اور توقعات کے ساتھ تمہاری زندگی میں آنے والی ہے۔ میرا خیال ہے اب تمہیں صرف اس کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ اسے ویلکم کرو۔''

☆☆☆

شاہنواز کی شادی ہوگئی۔ بصیرہ کو چند ہی دنوں میں شاہنواز کی بیوی زمرد کے مزاج کا اندازہ ہوگیا۔ وہ بدتمیزی کی حد تک منہ پھٹ اور تنک مزاج لڑکی تھی۔ بے جی کو بھی پھٹ سے جواب دے دیتی۔ شاہنواز کی تمام توجہ صرف اپنی ذات پر رکھنا چاہتی...... بے جی اور دونوں چچاؤں بالخصوص شاہنواز کی محبت کو رقیبانہ نظروں سے دیکھتی۔ بصیرہ کو ذرا لفٹ نہ کراتی۔ اسکول سے بصیرہ کی چھٹی ختم ہونے میں کچھ دن باقی تھے اور بے جی کی خواہش تھی کہ بصیرہ بیٹے کے ساتھ رخصت ختم ہونے تک ان کے پاس رہے لیکن بصیرہ نے حیلے بہانوں سے جلد واپسی میں ہی عافیت جانی۔ زمرد کی آنکھوں میں کھٹکتے رہنے سے عزت کے ساتھ واپس ہوجانا ہی بہتر تھا حالانکہ بھائی کے گھر میں بھی بھابی اور ان کے بچوں کی ناگواری کا سامنا رہتا تھا تاہم وہاں اماں کی صورت ایک شجر سایہ دار اس کے اور فراز کے لیے موجود تھا۔

☆☆☆

اماں کو چھوٹی موٹی بیماری تو لگی ہی رہتی تھی مگر ایک روز ایسی بستر پر پڑیں کہ پھر اٹھ ہی نہ سکیں۔ جوں جوں علاج ہوا، مرض میں افاقہ ہونے کے بجائے طبیعت بگڑتی ہی چلی گئی۔ کمزوری ایسی کہ بستر سے اٹھ نہ پاتیں۔ ٹیسٹ، دوائیں، علاج...... بھائی نے پورا خیال رکھا۔ بڑھاپا تھا، کمزوری تھی اور بصیرہ کی بیوگی کا غم اندر ہی اندر انہیں کھلا رہا تھا۔ فراز کی دیکھ بھال سے قاصر ہوگئیں۔ بصیرہ کو ملازمت کی مجبوری تھی۔ اماں اپنی روز افزوں کمزوری اور علالت کے باعث فراز کی دیکھ بھال کرنے سے قاصر ہوئیں تو بصیرہ نے اسے اپنے ساتھ اسکول لے جانا شروع کردیا۔ نائب قاصدوں کے حوالے کردیتی۔ ایک کے بعد دوسرا اس کا خیال رکھتا۔ پرنسپل ہمدرد تھیں اور ساتھی ٹیچرز بصیرہ کی مجبوری سے آشنا لہٰذا نائب قاصدوں کے ہاتھوں فراز کی دیکھ بھال پر معترض نہ ہوتیں البتہ افسران اعلیٰ کے ڈر سے فراز کو منظر عام سے ہٹا کر ادھر ادھر ہی رکھا جاتا۔
فراز ماشاءاللہ اب چلنے لگا تھا۔ اماں کی طبیعت جس دن ذرا سنبھلی ہوتی وہ بھی فراز کو چلتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتیں۔ اماں کی مستقل علالت کی خبر سن کر بے جی ان کی عیادت کو لاہور سے پنڈی آئیں تو فراز کو چھوٹے چھوٹے قدم بھرتے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔
''ایاز ہوتا تو بیٹے کو چلتا دیکھ کر کتنا خوش ہوتا۔'' بے جی یہ کہتے ہوئے روہانسی ہوگئیں۔
بصیرہ اس تجربے سے گزر چکی تھی۔ جس دن فراز نے پہلی بار قدم اٹھایا وہ منظر اس کی یادوں میں جیسے ٹھہر ہی تو گیا تھا۔ وفور مسرت سے اس نے فراز کو اپنی آغوش میں سمیٹ کر سینے سے لگالیا تھا۔ ایسی خوشی پہلے کب ملی تھی اسے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
لاہور واپسی سے قبل بے جی نے بصیرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''بہت دن ہوگئے تمہیں لاہور آئے۔ تمہاری اماں کی طبیعت بہتر ہو تو چکر لگانا۔''
''آؤں گی بے جی۔''
''میں جانتی ہوں تم نے اس بار آنے میں اتنا لمبا وقفہ

کیوں کردیا۔"

"کیوں؟" اس نے چونک کر بے جی کو دیکھا۔

"میرے سات بیٹے ہوتے اور ایاز کے بعد چھ اور بیٹوں کی بیویاں بھی گھر آجاتیں...... جو تمہارا مقام ہے وہ کسی کو نہیں ملنا تھا۔"

"شکریہ بے جی۔" اس کی آنکھیں یکبارگی چھلک اٹھیں۔

بے جی نے اسے گلے لگالیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ "خوشی دل کو گدگداتی ہے، گزر جاتی ہے پر غم ہمیشہ دل کے ساتھ رہتا ہے۔ تم میرے مرے بیٹے کی نشانی ہو۔ مجھے بیٹی کی طرح پیاری ہو۔"

بصیرہ نے بے جی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ہونٹوں سے لگالیا۔ اس کا اور بے جی کا درد مشترک تھا۔ اپنی عزیز ہستی کو ہمیشہ کے لیے کھودینے کا دکھ۔ ایاز کی موت کے بعد وہ اکثر نہایت دکھی ہو کر سوچتی...... موت کا اپنا کوئی پیارا نہیں ہے کیا۔ ایاز کو وہ اکثر خواب میں دیکھتی لیکن آنکھ کھلنے پر یہ احساس کہ ایاز اب دنیا میں نہیں تھا، اس کے دل کو ناقابل بیان دکھ سے دوچار کردیتا۔

☆☆☆

اماں کی بیماری طول کھینچ گئی۔ بڑھاپا خود کمزوری...... بلڈ پریشر، شوگر اور جوڑوں کی تکلیف برسوں پرانے روگ تھے جو اماں کی جان کو لگے تھے۔ جوان داماد کی موت کا غم تو جیسے اماں کا دل پکڑ کر ہی بیٹھ گیا تھا۔ بصیرہ کو دیکھتیں تو کلیجا منہ کو آتا۔ معصوم نواسے کی یتیمی سے دل غم سے پھٹنے لگتا۔ اس معصوم کو تو باپ کی گود میں جانا بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ انسان کو بیماری سے زیادہ دل کو لگے دکھ مار دیتے ہیں۔ بصیرہ سے تو نہ کہتیں کہ ابھی اس کا غم تازہ تھا البتہ اوروں سے ضرور کہتیں کہ اس کی پہاڑ سی جوانی شوہر کے بغیر کیسے کٹے گی...... بیٹے سے دبی زبان میں کہتیں...... "بہن کے لیے اپنے جاننے والوں سے کہہ سن کر رکھو۔ کوئی شریف آدمی ہو جو اس کے بچے کو بھی اپنالے۔"

بیٹا تسلی دیتا۔ "ہوجائے گا اماں! ہوجائے گا...... ابھی بہت جلدی ہے۔ بصیرہ کو اس کا غم بھول جانے دیں۔"

اماں کو گردوں کا مسئلہ ہوگیا۔ ڈائیلیسز پر رہیں۔ بیٹے نے ان کے علاج معالجے اور بصیرہ نے خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی مگر جب وقت پورا ہوجائے تو نہ علاج معالجہ کام دکھاتا ہے، نہ اولاد کی خدمت جانے والے کو روک پاتی ہے...... اماں چلی گئیں۔

بصیرہ جیسے نوکری کے ساتھ بیٹے کی پرورش، بیمار ماں کی تندہی سے خدمت اور گھریلو کام کاج نے خود سے بیگانہ کر رکھا تھا، اماں کی موت نے اسے بے آسرا ہی کردیا۔ بھابی کو اماں کی موت کے بعد اور رنگ دکھانے کا موقع ملا۔ بصیرہ کو انہوں نے اپنی اور اپنے بچوں کی خدمت گار ہی تو سمجھ لیا۔ کام کے دنوں میں شام کا سارا کام بصیرہ پر ہی ہوتا۔ بھائی کے بچوں کی فرمائشیں...... کسی کو برگر کی طلب ہوتی، کوئی فرنچ فرائز چاہتا، کسی کو نوڈلز بنا کر دینے ہوتے تو کبھی بھابی صاحبہ چائنیز کی فرمائش داغ دیتیں۔ آئے گئے مہمانوں کی خاطر داری بھی بصیرہ ہی کو کرنی ہوتی۔ چھٹی والے دن کپڑوں کی دھلائی، استری اور اگلے ہفتے کی تیاری کرنی ہوتی۔ وہ کپڑے دھونے کھڑی ہوتی تو بھابی اپنے اور بچوں کے کپڑے بھی واشنگ مشین میں ڈال دیتیں۔ بستروں کی چادریں اور تکیوں کے غلاف بھی ہوتے۔ بھائی کے کپڑے البتہ لانڈری سے دھل کر آتے تھے۔ بصیرہ استری کرنے کھڑی ہوتی تو بھابی اکثر اپنے اور بچوں کے کپڑے بھی استری کے لیے ڈال جاتیں۔ بھائی کے بچوں کو پڑھائی میں بھی مدد دینا ہوتی۔ ان تمام کاموں میں وہ فراز کو مناسب توجہ دینے سے قاصر رہتی۔ وہ بچہ ہی تو تھا۔ کبھی کسی بات پر روتا تو بھابی معترض ہوتیں۔

"ارے بھئی کیوں رونا مچا رکھا ہے تمہارے بیٹے نے۔ بچے کا منہ بھاڑ نا نحوست ہوتی ہے۔"

بھائی کے بچوں نے بھی فراز سے گویا دشمنی باندھ رکھی تھی۔ کوئی اسے بلاوجہ مار کر بھاگ جاتا تو کوئی بلا سبب دھکا مار کر گرا دیتا۔ کوئی اس کے ہاتھ سے کھلونا چھین لیتا تو کوئی اسے دانت نکوس کر پنجے دکھاتے ہوئے ڈراتا۔

ایک روز جب بصیرہ کچن میں تھی، فراز کسی بات پر رویا تو اس نے بھابی کو کہتے سنا۔ "باپ کو تو کھا گئے ہو، اب کیا رو رو کے کسی اور کو بھی کھانے کا ارادہ ہے۔" ہوسکتا ہے بھابی نے سوچا ہو وہ نہیں سن پائے گی مگر اس نے سن لیا تھا۔

☆☆☆

شاہنواز کی شادی کے بعد اماں کی علالت پھر ان کی موت کے بعد سر پر آپڑنے والے امور کے باعث وہ کافی عرصے تک لاہور نہ جاسکی۔ اس دوران فراز کے بڑے کے میں بے جی خود دو مرتبہ لاہور سے پنڈی آئیں۔ اپنے دوسرے چکر میں انہوں نے بصیرہ سے دبی زبان سے لاہور نہ آنے کا گلہ کیا تو اس نے صرف اتنا کہا۔ "بے جی! فرصت ہی نہیں ملتی۔"

"فرصت لوگی تو ملے گی۔" بے جی آہستہ سے بولیں۔

وہ بے جی کا منہ دیکھنے لگی۔

"اسکول سے آنے کے بعد تم رات تک گھر کے کاموں

میں لگی رہتی ہو۔ تمہاری بھابی کو سوچنا چاہیے کہ تم انسان ہو، کولہو کا بیل نہیں۔"

اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اماں کے بعد پہلی بار کسی نے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔

"اس وقت فراز کو تمہاری پوری توجہ کی ضرورت ہے۔ باپ تو سر پر رہا نہیں، تم بھی اس معصوم کو توجہ نہیں دے پاتی ہو۔ لاہور تبادلہ ہو سکتا ہے تمہارا تو کرا لو۔ وہاں میں تو ہوں گی۔"

'وہاں زمرد بھی ہوگی۔' بصیرہ نے دل ہی دل میں سوچا۔ یہاں بھابی تھیں تو وہاں زمرد جس کی آنکھوں میں لکھی تحریر بصیرہ پڑھ آئی تھی۔ فراز سے دادی اور چچاؤں کی محبت کو وہ خاصی حاسدانہ نظروں سے دیکھتی تھی۔ بھابی کا گھر چھوڑ کر مرحوم شوہر کے گھر میں جا رہنا جبکہ وہاں ایک تنک چڑھی بہو بھی آ چکی تھی، ایسا ہی تھا جیسے آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک جانا۔

"زمرد کی تم پروا نہ کرو۔ وہ تو سب کے ساتھ بدتمیزی کرتی ہے۔" بے جی نے کہا۔ بصیرہ کے کہے بنا ہی وہ اس کے دل کی بات تک پہنچ گئی تھیں۔

اس نے چونک کر بے جی کو دیکھا۔ "آپ کے ساتھ بھی؟"

"میں کوئی آسمان سے اتری ہوں...... جس کی فطرت میں بدتمیزی ہو، وہ کسی کو نہیں دیکھتا۔ وہ تو شان کو خاطر میں نہیں لاتی۔ وہ ایک کہے تو دس سناتی ہے۔ تم مان گئی ہوتیں تو ہم سب چین سے رہتے۔"

بصیرہ کو تاسف ہوا مگر اس نے وہی کیا تھا جو بہتر سمجھا تھا۔

لاہور واپس جاتے ہوئے بے جی نے بہت اصرار کے ساتھ کہا۔ "لاہور آنا بیٹا! وہ بھی تمہارا گھر ہے...... فراز کے باپ کا گھر ہے۔"

"آؤں گی بے جی۔"

"میں انتظار کروں گی۔ سب پوچھتے ہیں ایاز کا بیٹا تو اب بڑا ہو گیا ہوگا۔ میں کہتی ہوں ہاں، اپنے باپ کی جگہ لے لی ہے اس نے۔"

بے جی کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دکھائی دیے۔ بے جی کو بیٹے کے لیے دکھی ہوتے دیکھ کر بصیرہ کو بھی اپنا دکھ ان کے دکھ سے کم محسوس ہوتا تھا۔ اس نے بے جی کو گلے لگا لیا۔

☆☆☆

بے جی سے کیا وعدہ نبھانے کے لیے بصیرہ اگلی بار لاہور گئی تو گھر میں ایک ننھے مہمان کا اضافہ ہو چکا تھا۔ شاہنواز اور زمرد ایک بیٹے کے ماں باپ بن چکے تھے۔ بے جی سمیت سب بہت خوش تھے۔ بصیرہ کو یہ خبر لاہور آنے سے قبل فون پر بھی مل چکی تھی۔

"فراز! دیکھو تمہارا چھوٹا بھائی۔" بصیرہ نے چند ہفتوں کے ارباز کو اپنی گود میں لے کر فراز کو دکھاتے ہوئے کہا۔

فراز اشتیاق سے بچے کو دیکھنے لگا۔

"خدا بلند نصیب کرے۔" بے جی نے نومولود پوتے کو دعا دی۔

"بے جی! یہ دعا کریں کہ اس کے باپ کا سایہ اس کے سر پر رہے۔" زمرد نے فوراً کہا۔

بصیرہ کو زمرد کے منہ پھٹ ہونے کا تو معلوم تھا مگر وہ اس حد تک بدتمیز اور طعنہ زن ہوگی، اس کا اسے اندازہ نہ تھا۔ بفرضِ محال یہ مان لیا جاتا کہ زمرد نے معصوم فراز پر طعنہ زنی کی نیت سے یہ بات نہیں کی تھی تب بھی اسے موقع محل کا ادراک تو ہونا چاہیے تھا۔ ایسی سادہ اور فاتر العقل تو نہیں تھی وہ کہ اسے یہ احساس نہ ہوتا کہ وہ کس کی موجودگی میں کیسی بات کہہ رہی تھی۔ یہ کوئی بات تھی کہنے والی۔ بصیرہ کے دل کو جو دھکا پڑا سو پڑا، بے جی بھی زمرد کی بات پر پہلو بدلنے پر مجبور ہو گئیں۔ بعد میں انہوں نے بصیرہ سے کہا۔

"تم زمرد کی بات کا بُرا مت منانا۔"

"کون سی بات بے جی؟" بصیرہ انجان بن گئی۔

"کوئی بھی بات...... اس کی عادت ہے جو منہ میں آتا ہے بول دیتی ہے۔" بے جی نہایت فراست سے بات سمیٹ گئیں۔

"بے جی! مجھے اب کسی کی کوئی بات بری نہیں لگتی۔" بصیرہ نے بے جی کو اپنی دکھاوے کی مسکراہٹ سے مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کی۔ بھابی ہی بہت تھیں تیر چلانے اور اس کے ساتھ ذلت آمیز رویہ رکھنے کو۔ انہی کی زبان کے لگائے زخم اس کے دل سے مندمل نہ ہو پاتے تھے۔ اب زمرد بھی تیر برسانے کو میدان میں آ گئی تھی اور وہ بھی معصوم فراز پر جو اس کا دل تھا، جان تھی...... فراز کو کسی کا ٹیڑھی نظر سے دیکھنا بھی گوارا نہ تھا اسے مگر زمرد کی بدتمیزی میں بے چاری بے جی کا کیا دوش تھا۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ یہ اس کا لاہور کا آخری پھیرا ہوگا۔ اب نہ وہ خود بھی لاہور میں اپنے سسرال آئے گی، نہ فراز کو اس کی بدقسمتی کا طعنہ سننے کے لیے وہاں بھیجے گی۔ باپ کی ناگہاں موت میں اس معصوم کا کیا قصور...... اللہ کی مرضی...... ہر ذی روح کی جان اس کی امانت ہے۔ جب، جہاں اور جس طرح چاہے اپنی امانت واپس لے لے۔

بصیرہ زود رنج نہ تھی۔ بڑی سے بڑی بات کو پی جاتی تھی مگر فراز کے سلسلے میں وہ بھابی اور ان کے بچوں کی سن کر

درگزر کردینا تو اپنی مجبوری سمجھتی تھی کہ اس گھر میں اسے اور فراز کو رہنے کو چھت میسر تھی...... کسی اور کو وہ اپنی اور فراز کی مجبوری نہ بننے دینا چاہتی تھی...... بلکہ وہ تو بھابی کے اہانت آمیز رویے اور فراز کے ساتھ ان کے بچوں کے ناروا سلوک سے بچنے کے لیے اللہ سے دل ہی دل میں دعا گو رہتی تھی۔ ان کے گھر کی چھت تلے رہنے کا خراج اسے اکثر اپنی توہینِ ذات کی صورت ادا کرنا پڑتا تھا۔

☆☆☆

بصیرہ کی ترقی ہوگئی اور اگلے گریڈ میں ترقی ملنے پر اس کا تبادلہ پنڈی سے مری کردیا گیا۔ پنڈی سے روزانہ مری آنا جانا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ بے شمار لوگ معاش کے سلسلے میں صبح و شام پنڈی سے مری آتے جاتے تھے۔ اس کی ہمدرد ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ اپنا تبادلہ رکوانے کے لیے وہ اپنے خصوصی حالات بالخصوص ایک چھوٹے بچے کی واحد سرپرست ہونے کی درخواست انتظامیہ کو گزارے مگر انتظامیہ نے ترقی پانے والے تمام ملازمین کو فوری طور پر اپنے نئے مقامِ تعیناتی پر حاضری کا پابند کر رکھا تھا۔

بصیرہ کا نیا اسکول مری کی مخصوص فضا میں بسا ادارہ تھا۔ سربراہِ ادارہ نہایت نرم گو خاتون تھیں۔ اسکول کے اردگرد منظر بے حد پرسکون اور نظر افروز تھا۔ اسکول کی عمارت کشادہ اور صاف ستھری تھی۔ جوائننگ دیتے ہوئے بصیرہ نے پرنسپل کو بتادیا کہ وہ بیوہ اور ایک چھوٹے بچے کی ماں ہے جس کی دیکھ بھال کرنے والا اور کوئی نہیں۔ بچے کے ساتھ روزانہ مری آنا جانا مشکل ہوگا اور آمدورفت کا خرچہ بھی زیادہ ہوگا لہٰذا وہ اپنا تبادلہ دوبارہ پنڈی کروانے کی کوشش کرے گی۔ پرنسپل جو بصیرہ کی صورت ایک سائنس ٹیچر کے آجانے سے خوش تھیں، انہوں نے اسے روزانہ آنے جانے کی دقت سے بچنے کے لیے مری میں ہی رہائش اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔

"میڈم! پنڈی میں تو بھائی اور ان کی فیملی کے ساتھ رہتی ہوں، یہاں کہاں رہوں گی؟"

"کرائے پر کوئی گھر لے لیجیے گا۔ روزانہ آنے جانے میں بھی تو اچھا بھلا کرایہ خرچ ہوگا۔"

"کرائے کے مکان میں مکان کا صرف کرایہ ہی تو نہیں ہوتا، یوٹیلیٹی بلز بھی ہوتے ہیں۔"

"اللہ مالک ہے...... سوچتی ہوں کیا کرنا ہے۔"

اگلے دو تین دن فراز کے ساتھ پنڈی سے مری آنے جانے میں بصیرہ کو سفر کی دقت اور طویل اوقات کا بھی اندازہ ہوگیا۔ علی الصباح گھر سے نکلتی اور سہ پہر کو گھر واپس لوٹتی۔ ان دو تین دنوں میں پرنسپل کو بھی اس کی پیشہ ورانہ اہلیت کا اندازہ ہوگیا۔ طلبا اس کے پڑھانے سے بھی خوش تھے۔

تیسرے چوتھے دن پرنسپل نے خود اس سے کہا۔

"مس بصیرہ! مجھے مری میں آپ کے قیام کی ایک اور صورت بھی نظر آتی ہے جس سے آپ پر اخراجات کا بار بھی نہیں ہوگا۔"

"وہ کیا میڈم؟"

"ہمارے اسکول کا چوکیدار اسکول گراؤنڈ میں بنے کوارٹر میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ شریف آدمی ہے اور مقامی ہے۔ چھٹی کے بعد اسکول تو خالی ہو ہی جاتا ہے۔ کسی زمانے میں اسکول میں بچوں کے لیے ایک ڈسپنسری بھی ہوا کرتی تھی جو ڈسپنسری اٹینڈنٹ کی پوسٹ ٹرانسفر ہوجانے کے بعد خود بھی ختم ہوگئی۔ وہ کمرا اب خالی ہے۔ صرف ایک بیڈ پڑا ہے جہاں جو ضرورت کے وقت کسی بیمار بچے کے لیٹنے کے کام آجاتا ہے بس۔ آپ اگر کہیں تو میں ڈائریکٹر صاحب سے اجازت لے کر اس کمرے میں آپ کی رہائش کا بندوبست کروادوں۔ یہاں آپ کو چوکیدار اور اس کی فیملی کے اسکول پریمسز میں ہی رہنے کی وجہ سے اکیلے پن اور سیکیورٹی کا مسئلہ بھی نہیں ہوگا۔ میں کئی سال سے یہاں ہوں۔ چوکیدار نہایت شریف اور ڈیوٹی فل آدمی ہے۔"

بصیرہ سوچ میں پڑگئی۔

"آپ تیار ہوں تو میں ڈائریکٹر صاحب سے بات کرلوں گی۔"

"ٹھیک ہے میڈم! میں بھائی سے مشورہ کرکے آپ کو بتاتی ہوں۔"

بصیرہ نے بھائی سے مشورہ کیا تو وہ بولے۔ "تم دیکھ لو، تمہیں کس میں آسانی اور سہولت ہے۔"

"بھائی! آسانی اور سہولت تو آدمی کو اپنے ہی گھر میں ہوتی ہے لیکن صبح شام فراز کے ساتھ ویگنوں میں سفر کرنا بہت مشکل ہے۔ میں اگر دوبارہ پنڈی ٹرانسفر کے لیے اپلائی کردوں تو اس میں نہ جانے کتنا وقت لگ جائے۔"

"ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی ویسے کرو۔ نوکری تو کرنی ہے نا تمہیں۔"

ایاز اسے ٹوٹ کر یاد آیا جو بار بار اسے نوکری چھوڑ دینے کی ترغیب دیا کرتا تھا۔

اگلے دو دن اس کی آنکھوں میں بار بار اس خیال سے جل تھل مچتی رہی کہ مری میں اس کے مستقل قیام کو بھائی نے بھی کتنی "فراخدلی" سے قبول کرلیا تھا۔

اپنے دل پر پتھر رکھ کر اس نے اسکول کی متروکہ ڈسپنسری میں قیام کے لیے پرنسپل کو اپنی رضامندی دے دی اور وہیں پرنسپل کے دفتر میں ان کے روبرو بیٹھی وہ بلک بلک کر رو دی۔

''کیا ہوا...... کیا ہوا مس بصیرہ؟'' پرنسپل اپنی ریوالونگ چیئر سے اٹھ کر اس کے پاس آ کھڑی ہوئیں۔

وہ کیا بتاتی انہیں۔ کیسے بتاتی کہ بھابی کے اہانت آمیز رویے کے باوجود وہ بھائی کے گھر میں خود کو کتنا محفوظ و مامون تصور کرتی تھی۔ اسکول ڈسپنسری والے کمرے میں تو وہ ہوگی...... فراز...... اور اس کے دکھی دل سے لپٹی بے شمار یادیں۔ وہ تو شاید اکیلی ہونے کے خوف سے سو بھی نہ پائے گی...... ہاں فراز اس کے ساتھ ہوگا...... مگر وہ تو ابھی بچہ ہی تھا۔ عورت تو ایک مضبوط و توانا مرد کے سائے میں تحفظ محسوس کرتی ہے۔

''کچھ نہیں میڈم!'' اس نے آنکھیں پونچھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہماری پی ٹی آئی صدیقہ بیگم یہاں نزدیک ہی رہتی ہیں۔ میں ان سے کہہ دوں گی کہ چکر لگالیا کریں آپ کے پاس۔ ویسے آپ بھی جاسکتی ہیں کسی وقت ان کے گھر۔ شوہر ان کے ملک سے باہر ہوتے ہیں۔ ایک بیٹی ہے جو ڈاکٹر ہے۔ نکاح ہو چکا ہے اس کا۔ رخصت ہو کر انگلینڈ جائے گی۔''

''میڈم! آپ ڈائریکٹر صاحب کو میری مجبوری بتا کر ان سے اجازت لے لیں۔ میرا اسکول میں رہنا ہی بہتر ہے۔''

''ہاں، میں بھی اسی حق میں ہوں۔ میں آج ہی بات کرتی ہوں۔''

☆☆☆

انسانی ہمدردی کی بنیاد پر بصیرہ کو اسکول میں ہی رہنے کی اجازت مل گئی۔ بھائی کے گھر سے وہ اپنا سامان اسکول لے آئی۔ سامان تھا ہی کیا...... اس کے اور فراز کے کپڑے اور جوتے، دونوں کے استعمال کی چھوٹی موٹی چیزیں اور فراز کے چند کھلونے۔ پرنسپل نے اپنے گھر سے ایک سنگل بیڈ مع میٹرس اس کے کمرے میں ڈلوا دیا جہاں بصیرہ کو قیام کرنا تھا۔ چھوٹا سا کمرا تھا۔ وہاں سنگل بیڈ ہی آسکتا تھا۔

شروع کے چند دن بہت اذیت ناک تھے۔ بصیرہ کا دل بار بار بھر آتا۔ کبھی اماں یاد آتیں، کبھی ایاز۔ سوچا تھا کبھی کہ زندگی اس بری طرح پلٹا کھائے گی۔ سگے رشتوں کے ہوتے وہ یوں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرے گی۔ پنڈی اور لاہور قریبی رشتوں سے بھرے پڑے تھے۔ بھائی تو پنڈی میں ہی بستا تھا۔ کتنی آسانی سے اس نے کہہ دیا تھا...... جیسے تمہاری مرضی، ویسے کرو...... نوکری تو بہر حال کرنی ہی ہے۔ ایک دفعہ جھوٹے منہ ہی کہہ دیتا...... کیا ضرورت ہے اپنا گھر چھوڑ کر لاوارثوں کی طرح اسکول میں جا پڑنے کی۔ نوکری کوئی مجبوری تو نہیں۔ میں تمہاری اور تمہارے بچے کی کفالت کرسکتا ہوں۔ یہاں تو چھٹی کے بعد ہو کا عالم ہوگا...... چوکیدار کا کوارٹر دور اسکول کے احاطے کے شرقی گوشے میں تھا۔ کبھی کبھار اس کے بچے آتے جاتے دکھائی دے جاتے ورنہ سناٹا رہتا۔ بصیرہ ذرا سی آہٹ پر چونک جاتی۔

چوکیدار حشمت علی اچھا آدمی تھا۔ چھٹی کے بعد کاریڈور کا چکر لگاتے ہوئے اونچی آواز میں پوچھ لیتا۔ ''مس جی! کوئی مسئلہ تو نہیں۔''

کبھی وہ کمرے کے اندر ہی سے جواب دے دیتی۔

''نہیں حشمت اللہ! کوئی مسئلہ نہیں۔'' کوئی مسئلہ ہوتا تو وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آتی۔ فراز بھی اس کے ساتھ ساتھ ہوتا۔ اسٹاف کے باتھ روم میں جو چھٹی کے بعد اس کے استعمال میں ہوتا تھا، پانی نہ آنے کا عموماً مسئلہ ہوتا۔ حشمت اللہ کچھ نہ کچھ حل نکال دیتا۔ کبھی اسے بازار سے کوئی سامان منگوانا ہوتا تو حشمت کو پیسے دے کر منگوا لیتی۔

وقت کے دو ہاتھوں میں سے ایک جلاد ہے تو دوسرا مہربان...... مہربان ہاتھ نے بصیرہ کے دل کو دھیرے دھیرے زندگی کے اس نئے ڈھب کا عادی کر دیا تھا۔ تیسرے چوتھے ہفتے وہ ویک اینڈ پر پنڈی بھی چلی جاتی۔ بھابی اب اسے مہمان کی طرح سمجھتیں۔ چائے پانی اور کھانے کو پوچھ لیتیں مگر ساتھ ہی کوئی فرمائش بھی داغ دیتیں۔ ''بہت دن ہوگئے تمہارے ہاتھ کا پلاؤ کھائے۔'' اور بصیرہ کو ان کی فرمائش کی تعمیل کرنا پڑتی۔ بھائی کے بچے فراز سے بڑے ہونے کے باوجود اسے کسی نہ کسی بہانے تنگ کرنے میں پیچھے نہ رہتے۔ کبھی کوئی خوامخواہ ہی اس کے سر پر چپت مار دیتا، کوئی جن بابا بن کر دانت نکوستا اور اسے ڈراتا۔ بصیرہ کو اپنے ساتھ کسی کی کوئی زیادتی گوارا تھی مگر فراز کے ساتھ کسی قیمت پر نہیں۔ وہ پھر پنڈی نہ آنے کا تہیہ کرتی مگر پھر گھر کی ہڑک اٹھتی اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پنڈی چلی جاتی۔ وہاں وہ مکان تھا جو کبھی اس کا گھر رہا تھا۔ اب بھی تھا...... اور وہاں اس کا بھائی، اس کا ماں جایا رہتا تھا جسے دیکھ کر اس کے دل میں ٹھنڈک پڑ جاتی تھی۔ وہ بیچارہ ہر شریف آدمی کی طرح اپنی بیوی کے دام میں تھا تو کیا، بصیرہ تو اسے اپنا محرم ہی نہیں محترم بھی سمجھتی تھی۔

☆☆☆

میدانی علاقوں کے برعکس مری کے تعلیمی اداروں میں موسم گرما کے بجائے موسم سرما میں طویل تعطیلات دی جاتی تھیں۔ موسم سرما آیا اور تعطیلات ہوگئیں تو بصیرہ اس مخمصے میں پڑگئی کہ طویل تعطیلات اسکول کے سنسان اور ویران ماحول میں ایک چھوٹے بچے کے ساتھ کیونکر گزارے۔ سردیوں میں دن کا دورانیہ کم ہونے کے باوجود تنہائی اور اداسی کا احساس نہ جانے کیوں بڑھ جاتا ہے۔ بصیرہ نے تعطیلات کے آغاز پر چند دن تو سناٹے میں گزارے پھر اس کا جی گھبرانے لگا۔ چوکیدار حشمت اللہ بھی پرانا اونی دوشالہ اوڑھے، سر پر اونی ٹوپا چڑھائے دن میں تو اسکول کے میدان میں بیٹھا دھوپ تاپتا نظر آتا۔ ایک دو چکر اسکول کی عمارت کے اندر بھی لگا لیتا مگر دھوپ ڈھلی پڑتے ہی وہ بھی کم کم نظر آتا۔ اس کے بیوی بچے بھی زیادہ تر گھر کے اندر ہی رہتے۔ بصیرہ کے لیے درد انگیز سناٹے اور تنہائی سے نکلنے کو دو ہی راستے تھے۔ پنڈی میں بھائی کا گھر یا لاہور میں فراز کی دادی کا گھر...... جب وہ مری آئی تھی، بے جی اسے اکثر فون کرتی رہتی تھیں۔ فراز سے بھی بات کرتیں جو سادہ جملوں میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لائق ہو چکا تھا۔ تعطیلات سے قبل ہی بے جی نے بصیرہ کو لاہور آنے کی دعوت دی تھی۔ دل تو اس کا بہت تھا وہاں جانے کو مگر زمرد کی وجہ سے ہچکچاتی تھی۔ اس گھر میں زمرد کی حیثیت اس کی نسبت زیادہ مضبوط تھی۔ اس کا شوہر اس کے سر پر تھا۔ وہ خاندان کی اگلی نسل کی امین تھی۔ اگلی نسل کی امین تو بصیرہ بھی تھی مگر شوہر کے بعد سسرال میں اس کی حیثیت وہ نہ رہی تھی جو زمرد کی تھی۔ حقیقت یہ بھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ بے جی کی گرمجوشی اور دردمندی میں بھی پہلے کی سی بات نہ رہی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے چند دن کے لیے بھائی کے گھر ہی جانے کو ترجیح دی جبکہ وہاں سے اسے تعطیلات پنڈی میں گزارنے کی جھوٹوں بھی دعوت نہیں دی گئی تھی۔

وہ اپنے اور فراز کے مختصر سے اسباب کے ساتھ بھائی کے گھر پہنچی تو بھابی نے کہا۔ ”ہم نے تو برف باری دیکھنے مری آنا تھا۔ خیر، اچھا ہوا تم آگئیں۔ سردی میں مجھ سے تو پانی کا کام نہیں ہوتا۔ ہاتھوں کی انگلیاں سوج جاتی ہیں۔ اب تم اپنے بھائی اور بچوں کی فرمائشیں پوری کرنا۔“

بصیرہ کو پہلے ہی اندیشہ تھا۔ ”میں دیکھ لوں گی بھابی!“ اس نے کہا۔

بھائی کے بچے اب کی بار فراز کے ساتھ پہلے کی طرح نہ گھلے ملے تھے۔ شاید اس لیے کہ انہیں معلوم تھا کچھ دنوں کی بات ہے، پھر واپس چلا جائے گا۔

بصیرہ نے کچن سنبھال لیا۔ فراز زیادہ تر بھائی کے چھوٹے بیٹے شہود کے ساتھ کھیل کود میں لگا رہتا۔ شہود، فراز سے دو سال بڑا اور بھائی کے چار بچوں میں تیسرے نمبر پر تھا۔ اس سے چھوٹی عنایہ، فراز سے چھ ماہ چھوٹی تھی۔

بصیرہ کو بھائی کے ہاں آئے تیسرا یا چوتھا دن تھا کہ ایک روز فراز منہ بسورتے ہوئے اس کے پاس آیا اور شکایتاً بولا۔

”ماما! شہود کہتا ہے یہ گھر میرا ہے، تمہارے ابو تو مر گئے۔“

بصیرہ نے سہم کر فراز کو اپنے سینے سے لگا لیا اور دیر تک اسے سینے ہی سے لگائے رکھا۔ نہ فراز نے مزید کچھ کہا، نہ وہ کچھ بولی مگر رات کو جب وہ فراز کو سلانے کے لیے اس کے نزدیک لیٹی تو اس نے فراز کو دھیرے دھیرے تھپکتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے ابو نے اللہ میاں کے ہاں آسمان پر بڑا اچھا گھر بنایا ہے۔“

”تو پھر ادھر چلیں نا۔“ فراز معصومیت سے بولا۔

”چلیں گے بیٹا! ایک دن ہمیں وہیں جانا ہے۔“

”میں شہود کو ادھر نہیں آنے دوں گا اپنے گھر میں۔“

”بیٹا! شہود تمہارا بھائی ہے۔“

”شہود گندا ہے۔“

”بری بات بیٹا...... بھائی کو گندا نہیں کہتے...... اچھا اب تم سو جاؤ۔“ بصیرہ نے فراز کو چمکارتے ہوئے کہا۔

اگلے دن شہود کی فراز کو اپنی سائیکل پر نہ بٹھانے پر پھر ان بن ہوگئی اور فراز نے شہود کو دھمکی دی کہ اس کے ابو نے آسمان پر جو گھر بنایا ہے، وہ شہود کو اس گھر میں نہیں آنے دے گا۔ شہود سے بڑی ہانیہ نے فراز کا مذاق اڑایا کہ وہ جھوٹ بولتا ہے، آسمان پر کوئی گھر نہیں بنا سکتا۔ فراز منہ بسورتا بصیرہ کے پاس آیا اور اس کے پیچھے پیچھے شہود اور ہانیہ بھی آگئے۔ ہانیہ جو نہایت پٹاخہ تھی، بولی۔ ”پھپھو! آسمان پر کوئی گھر بنا سکتا ہے؟“

”کیوں...... کیا ہوا؟“

”یہ فراز کہتا ہے اس کے ابو نے آسمان پر گھر بنایا ہے۔“

”ہاں نا۔“ بصیرہ نے کہا۔

”نہیں پھپھو! آسمان پر تو سورج ہوتا ہے، چاند ہوتا ہے، تارے ہوتے ہیں، گھر کوئی نہیں ہوتے۔“ ہانیہ بولی۔

”اچھا تینوں دوستی کرو۔“ بصیرہ نے ان کے ہاتھ ملوائے۔

بچے اِدھر اُدھر ہوگئے۔ فراز کا دل رکھنے کو انہیں مبہم معلومات دینے پر بصیرہ کو نہ صرف افسوس ہوا بلکہ اس نے شرمندگی بھی محسوس کی...... مگر مسئلہ یہ تھا کہ فراز کا دل رکھنے کو وہ کسی بھی حد تک جا سکتی تھی۔

☆☆☆

بے جی نے اسے لاہور بلانے کے لیے پھر فون کیا۔
''بہت دن ہو گئے فراز کو دیکھے...... چھٹیاں ہیں، کچھ دن کو آجاؤ۔'' انہوں نے بصیرہ سے کہا۔
''ابھی تو بھائی کے گھر ہوں بے جی!''
''فراز پر کچھ حق تو ہمارا بھی ہے بیٹا!''
بصیرہ شرمندہ ہو گئی۔ ''سوری بے جی...... ! آؤں گی۔''
بصیرہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی لاہور جانا پڑا۔ وہ بے جی کو بنا اطلاع کیے خود ہی چلی گئی۔ راستے میں اس نے فراز سے کہا۔ ''ہم دادو کے گھر جا رہے ہیں۔ وہاں چاچو بھی ہوں گے، چاچی بھی...... چاچی کا ایک منا ہے...... تمہارا چھوٹا بھائی...... اس کے ساتھ پیار سے رہنا۔''
اس بار زیادہ وقفے سے آنا ہوا تھا۔ بے جی، شاہنواز اور گل سب نے گرمجوشی دکھائی۔ زمرد بھی کچھ سدھری ہوئی لگتی تھی۔
''فراز آتا ہے تو مجھے لگتا ہے جیسے میرا ایاز میرے پاس آگیا۔'' بے جی روہانسی ہوئیں۔ ''بیٹا! جب تمہیں آسانی ہو، اسے لے آیا کرو۔''
''سوری بے جی! اس بار دیر ہوئی۔ نیا اسکول تھا اور دور بھی۔ ایڈجسٹ ہونے میں ٹائم لگا۔''
''پنڈی ہی اچھا تھا۔''
''جی...... مگر نوکری تو نوکری ہوتی ہے۔ ٹرانسفر ہونے پر جانا پڑا۔''
''تم مری میں اپنے اسکول ہی میں رہتی ہو...... اکیلے دل نہیں گھبراتا؟''
''گھبرائے بھی تو کیا...... نوکری تو کرنی ہے...... کرائے پر کوئی گھر لیتی تو بھی اکیلے تو رہنا ہی پڑتا۔''
''اکیلی کب تک رہو گی بیٹا۔''
بصیرہ نے چونک کر بے جی کو دیکھا۔
''عورت کے لیے اکیلے زندگی گزارنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ابھی جوان ہو...... بچے کا ساتھ ہے...... لڑکے بڑے ہوتے ہیں تو سو مسائل ہوتے ہیں...... گھر سے باہر نکلتے ہیں تو دوست کم، غلط راستہ دکھانے والے زیادہ ہوتے ہیں۔ ماں کہاں کہاں ان کے پیچھے پھر سکتی ہے۔ انہیں صحیح راستہ دکھانے کے لیے کسی مرد کی ضرورت ہوتی ہے...... کسی نیک بندے کا ہاتھ تھام لو۔''
بصیرہ سن رہ گئی۔ اس کے مرحوم شوہر کی ماں اسے دوسری شادی کی ترغیب دے رہی تھی۔
''نہیں بے جی!'' اس نے قدرے توقف سے کہا۔
''میں...... اپنے بچے کو خود ہی پالوں گی۔''
''مشکل ہوگی۔''
''اللہ مالک ہے۔''
''ہاں، اللہ تو سب کا مالک ہے۔ اسی نے اپنے پیارے حبیب کے ذریعے ہم مسلمانوں کو ہر معاملے میں عافیت کا راستہ دکھایا ہے...... بیوہ عورت کو دوسرا نکاح افضل ہے۔''
بصیرہ کی آنکھیں بھر آئیں...... سینہ بھاری ہو گیا۔
''نہیں بے جی...... !'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔
''میرے لیے بس ایاز ہی تھے...... فراز نہ ہوتا تو ایاز کے بعد میرے لیے زندگی ختم ہو گئی تھی...... شاید اپنے ہاتھوں اپنا خاتمہ کر لیتی میں۔''
''استغفر اللہ! ایسا سوچنا بھی حرام ہے۔ شوہر کے بعد بیوی کا بھی ستی ہو جانا ہمارا طریقہ نہیں اور...... اب تو ان کی عورتیں بھی ستی نہیں ہوتی ہیں...... ہمارا دین تو کہتا ہے بیوہ عورت کا دوبارہ نکاح کراؤ...... میرے بچے سے تمہاری محبت اور وفاداری اپنی جگہ مگر اکیلی کب تک چلو گی...... تھک جاؤ گی...... اور پھر تمہیں احساس ہوگا کہ تمہیں زندگی نئے سرے سے شروع کر لینی چاہیے تھی۔''
''سوری بے جی! زندگی نئے سرے سے بھی شروع نہیں کی جا سکتی۔ زندگی کی ڈور تو جہاں ٹوٹ گئی، سو ٹوٹ گئی...... دوبارہ جوڑنے کے لیے گرہ لگانا پڑتی ہے...... اور گرہ تو گرہ ہی ہوتی ہے نا بے جی...... ! جوڑ ہمیشہ نمایاں رہتا ہے...... کھٹکتا ہے...... برا بھی لگتا ہے۔ ہم انسانوں کی زندگی دوبارہ نئے سرے سے شروع کرنے کا اختیار تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے اور میری دعا ہے کہ اس زندگی میں بھی مجھے ایاز کا ساتھ ملے۔''
''بیٹا! میں ایک عورت ہوں...... بیوگی میں نے بھی گزاری ہے...... میں تمہارے لیے ایاز کی ماں بن کر نہیں، ایک عورت کی طرح سوچتی ہوں۔''
☆☆☆
تعطیلات ختم ہوئیں۔ اسکول دوبارہ کھل گیا۔ پھر وہی شب و روز...... چھٹی کے بعد وہی کمرا...... وہی تنہائی...... وہی سناٹا...... چوکیدار کا کوارٹر...... کبھی کبھار کوارٹر کی طرف سے آنے والی کوئی آواز...... کوارٹر کی چمنی سے نکلتا دھواں...... اور گاہے گاہے سناٹے کا سینہ چیرتی چوکیدار کی سیٹی کی آواز نہ ہوتی تو بصیرہ کی سماعت سن ہی ہو جاتی۔ فراز کی تعلیم شروع ہونے کا مرحلہ بھی آ گیا تھا۔ اسکول کے نزدیک ہی ایک کنڈرگارٹن تھا جو دیگر تعلیمی اداروں کی نسبت

قدرے تاخیر سے کھلتا تھا۔ بصیرہ نے فراز کے داخلے کے لیے وہاں بات کر رکھی تھی۔ اس کے اپنے اسکول سے دو تین منٹ کی پیدل مسافت پر تھا۔ وہاں فراز کو پہنچانا اور چھٹی کے بعد واپس لینا بھی مشکل نہ تھا۔ بصیرہ کسی وجہ سے خود اسے اسکول پہنچانے یا واپس لینے کے لیے نہ جا سکتی تو اس کے اپنے اسکول کا کوئی نائب قاصد یا آیا اسے پہنچا بھی دیتے اور واپس بھی لے آتے۔

پرنسپل، ٹیچرز اور دیگر اسٹاف سب کا رویّہ بصیرہ کے ساتھ نہایت ہمدردانہ تھا۔ فراز تو ان سب کا چہیتا بن گیا تھا۔ اس کی ذرا سی تکلیف پر بصیرہ کے ساتھیوں کی خدمات حاضر ہوتیں۔ اسکول اس کا اور فراز کا گھر اور اسکول کے ساتھی ان دونوں کی فیملی بن گئے تھے۔ بصیرہ کے اسکول کی بچیاں فراز سے یوں پیار کرتیں جیسے وہ دنیا کا انوکھا لاڈلا بچہ تھا۔ قدرت کا یہ قانون کتنا سکون بخش ہے کہ انسان سے کوئی نعمت جاتی ہے تو کوئی آتی بھی ہے۔

بصیرہ اللہ کی شکر گزار تھی اور اللہ کے ان بندوں کی ممنون جنہوں نے اس کی اور فراز کی زندگی میں آسانیاں پیدا کردی تھیں۔ بھائی کا گھر جو بھی اس کا بھی تھا، اسے اکثر یاد آتا، دل میں ہوک سی اٹھتی۔ جب تک ابا حیات تھے زندگی کچھ اور تھی۔ گھر میں ابا کے حکم کا سکہ چلتا تھا۔ ان کا کہا حرفِ آخر ہوتا۔ بھائی ان کے سامنے سر نہ اٹھاتے، بھابی کی بولتی بند رہتی۔ ان کے بعد تو بھابی کی زبان ایسی کھلی تھی کہ اماں کو بھی خاطر میں نہ لاتیں۔ شادی کے بعد سسرال گئی تو تھوڑا ہی عرصہ چین نصیب ہوا۔ ایاز کی موت نے اسے پھر میکے کی دہلیز پر لا ڈالا۔ باپ کا گھر اب بھائی کی راجدھانی بن چکا تھا۔ بھائی بیوی کی جنبشِ ابرو کا پابند...... ایاز کے بعد بصیرہ نے جتنا عرصہ بھائی کے گھر میں گزارا، وہ جانتی تھی کہ بھابی کا رویہ اس کے ساتھ کتنا نامناسب رہا۔ نہ جانے ایسی عورتیں یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ ایسا کڑا وقت اللہ نہ کرے ان پر بھی آسکتا ہے......

مگر عجب بات یہ تھی کہ بصیرہ کو بھائی کے گھر کی ہوک پھر بھی رہتی تھی۔ گھر کی تڑپ تو مرد کو بھی ہوتی ہے۔ ایاز پردیس سے اپنے گھر مستقل واپسی کا کتنا آرزومند ہوتا تھا۔ بصیرہ تو عورت تھی جس کی گھٹی میں گھر کی چاہت پڑی تھی۔

اسکول میں جن ساتھیوں سے اس کی دوستی اور بے تکلفی ہو چکی تھی، وہ بھی ڈھکے چھپے اور کبھی واشگاف الفاظ میں اسے دوبارہ شادی کا مشورہ دیتی تھیں۔ وہ کبھی اپنے انداز و اطوار سے ٹال جاتی، کبھی صاف انکار کردیتی اور کبھی برا بھی مان جاتی۔ ”کیا ضرورت ہے مجھے دوبارہ شادی کرنے کی...... میرے پاس میرا بچہ ہے...... کیوں میں اپنے بچے کو کسی دوسرے آدمی کے رحم و کرم پر پالوں۔“

”کل کو جب تمہارا بیٹا بڑا ہو جائے گا، اس کی اپنی فیملی، اپنی زندگی ہوگی تو تمہیں اپنے لیے ایک ساتھی کی ضرورت ہوگی بصیرہ!“ کوئی بے تکلف ساتھی اسے سمجھاتی۔

”نہیں تھا میری قسمت میں ساتھی...... ہوتا تو فراز کے ابو کیوں جاتے۔“ بصیرہ روہانسی ہو جاتی۔

”کسی ایک شخص کے چلے جانے سے زندگی ایک جگہ پر تھم نہیں جاتی بصیرہ!“

”میرے لیے تھم ہی گئی ہے۔“

☆☆☆

عید کی چھٹیاں ہوئیں تو چوکیدار بھی ایک نائب قاصد کو اپنی جگہ پر ڈیوٹی کا پابند کروا کے اپنے بال بچوں سمیت عید منانے کے لیے اپنے گاؤں چلا گیا۔ بصیرہ نے بھی اپنا اور فراز کا مختصر اسباب بیگ میں رکھا اور عید کی چھٹیاں گزارنے کے لیے بھائی کے گھر پنڈی روانہ ہو گئی۔

”اچھا ہوا تم آ گئیں...... عید پر اتنا آنا جانا لگا رہتا ہے...... میں اکیلی کہاں نمٹا پاتی۔“ بھابی نے کہا۔

وہ بھابی کے ان کلمات کے لیے تیار تھی۔

بھائی کے بچے اپنے عید کے کپڑے، جوتے وغیرہ بصیرہ اور فراز کو دکھا دکھا کر اتراتے رہے۔ ”یہ دیکھیں پھپو...... یہ دیکھیں پھپو...... یہ شوز بابا نے دلائے ہیں۔“

فراز اپنی معصوم سی حیرت اور تجسس کے ساتھ دیکھتا رہا۔

رات کو بھائی، بھابی اور بچے گاڑی میں بیٹھ کر چاند رات منانے باہر چلے گئے۔ کسی نے بصیرہ سے جھوٹے منہ بھی ساتھ چلنے کو نہیں کہا بلکہ بھابی نے حکم صادر فرمایا۔ ”بصیرہ! کباب کا بھرتا تو تم نے پیس لیا تھا، ٹکیاں بھی بنا لینا اور ہاں...... شیر خورما بھی بنا کر فریج میں رکھ دو گی تو صبح تک مزیدار ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

جاتے جاتے بھائی نے دبی زبان سے کہا۔ ”فراز کو بھی ساتھ لے لیں؟“

”چھوٹا ہے...... ماں کے بغیر پریشان ہو جائے گا۔“ بھابی فوراً بولیں۔

بھابی نہ بھی کہتیں تو بصیرہ فراز کو نہ جانے دیتی۔ بھابی اور بچوں کا رویہ دیکھتی تھی وہ فراز کے ساتھ...... کھنچے کھنچے رہتے...... اور شہود تو اسے دشمن کی طرح گھورتا تھا۔

بھائی، بھابی اور بچوں کے جانے کے بعد وہ کباب ٹکیاں بنانے بیٹھی تو فراز نے جو اس کے نزدیک ہی بیٹھا تھا،

اس سے کہا۔ "ماما! میرے بابا کیوں نہیں آتے؟"

پل بھر کو تو جیسے اس کا دل بھی تھم گیا۔

"تمہیں بابا کیوں یاد آگئے؟" اس نے اپنے دل کی رفتار بحال ہونے پر کہا۔

"میں بھی جایا کروں گا نا گاڑی میں اپنے بابا کے ساتھ۔" فراز نہایت معصومیت سے بولا۔

"ہم اپنے بیٹے کے لیے خود گاڑی لے لیں گے...... ماما گاڑی چلانا سیکھ لیں گی اور اپنے بیٹے کو خود گاڑی میں لے جایا کریں گی۔"

"نہیں ناماما...... بابا کے ساتھ۔"

"اوکے...... اوکے!" بصیرہ نے بھاری دل کے ساتھ فراز کے اطمینان کو کہا۔

کباب ٹکیاں بنا کر فریزر میں رکھنے کے بعد شیر خورما بنانے سے قبل وہ فراز کو سلانے کے لیے بستر پر لیٹی تو فراز کے ذہن کی سوئی اس نے وہیں اٹکی پائی۔

"ماما! میرے بابا کب آئیں گے؟"

"تم سو جاؤ۔"

"میں سوؤں گا تو بابا آجائیں گے؟"

اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل تھا۔ بصیرہ نے فراز کو اپنے اور نزدیک کھینچ کر سینے سے لگالیا اور اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر کر اس کا سر گدگدانے لگی۔

"ماما......!"

"سو جاؤ میری جان۔"

"ماما! آپ کے بابا کدھر ہیں؟"

"اللہ میاں کے پاس۔"

"شود بولتا ہے میرے بابا بھی اللہ میاں کے پاس چلے گئے...... مر گئے۔"

"چندا ماموں دور کے...... پھوئے پکائیں پور کے...... آپ کھائیں تھالی میں...... فراز کو دیں پیالی میں......" بصیرہ بیٹے کا دھیان بٹانے کو لوری گنگنانے لگی۔

"یہ والا نہیں ماما!" فراز کا دھیان سابقہ موضوع سے ہٹنے لگا۔

"تو پھر کون سا؟"

فراز خود ہی اپنی ٹیچر کی یاد کرائی ہوئی ایک انگریزی نظم گنگنانے لگا۔ بصیرہ اللہ کی شکر گزار ہوئی کہ اس کا دھیان ایک تکلیف دہ موضوع سے ہٹ گیا تھا...... مگر کب تک؟ بالآخر تو اسے اس حقیقت کے ساتھ زندگی کی راہ گزر پر چلنا تھا کہ وہ باپ کی شفقت سے محروم تھا۔

روزِ عید بے جی نے اسے فون کیا پھر باری باری شاہنواز، گلفراز اور زمرد نے اس سے اور فراز سے بات کی۔

"عید کا دن تو آپ ہمارے ساتھ گزار لیتیں۔" شاہنواز کے لہجے نے چغلی کھائی کہ وہ اپنی بات نہ مانے جانے پر بصیرہ سے ہنوز شکوہ کن تھا۔

"میرے اور فراز کے لیے سال کے تین سو پینسٹھ دن ایک ہی جیسے ہیں۔" اس نے کہا۔

"آپ کی اپنی چوائس ہے ورنہ ہر دن مختلف بھی ہو سکتا تھا۔" شاہنواز بولا۔

"میں گلہ تو نہیں کر رہی۔"

"اپنے ساتھ آپ نے فراز سے بھی زیادتی کی...... ان رشتوں سے دور کر کے جو اس کی محرومی کا مداوا بن سکتے تھے۔"

"ہوتا وہی ہے جو رب چاہتا ہے۔"

"اپنی خطا کو رب کی مشیت کے کھاتے میں ڈال دینا تو ہم بندوں کا شیوہ ہے۔"

"آج عید کا دن ہے۔"

"جانتا ہوں۔"

"زمرد خفا نہ ہو جائے اتنی لمبی بات پر۔"

"بے جی نے اس کی بڑی اچھی تربیت کر دی ہے۔"

"بے جی از گریٹ۔"

"کوئی شک نہیں...... بھائی کے بعد انہوں نے جس صبر سے خود کو کمپوزڈ رکھا، وہ مجھے حیران کر دیتا ہے۔"

"کافی دن ہوئے ایاز کے بعد کہیں ایک جملہ پڑھا تھا...... جتنا بڑا سانحہ ہو اس کی اتنی ہی جلدی صبر کرنے کی طاقت آجاتی ہے...... مگر مجھے اس سے اختلاف محسوس ہوتا ہے...... بعض زخم اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ کبھی نہیں بھرتے۔"

"میں آپ کے لیے دعا گو ہوں۔"

"تھینک یو۔"

شام کو بھائی اپنی بیگم اور بچوں کو رشتے داروں سے عید ملنے اور باہر گھمانے پھرانے کے لیے لے جانے لگے تو فراز بھی ان کے ساتھ جانے کی ضد کرنے لگا۔ بھائی نے چاہا کہ اسے بھی ساتھ لے لیں مگر بھابی بولیں۔ "چھوٹا ہے...... اپنی ماں کے بغیر اتنی دیر باہر کیسے رہے گا۔"

"بصیرہ کو بھی لے لیتے ہیں...... اس کی بھی آؤٹنگ ہو جائے گی۔"

"اور ہمارے پیچھے کوئی عید ملنے آ گیا تو؟"

"پھر تو ہمیں بھی گھر میں رہنا چاہیے۔" بھابی کے سامنے اپنی بولتی بند رکھنے والے بھائی نہ جانے کیسے کہہ گئے۔

"کیا مطلب؟" بھابی نے تیوری چڑھائی۔ "میں عید کے دن بھی اپنے بہن بھائیوں سے ملنے نہ جاؤں؟"

"میرا یہ مطلب نہیں۔"

"تو پھر کیا مطلب ہے؟"

"میرا مطلب ہے کوئی آیا تو ہم ہی سے ملنے آئے گا نا۔"

"بصیرہ ہے نا۔"

"بصیرہ بھی تو ہمارے ساتھ عید منانے کے لیے آئی ہے۔"

"بیوہ عورت کی کیا عید، کیا بقر عید۔"

بھائی اور بھابی پورچ میں کھڑی گاڑی میں بیٹھنے سے قبل یہ باتیں کر رہے تھے اور بصیرہ گھر کے اندر لابی میں پورچ کے رخ پر کھلنے والی کھڑکی کے نزدیک کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔

"جاؤ فراز! تم اپنی ماما کے پاس جاؤ۔" اس نے بھابی کو کہتے سنا۔

بصیرہ تڑپ کر لابی سے باہر نکل آئی۔ بھائی، بھابی اور ان کے بچے گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ فراز کھڑا حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے فراز کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بھابی نے گاڑی کا شیشہ نیچے کیا اور سر باہر نکال کر بولیں۔ "ہمارے ساتھ جانا چاہ رہا ہے مگر اتنی دیر اس کا خیال کون رکھے گا۔"

"یہ تو بچہ ہے بھابی...! آپ لوگ جائیں... میں ہوں نا اس کا خیال رکھنے کو۔"

بھائی، بھابی اور بچوں کے واپس آنے تک فراز ان کی واپسی اور ماں کے ساتھ باہر جانے کی راہ تک تک کر سو چکا تھا اور بصیرہ بھائی، بھابی کی عدم موجودگی میں گھر آنے والے مہمانوں کی خاطر مدارات کرتے ہوئے یہی سوچتی رہی کہ یہاں آنے کے بجائے وہ مری میں ہی رہی ہوتی تو بہتر تھا۔ اس کی کولیگز میں سے کسی نہ کسی کو تہوار پر فراز کو بھی عید کی خوشیوں میں شریک کرنے کا خیال آ ہی گیا ہوتا... بے درد اپنوں سے تو دردمند غیر ہی بھلے۔

عید کے دوسرے دن ہی وہ مری واپس آ گئی حالانکہ بھابی نے اسے ایک دن اور روکنے کی بہت کوشش کی۔ وہ جانتی تھی بھابی کیوں اصرار کر رہی تھیں۔ ان کے اپنے بھائی بہنوں نے عید کی ٹر منانے کے لیے آنا تھا۔ بصیرہ کا سارا دن کچن میں ہی گزرتا۔ کام میں اسے کوئی عار نہ تھا مگر بھابی کو بھی تو اس کی اور فراز کی فیلنگز کا خیال ہونا چاہیے تھا۔ یکطرفہ احساس سے بات کب تک بنتی ہے۔

☆☆☆

اسکول میں بصیرہ کے ساتھیوں میں ایک قریبی دوست، رازدار اور غمگسار مسز غیاث تھیں۔ وہ گاہے گاہے اسے سمجھاتیں کہ اس طرح بچے کے ساتھ اسکول کے ایک چھوٹے سے کمرے میں پڑے رہنے سے زندگی نہیں گزرے گی۔ آئندہ زندگی میں نہ جانے کتنے پیچ و خم آنے تھے... ملازمت بھی ٹرانسفر ایبل تھی... ملازمت میں اس کی اگلی تعیناتی نہ جانے کس شہر میں اور کس مقام پر ہوتی تھی۔ یہاں تو اسے رہائش کے لیے ایک کمرے کی سہولت میسر تھی، آئندہ منزل پر نہ جانے کیا ہو... اس کے اور فراز کے سر پر اپنے گھر کی چھت میسر ہونا لازم تھی۔ انہوں نے بصیرہ کو دو رشتے بھی بتائے تھے... ایک فوجی افسر تھا جس کی پوسٹنگ مری میں تھی۔ بیوی فوت ہو چکی تھی، دو بچے تھے، دونوں لڑکے۔ مذکورہ افسر اپنا گھر آباد کرنے کے لیے دوسری شادی کا خواہاں تھا۔ دوسرا رشتہ مری کی ایک اقامتی درس گاہ میں تدریسی فرائض سرانجام دینے والے ایک سائنس ٹیچر کا تھا۔ اس کی لیٹ میرج تھی۔

بصیرہ نے دونوں سے انکار کر دیا۔

مسز غیاث نے پھر ایک رشتہ بتایا... سرکاری محکمے میں سولہویں گریڈ کا ملازم تھا۔ عمر اچھی خاصی تھی مگر ہنوز کنوارا تھا۔ والدین حیات نہ تھے۔ بہن بھائی سوتیلے تھے جن سے اس کا کوئی رابطہ نہ تھا۔

"غیاث صاحب تقریباً بارہ تیرہ سال سے جانتے ہیں اسے۔ بے حد شریف، نیک اور نمازی آدمی ہے۔ کرائے کے گھر میں رہتا ہے۔ جلد ہی سترہ گریڈ میں پروموشن ہونے والی ہے اور ہو سکتا ہے پروموشن کے ساتھ اس کی ٹرانسفر بھی راولپنڈی ہو جائے۔"

بصیرہ جو خاموشی سے مسز غیاث کی بات سن رہی تھی، اسے عذر کی راہ ملی۔ "مسز غیاث! اس کی تو ٹرانسفر ہو جائے گی... مجھے تو پھر بھی یہیں رہنا پڑے گا۔"

"تم بھی اپنا ٹرانسفر کرا لینا۔"

"اور اگر اس کا ٹرانسفر ایسی جگہ ہوا جہاں مجھے ٹرانسفر کا راستہ نہ ملا؟"

"چھٹی لے لینا۔" مسز غیاث بولیں۔

"میری زیادہ چھٹیاں جمع نہیں ہیں مسز غیاث! پھر کیا کروں گی؟" بصیرہ انہیں ٹالنے کو بولی۔

"اللہ مالک ہے۔ جاب چھوڑ دینا۔ جاب اتنی ضروری نہیں جتنا عورت کے سر پر اپنے گھر کی چھت اور ایک اچھے لائف پارٹنر کا ساتھ ہونا۔"

"میں اکیلی نہیں ہوں مسز غیاث! میرے ساتھ بچہ بھی ہے۔ خود سے پہلے مجھے اس کے لیے سوچنا ہے۔ میں اسے کسی

اور کے رحم و کرم پر نہیں رکھنا چاہتی۔"

"سب عورت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ہم نے ایسے کیسز بھی دیکھے ہیں کہ شوہر کے انتقال یا خدانا خواستہ کسی وجہ سے شوہر کی علیحدگی کے بعد بچے والی عورت کی دوسری شادی ہوئی اور دوسرے شوہر نے اس کے پہلے شوہر کے بچوں کو بھی اپنی اولاد کی طرح پالا۔"

"قسمت کی بات ہے مسز غیاث! میں اگر اتنی خوش قسمت ہوتی تو ایاز کیوں جاتے۔"

"اللہ کی مشیت اللہ ہی کو معلوم۔"

"میں اس کی مشیت میں راضی ہو چکی ہوں۔"

"تم ایک دفعہ اس شخص سے مل تو لو۔"

"کیا کروں گی مل کر۔"

"اسے اپنی پرائیرٹی بتادو...... بتادو اسے کہ تم اپنے بچے کے معاملے میں اتنی حساس ہو کہ کوئی کمپرومائز نہیں کرو گی۔ مل کر تو دیکھو...... ہو سکتا ہے وہ تمہارے دل کو لگ جائے۔"

"نہیں مسز غیاث!"

"کچھ وقت لو...... اچھی طرح سوچ بچار کرو...... بعض جذباتی فیصلے آگے جا کر تکلیف دہ بن جاتے ہیں۔ اولاد اپنی زندگی میں مگن ہو جاتی ہے...... کبھی کبھی ایسی خود غرضی دکھاتے ہیں بچے کہ ماں باپ شاکڈ رہ جاتے ہیں۔ بصیرہ! عورت کے لیے اکیلے زندگی گزارنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بیماری، آزاری، دکھ، تکلیف، تنہائی، سو مسائل ہوتے ہیں۔"

"اللہ مالک ہے۔"

☆☆☆

فراز بڑا اور سمجھ دار ہو رہا تھا۔ آئے دن اس کی نت نئی فرمائشوں میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ کبھی کوئی مہنگا کھلونا خریدنے کے لیے بضد، کبھی لائٹس والے جوگرز کی فرمائش، کبھی بائیسکل لینے کی خواہش تو کبھی باہر جانے پر اصرار۔ آئے دن تو اس کے اسکول میں بہانے بہانے پارٹیاں منعقد کرنے کے لیے بھی پیسے تو کبھی چیزیں منگوائی جاتیں۔ بصیرہ سوچتی ان اداروں سے تو سرکاری تعلیمی ادارے اچھے جو مناسب فیس لیتے ہیں اور پارٹیوں کے چکر میں والدین کی جیب پر غیر ضروری بوجھ نہیں ڈالتے۔

بصیرہ چودہ گریڈ کی ملازم تھی۔ تن تنہا اسے اپنے اور بچے کے اخراجات سے نمٹنا پڑتا۔ بچے کو اچھا کھلانا، پہنانا بھی ضروری تھا۔ بصیرہ کی امی کہا کرتی تھیں اولاد کو کھلایا پلایا اور تعلیم پر خرچ کیا ضائع نہیں جاتا۔ بصیرہ کا تو ایک ہی بچہ تھا۔ اس کا بس چلتا تو دنیا جہان کی نعمتیں اس کے سامنے ڈھیر کر دیتی۔ پھلوں میں اسے کیلا اور سیب بہت مرغوب تھے مگر سیب کو چھلکے سمیت کھانا سخت ناپسند۔ اسے چھلکا اتار کر سیب کی قاشیں کاٹ کر دینے کے بعد بصیرہ چھلکے اس خیال سے خود کھا لیتی کہ آخر ان چھلکوں میں بھی تو غذائیت ہوتی ہے اور اسے بھی خود کو توانا رکھنے کے لیے غذائیت کی ضرورت تو تھی لیکن ایک روز فراز کو سیب چھیل کر دینے کے بعد اس نے بے خیالی میں اسی کے سامنے سیب کے چھلکے چبانا شروع کر دیے۔ فراز چند ثانیے دیکھتا رہا پھر اچانک ہی مچل گیا کہ آپ نے میرا سیب کیوں کھایا...... بصیرہ دم بخود رہ گئی...... فراز کے مچلنے پر اپنی غلطی کا احساس دکھ میں بدل گیا۔ چھلکوں والی پلیٹ رنج کی کیفیت میں ایک طرف رکھ دی اور فراز کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! نہیں کھایا میں نے تمہارا سیب...... یہ تو چھلکے ہیں سیب کے۔"

"کھایا ہے، میرا سیب کھایا ہے۔" فراز مزید مچلا۔

"اچھا سوری! آئندہ نہیں کھاؤں گی۔"

فراز اسے خفگی سے دیکھنے لگا۔

"سوری میرا بچہ!" بصیرہ نے اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

فراز کا موڈ ٹھیک ہو گیا۔ مزے سے اپنی پلیٹ سے سیب کی قاشیں اٹھا کر کھانے لگا اور بصیرہ دل میں یہ سوچنے پر مجبور ہوئی کہ وہ اپنی ذات کو فراموش کر کے فراز کے کھانے پینے، اچھے کپڑوں اور دیگر ضروریات کا کتنا خیال رکھتی تھی اور فراز......! مگر ماں تھی۔ فراز سے اس کی یہ رنجش بھی پیار میں ڈھل گئی۔ رات کو اس کے سو جانے کے بعد اس کی اس حرکت کو بھی یاد کر کر کے اسے بار بار محبت سے دیکھتی رہی۔

☆☆☆

پنڈی کے ایک ثانوی اسکول میں سائنس ٹیچر کی اشد ضرورت ہونے پر بصیرہ کا تبادلہ پھر راولپنڈی ہو گیا۔ دوبارہ بھائی کے گھر جانا پڑا۔ پنڈی میں رہتے ہوئے بھائی کے گھر سے الگ رہنا تو معیوب ہوتا۔ ویسے بھی وہ کرائے کا گھر لینا افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ اخراجات بڑھ رہے تھے۔ سرفہرست فراز کے تعلیمی اخراجات تھے۔ بھابی نے اسے ممٹی میں اپنا اور فراز کا بستر ڈالنے کی عنایت مرحمت فرمانے کے ساتھ اسٹور میں پڑی ایک پرانی میک شفٹ الماری بھی جو بھائی کسی زمانے میں دبئی سے لائے تھے، اسے اپنے اور فراز کے کپڑے وغیرہ رکھنے کے لیے دے دی۔ فراز کا داخلہ اس نے اپنے اسکول کے نزدیک ہی ایک انگریزی میڈیم اسکول میں کروا دیا۔ یوں فراز کے اسکول آنے جانے کے لیے اسکول وین یا ٹیکسی لگوانے کا خرچ

کم ہو گیا۔ فراز کو اس کے اسکول چھوڑتے ہوئے وہ اپنے اسکول جاتی اور چھٹی کے بعد اس کے اسکول جا کر اپنے ساتھ لے لیتی۔ اگرچہ فراز کے اسکول سے اپنے اسکول آنے جانے کے لیے بھی اسے وین لینا پڑتی مگر اخراجات قابو میں رہتے۔

البتہ بھائی کے گھر رہنے میں اسے فراز کی فرمائشوں کو لگام دینی پڑتی۔ بھابی اور ان کے بچے حتیٰ کہ بھائی بھی فراز کے کھانے پینے پر خاصی کڑی نظر رکھتے۔ بصیرہ اس کے لیے چھپا چھپا کر چیزیں لاتی مگر ان لوگوں کو کبھی خوشبو، کبھی چھلکوں اور کبھی خالی ڈبوں اور شاپرز سے خبر ہو جاتی۔

''کل تم نے اور پھپھو نے پیزا کھایا تھا نا؟'' فراز سے پوچھا جاتا اور وہ معصومیت سے اقرار کر لیتا۔

''پھپھو تمہارے لیے رس ملائی لے کر آئی تھیں نا؟'' اور فراز کا سر اثبات میں ہل جاتا۔

فراز کے کپڑوں، جوتوں اور کھلونوں کے بارے میں بھی ایسے ہی استفسارات کیے جاتے۔ بصیرہ بھولے بھٹکے اپنے لیے کوئی چیز خرید لاتی تو بھابی کو کھٹکتی۔

''تمہارا بیگ ابھی کام تو دے رہا تھا۔ کیا ضرورت تھی نیا بیگ خریدنے اور فضول خرچی کرنے کی۔ بچے کا ساتھ ہے..... برے بھلے وقت کے لیے پیسا سنبھال کر رکھا کرو۔''

''بھابی! تین ساڑھے تین سال سے ایک ہی بیگ استعمال کر رہی تھی۔ پرانا ہو گیا تھا۔ زپ بھی بار بار پھنس جاتی تھی۔'' اسے وضاحت دینی پڑتی۔

''میں تو تمہیں سمجھا رہی ہوں۔ میری کون سی اپنی جیب سے گیا ہے پیسا۔'' بھابی برا مان جاتیں۔

''مجھے معلوم ہے بھابی! آپ میرے بھلے کو ہی سمجھاتی ہیں۔'' وہ کہتی۔

مٹی میں رہتے ہوئے اسے صبح سے شام تک بارہا نیچے اترنا اور اوپر آنے کے لیے سیڑھیاں چڑھنا پڑتا۔ پاؤں تھک جاتے۔ فراز نیچے جاتا تو اکثر منہ بسورتا ہی ایسی شکایتوں کے ساتھ اوپر آتا۔

''ماما! شود کہتا ہے نیچے مت آیا کرو۔''

''ماما! ہانیہ باجی کہتی ہیں..... سارے کمرے ہمارے ہیں..... تمہارا کوئی بھی نہیں۔''

''ماما! امامی مجھے گھولتی (گھورتی) ہیں۔''

''ماما! اسعود بھائی کہتے ہیں تم گندے ہو۔''

''ماما! ہانیہ باجی مجھے جوکر بول رہی تھیں۔''

بصیرہ کا جی چاہتا دوبارہ مری چلی جائے۔ اپنوں کے ساتھ رہ کر آزار جھیلنے سے تو وہ تنہائی ہی بہتر تھی۔ اس کے اپنے اختیار میں ہوتا تو مری واپس جانے میں ذرا دیر نہ کرتی مگر اس کے اپنے اختیار میں کب تھا۔ یہ تو ارباب اختیار کے ہاتھ میں تھا کہ جہاں چاہتے تعیناتی کر دیتے۔

سخت لو میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کے مانند کبھی کبھار بے جی کا فون آ جاتا۔ کبھی زمرد بھی بات کر لیتی۔ وہاں سب خوش تھے۔ شاہنواز اور زمرد کے دو بچے..... گلفراز کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد اسے جاب بھی مل گئی تھی۔ زمرد کی بھتیجی سے اس کی شادی کی بات بھی پکی ہو چکی تھی۔ دوبارہ پنڈی تبادلے کے بعد وہ موسم بہار کی تعطیلات میں بے جی کے اصرار پر ایک ہی بار لاہور گئی تھی۔ واپس آئی تو بھابی کا منہ پھولا ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ تعطیلات میں اپنے حصے کی گھریلو ذمے داریاں بصیرہ کے سپرد کر کے وہ خود مکمل آرام کرنا چاہتی تھیں۔ اس کی واپسی کے دو چار دن بعد بھابی کا موڈ قدرے بہتر ہوا تو وہ بولیں۔

''اب تمہارے لاہور جانے کا کیا تک تھا؟''

''بے جی بہت دنوں سے اصرار کر رہی تھیں۔ فراز کو دیکھے کافی دن ہو گئے تھے انہیں۔''

''چلو فراز تو ان کا پوتا ہے..... تمہارا بار بار وہاں جانا نہیں بنتا اب۔''

''ایاز ان کے بیٹے تھے اور میرے شوہر۔''

''شوہر گیا، رشتہ ختم۔''

''ایسا کیسے بھابی!'' وہ دکھی ہوئی۔

''ایسا ہی ہے۔'' بھابی نے اپنی بات پر زور دیا پھر چبھتے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ''وہ تو اچھے لوگ ہیں جو بیٹے کی اولاد کی وجہ سے پوچھ لیتے ہیں تمہیں ورنہ تمہارا اب کیا رشتہ رہا ان سے..... ویسے بھی اس گھر میں تمہارے دو دو جوان دیور ہیں..... ایک کی بیوی ہے، دوسرے کی بھی آ جائے گی۔ انہیں اپنے گھر میں تمہارے آنے جانے اور رہنے پر اعتراض کرتے کیا دیر لگتی ہے..... بھئی تمہارے لیے تو مرحوم شوہر کے بھائی نامحرم ہی ہوئے۔''

بصیرہ دم بخود رہ گئی۔

''میں انہیں چھوٹے بھائیوں کی طرح سمجھتی ہوں بھابی!'' اس نے کہا۔

''تمہارے سمجھنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جو حقیقت ہے وہ ہے۔'' بھابی نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ کٹ کر رہ گئی۔

بھابی اگر اس طرح سوچ رہی تھیں تو زمرد اور باقی لوگ..... اس نے سوچ لیا آئندہ بے جی کے بلانے پر بھی لاہور نہیں جائے گی..... مگر فراز..... وہ تو ان کا خون تھا۔ ان

کے مرحوم بیٹے کی اکلوتی اولاد۔
مسز غیاث سے اس کی راولپنڈی آنے کے بعد بھی وقتاً فوقتاً فون پر بات ہوتی رہتی تھی۔ موسم بہار کی تعطیلات ختم ہونے پر دوبارہ اسکول کھلا تو اس نے وقفے کے دوران مسز غیاث کو فون کیا۔

"چھٹیاں کیسی گزریں؟" انہوں نے پوچھا۔

"گزر گئیں مسز غیاث!"

"کہاں...... پنڈی یا لاہور؟"

"لاہور...... بے جی بہت اصرار کر رہی تھیں۔"

"اچھا ہوا تم چلی گئیں۔"

"مگر آئندہ نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں؟" مسز غیاث چونکیں۔

اس نے من و عن بھابی کا اعتراض مسز غیاث کے گوش گزار کر دیا۔

"اسی لیے سمجھاتی ہوں تمہیں کہ کسی شریف آدمی کا ہاتھ تھام لو۔ ہم عورتوں کو مرد سے ہی اعتبار اور تحفظ ملتا ہے۔ شادی کر لو گی، تمہارا اپنا گھر ہوگا۔ بار بار بھابی کا منہ بھی نہیں دیکھنا پڑے گا تمہیں ورنہ یہی ہوگا کہ ان کی اور ان کے بچوں کی خدمت بھی کرو گی اور الٹی سیدھی بھی سنو گی۔"

وہ چپ رہی۔

"وہ جو رشتہ میں نے تمہیں بتایا تھا، ابھی ہے...... اس بے چارے کی بھی اللہ جانے کہاں گوٹ پھنسی ہے کہ شریف اور برسر روزگار ہونے کے باوجود اب تک شادی نہیں ہوئی۔ غیاث سے کہوں اس سے بات کریں؟"

بصیرہ حالات سے ایسی کبیدہ خاطر ہو چکی تھی کہ اس نے کہا۔ "مسز غیاث! میں خود تو اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتی۔" بصیرہ کی یہ بات گویا اس کی آمادگی تھی۔

مسز غیاث خوش ہوگئیں۔ "غیاث کریں گے نا اس سے بات اور تمہارے بھائی، بھابی سے میں بات کر لوں گی۔"

"کیسے؟" بصیرہ چونک کر بولی۔ "بھائی، بھابی سے تو آپ کا انٹروڈکشن ہی نہیں۔"

"انٹروڈکشن ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ تم مجھے فون نمبر دو گی۔ میں ان سے بات کر لوں گی۔ ایڈریس دو گی تو گھر آجاؤں گی۔"

"وہ لوگ سمجھیں گے میں نے پلان کیا ہے۔"

"استغفراللہ! تم سولہ سال کی لڑکی تو ہو نہیں۔ ایک بچے کی ماں ہو۔ بالفرض تم نے خود بھی پلان کیا ہے تو اس میں گھبرانے کی کیا بات...... تم اپنی زندگی کا فیصلہ کر سکتی ہو۔ خیر، پہلے تو غیاث لڑکے سے بات کر لیں۔"

"لڑکا!" بصیرہ نے استعجاب ظاہر کیا۔

"بھئی ہے تو وہ پینتالیس کے لگ بھگ لیکن جب تک شادی نہ ہو، مرد کو لڑکا اور عورت کو لڑکی ہی کہا جاتا ہے۔"

"آپ ایک بیوہ عورت اور بچے کی ماں کو ایک لڑکے کے سر منڈھنے کا پروگرام بنا رہی ہیں۔"

"دعائیں دے گا ہمیں۔" مسز غیاث نے توقف کیا۔ "ویسے ہمارے میاں جتنی تعریف کرتے ہیں اس بندے کی شرافت کی، اس سے امید تو یہی ہے کہ تھوڑی بہت دعائیں تم سے بھی مل جائیں گی ہمیں۔"

"میں تو اب بھی آپ کے لیے بہت نیک گمان رکھتی ہوں مسز غیاث! آپ نے میرا اور فراز کا بہت خیال رکھا۔ خدا آپ کو اس کی جزا دے۔"

زندگی میں مخلص لوگوں کا ملنا بھی خدا کی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ مسز غیاث بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھیں۔

☆☆☆

دو دن بعد مسز غیاث نے اسے فون کیا اور نہایت بشاش لہجے میں بولیں۔ "ہاں بھئی، لڑکا تو چاروں ہاتھ پاؤں سے راضی ہے۔"

"غیاث بھائی نے اسے یہ بتا دیا کہ میرا بیٹا بھی ہے؟" بصیرہ نے پوچھا۔

"ہاں ہاں، یہ تو ضروری تھا بتانا۔"

"پھر؟"

"پھر کیا، وہ تیار ہے۔ اب تم بتاؤ مجھے اپنی بھابی کا فون نمبر دو گی یا میں تمہارے گھر آؤں ان سے بات کرنے کے لیے؟"

"گھر آنا ہی بہتر ہوگا مسز غیاث! مگر آپ کو دور بہت پڑے گا۔"

"بڑے کاموں کے لیے فاصلوں کو خاطر میں نہیں لایا جاتا۔ تمہارا گھر آباد ہونے کی مجھے دلی خوشی ہوگی۔"

"میں آپ کو ایڈریس بھیج دوں گی۔ ملنے کے بہانے آجائیں۔"

"ملنے کے بہانے کیوں...... ہم رشتہ لے کر آئیں گے بھئی۔"

"مسز غیاث! مجھے شرم محسوس ہوتی ہے اور ڈر بھی لگتا ہے۔"

"کس بات کی شرم اور کس بات کا ڈر؟"

"لوگ کیا کہیں گے...... دوسری شادی کر لی۔"

"کوئی گناہ تو نہیں...... اور ڈر کس بات کا؟"

''کہ دوسرا شخص فراز کے ساتھ نہ جانے کیسا ہو۔''

''نیک گمان رکھو..... دنیا میں اچھے لوگوں کی کمی نہیں...... خیر تم مجھے ایڈریس بھیجو۔''

''بتا کر آیئے گا۔''

''کیوں؟''

''تا کہ میں آپ کی پسند کی چیزیں بنا سکوں۔''

''ہرگز نہیں...... میں کسی بھی وقت آ کر تمہیں سرپرائز دے سکتی ہوں۔''

''بھابی سے یہ مت کہیے گا کہ میں نے حال ہی میں ایڈریس دیا ہے آپ کو۔ کہیے گا، بہت پہلے دیا تھا۔''

''عجیب عورت ہو۔ اتنا تو کنواری لڑکیاں بھی نہیں ڈرتیں۔ یہ تمہارا حق ہے بصیرہ...... ! اور دوسروں کا فرض کہ وہ تمہیں اس طرح نہ بیٹھا رہنے دیں بلکہ دوبارہ تمہارا گھر آباد کرائیں۔''

☆☆☆

ویک اینڈ پر مسز غیاث اپنے شوہر کے ساتھ آ پہنچیں۔ انہوں نے اور بصیرہ دونوں نے یہ ظاہر کیا جیسے مسز غیاث کسی پیشگی پروگرام کے بغیر اچانک ہی آ گئی تھیں۔ بھائی اور بھابی مسز غیاث اور ان کے شوہر سے بڑے تپاک سے ملے۔ بصیرہ کے ساتھ بھابی کا رویہ جو بھی ہو مگر ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ گھر آئے لوگوں سے بہت اخلاق سے ملتی تھیں۔ بصیرہ ان کی خاطر تواضع کا سامان کرنے کے لیے کچن میں گئی تو دونوں نے موقع دیکھ کر اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیا۔

بھائی بہت خوش ہوئے اور انہوں نے کہا۔ ''آپ لوگوں کا بہت شکریہ کہ آپ نے ہماری بہن کے لیے اتنے خلوص سے سوچا اور اتنی دور سے قدم اٹھا کر تشریف لائے۔''

''جن صاحب کا میں نے آپ سے ذکر کیا ہے، میں پوری ایمانداری سے ان کی شرافت اور نیکی کی ذمے داری لینے کو تیار ہوں۔'' غیاث صاحب بولے۔ ''اتنے سال ہو گئے مجھ سے ان کی واقفیت کو۔ اس شخص کو میں نے صوم و صلوٰۃ کا پابند اور دوسروں کا خیر خواہ پایا۔ کبھی اس کے منہ سے کوئی غلط لفظ نہیں سنا میں نے۔ البتہ ذاتی گھر نہیں ہے اس کے پاس۔ کرائے کے مکان میں رہتا ہے۔''

''گھر والی آئے گی تو گھر بھی بنا لے گا۔'' مسز غیاث نے لقمہ دیا۔

''بصیرہ کی رضا ضروری ہے۔'' بھابی بولیں۔

''بے شک۔'' مسز غیاث نے تائید کی۔ ''آپ لوگ پوچھ لیں...... آپس میں ڈسکس کر لیں...... پھر ہمیں بتا دیجیے گا۔''

''ہم بھی پوچھ لیں گے...... مگر آپ بھی تو بصیرہ کی کولیگ رہی ہیں۔ دوستوں سے آدمی زیادہ بے تکلفی سے اور کھل کر بات کر لیتا ہے۔ آپ خود بھی پوچھ لیں بصیرہ سے...... میرا خیال ہے وہ راضی نہیں ہوگی۔'' بھابی نے کہا۔

''وہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں...... سمجھانے سے آدمی سمجھ جاتا ہے۔'' مسز غیاث بولیں۔

''ٹھیک ہے۔ اگر بصیرہ راضی ہو جاتی ہے تو آپ ان

''میں نے سلمان سے اسما کا رشتہ طے کر دیا ہے۔'' حاجی صاحب نے خلال کرتے ہوئے بیگم کو بتایا۔

''حاجی صاحب میں نے تینوں رشتے کے کوائف اور تصویریں اسما کو دکھائی تھیں اور اس نے احمد کے لیے ہاں کی ہے۔'' حاجی صاحب کی بیگم نے منمناتی آواز میں کہا۔

''کیا؟ کیا کہا آپ نے؟ آپ کو کیا ضرورت تھی اسے غیر محرموں کی تصاویر دکھانے کی؟ اس کی شادی کا فیصلہ تو مجھے کرنا ہے۔''

''مگر حاجی صاحب یہ اسما کی زندگی کا معاملہ ہے، پھر شریعت بھی تو اسے فیصلے کا حق دیتی ہے۔''

''بیگم کیا آپ کی عقل گھاس چرنے گئی ہے؟ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟ لڑکیوں سے کب پوچھا جاتا ہے؟ انہی تو صرف نکاح نامے پر دستخط کرنا ہوتا ہے۔'' حاجی صاحب کی غصہ بھری آواز دور تک گونج گئی۔

......

''حاجی صاحب کل جمال کا فون آیا تھا، وہ اپنی کلاس فیلو ریٹا سے شادی کرنا چاہ رہا ہے۔ میں نے اسے کہہ دیا کہ اس رشتے پر حاجی صاحب کبھی بھی راضی نہیں ہوں گے۔ اب بھلا اہلِ کتاب بھی اہلِ کتاب رہے ہی کب ہیں؟''

''کیا بات کرتی ہیں آپ بیگم؟ بہت بال کی کھال نکالنے لگی ہیں۔ لڑکا ذات ہے بھئی، اسے من مانی کرنے دیجیے۔ میری طرف سے اسے ریٹا سے شادی کرنے کی پوری پوری اجازت ہے۔'' حاجی بولے۔

(تحریر: شاہین کمال، کلگری، کینیڈا)

صاحب کو انوائٹ کرلیں۔'' بھائی نے کہا۔

''بہت مناسب۔'' غیاث صاحب نے تائید کی۔

''دونوں ایک دوسرے کو دیکھ لیں...... بات کرلیں...... اللہ کو منظور ہوا تو بات آگے بڑھ جائے گی۔'' مسز غیاث بولیں۔

بصیرہ ٹی ٹرالی لے آئی تھی۔ بھابی نے اسے معنی خیز نظروں سے اور مسز غیاث نے دونوں کو کن انکھیوں سے دیکھا۔

بصیرہ کچھ نروس ہو رہی تھی۔ دبی، لجی اور شرمائی وہ ہمیشہ ہی رہی تھی۔ شادی شدہ اور ایک بچے کی ماں ہونے کے باوجود اس میں بے باکی ذرا نہ تھی۔

غیاث صاحب اور مسز غیاث کے جانے کے بعد بھابی نے بصیرہ سے کہا۔ ''جانتی ہو تمہاری دوست اپنے شوہر کے ساتھ کیوں آئی تھیں؟''

''ملنے کے لیے بھابی! کافی دن ہو گئے تھے ملے ہوئے۔ مری میں انہوں نے میرا بہت خیال رکھا۔''

''اب تک خیال رکھے ہوئے ہیں۔'' بھابی کے لہجے میں معنی خیزی تھی۔

''اچھی خاتون ہیں۔''

''رشتہ لائی ہیں تمہارے لیے۔''

''دماغ تو نہیں چل گیا ان کا۔''

''لگتا تو یہی ہے۔ کنوارے مرد اور بچے والی عورت کا کیا جوڑ...... اور بھئی سوتیلا تو سوتیلا ہی ہوتا ہے، چاہے سوتیلی ماں ہو یا سوتیلا باپ...... کیا تمہیں اپنے بچے پر سوتیلا باپ لانا منظور ہوگا؟''

بصیرہ سمجھ نہ پائی کہ بھابی اتنی منفی سوچ کا مظاہرہ کیوں کر رہی تھیں۔ انہیں تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ وہ ان کے گھر سے جائے گی...... شاید اس لیے کہ انہیں مفت ہاتھ آئی خدمت گار کا ہاتھ سے جانا منظور نہ تھا۔ جب سے وہ مری سے واپس آئی تھی، گھر کے زیادہ بکھیڑے اسی کی جان کو تھے۔ کتنی خود غرض تھیں بھابی...... اس کے اور اس کے بچے کے مستقبل سے انہیں کوئی دلچسپی، کوئی بہی خواہی نہیں تھی۔ بھابی کے رویے نے اسے مسز غیاث کے مخلصانہ اقدام پر مستحکم کر دیا۔

☆☆☆

تین چار دن بعد بھابی نے اسے معیوب نظروں سے دیکھتے ہوئے نہایت متعجب لہجے میں کہا۔ ''ہیں! تم راضی ہو گئیں؟''

وہ چپ رہی۔

''مسز غیاث کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھیں بصیرہ کو میں نے راضی کر لیا ہے۔ اتوار کو دونوں میاں بیوی اس شخص کو ہم سب سے ملوانے کے لیے لا رہے ہیں۔'' بھابی نے توقف کیا۔ ''دیکھ لینا...... کوئی عیب دار آدمی نہ ہو...... بعض نکھٹو کھاتی کماتی عورت تلاش کرتے ہیں۔''

اس نے مسلسل خاموشی پر اکتفا کیا۔

''بعض شادی کے لائق ہوتے بھی نہیں۔ گلے میں شادی شدہ ہونے کا تمغہ لٹکانا چاہتے ہیں بس۔'' بھابی کھل کر بولیں۔

بصیرہ کو حیا آئی۔

''اچھی طرح اطمینان کرنا۔ سوال یہ ہے کہ اب تک شادی کیوں نہیں ہوئی اس کی۔ آخر کوئی تو وجہ ہوگی۔ لڑکے تو ادھر جوان ہوئے نہیں، شادی کے لیے شور مچانے لگتے ہیں۔''

بصیرہ اب بھی چپ ہی رہی۔

اتوار کو مسز غیاث اپنے شوہر اور بصیرہ کے لیے مجوزہ رشتے کے ہمراہ آئیں۔ نام اس کا محمد عثمان تھا۔ صورت شکل، قد بت بس واجبی، حلیہ شریفانہ...... گفتگو کم مگر مدبرانہ...... بھلا مانس لگتا تھا۔ بصیرہ کو بس ایک نظر دیکھا۔ نہ کچھ پوچھا نہ پاچھا۔ کھانا پینا نہایت تمیز داری سے...... فراز سے ملوایا گیا تو ہاتھ ملایا، اپنے پاس بٹھایا...... نرم و رساں لہجے میں نام پوچھا...... کس کلاس میں پڑھتے ہو...... کھانے میں کیا پسند ہے...... پسندیدہ کھیل...... اور بس۔

غیاث صاحب نے بھائی سے کہا۔ ''باقی باتیں آپ سے فون پر ہوں گی۔''

''ان شاء اللہ!'' بھائی نے کہا۔ ان کی باڈی لینگویج بتا رہی تھی کہ آنے والا ان کے دل کو بھایا تھا۔ مہمانوں کے جانے کے بعد بھابی نے تبصرہ کیا۔ ''بہت گھنا آدمی لگتا ہے۔''

''شریف آدمی ہے...... بہت نپی تلی گفتگو کی...... ہم ہی بولتے رہے۔ وہ تو زیادہ وقت چپ ہی رہا۔'' بھائی نے کہا۔

''یہ جو چپ رہتے ہیں نا، یہ بڑے گہرے ہوتے ہیں۔ اپنا بھید نہیں دیتے، دوسروں کی جڑوں میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' بھابی بولیں۔

''بہرحال، کہیں تو سیٹل کرنا پڑے گا بصیرہ کو۔ آخر کب تک اکیلی رہے گی۔''

''اکیلی کیوں...... بچہ ہے نا اس کے پاس۔''

''بچے کو خود سہارے کی ضرورت ہے۔ مجھے تو ٹھیک آدمی لگا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ کنوارہ ہے۔ پہلے بیوی بچوں کا جھنجٹ نہیں ہے۔ خدانخواستہ کوئی اونچ نیچ ہوئی بھی تو بصیرہ اپنے پیروں پر کھڑی ہے۔''

''ہاں تو اسے اپنے پیروں پر ہی کھڑا رہنے دیں نا......

ماں بیٹا اپنی زندگی گزارنے میں آزاد ہیں...... کیوں پابند کرتے ہیں بصیرہ کو دوسرے مرد کا...... اور کیوں اس کے بچے پر سوتیلا باپ لانے کے درپے ہیں آپ لوگ۔ کچھ تو ہوگا جس کی وجہ سے وہ ایک بچے کی ماں سے شادی کو تیار ہے۔''

''اللہ سے اچھی امید رکھنی چاہیے۔''

مسز غیاث اور ان کے میاں نے خاصی سرگرمی دکھائی۔ بصیرہ نے استخارہ کرنا ضروری سمجھا۔ نیند میں تھی کہ کانوں میں آواز آئی...... ان اللہ مع الصابرین...... مسز غیاث کو بتایا تو انہوں نے کہا...... اس سے بڑھ کر کھلا اشارہ کیا ہوگا...... تم اتنے برسوں سے صبر سے بیٹھی ہو۔ اللہ پاک تمہیں مایوس نہیں ہونے دیں گے...... بصیرہ کا دل جیسے ٹھہر سا گیا۔

کچھ باتیں بھائی اور غیاث صاحب کے درمیان فون پر ہوئیں۔ کچھ معاملات مسز غیاث اور غیاث صاحب کے ہمراہ عثمان کی آمد و رفت سے طے پائے۔ بصیرہ نے صرف ایک بات کی یقین دہانی چاہی اور وہ یہ کہ اس کی زندگی میں آنے والا نیا شخص اس کے بچے کو خوشدلی سے قبول کرے گا...... جواب آیا...... ان شاء اللہ!

عثمان کے مری سے پنڈی تبادلے کے احکامات بھی جاری ہو چکے تھے۔ اس نے بصیرہ کے اسکول کے نزدیک ایک مکان کا بالائی پورشن جو دو کمروں، لاؤنج، کچن اور ٹیرس پر مشتمل تھا، کرائے پر لے لیا۔

نہایت سادہ سی گھریلو تقریب میں بصیرہ کا عثمان سے نکاح ہو گیا اور وہ بصیرہ اور فراز کو اپنی کرائے کی رہائش گاہ میں لے آیا۔ فراز کو بصیرہ نے آہستگی سے سمجھا دیا تھا...... ہم تمہارے بابا کے گھر جا رہے ہیں...... فراز جو اپنی کم عمری کے باعث ماں کے عقدِ ثانی اور سوتیلے باپ جیسی باتوں سے ناآگاہ تھا...... خوش تھا کہ ماموں کے بچوں کی طرح اسے بھی ''بابا'' مل گئے تھے۔ عثمان کے کرائے کے مکان میں پہنچ کر تو اس کی خوشی اور بے یقینی دیدنی تھی۔ گھر کے دونوں کمروں، کچن اور باتھ روم میں بار بار جھانکتا اور نہایت ایکسائٹمنٹ سے بصیرہ سے کہتا...... ''ماما! یہ روم بھی میرا ہے...... یہ دوسرا روم بھی میرا ہے...... یہ کچن بھی میرا ہے...... یہ باتھ روم بھی میرا ہے۔''

بصیرہ کی آنکھیں اس کی ایکسائٹمنٹ پر بھیگ رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ بھائی کے بچوں بالخصوص ہانیہ اور شہود نے فراز کو اس نفسیاتی دباؤ میں رکھا ہوا تھا کہ ان کا گھر فراز کا گھر نہیں تھا۔ اسی لیے وہ نئے گھر میں آکر بے حد خوش ہو رہا تھا۔

''مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے سوائے فراز کے لیے محبت اور اپنائیت کے۔'' بصیرہ نے اپنی زندگی میں آنے والے دوسرے مرد سے کہا۔

''ان شاء اللہ آپ کو مجھ سے شکایت نہیں ہوگی۔'' عثمان نے یقین دلایا۔

☆☆☆

بے جی کو خبر ملی تو انہوں نے اسے فون کیا۔ ''بصیرہ بیٹی! میں خوش ہوں کہ تم نے صحیح فیصلہ کر لیا۔ دعا ہے کہ تمہیں بہت خوشیاں ملیں...... ایک درخواست ہے تم سے...... فراز سے ہمارا تعلق نہ ٹوٹنے دینا۔''

''فراز سے آپ کا تعلق کیسے ٹوٹ سکتا ہے بے جی...... وہ آپ کا ہے...... آپ ہی کا رہے گا۔''

''خوش رہو۔''

''آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''ایاز کے بعد کیسی طبیعت اور کیسا جینا بیٹے!''

''بے جی! میں نے بھی یہ مشکل فیصلہ اس لیے کیا کہ...... فراز میرے بھائی کے بچوں کے مقابلے میں احساسِ کمتری کا شکار ہوا جا رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا گھر ان کے کزنز کا ہے، باپ ان کے ہیں...... اس کا نہ باپ ہے نہ اپنا گھر۔''

''تم نے بہت اچھا کیا...... میں تو خود تم سے کہتی تھی۔''

''فراز کو اور مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔''

''صرف تم دونوں ہی کو کیوں...... اسے بھی دعاؤں میں یاد رکھوں گی جس نے تمہاری زندگی میں میرے ایاز کی جگہ لی ہے۔''

بصیرہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ کتنی کشادہ دل تھیں بے جی۔

☆☆☆

کئی سال بعد زندگی ایک ڈھرے پر آگئی۔ عثمان سے عقد کے بعد بصیرہ کو احساس ہوا یہ فیصلہ اسے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔ ایاز کی موت کے بعد کتنی اجڑی ہوئی تھی وہ۔ مری کے اسکول میں گزارا وقت کتنا جاں سوز تھا۔ اسکول کی لق و دق عمارت کے ایک بہت چھوٹے سے حبس زدہ کمرے میں رہنا اس کی زندگی کا مشکل ترین دور تھا۔ دن تو جیسے تیسے گزر ہی جاتا، رات آنکھوں میں کٹتی۔ بہت مشکل دور تھا وہ۔

بھائی کے گھر میں دوسری طرح کی مشکلات تھیں۔ بھابی کی چبھتی ہوئی باتیں...... بچوں کا فراز کو دوسرے بلکہ تیسرے درجے کا شہری سمجھنا...... ننھی سی جان سے ایسے کھنساتے تھے کہ اللہ کی پناہ۔

عثمان سے عقد کے بعد اب وہ سب کچھ نہ تھا...... زندگی

کا قرینہ بدل گیا تھا۔ گھر کرائے کا سہی مگر اپنائیت، خودمختاری اور تحفظ کا احساس تھا۔ بکھری ہوئی زندگی جیسے سمٹ گئی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ فراز اپنے نئے گھر میں بہت خوش تھا۔ اب اسے بھائی کے بچوں سے یہ طعنہ نہیں ملتا تھا کہ گھر اس کا نہیں تھا، ان کا تھا۔

☆☆☆

بصیرہ کو چند ہی دن میں عثمان کی عادات و خصائل کا اندازہ ہوگیا۔ وہ شعائرِ اسلامی کا پابند ایک نیک فطرت آدمی تھا۔ پنج وقتہ نمازی اور تہجد گزار...... نماز کے جن اوقات میں وہ گھر میں ہوتا، فراز کو بھی نماز کے لیے اپنے ساتھ مسجد لے جاتا۔ فراز نہایت شوق سے اس کے ساتھ جاتا۔ عثمان معمولی شکل وصورت اور پکی رنگت کا حامل تھا مگر نماز کی پابندی نے اس کی شخصیت کو جلا دے رکھی تھی۔ دھیمے لہجے میں مدلل گفتگو کرتا۔ نفاست اور پاکیزگی پسند تھا۔ فراز سے نہایت محبت اور اپنائیت سے پیش آتا۔ یہی وجہ تھی کہ چند دن میں ہی فراز اس سے نہایت مانوس ہوگیا۔ بصیرہ نے فراز کو اوّل دن سے ہی عثمان کو بابا کہنے کی عادت ڈالی۔ نیا محلہ تھا، سب یہی سمجھتے کہ فراز بصیرہ ہی نہیں، عثمان کی بھی سگی اولاد تھا۔ حقیقت تو ایک دن کھل ہی جانی تھی مگر نہ بصیرہ نے آس پڑوس میں کسی کو یہ بتانا ضروری سمجھا تھا کہ اس کی دوسری شادی تھی، نہ عثمان نے کسی سے یہ کہنا سننا ضروری جانا تھا۔

بصیرہ نے فراز کو نئے اسکول میں داخل کرادیا تھا۔ صبح کو بصیرہ، عثمان اور فراز اکٹھے گھر سے نکلتے۔ فراز کو عثمان اپنی اسکوٹر پر اپنے آگے بٹھاتا، بصیرہ پیچھے بیٹھتی۔ فراز کو اس کے اسکول پہنچانے کے بعد عثمان، بصیرہ کو اس کے اسکول چھوڑتا پھر اپنے آفس چلا جاتا۔ دوپہر کو گھر واپسی کے لیے بصیرہ نے ایک ٹیکسی لگوائی تھی۔ فراز کو اس کے اسکول سے لیتی ہوئی وہ اس ٹیکسی میں گھر آجاتی۔ عثمان کی اپنے دفتر سے واپسی سہ پہر کو ہوتی۔ دفتر سے واپس آکر وہ کچھ دیر آرام کرتا۔ بصیرہ خیال رکھتی کہ اس کے آرام میں خلل واقع نہ ہو۔ ماں بیٹا دونوں کو اگر بات کرنا ہوتی تو نہایت دھیمی آواز میں بات کرتے۔ اس دوران بصیرہ بیٹے کو کھیل کود اور بھاگ دوڑ سے بھی منع کردیتی۔ دونوں دبے پاؤں چلتے، پھر عصر، مغرب اور عشا کی نمازوں کا سلسلہ ہوتا۔ فراز نہایت شوق سے عثمان کے ساتھ مسجد جاتا۔ چھوٹا تھا، نماز پڑھنی تو ابھی اسے کیا آنی تھی مگر عثمان کا کہنا تھا بچوں کا اپنے بڑوں کے ساتھ مسجد جانا بھی انہیں نماز کی پابندی کی طرف مائل کرتا ہے۔ عصر کے بعد عثمان خود فراز کو قرآنی قاعدہ پڑھاتا۔

بصیرہ مطمئن تھی کہ فراز کو ایک اچھے آدمی کی سرپرستی مل گئی تھی۔ بھائی کے ہاں جانا ہوتا تو فراز ان کے بچوں کے سامنے پہلے کی طرح دبا دبا نہ رہتا بلکہ بار بار انہیں جتاتا کہ میرا گھر ہے...... میرے بابا بھی ہیں۔ جب بھی وہ آتے تو انہیں نہایت شوق اور اعتماد سے اپنے گھر کا ایک ایک کمرا، کچن، صحن حتیٰ کہ باتھ روم بھی دکھاتا۔ ان کے سامنے بابا کے قصائد پڑھتا۔ ”میرے بابا میرے لیے چیز لاتے ہیں...... فروٹ بھی لاتے ہیں...... مجھے اپنے اسکوٹر پر بازار لے جاتے ہیں...... مسجد بھی لے جاتے ہیں...... میں بابا کے ساتھ نماز پڑھتا ہوں...... میرے بابا مجھے کہانی بھی سناتے ہیں...... بابا کہتے ہیں اندھیرے سے نہیں ڈرتے۔“

فراز جو پہلے شرمیلا، دبا دبا اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے سہم جانے والا ڈرپوک سا بچہ ہوا کرتا تھا، عثمان کی سپورٹ سے اس کا اعتماد دن بدن بڑھتا جارہا تھا۔ اب نہ وہ شور سے ڈرتا، نہ اونچی آوازوں سے سہمتا...... نہ اندھیرے سے خوف کھاتا، نہ رات کو سوتے میں ڈرتا۔ پہلے تو اس کا یہ حال تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر خوفزدہ ہوجاتا تھا۔ ذرا کسی نے آواز اونچی کی، سہم جاتا تھا۔ ذرا کسی نے گھورا جہاں کا تہاں رہ جاتا اور رونے لگتا۔ عدم تحفظ کا احساس رکھنے والے بچے اکثر اسی انداز سے سوتے ہیں۔ بصیرہ کا دل دکھتا۔ سمجھ میں نہ آتا کہ فراز کو اس کے احساسِ عدم تحفظ سے کیونکر نکالے۔ وہ اس کا اعتماد بڑھانے کو اسے بہادر لوگوں کی کہانیاں سناتی مگر وہ کسی صورت اپنے مختلف نوعیت کے خوف اور ڈر سے نہ نکلتا...... مگر عثمان کی تربیت فراز کے حق میں جادو دکھا رہی تھی۔ خدا بخشے امی کہا کرتی تھیں۔ ”بیٹیوں کو تو مائیں سنبھال لیتی ہیں...... بیٹے باپ کے قابو ہی آتے ہیں۔“ قابو کیا آتا...... فراز تو دن بدن عثمان کا مداح ہوا جارہا تھا۔ اس کی زبان پر ایک ہی کلمہ رہتا۔ ”میرے بابا...... میرے بابا!“ بلکہ لطف کی بات یہ تھی کہ بصیرہ اگر اسے کسی بات پر ٹوکتی یا ڈانٹتی تو وہ عثمان سے اس کی شکایت کرتا۔ عثمان نہایت توجہ سے اس کی بات سنتا اور بصیرہ کے مرتبے و وقار پر کوئی حرف نہ آنے دیے بغیر نہایت تحمل سے پوچھتا۔

”ہاں بھئی، آپ نے ہمارے بیٹے کو کیوں ڈانٹا۔“

”آپ اپنے لاڈلے بیٹے سے پوچھیے۔“

”ہاں جناب! آپ بتایئے۔“ عثمان کا روئے سخن فراز کی طرف ہوتا۔

”بابا! کپ میں نے تھوڑی توڑا تھا۔ خود سے ٹوٹ گیا۔“

”خود سے کیسے؟“ بصیرہ، فراز کو دیکھتی۔

"ایسے۔" وہ اپنے ہاتھوں کی حرکات سے بتاتا۔
"چلو کوئی بات نہیں...... اور آجائے گا کپ۔ ماما سے سوری کرلو۔"
"سوری ماما!"
بصیرہ دل ہی دل میں خدا کی شکر گزار ہوتی کہ عثمان کے روپ میں فراز کو ایک اچھا سرپرست ہی نہیں، دوست اور راہبر بھی مل گیا تھا۔ دوسری شادی کے خیال سے وہ کتنا ڈرتی تھی کہ خدا جانے دوسرا آدمی اس کے بچے کو قبول بھی کرے گا یا نہیں...... اور اگر قبول کر بھی لے گا تو نہ جانے اس کے ساتھ کس طرح کا رویّہ رکھے۔ فراز کے ساتھ عثمان کے رویّے نے اس کے تمام خدشات دور کردیے تھے۔ رب کی بہت مہربانی تھی۔

☆☆☆

بہت دنوں بعد اس نے بے جی کو فون کیا اور علیک سلیک کے بعد معذرت کی۔ "سوری بے جی! بہت مصروف رہی۔ آپ کو فون کرنے کا خیال آیا تھا مگر کوئی نہ کوئی کام نکل آتا۔"
"کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں اور فراز کو یاد تو برابر کرتی رہی مگر میں نے فون کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ کہیں تمہارے شوہر کو اعتراض نہ ہو۔"
"نہیں بے جی! انہیں بھلا کیوں اعتراض ہوگا۔ بس میں ہی کچھ مصروف زیادہ تھی۔"
"نئی زندگی کے نئے تقاضے بیٹا!"
"نوکری، گھر کے کام کاج، فراز کے کام...... چھوٹے بچوں کو بھی اسکول والے اتنا ہوم ورک دیتے ہیں کہ مکمل کراتے شام ہوجاتی ہے۔"
"ٹھیک کہتی ہو...... فراز سے بات کراؤ گی؟"
"کیوں نہیں بے جی! آپ ہولڈ کیجیے، میں اسے بلاتی ہوں۔" بصیرہ نے فراز کو پکارا۔
"جی ماما!" فراز لپکا ہوا آیا۔
"دادو سے بات کرو۔" بصیرہ نے فون اس کی طرف بڑھایا۔
"مجھے نہیں کرنی۔ میں بابا کے ساتھ بال کھیل رہا ہوں۔"
"بری بات...... کھیل لینا...... پہلے دادو سے بات کرو۔" بصیرہ نے زبردستی فون اس کے کان سے لگا دیا۔
عثمان بھی آگیا۔ اس کے ہاتھ میں فراز کی گیند تھی جو چند دن پہلے اسی نے فراز کو اتوار بازار سے دلوائی تھی۔
فراز بے جی سے بات کررہا تھا۔ عثمان اسے بغور دیکھنے اور سننے لگا۔ اسپیکر آن تھا۔
"کیسا ہے میرا بچہ؟" بے جی بہت پیار سے پوچھ رہی تھیں۔
"ٹھیک۔"
"کیا کررہے تھے؟"
"بابا کے ساتھ بال کھیل رہا تھا۔"
"بابا سے خوب دوستی ہے میرے بیٹے کی؟"
"جی۔"
"میرے پاس لاہور کب آؤ گے؟"
"پتا نہیں۔"
"پتا کیوں نہیں؟"
"بس۔"
"کوئی چیز چاہیے تمہیں؟"
فراز سوچ میں پڑ گیا۔ بصیرہ نے اسے انگلی سے انکار کا اشارہ دیا۔
"نہیں۔" فراز نے کہا۔
"چاچو، چاچی...... سب لوگ تمہیں یاد کرتے ہیں۔"
فراز چپ رہا۔ بصیرہ کا منہ دیکھنے لگا۔
"لاؤ، اب مجھے دو۔ اب میں بات کرتی ہوں۔" بصیرہ نے فراز سے فون لے لیا۔
"جی بے جی!"
عثمان نے ایک نظر اسے دیکھا۔ فراز نے عثمان کا ہاتھ پکڑا اور دونوں چلے گئے۔
"فراز گیا؟"
"جی بے جی! عثمان اور وہ دونوں گئے۔"
"اچھا! عثمان بھی تھے...... تم نے میری بات کرادی ہوتی ان سے۔ خیر، اب تو گئے۔ میری طرف سے دعا کہنا۔"
"جی ضرور۔"
"گل کی شادی کی تاریخ طے کردی ہے۔ تم تینوں کو آنا ہے۔ بلکہ آکر تیاری کرنی ہے۔"
"مبارک ہو بے جی!"
رات کو جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو اس نے عثمان سے کہا۔ "فراز کی دادی آپ کو دعا کہہ رہی تھیں۔"
عثمان کچھ نہیں بولا۔
"فراز کے چھوٹے چچا کی شادی کی دعوت دی ہے انہوں نے۔"
وہ چپ رہا۔
"چلیں گے؟"
"میں نہیں سمجھتا کہ میرا وہاں جانا بنتا ہے۔" عثمان نے کہا۔
بصیرہ کچھ نہ کہہ پائی مگر اسے اندازہ ہوگیا کہ عثمان کو یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔ اس کی غیر معمولی حساس فطرت نے

عثمان کی بات کا اتنا اثر لیا کہ نیند دیر تک اس کی آنکھوں سے دور رہی۔

☆☆☆

بے جی جلدی جلدی فون کرنے لگیں۔ گلفراز کی شادی قریب تھی۔ بصیرہ نوٹ کرتی جب ان کا فون آتا، عثمان کی باڈی لینگویج سے ظاہر ہوتا کہ اسے بے جی سے بصیرہ اور فراز کا فون پر بات کرنا اچھا نہ لگتا تھا۔ وہ زبان سے کچھ نہ کہتا مگر اس کے چہرے کا ٹھہراؤ اضطراب میں بدل جاتا۔ اس کی حرکات و سکنات میں ہلکی سی جھنجلاہٹ دکھائی دیتی۔

گلفراز کی شادی کے دن نزدیک آئے تو بے جی کا ان تینوں کو بلانے کے لیے اصرار روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ بصیرہ حیلے بہانوں سے کام چلاتی رہی لیکن جب شادی سر پر ہی آ پہنچی تو بے جی کے اصرار پر اس نے دبی زبان سے عثمان سے کہا۔ ''فراز کی دادی بہت بلا رہی ہیں...... آپ چلیں نا۔''

''میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا میرا وہاں جانا نہیں بنتا۔ میرا تعلق کیا ہے ان سے؟''

''فراز کا تو ہے۔'' وہ محتاط لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے...... تم جانو...... فراز جانے...... وہ جانیں۔''

''دیکھیے...... میں، فراز اور آپ ایک ہی فیملی ہیں۔ آپ کی مرضی کے بغیر نہ میں کہیں جا سکتی ہوں نہ......'' وہ کہتے کہتے رکی۔ ''بات یہ ہے کہ فراز ان کے مرحوم بیٹے کی اولاد ہے۔ اس سے ان کا ایک جذباتی تعلق ہے۔ اس تعلق میں رکاوٹ بن کر میں اللہ اور اس کے بندوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتی۔''

''میں نے کب کہا کہ تم اللہ اور اس کے بندوں کو ناراض کرو۔ تمہارا مجھ سے تعلق ہے...... میری بیوی ہو تم...... تمہارا پچھلا تعلق اب ختم ہو جانا چاہیے...... اور مجھے بھی ان لوگوں سے تعلق جوڑنے کو مت کہو جن سے میرا کوئی تعلق ہی نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' بصیرہ رنجور ہوئی۔ ''مگر فراز سے میں ان کا تعلق نہیں توڑ سکتی...... اس سے تو ان کا تعلق بہر حال رہے گا۔''

وہ خاموش رہا۔

عثمان سے شادی کے بعد بصیرہ کے لیے یہ پہلا موقع تھا جب عثمان نے اس سے قدرے خفگی سے بات کی تھی۔ اسے عثمان جیسے دین دار، بردبار اور حلیم الطبع آدمی سے ایسے رویے کی توقع نہ تھی۔ فراز اور خود بصیرہ کے ساتھ اس کا اب تک کا سلوک ایسا رہا تھا کہ بصیرہ اللہ کی شکر گزار ہوتی کہ جس نے اسے ایک قدردان شریک زندگی اور فراز کو ایک اچھا سرپرست میسر کر دیا تھا...... مگر یہ بھی تو لوح محفوظ میں درج ایک حقیقت تھی کہ فراز مرحوم و مغفور ایاز کا بیٹا تھا اور ایاز کے گھر والوں سے اس کا رشتہ اٹوٹ تھا۔ بصیرہ کا اپنا رشتہ تو اس گھر سے ٹوٹ چکا تھا مگر فراز کا ان سے رشتہ تو تاحیات قائم رہنا تھا۔

جوں جوں دن گزرتے گئے، بے جی کا انہیں شادی میں بلانے کے لیے اصرار بڑھتا چلا گیا۔ بصیرہ کو عدم شرکت کے لیے بہانے سوچنا مشکل ہو گئے۔ خانگی اور ملازمتی ذمے داریوں کا بہانہ کس حد تک کام دکھا سکتا تھا۔ بالآخر اسے بے جی سے سچ بولنا پڑا۔ ''بے جی! عثمان کے بغیر میرا آنا مشکل ہے...... میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے۔''

''میں سمجھ سکتی ہوں تمہاری مجبوری...... کوئی بات نہیں...... ہاں تم اگر فراز کو بھیج سکتی ہو تو بھیج دو۔ گل اسے لینے کے لیے آ جائے گا...... اور شان واپس بھی چھوڑ جائے گا۔'' بے جی نے بصیرہ سے کہا۔

بصیرہ کا دل بند ہونے لگا۔ فراز کو آج تک اس نے ایک رات کے لیے خود سے دور نہ کیا تھا، دو چار دن کے لیے بھی اس کا دور جانا تو بڑی بات تھی۔

''بے جی! وہ خود بھی تنگ ہو گا، آپ لوگوں کو بھی پریشان کرے گا۔''

''تم فکر نہ کرو۔ یہاں ماشاءاللہ سب ہیں اس کا خیال رکھنے کو۔ اس کے پریشان ہونے کا سوال ہی نہیں۔ شاہنواز کے بچے ہیں، ان کے ساتھ بہلا رہے گا۔ یہ کہو تم نہیں رہ سکتیں اس کے بغیر۔'' بے جی بولیں۔

''ایسا ہی ہے بے جی!'' اس نے اقرار کیا۔

''بیٹا! تمہارے پاس تو اس نے سدا رہنا ہے۔ میں تو بس دو چار دن کو اپنے پاس بلانا چاہتی ہوں۔ میرے ایاز کی نشانی ہے وہ۔ گل کی شادی میں شریک ہو گا تو مجھے لگے گا ایاز شریک ہو گیا۔''

''میں ذرا فراز کو آمادہ کر لوں۔''

''ٹھیک ہے...... اس سے کہنا وہاں اس کے چاچو ہیں، چاچی ہیں، ان کے بچے ہیں...... بوڑھی دادو ہے جو اس سے بہت پیار کرتی ہے...... تم بالکل فکر نہ کرنا...... میں اس کا پورا خیال رکھوں گی۔''

''مجھے معلوم ہے بے جی!''

☆☆☆

''فراز کو اس کی دادی شادی میں شرکت کے لیے لاہور بلا رہی ہیں۔ اس کا چاچو اسے لینے کے لیے آئے گا۔ بڑا چاچو واپس بھی چھوڑ کر جائے گا۔'' بصیرہ نے عثمان کو بتایا۔

عثمان اسے دیکھنے لگا۔

"بھیج دوں؟"

"مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟" عثمان کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔

"اس لیے کہ آپ اس گھر کے سربراہ ہیں۔"

"کیوں اسے دو کشتیوں کا سوار بنانا چاہتی ہو۔"

"کیا مطلب؟" اب وہ عثمان کا منہ دیکھنے لگی۔

"اسے اپنا رہنے دو یا انمی کا بنا دو۔"

"میں سمجھی نہیں۔" بصیرہ چونکی۔

"بچہ ہے...... کنفیوز ہو جائے گا کہ میرا باپ اگر زندگی سے نکل چکا ہے تو یہ دوسرا آدمی جو میری زندگی میں آ گیا ہے، کون ہے۔"

"اسے ایک نہ ایک دن تو یہ بات سمجھنی ہی ہے۔"

"میری حیثیت؟"

"آپ سب کچھ ہیں فراز کے لیے...... میرے لیے...... اس گھر کے لیے۔" بصیرہ نے کہا۔

"وہاں جائے گا...... ان کی باتیں سنے گا...... تو میرا کیا امیج بنے گا اس کے ننھے سے ذہن میں۔"

"آپ کا امیج جو ہے وہی رہے گا۔ میں اسے متاثر نہیں ہونے دوں گی۔ آپ اس سے اتنا پیار کرتے ہیں کہ میں دن میں نہ جانے کتنی مرتبہ اپنے رب کا شکر ادا کرتی ہوں۔"

"تمہیں دکھانے کے لیے نہیں...... میں واقعی اس سے پیار کرتا ہوں۔"

"میں جانتی ہوں۔"

"جانتی ہو تو اس کے اور میرے درمیان دیوار کھڑی کرنے کی حماقت مت کرو...... خوش ہے...... اسے خوش ہی رہنے دو۔"

"عثمان! میں فراز سے اس کے باپ کی نسبت تو نہیں چھین سکتی...... نہ اسے اس کے ددھیالی رشتوں سے محروم کر سکتی ہوں۔ ہاں، آپ سے میرا وعدہ ہے کہ آپ سے فراز کا تعلق کسی اور رشتے کے مقابلے میں مقدم رہے گا...... وہ آپ کا مطیع اور فرمانبردار بن کر رہے گا۔ موقع ایسا ہے کہ میں اسے بھیجنے سے انکار بھی نہیں کر سکتی۔"

عثمان خاموش رہا۔

"آپ کو گوارا نہیں تو میں خود تو وہاں جانے کا تصور بھی نہیں کر رہی مگر فراز کو وہاں جانے کی اجازت دیں...... بُرا نہ منائیں...... وہ دکھی ہیں...... پلیز! پلیز عثمان!" بصیرہ گڑگڑا دی۔

عثمان نے ایک گہری سانس کھینچی پھر بولا۔ "ٹھیک ہے...... مگر زیادہ دن وہاں نہ رہے۔"

"میں خود بھی نہیں رہ سکتی زیادہ دن تک اس کے بغیر۔" بصیرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

☆☆☆

گلفراز آ رہا تھا فراز کو اپنے ساتھ لاہور لے جانے کے لیے۔ بصیرہ اداس ہو رہی تھی کہ فراز کے بغیر چند دن بھی کیونکر رہے گی۔ دنیا میں آنے کے بعد سے اب تک وہ ایک دن بھی اس سے جدا نہ رہا تھا۔ وہ اس کے لیے متفکر تھی...... خدشات تھے۔

"دادو کے گھر جا رہے ہو...... تمیز سے رہنا...... دادو کے ساتھ ہی رہنا...... رات کو ان کے پاس ہی سونا...... ادھر اُدھر مت جانا...... کوئی شرارت، کوئی بدتمیزی نہیں...... ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" فراز نے اثبات میں سر ہلایا۔

گلفراز آیا تو عثمان سے بھی ملاقات ہوئی۔

"بھائی جان! آپ آتے نا شادی میں۔" گلفراز نے بے حد گرمجوشی سے عثمان کو دعوت دی۔

"فراز جا رہا ہے...... کافی ہے۔" عثمان نے رکھائی سے کہا۔

بصیرہ شرمندہ ہو گئی۔

فراز خوشی خوشی گاڑی میں بیٹھا لیکن اچانک ہی اس کا موڈ بدل گیا۔ "ماما! آپ بھی چلیں...... بابا آپ بھی گاڑی میں بیٹھیں نا۔"

"بیٹا! بابا کو آفس جانا ہے اور ماما کو گھر کے بہت سے کام کرنے ہیں۔ چاچو صرف تمہیں لے جائیں گے اپنے ساتھ۔" بصیرہ نے اسے پیار سے سمجھایا۔

"مجھے نہیں جانا چاچو کے ساتھ۔" فراز منہ بسورنے لگا۔

"یار! چاچو تمہیں بہت مزہ کرائیں گے۔ ہم گھومیں گے، پھریں گے...... پارک میں جائیں گے...... فن لینڈ جائیں گے...... ریسنگ کار میں بیٹھیں گے...... دو جائیں گے...... چاچو کی شادی بھی ہے بیٹا...... دادو جان نے تمہارے لیے اچھے اچھے کپڑے سلوائے ہیں...... بہت مزہ آئے گا بیٹا!" گلفراز کی دی ہوئی لالچ کام دکھا گئی۔

گلفراز کی گاڑی حرکت میں کیا آئی، بصیرہ کا دل جیسے بیٹھ ہی تو گیا۔ پلٹی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ عثمان نے اسے دیکھا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"اب سمجھ میں آئی میری بات؟"

وہ عثمان کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے

گی...... اور جب اسے احساس ہوا کہ اگر عثمان نہ ہوتا تو وہ اس وقت کس کے سہارے تسلی پاتی۔

فراز پہلی بار ماں سے دور گیا تھا۔ راستے میں ہی اس نے گھر واپس جانے کی رٹ لگادی۔ گلفراز نے اسے جوں توں بہلا کر لاہور تک سفر تمام کیا۔ بصیرہ جو راستے بھر گاہے گاہے گلفراز اور فراز سے رابطے میں رہی تھی، جانتی تھی فراز اس کے بغیر نہ رہ پائے گا لیکن گلفراز سے جو اپنی شادی سے صرف تین دن قبل فراز کو لینے آیا تھا، کیسے کہہ سکتی تھی کہ اسے واپس چھوڑ جائے۔ دل پر پتھر رکھ کر فراز کے بہل جانے کی امید باندھی مگر امید بر نہ آسکی۔

لاہور پہنچنے کے بعد فراز نے وہ رونا دھونا مچایا کہ اگلے ہی دن بے جی نے فون پر بتایا۔ ”بصیرہ بیٹی! فراز کسی صورت نہیں بہل رہا ہے۔ بس ایک ہی رٹ ہے اس کی...... ماما کے گھر جانا ہے...... بابا کے پاس جانا ہے۔ رو رو کر ہلکان ہوا جا رہا ہے۔ میں اسے شان کے ہاتھ واپس بھیج رہی ہوں۔“

”بے جی! شادی کا گھر ہے۔ شان کو تو بیسیوں کام ہوں گے۔“

”ہاں...... ہیں تو مگر میں کسی اور کے ساتھ اسے بھیج بھی تو نہیں سکتی۔ میرے ایاز کی امانت ہے یہ۔“

”میں اتنی شرمندگی محسوس کر رہی ہوں بے جی!“

”کوئی بات نہیں...... بچہ ہے...... اس نے تمہارے سوا اور دیکھا ہی کسے ہے۔“

”عثمان بھی بہت پیار کرتے ہیں اس سے۔“

”اندازہ ہو گیا ہے مجھے۔ تمہارے ساتھ وہ اسے بھی یاد کر رہا ہے بار بار...... لیکن......“ بے جی نے اپنی بات نامکمل چھوڑ دی۔

”لیکن......؟“ بصیرہ نے بے جی سے ان کی بات کی تکمیل چاہی۔

”عثمان سے کہنا ہم دکھی لوگ ہیں...... ہمیں پرایا نہ گردانے۔“

”سوری بے جی!“

”تم سوری کیوں کرتی ہو؟“

”غلطی میری ہی ہے...... زندگی ویسے بھی تو گزر سکتی تھی جیسے میں گزار رہی تھی۔“

”نہیں...... تمہاری کوئی غلطی نہیں...... تم نے بہت اچھا کیا۔“

”بہت مجبور ہو گئی ہوں بے جی! آپ نے بلایا اور میں آنہ سکی...... رنج ہے مجھے۔“ اس کی آواز رندھ گئی۔

”بیٹا! میں عورت ہوں۔ تمہارا دکھ، تمہاری مجبوری سمجھ سکتی ہوں۔“

فراز کو بے جی نے ان کپڑوں اور جوتوں کے علاوہ جو انہوں نے اس کے لیے گلفراز کی شادی میں پہننے کو خریدے تھے، دیسی گھی، دیسی انڈوں، مکھنڈی حلوا اور اس البم کے ساتھ واپس بھیجا جس میں بصیرہ اور ایاز کی شادی اور ولیمے کی تصاویر چسپاں تھیں۔ بے جی اسے فون پر بتا چکی تھیں کہ یہ یادگار البم وہ ایک امانت سمجھتے ہوئے فراز کے ساتھ اس لیے بھجوا رہی تھیں کہ جب فراز بڑا ہو تو اسے یہ تو معلوم ہو کہ اس کا باپ کون اور کتنا وجیہہ تھا اور اس کے ماں باپ کی جوڑی کتنی حسین تھی۔

”ماما! دادو بولتی تھیں اس میں میرے بابا کی فوٹو ہیں۔“ فراز نے جو گھر واپس آنے پر بہت خوش تھا، البم کے بارے میں کہا۔ عثمان چہرے پر تناؤ کا تاثر لیے اس کی بات سن رہا تھا۔

بصیرہ بھانپ گئی کہ وہ البم بھجوائے جانے پر ناخوش ہوا تھا۔

”سوری عثمان!“ اس نے دھیرے سے کہا۔

عثمان اسے دیکھنے لگا۔

”میں نے تو نہیں کہا تھا...... فراز کی دادی نے آپ ہی بھجوا دی۔“ وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

”پتا نہیں لوگ مرنے والوں کے ساتھ کیوں جینا چاہتے ہیں۔“ وہ بڑبڑایا۔

بصیرہ اس کی بات سے ہرٹ ہوئی مگر مسئلہ یہ تھا کہ عثمان کا رویہ اس کے اور فراز کے ساتھ اتنا اچھا تھا کہ وہ اس کی بات پر منفی ردعمل کا اظہار کرنے سے قاصر تھی۔

”آؤ بیٹا! باہر چلتے ہیں۔“ عثمان نے فراز سے کہا اور وہ خوشی خوشی اس کا ہاتھ تھام کر ان کے ساتھ چل دیا۔ ان کے جانے کے بعد اس نے گھر کے داخلی دروازے کی کنڈی چڑھائی اور البم کو یوں کھولا جیسے کسی نایاب دفینے تک رسائی لے رہی ہو۔ کتنی یادیں جڑی تھیں ان تصویروں سے...... اس کے ذہن کے پردے پر فلم سی چل پڑی۔

رشتے دار ہونے کے ناتے لاہور میں شادی کی ایک خاندانی تقریب میں اس نے پہلی بار ایاز کو بغور دیکھنے پر سوچا تھا...... ایسا وجیہہ نوجوان بھی تھا اس کے رشتے داروں میں۔ بڑی پھپھو کو اس نے ایک دفعہ امی سے کہتے سنا تھا...... ”ایاز کی ماں تو اس کے لیے کوئی پری ڈھونڈے گی......“ تب اسے کیا معلوم تھا کہ وہ پری وہ خود ہوگی۔ مایوں کے پیلے جوڑے میں اس پر ٹوٹ کر روپ آیا تھا۔ پھر مہندی والے دن دھانی رنگ کے شرارے، آتشیں کرتی اور آتشیں بارڈر والے دھانی دوپٹے میں اس کا حسن دو آتشہ ہو گیا تھا۔ ایاز اسٹیج پر اس کے برابر میں آکر بیٹھا تو اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

برات والے دن تو لوگ کہہ رہے تھے چاند سورج کی جوڑی ہے...... اور ولیمے والے دن تو ایاز اتنا مسرور تھا جیسے اسے دو جہاں کے خزانے مل گئے ہوں۔ وہ شرمائی لجائی بیٹھی رہی تھی۔

''یار! تمہارے شرمانے پر مرمٹا ہوں میں۔'' بعد میں ایاز نے اس سے کہا تھا۔ پھر اچانک ہی بولا تھا۔ ''کیا ساری زندگی ایسے ہی شرمائی رہو گی؟''

اس نے جھینپ کر کہا تھا۔ ''میری عادت ہے...... بے باکی مجھے اچھی نہیں لگتی۔'' شادی کے بعد کتنا کم وقت گزرا تھا اس کا ایاز کے ساتھ مگر اس کم وقت میں بھی ایاز نے مستقبل کے ڈھیروں خواب اس کی آنکھوں میں بسا دیے تھے۔ وہ پردیس سے جلد واپس آکر گھر والوں کے ساتھ ہی رہنا چاہتا تھا مگر کسے خبر تھی کہ خواب جن میں اس نے بصیرہ کو بھی اپنا شریک کر رکھا تھا، تشنۂ تعبیر رہ جائیں گے۔

عثمان اور فراز کی واپسی تک وہ البم میں چھپاں ایک ایک تصویر کو کئی کئی مرتبہ دیکھتی رہی۔ عثمان کہہ گیا تھا پتا نہیں کیوں لوگ مرنے والوں کے ساتھ جینا چاہتے ہیں...... بے ایمانی بھی تو بے ایمانی سہی...... سچ تو یہ تھا کہ وہ عثمان کی رفاقت میں ہوتے ہوئے بھی مرنے والے کی یادوں کو نہ بھلا پائی تھی۔

عثمان اور فراز باہر سے واپس آئے تو عثمان نے حسب معمول فراز کی پسندیدہ کھانے پینے کی چیزیں اسے دلوا رکھی تھیں۔ فراز خوش تھا۔ البم میز پر رکھی تھی۔ انگور کے خوشے سے چن چن کر انگور توڑتے ہوئے فراز کی نظر البم پر پڑی اور وہ البم کھول کر تصویریں دیکھتے ہوئے کسی تصویر کے بارے میں بے جی کی جانب سے فراہم کردہ معلومات، کسی پر تبصرہ اور کسی کے بارے میں سوال پہ سوال کرنے لگا۔ عثمان موجود تھا۔

''ماما! یہ میرے بابا ہیں۔'' فراز نے ایاز کی تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا تو بصیرہ کی نظر بے اختیار عثمان کی طرف اٹھ گئی۔ وہ اضطراب سے دوچار نظر آتا تھا۔

''لاؤ، مجھے دو۔ تم انگور کھاؤ۔ دیکھو تو کتنے مزیدار ہیں۔'' بصیرہ نے انگور کے خوشے سے ایک انگور توڑ کر منہ میں ڈالتے ہوئے فراز سے البم لینے کی کوشش کی۔

''نہیں...... میں دیکھوں گا۔'' فراز اڑ گیا۔

''بعد میں دیکھ لینا۔'' اس نے کن انکھیوں سے عثمان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... ابھی۔''

''یہ...... آپ دلہن ہیں۔''

''فراز بیٹے! میں نے آپ سے کہا ہے...... چپ چاپ دیکھو۔''

''ماما! دادو بولتی تھیں میرے بابا اللہ میاں کے گھر چلے گئے۔ ماما! اللہ میاں کا گھر آسمان میں کدھر ہوتا ہے؟''

عثمان کا اضطراب بڑھ گیا تھا۔

''میں نے کہا نا چپ چاپ دیکھو۔'' بصیرہ کی نظریں عثمان کی نظروں سے ملیں۔

''اب چپ کیوں کرتی ہو اسے...... وہ تو بچہ ہے...... پوچھے گا۔'' عثمان کے لہجے میں تلخی تھی۔

''سوری عثمان!''

''اور بھیجو اسے وہاں...... کنفیوز ہونے کو۔'' عثمان اب باقاعدہ غصے میں تھا۔

بصیرہ نے خاموش رہنے میں عافیت سمجھی۔ مرد کا کیا اعتبار۔ مری میں اس کی ایک عمر رسیدہ ساتھی کہا کرتی تھیں...... ''شوہر کتنا ہی شریف ہو، اسے بے ضرر نہیں سمجھنا چاہیے۔ کبھی بھی، کسی بھی بات پر عورت کی مٹی پلید کر سکتا ہے...... جب دیکھو کہ اس کی تیوری پر بل ہے، اس سے دور ہٹ جاؤ...... بحث مت کرو...... بعد میں سہولت سے بات کرلو۔''

رات کو سونے سے قبل اس نے دبی زبان سے عثمان سے کہا۔ ''آپ شام کو غصہ ہو رہے تھے...... فراز کو ایک دن تو یہ حقیقت معلوم ہونی ہی ہے کہ اس کا باپ مر چکا ہے۔''

''زندہ ہے۔'' وہ بھڑک کر بولا۔ ''اگر اس کا باپ مر چکا ہے تو پھر میں کون ہوں اس کا؟''

''آپ اس کے لیے سب کچھ ہیں عثمان!'' وہ دھیرے سے بولی۔

''اگر میں سب کچھ ہوں تو...... اب جو نہیں ہے اسے مت الجھاؤ اس میں۔ اسے میرا رہنے دو یا اس کا بنادو جو نہیں ہے۔''

بصیرہ پریشان ہوگئی۔ کس الجھن نے آلیا تھا اسے۔ ایک شخص جو اس کا شوہر تھا مگر اس کے بیٹے کا باپ نہیں، اس کے بیٹے کو اس کے حقیقی مرحوم باپ کے خیال اور تصور سے بھی قطع کردینے کا خواہاں تھا...... یہ کیسے ممکن تھا بھلا؟ فراز کی نسبت تو اس کے مرحوم باپ ہی سے تھی۔ اسکول میں اس کا نام فراز بن ایاز لکھا تھا۔ وہ اس نسبت کو کیسے مٹا سکتی تھی اس کی زندگی سے۔ کیسے فراز کو اس کے حقیقی باپ کے تصور سے دور رکھ سکتی تھی...... ہاں ایاز اب طبعی طور پر تو زندگی میں نہیں تھا مگر فراز سے اس کا رشتہ تو باقی تھا...... وہ اس رشتے کی نفی کیونکر کرسکتی تھی۔

''وہ آپ ہی کا بن کر رہے گا...... یہ میرا آپ سے وعدہ ہے...... مگر...... میں اسے ان رشتوں سے بھی جدا نہیں کرسکتی جو اٹل ہیں۔''

وہ کچھ نہیں بولا مگر اس کے چہرے پر تشنگی کیفیت برقرار رہی۔

☆☆☆

البم کو اکثر کھول کر بیٹھنا فراز کے لیے کھیل بن گیا۔ بصیرہ اسے اِدھر اُدھر چھپا بھی دیتی تو وہ تقاضا کرتا۔ ”میں دادو کو دیکھوں گا...... مجھے بابا کو دیکھنا ہے...... میرے چاچو کو دیکھنا ہے مجھے......“ بصیرہ کو اسے البم نکال کر دینا پڑتی۔

اس شام جب عثمان دفتر سے گھر واپس لوٹا تو فراز البم کھولے بیٹھا تھا۔ ”بابا! یہ دادو ہیں اور یہ میرے بابا...... دادو بولتی ہیں میرے بابا اللہ میاں کے گھر چلے گئے...... اللہ میاں کا گھر بہت دور ہے نا بابا؟“ فراز نہایت معصومیت سے بولا۔ عثمان نے بصیرہ کو دیکھا اور ہاتھ میں پکڑا تھیلا میز پر رکھ کر کمرے میں چلا گیا۔ بصیرہ سمجھ گئی وہ ناراضگی میں گیا تھا۔

”لاؤ مجھے دو...... ہر وقت اسی کو نہ کھول کر بیٹھے رہا کرو۔“ بصیرہ نے البم فراز کے سامنے سے اٹھالی۔

”میں دیکھوں گا...... دیکھوں گا...... دادو کو...... اپنے بابا کو۔“ فراز مچلنے لگا۔

”خبردار جو آئندہ تم نے اسے ہاتھ لگایا۔“

فراز رونے لگا۔

بصیرہ جو عثمان کی ناراضگی بھانپ کر پریشان ہوگئی تھی، اس نے فراز کے گال پر طمانچہ رسید کیا...... وہ اور زور زور سے رونے لگا۔ عثمان کمرے سے باہر آگیا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا۔

”ماما نے مارا۔“ فراز شکایتاً بولا۔

”کیوں؟“ عثمان نے فراز کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے بصیرہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ماما مجھے دادو، چاچو اور بابا کو نہیں دیکھنے دیتیں۔“ بصیرہ کے بجائے فراز نے اپنی پٹائی کی وجہ خود بیان کی۔

”روزانہ اس البم کو کھول کر بیٹھ جاتا ہے۔“ بصیرہ نے گویا اپنی صفائی پیش کی۔

”ہاں تو اس کا کیا قصور؟“ عثمان نے ہاتھ بڑھا کر البم بصیرہ سے لے لی۔ ”جو اسے بتایا گیا ہے، وہی دہرائے گا نا۔“

بصیرہ اس کا منہ دیکھنے لگی۔

”میں جوتا چینج کر کے آتا ہوں پھر اپنے بیٹے کو باہر لے کر چلتا ہوں۔“ عثمان نے فراز کو پیار کرتے ہوئے کہا اور البم لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بصیرہ نے سوچا وہ البم کو کمرے میں کہیں رکھ دے گا۔ وہ عثمان اور فراز کے جانے کے بعد البم کو اٹھا کر کسی ایسی جگہ چھپا دے گی جہاں فراز کی رسائی نہ ہو...... مگر ان دونوں کے جانے کے بعد وہ کچن میں ایسی مصروف ہوئی کہ البم کا دھیان ہی نہ رہا۔

عثمان اور فراز مغرب کی نماز کے بعد گھر واپس ہوئے۔ عثمان نے فراز کو ایک نیا کھلونا، جلیبی اور نمک پارے دلوائے تھے۔ مغرب کے بعد حسبِ معمول کھانا کھایا گیا پھر عشا کی نماز کا وقت ہوگیا۔ بصیرہ کو اگلے دن کے لیے اپنے، عثمان اور فراز کے کپڑوں پر استری کرنا تھی اور ڈھیروں چھوٹے موٹے کام جو صبح سے رات تک اسے چین کی سانس لینے کی فرصت ہی نہ دیتے تھے۔ فراز سو گیا...... عثمان بھی بستر پر تھا۔ وہ بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ رات کو نہ جانے کیا وقت تھا جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے عثمان کو بستر پر نہ پایا۔ کمرے کی کھڑکی کے شیشے پر شعلوں کا عکس لہراتے دیکھ کر وہ گھبرا کر اٹھی اور ننگے پاؤں ہی کمرے سے باہر نکل آئی۔ عثمان صحن میں تھا اور وہاں کھڑا اس چیز کو جلتے دیکھ رہا تھا جس سے اٹھتے شعلوں کا عکس کھڑکی کے شیشے پر لہراتے دیکھ کر وہ گھبرا کر باہر نکل آئی تھی۔

”کیا ہوا عثمان؟“ وہ اس کے نزدیک پہنچ کر بولی۔

”کچھ نہیں۔“

”یہ کیا جل رہا ہے؟“

وہ چپ رہا۔

جلتی شے کو غور سے دیکھنے پر بصیرہ کو اپنے بدن سے جان جاتی محسوس ہوئی۔ البم جل رہی تھی اور اس میں چھپاں تصویریں چٹخنے سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ لوگ جن کی تصویریں جل رہی تھیں، دہائیاں دے رہے تھے۔

”یہ کیا، کیا آپ نے؟“ وہ مری مری آواز میں بولی اور گھٹنے پکڑ کر یوں نیچے بیٹھ گئی جیسے کوئی چتا جلتے دیکھ کر پُرسہ دے رہی ہو۔

البم جل کر راکھ ہوگئی۔

عثمان نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اوپر کھینچا۔ وہ شدید صدمے کے باوجود اٹھنے پر مجبور ہوئی۔ عثمان نے اسے اپنے گلے لگالیا اور اس کی پیٹھ دھیرے دھیرے یوں سہلانے لگا جیسے اسے تسلی دے رہا ہو۔ وہ شدید صدمے میں تھی۔ اسے عثمان سے شادی کرنے پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔ کیسا تھا یہ شخص...... اتنا تنگ دل...... اتنا تنگ ذہن...... اس شخص کی تصویروں سے اتنا عناد جو اس دنیا میں نہیں تھا اب...... فراز کو اس کے حقیقی باپ سے آشنا رکھنے کو اب کیا رہ گیا تھا اس کے پاس...... بے جی کے پاس یقیناً ہوں گی اس کی تصاویر مگر اس کے اپنے پاس؟ وہ خود کو یکسر تہی دامن محسوس کر رہی تھی۔ عثمان

کے ساتھ روبوٹ کی طرح چلتی وہ کمرے میں آ گئی۔ بقیہ رات اس نے آنکھوں میں کاٹی۔ دل کسی زخم کی طرح دکھتا رہا۔ بے بسی اور مجبوری کا احساس اسے بچوکے دے رہا تھا۔ عثمان سے شادی کرنے سے پہلے وہ اپنے ہر فعل میں کتنی خود مختار تھی۔ بجا کہ دیگر مسائل تھے مگر ایسے قلبی صدمات تو نہ تھے جن سے اسے اب گزرنا پڑ رہا تھا۔ عثمان اس کے بچے کی زندگی سے اس کے حقیقی باپ کا تصور تک محال کر دینا چاہتا تھا۔

اگلے چند دنوں کے دوران فراز نے کئی مرتبہ تقاضا کیا۔ "ماما! مجھے میرے بابا کو دیکھنا ہے۔" بصیرہ کو اس کا دھیان اِدھر اُدھر بٹانا پڑا۔ بچہ تھا...... جلد ہی بھول بھال گیا مگر بصیرہ کو عثمان کی زیادتی بھلانا ممکن نہ ہوا۔ مسز غیاث سے اس کی دوستی برقرار تھی۔ کبھی وہ فون کر لیتیں، کبھی بصیرہ انہیں یاد کر لیتی۔ پنڈی میں ان کے رشتے دار رہتے تھے۔ گاہے گاہے ان سے ملنے کے لیے پنڈی آتی رہتی تھیں۔ دو تین بار بصیرہ سے ملنے کے لیے آ چکی تھیں۔ دل کا بوجھ بڑھا تو بصیرہ نے انہی کو فون کیا۔

"تمہارا اور فراز کا تو خیال رکھتا ہے نا وہ؟" مسز غیاث بولیں۔

"جی۔"

"تمہارے ساتھ گالم گلوچ نہیں کرتا...... ہاتھ نہیں اٹھاتا؟"

"کبھی نہیں۔"

"تمہارے بیٹے پر بھی تشدد نہیں کرتا؟"

"قطعاً نہیں۔"

"تو پھر کیا پریشانی ہے؟"

بصیرہ چند لمحوں کو دم بخود رہ گئی۔

"مسز غیاث تشدد صرف گالم گلوچ اور مارنا پیٹنا ہی تو نہیں ہوتا۔"

"بائی دی وے پھر کیا ہوتا ہے؟"

"دوسروں کی فیلنگز کو ہرٹ کرنا...... جذبات کو مجروح کرنا۔"

"چھوڑو بصیرہ...... چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پر مت لیا کرو۔ جو گزر گیا، اسے بھول جاؤ...... جو مل گیا، اسے انجوائے کرو۔"

"چھوٹی چھوٹی باتیں؟" بصیرہ گلوگیر ہوئی۔ "عثمان، فراز کو اس کی دادی کے ہاں بھیجنے پر ناراض ہوتے ہیں۔ اس کے باپ کا نام اس کی زندگی سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔ میں نے ایاز کے گھر والوں سے اپنا تعلق محدود کر لیا ہے۔ بے جی کو بھی فون شاذ ہی کرتی ہوں مگر فراز تو انہی کا پوتا ہے...... ان کے مرحوم بیٹے کی نشانی...... اس کا تعلق ان سے کیسے ختم کیا جا سکتا ہے؟"

"بعض معاملات کو وقت اور حالات کے دھارے پر چھوڑ دینا پڑتا ہے بصیرہ! وقت خود سنبھال لیتا ہے چیزوں کو۔"

کتنی آسانی سے کہہ دیا تھا مسز غیاث نے یہ سب کچھ۔ آدمی جب خود تجربے کی چکی سے گزرتا ہے تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ پسنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔

"گورا لوگ کہتا ہے...... کھاؤ پیو، موج کرو۔" مسز غیاث نے اس کی فون کال کا اختتام خوشگواری سے کرنا چاہا۔

"ہمارے لیے اس کا کلیہ مختلف ہے مسز غیاث!" اس کا لہجہ درد آگیں تھا۔

"وہ کیا بھلا؟"

"برداشت کرو...... ڈو آر ڈائی...... کر گزرو یا جان سے ہی گزر جاؤ۔"

"او کے...... پھر بات کریں گے۔"

وہ آخری کندھا بھی جس پر سر رکھ کر وہ اپنے دل کا بوجھ اتارنا چاہتی تھی، کس خوبصورتی سے خود کو چرا گیا تھا۔ اب اسے اکیلے ہی سہنا تھا۔

☆☆☆

عثمان نکما، بے پروا، اپنی ذمے داریوں کا احساس نہ رکھنے والا، دشنام طراز یا ہتھ چھٹ ہوتا...... اس کے ساتھ نرم گو اور فراز کا محب نہ ہوتا تو شاید وہ ایک سخت فیصلہ کر کے اس سے اپنا اور فراز کا راستہ جدا کرنے کی ہمت کر لیتی مگر مشکل جو اسے کسی سخت اور ناپسندیدہ فیصلے سے روکتی تھی، یہ تھی کہ عثمان اس سے ہمیشہ نہایت تمیز کا رویہ رکھتا، اس سے احترام سے بات کرتا، کبھی کسی بات پر چیخ پکار نہ کرتا...... فراز پر اس کی شفقت روز افزوں تھی۔ فراز سے بھی کبھی اس کی کسی غلطی پر بھی ٹوکا نہ کرتا۔ ٹوکنا ہوتا تو نہایت مشفقانہ اور دوستانہ انداز میں اصلاح کرتا۔ کہنے کو وہ بچہ تھا مگر اسے بھی بڑوں کا سا احترام دیتا...... اس کی ضرورتوں کا خیال رکھتا...... اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔ ایسے حالات میں وہ کیسے کوئی سخت فیصلہ کرنے کی ہمت کر سکتی تھی...... مگر پھر بھی تھی الجھن میں...... عثمان سے فراز کی محبت فراز اور اس کے حقیقی خونی رشتوں میں آڑ بن رہی تھی۔

بے جی نے فراز کو دو چار دن کے لیے پھر لاہور بلانے کو بصیرہ کو کئی مرتبہ فون کیا۔ کبھی اس نے فراز کی طبیعت خرابی کا بہانہ کیا تو کبھی اسکول میں ٹیسٹ یا امتحان کو جواز بنایا...... مگر کب تک وہ انہیں ٹال سکتی تھی۔ تعلیمی اداروں میں تعطیلات

ہوئیں تو فراز کو اپنے پاس بلوانے کے لیے بے جی کا اصرار بڑھ گیا۔ گھریلو معاملات خاصے خوشگوار اور پرسکون چل رہے تھے۔ عثمان ان دونوں کا خیال رکھتا...... ان کی ہر ضرورت پوری کرتا...... اکثر سیر و تفریح کے لیے باہر بھی لے جاتا۔ بصیرہ بھی عثمان کی خدمت گزاری میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتی۔ دفتر سے آنے کے بعد کچھ دیر سستانے کو وہ بستر پر لیٹتا تو اس کے آرام میں خلل نہ پڑنے دینے کی خاطر فراز کی بھاگ دوڑ اور زور سے بولنے پر پابندی لگ جاتی۔ بصیرہ، فراز کے دل میں عثمان کی محبت اور احترام کے بیج بو کر ان سے پھوٹنے والے شگوفوں کی نہایت تندہی سے آبیاری کر رہی تھی۔ جلتی البم کے شعلے اب بھی اس کے دل میں ہوک مچاتے لیکن وہ ان شعلوں کو اپنی ٹھنڈی سانسوں سے بجھانے کی کوشش کرتی۔

فراز کو چند دن کے لیے اپنے پاس بلانے کو بے جی کا اصرار گلہ بننے لگا تو وہ عثمان سے بات کرنے پر مجبور ہوئی۔ ”فراز کی دادی اسے چند دن کے لیے لاہور بلانا چاہ رہی ہیں۔“

”مجھے اختلاف دے رہی ہو یا......؟“ اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”آپ سے پوچھ رہی ہوں۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو؟“

”آپ کی اجازت ہو تو ان سے کہوں کوئی آ کر لے جائے اسے۔“

”مجھ سے ایسے سوال مت کیا کرو جو مجھے زچ کریں۔“

”میں اپنے گھر کا سکون برباد نہیں کرنا چاہتی عثمان...... لیکن کیا کروں...... وہ بار بار فون کر کے مجھے مجبور کر دیتی ہیں...... وہ بھی مجبور ہیں شاید۔“ بصیرہ کی آواز بھرا گئی اور وہ رونے لگی۔

عثمان پسیج گیا۔

”وہ جائے گا تو پھر ڈبل مائنڈڈ ہو کر آئے گا...... میں ہوں اس کا باپ یا کوئی اور...... یاد نہیں پچھلی مرتبہ بھی وہ جا کر کتنا پریشان ہوا تھا۔“

”محبت کی اپنی بندھائی ہوتی ہے عثمان! آپ اس سے اور وہ آپ سے محبت کرتا ہے۔ جہاں بھی جائے، آپ ہی کا رہے گا۔ میں زندگی میں کبھی آپ سے کچھ اور نہیں مانگوں گی...... فراز کی ان لوگوں سے کبھی کبھی ملنے دینے کی اجازت کے سوا۔ پلیز...... پلیز عثمان!“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر عثمان کے سامنے کر دیے۔

وہ کچھ دیر چپ مگر ہیجان میں رہا پھر اس نے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ”او کے۔“

”تھینک یو! تھینک یو عثمان!“ اس کی آواز بھرا گئی۔

☆☆☆

اس بار شاہنواز، فراز کو اپنے ساتھ لاہور لے جانے کے لیے آیا۔ گلفراز پاؤں میں کچھ تکلیف کے باعث گاڑی چلانے سے قاصر تھا۔ شاہنواز، عثمان کی موجودگی میں پہنچا۔ اس سے مل کر شاہنواز نے بصیرہ کو ایک نظر دیکھا مگر اس ایک نظر میں سوال تھے، گلہ تھا، شکوہ تھا...... جیسے کہتا ہو...... میں برا تھا کیا...... تمہارے انکار نے میرے بھائی کی نشانی کو ہمارے ساتھ نہیں رہنے دیا...... دور کر دیا...... عثمان سے بھی وہ کچھ زیادہ گرمجوشی سے نہیں ملا۔ بصیرہ نے اس کی نگاہوں میں لکھی ہر تحریر پڑھ لی مگر وہ اپنے فیصلے پر مطمئن تھی۔ شاہنواز کو وہ ایاز کی جگہ قبول ہی نہ کر سکتی تھی۔

فراز کو شاہنواز اپنے ساتھ لے گیا۔ اس بار فراز نے جاتے وقت نہ جانے یا بصیرہ اور عثمان کو بھی اپنے ساتھ لے جانے کی ضد نہیں کی۔ گھر میں سناٹا چھا گیا۔ بصیرہ اداس تھی...... عثمان چپ...... لگتا تھا کہ فراز کے جانے سے وہ خوش نہیں تھا۔ بصیرہ کے آنسوؤں اور التجا نے اسے مجبور کر دیا تھا۔

فراز واپس آیا تو گھر میں رونق آئی۔ اسے پہلے سے بھی زیادہ چیزیں دے کر بھیجا گیا تھا۔ واپسی پر شاہنواز کے بجائے گلفراز اسے چھوڑنے کے لیے آیا اور اس نے بتایا کہ اس بار فراز خوش رہا تھا۔

بے جی نے بصیرہ کو فون کیا۔ ”بیٹی! تمہارا شکریہ کہ تم نے بچے کو بھیجا۔ اس بار خوش رہا۔ شاہنواز کے بچوں کے ساتھ اس کا دل لگا رہا۔ ایک ضروری بات کرنا تھی تم سے۔“

”جی بے جی!“ وہ ہمہ تن گوش ہوئی۔

”ایاز کے بعد اس کی چیزوں میں مجھ بدنصیب ماں کے حصے میں جو کچھ آیا ہے، وہ میں فراز کو دینا چاہتی ہوں۔ تم اسے ساتھ لے کر آجاؤ تو یہ کام کروا لیں۔“

”آپ برا نہ مانیے گا بے جی...... میں نے تو اب تک ان چیزوں کی طرف بھی نہیں دیکھا جو میرے اور فراز کے حصے میں آگئیں۔ بینک اکاؤنٹ میں تیسرے چوتھے مہینے تھوڑے سے پیسے ضرور جمع کروا دیتی ہوں تاکہ اکاؤنٹ ڈورمینٹ نہ ہو مگر آج تک ایک پیسا نکلوایا نہیں۔ وراثت نامہ بنواتے وقت میں کتنی تکلیف سے گزری، میرا خدا ہی جانتا ہے۔ میرے لیے سب سے قیمتی ایاز خود تھے۔ ان کے بعد مجھے کسی شے کی تمنا نہیں رہی۔ فراز جب بڑا ہوگا اپنے ابو کی چیزیں خود سنبھالے گا۔ آپ اسے جو دینا چاہتی ہیں شاہنواز اور گلفراز کو

دیں، ان کا حق بنتا ہے۔"

"میں نے دونوں سے مشورہ کرلیا ہے...... وہ راضی ہیں...... خوش ہیں۔"

"پھر بھی بے جی...... آپ فراز کو جس اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔"

"میری اولاد کی اولاد ہے۔ سود اصل سے زیادہ پیارا ہوتا ہے۔ بڑا ہوگا تو اس کے باپ کی چیزیں اس کی تعلیم، شادی اور جہاں اس کو ضرورت ہو وہ خرچ کرے گا۔ اپنی کسی ضرورت کے لیے اسے کسی کا منہ نہیں دیکھنا پڑے گا۔"

"آپ فکر نہ کیجیے۔ عثمان بھی اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اس کی ہر خواہش پوری کرتے ہیں۔"

"اللہ تعالیٰ جزا دے۔ تم نے اچھا کیا دوبارہ اپنا گھر بسالیا۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری...... بے جی سن پائیں یا نہیں...... نامعلوم!

☆☆☆

بے جی سے ہونے والی بات اس نے عثمان کو بتانا ضروری سمجھی۔

"تم نے کہا ہوتا فراز کو آپ کی عنایتوں کی ضرورت نہیں۔ ہمارا بچہ ہے، ہم اس کا خود خیال رکھ سکتے ہیں۔ انہیں اس کی تعلیم، شادی اور دوسری ضرورتوں کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"میں نے منع کردیا عثمان...... طریقے سے معذرت کرلی۔"

"انہیں چاہیے ہمیں ہماری زندگی جینے دیں۔"

بصیرہ چپ رہی۔ اتنا مہذب اور متحمل آدمی بھی دنیا سے گزرے ایک شخص کے لواحقین کے بارے میں بات کرتے ہوئے کتنا درشت ہوجاتا تھا۔

بصیرہ نے اپنی اب تک کی زندگی میں اپنے قریبی رشتوں کے علاوہ اپنے ساتھ کام کرنے والے رفقاء سے بھی بہت کچھ سیکھا تھا۔ پنڈی میں اس کے سب سے پہلے اسکول میں ایک اکاؤنٹنٹ ہوا کرتا تھا، رفیق احمد...... اس کی بیوی تیسرے بچے کی ولادت میں پیچیدگی کے باعث مرچکی تھی۔ رفیق کے دو بچے پہلے ہی تھے، تیسرا نومولود جس کی پیدائش کے بعد ماں مرگئی تھی۔ رفیق اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے سلسلے میں بہت پریشان رہا کرتا تھا۔ بوڑھی دادی بچوں کو سنبھالتی مگر جوان ماں کی طرح تو ان کی دیکھ بھال نہ کرسکتی تھی۔ رفیق دوسری شادی کرنا چاہتا تھا مگر جہاں بات چلتی، لڑکی والے تین چھوٹے بچوں کا سن کر بدک جاتے اور انکار کردیتے۔ رفیق کو اس نے ایک روز ساتھی کلرک سے کہتے سنا۔ "یار! جہاں بات چلتی ہے، بچوں کا سن کر لوگ انکار کردیتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ مرنے والی عورت ان کی اپنی بہن بیٹی بھی تو ہوسکتی تھی۔"

'ٹھیک ہی تو کہتا تھا بے چارہ رفیق احمد!' بصیرہ اب اکثر سوچتی۔ 'زندہ رہنے والے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ مرنے والے کی جگہ وہ خود بھی تو ہوسکتے تھے۔'

مگر......!

ایاز کے ہوتے ہوئے وہ ایسا کب سوچ سکتی تھی۔ وہ تو اس کا ناز بردار تھا...... اس کی جنبش ابرو پر نظر رکھتا تھا...... جو وہ چاہتی، وہی کرتا...... اس کی خوشی میں خوش رہا کرتا تھا...... قدم قدم پر اسے اعتماد دیتا تھا۔ رفاقت مختصر تھی مگر کتنی قوی اور یادگار۔

اس کی ایک کولیگ مسز مختار جنہوں نے پہلے شوہر سے طلاق کے بعد دوسری شادی کی تھی، کہا کرتی تھیں۔ "دوسرا شوہر اپنی بیوی پر سو فیصد اعتبار بھی نہیں کرتا۔ پہلا شوہر زندہ ہو یا مردہ، کانٹے کی طرح اس کے دل میں کھٹکتا رہتا ہے۔ تمام زندگی بیوی کے دل میں اس کے پہلے شوہر کو کریدتا رہتا ہے۔"

لیکن بصیرہ کی ایک اور ساتھی انجم پرویز کی رائے مختلف تھی۔ انجم کی بھی دوسری شادی تھی۔ وہ بڑے ناز سے کہتیں۔ "میرے میاں کبھی بھولے سے بھی میرے سابقہ ہسبنڈ کا نام اپنی زبان پر نہیں لاتے۔"

سو دنیا اپنے باسیوں کے متضاد تجربات کا مجموعہ ہے۔

عثمان کا طرز عمل مسز مختار اور انجم پرویز کے بین بین تھا۔ اس نے کبھی ایاز کے بارے میں اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس کے اور فراز کے ساتھ اس کا حسن سلوک مثالی تھا۔ بہت کم مرد ہوتے ہوں گے ایسے جو بیوی کی پہلے شوہر سے اولاد کو اس طرح اپنائیں جیسے عثمان نے فراز کو اپنایا تھا۔ دینی احکامات سے آگاہ اور ان پر حتی الوسع کاربند نہ ہوتا تو شاید فراز کی ولدیت کے خانے سے ایاز کا نام ہٹا کر اپنا نام درج کرادیتا۔ فراز کو وہ لوگوں سے ہمیشہ اپنے بیٹے کے طور پر متعارف کراتا مگر اتنا نفیس آدمی ہونے کے باوجود ایاز کے گھر والوں سے بصیرہ کا رسمی ربط ضبط اور فراز سے ان کا تعلق عثمان کو ایک آنکھ نہ بھاتا۔ ہمیشہ خفگی ظاہر کرتا۔ بصیرہ کی سمجھ میں نہ آتا کہ اسے کیونکر سمجھائے کہ اپنے باپ کے رشتے داروں سے فراز کا رشتہ اٹوٹ تھا جسے دنیا کی کوئی طاقت جھٹلا نہیں سکتی تھی...... تو پھر دیواریں کھڑی کرنے سے فائدہ کیا تھا۔

بہرحال بصیرہ کو اب عثمان کے ساتھ نباہ کرنے کے

لیے دیوار کے اس طرف ہی رہنا تھا۔

☆☆☆

کل کی بات لگتی تھی جب فراز اس کی انگلی پکڑ کر اسکول جایا کرتا تھا۔ اب وہ بصیرہ کو اپنی موٹر بائیک پر بٹھا کر اس کے اسکول ڈراپ کرتا، اپنے کالج جایا کرتا تھا۔ گزرے برسوں میں زندگی کے نقش و نگار بہت تبدیل ہوئے تھے۔ بصیرہ نے میکے کی جائداد میں اپنے حصے کے عوض بھائی سے ملنے والی رقم، ایاز کے ترکے سے ملنے والا اپنا حصہ، اپنے کچھ زیورات فروخت کر کے حاصل ہونے والی رقم اور اپنے محکمے سے ہاؤس پرچیز لون سے حاصل شدہ مجموعی رقم سے ایک دو منزلہ مکان خرید لیا تھا۔ مکان کی بالائی منزل اس نے کرائے پر چڑھا دی تھی، زیریں منزل اپنے تصرف میں رکھی۔ بڑا مکان تھا۔ چھوٹا اس لیے نہ خریدا کہ اول تو یہ مکان مالک کی بیرون ملک منتقلی کے باعث نہایت مناسب قیمت پر مل رہا تھا۔ دوم، فراز کے روز افزوں تعلیمی اور دیگر مصارف کے پیش نظر آمدن میں اضافہ بھی ضروری تھا۔

مکان کی اوپری منزل کرائے پر اٹھانے سے معقول ماہانہ آمدن کا سلسلہ بن گیا تھا حالانکہ جب وہ مکان کی خریداری کے لیے ممکنہ ذرائع سے رقم اکٹھی کر رہی تھی تب عثمان نے اس سے کہا تھا۔ ”گھر کی فکر کیوں کرتی ہو۔ گھر بھی بن جائے گا۔“ مگر اسے اپنے گھر کی لگن تھی۔ عثمان تو اس کے زیورات کی فروخت اور محکمے سے لون لینے کے حق میں بھی نہیں تھا مگر بصیرہ نے کہا۔

”زیور یوں ہی رکھا ہے بلکہ اس کی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔“

”فراز کی شادی کے لیے اٹھا رکھو۔“

”ایک سیٹ اور چوڑیاں رکھ لوں گی اس کی دلہن کے لیے۔ گھر بھی تو فراز اور اس کے بچوں کے لیے ہی ہوگا۔“

ہاؤس پرچیز لون کے لیے اس نے کافی پہلے سے درخواست دے رکھی تھی۔ اس کا نام آگیا تو عثمان نے کہا۔

”کیوں قرض کے چکر میں پڑتی ہو۔“

”آہستہ آہستہ اتر جائے گا۔ ایک سہولت ہے محکمے کی طرف سے جس کا وہ بھی فائدہ اٹھاتے ہیں جنہیں ضرورت نہیں ہوتی۔ میرا نام آگیا ہے تو کیوں نہ لوں۔“

خوش قسمتی سے ایک مکان بھی اچھا اور مناسب قیمت پر فروخت ہوتا علم میں آگیا۔ بصیرہ کے پاس کچھ رقم کم تھی، وہ اس نے ادھر اُدھر سے قرض ادھار لے کر پوری کر لی اور مکان کا سودا کر لیا۔ قبضہ لینے کے بعد مہینے بھر کے اندر اوپری منزل کرائے پر اٹھ گئی۔ پیشگی کرائے اور ماہانہ کرائے سے قرض لی گئی رقم کی واپسی کا بھی آسرا ہو گیا۔ اپنے گھر کی چھت تلے آ کر بصیرہ بہت خوش تھی۔ باپ کے ترکے سے فراز کو جو کچھ ملا تھا، اسے بصیرہ نے فراز کی بلوغت کے بعد بھی مصرف میں لانے سے گریز رکھا تھا۔

فراز اس اعتبار سے خوش نصیب تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد اتنے محبت کرنے والے لوگ اس کے ارد گرد تھے کہ اسے زندگی میں کسی محرومی کا احساس نہ تھا۔ بصیرہ اس کی ہر ضرورت، ہر خواہش پوری کرتی۔ دادی اور دونوں چچا گاہے گاہے اتنا کچھ دیتے رہتے جو سر پر باپ ہونے والے اکثر بچوں کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔ باپ کی شفقت کی کمی عثمان نے اس قدر احسن طریقے سے پوری کی تھی کہ بصیرہ رب کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی اور عثمان کی نہایت ممنون رہتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے اور فراز کے ساتھ عثمان کا نہ صرف حسن سلوک بڑھتا گیا تھا بلکہ ایاز کے گھر والوں کے ساتھ فراز کے تعلق پر بھی اس کی ناگواری دھیرے دھیرے کم ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ بصیرہ اکثر سوچتی فراز کے ددھیال والوں کے بارے میں عثمان کے سابقہ رویے پر کسی وقت مشتعل ہو کر اگر وہ عثمان سے علیحدگی کا سخت فیصلہ کر لیتی جیسا کہ ان دنوں بھی کبھی اس کا دل اسے اکسایا کرتا تھا تو آج زندگی کا روپ کتنا مختلف ہوتا۔ وہ صبر سے سہہ گئی تھی اور اس کے صبر و برداشت کا ثمر یہ تھا کہ وہ، عثمان اور فراز ایک تکون کے تین کونوں کے مانند آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ زندگی بکھرنے نہیں پائی تھی، مربوط اور منضبط تھی۔

بے جی کو اللہ نے لمبی عمر دی تھی۔ جسمانی تکالیف تھیں مگر حیات تھیں۔ شاہنواز اور گلفراز دونوں عیال دار تھے۔ عثمان سے شادی کے بعد بصیرہ کا کبھی لاہور جانا نہ ہوا تھا مگر کبھی بھولے بھٹکے ان لوگوں سے بصیرہ کا بھی رابطہ ہو ہی جاتا تھا۔

☆☆☆

وقت پھر تیزی سے اڑا تھا۔

فراز اپنی تعلیم کی تکمیل کے کچھ عرصے بعد بیرونِ ملک چلا گیا تھا۔ وطنِ عزیز میں نوجوانوں کے لیے روزگار کے مواقع محدود تھے۔ ملازمتوں سے سبکدوش ہونے والے افراد تعلیم یافتہ نئی نسل کے حق پر قابض ہو کر دوبارہ کرسیوں پر براجمان ہو جاتے اور نوجوانوں کو دیارِ غیر کوچ کرنے پر مجبور کر دیتے۔

عثمان قطعاً اس کے حق میں نہ تھا کہ فراز معاش کی خاطر گھر سے دور جائے۔ بصیرہ بھی نہیں چاہتی تھی مگر ننھی چڑیا کے بچے کو بھی پر لگ جائیں تو وہ اکیلا ہی اڑتا ہے۔ فراز نے بھی جانے کا تہیہ کر لیا۔

''تم چلے جاؤ گے تو ہمارے پاس کیا رہ جائے گا۔'' عثمان نے افسردگی سے کہا۔

''ماما!'' فراز نے مسکرا کر کہا۔

''اور میرے پاس؟'' بصیرہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

''بابا!''

فراز کا ایک بازو عثمان کے شانوں پر دراز تھا، دوسرا بصیرہ کے شانوں پر۔

فراز چلا گیا۔

گھر میں دو نفوس رہ گئے...... بصیرہ اور عثمان...... ان دونوں میں قربت اور بڑھ گئی۔ بصیرہ کو فراز کی یاد ستاتی تو عثمان اسے دلاسہ دیتا۔ ''اداس کیوں ہوتی ہو۔ دعا کیا کرو اس کے لیے۔''

''وہ اکیلا ہے عثمان...... یہاں تو ہم دونوں تھے اس کا خیال رکھنے کو۔'' بصیرہ فکر مند ہوتی۔

''کوئی لڑکی دیکھو اس کے لیے۔ چھٹی پر گھر آئے تو اس کی شادی کر دینا...... اکیلا نہیں رہے گا۔ شوہر اور بیوی کے رشتے کی خوبصورتی یہی ہے۔''

''واقعی۔'' بصیرہ قائل ہو جاتی۔ عثمان نہ ہوتے تو فراز کے جانے کے بعد میں کتنی اکیلی ہوتی۔ کہاں جاتی میں اپنی تنہائی بتانے کو...... کیا بھائی کے گھر......؟ وہاں پہلے اماں نہ ملی تو اب کیا ملتی۔ شکر ہے خدا کا عثمان میرے ساتھ ہیں...... میرے پاس ہیں...... ہمارا اپنا گھر ہے۔ بچوں کو تو ایک دن پر لگ ہی جانا ہوتے ہیں...... تھینکس گاڈ!' وہ دل ہی دل میں سوچتی۔

بصیرہ نے فراز کے لیے لڑکی منتخب کر لی۔ بھائی کی سب سے چھوٹی بیٹی۔ اس نے فراز کو فون پر بتایا تو وہ بولا۔ ''ماما! آپ کو یاد نہیں مامی اور ان کے بچے ہمارے ساتھ کیا کرتے تھے۔ شہو جب میرا گریبان پکڑ کر کہتا یہ تمہارا گھر نہیں ہے...... تمہارا کوئی بھی گھر نہیں ہے...... تمہارے بابا بھی نہیں ہیں تو میں ڈر جاتا تھا۔ آپ اسی گھر کی لڑکی سے میری شادی کرنا چاہتی ہیں؟''

''بیٹا! لوگ جیسے ہوں ہم بھی ویسے ہی بن جائیں تو پھر ہم میں اور ان میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔''

''یعنی لوگ اگر ہمارے ساتھ اچھے ہوں تو ہمیں ان کے ساتھ برا ہونا چاہیے۔'' فراز کو مذاق سوجھا۔

''نہیں...... لوگ اگر ہمارے ساتھ اچھے ہوں تو ہمیں ان سے بڑھ کر ان کے ساتھ اچھا ہونا چاہیے۔ تمہارے بابا میرے ساتھ اچھے رہے۔ تم دیکھو میں ان کے ساتھ کس طرح رہی۔''

''ان سے بھی بڑھ کر اچھی...... لیکن سب لوگ آپ کی طرح نہیں ہوتے ماما!''

''جیسے عنایہ اپنے بہن بھائیوں سے مختلف ہے۔''

''آپ نے بہت خوبصورتی سے میری بات اس طرف گھما دی۔''

''تمہاری اماں ہوں بیٹے جی...... اچھا بولو، کرلوں نا میں تمہارے ماموں اور مامی سے بات؟''

''آپ کی مرضی۔''

''تمہاری مرضی بھی ہونی چاہیے۔''

''آپ کی خوشی، میری خوشی...... بابا سے ضرور پوچھ لیجیے گا۔''

''ان سے پوچھے بغیر کوئی کام کیا ہے میں نے آج تک۔ انہیں بہت جلدی ہو رہی ہے تمہاری شادی کی۔''

''اپنی بار دیر کیوں کی؟''

''کیونکہ انہیں ہماری زندگی میں آنا تھا۔''

''بابا بہت اعلیٰ ہیں۔''

''بے شک...... بائی دی وے، ماں کے بارے میں کیا رائے ہے تمہاری؟''

''راز ہے، راز ہی رہنے دیں۔''

''لو یو میری جان، میرا دل۔''

''لو یو ٹو ماما!''

''جیتے رہو...... خوش رہو۔''

☆☆☆

بھائی اور بھابی تو جیسے انتظار میں ہی تھے۔ دنیا بھی نرالی ہے۔ وہی بھابی جنہیں اپنے گھر میں بھی فراز کا معصوم وجود کھٹکتا تھا، فراز کے لیے عنایہ کا رشتہ مانگے جانے پر بچھ بچھ ہی تو گئیں۔

''ارے بھئی فراز ہمارا اپنا بچہ ہے۔ اس سے بڑھ کر ہمیں کون عزیز ہو سکتا ہے۔''

بات پکی ہو گئی اور دونوں طرف شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ عثمان بہت پُرجوش تھا جیسے فراز اس کا اپنا ہی بیٹا تو ہو۔ گھر پر نیا رنگ و روغن، نئی آرائش، نیا فرنیچر۔

بصیرہ خوشی کے اس موقع پر ہلکی سی ناگواری سے بھی حتی الوسع بچنے کی کوشش میں تھی۔ دن رات، سوتے جاگتے اس کے ذہن پر بس ایک ہی فکر سوار رہتی کہ فراز کی شادی میں اس کی دادی اور چچاؤں کو مدعو کرنے کے لیے عثمان سے کیونکر بات کرے۔ اس نے منع کر دیا...... بگڑ گیا...... ناگواری کا اظہار کیا تو...... عثمان سے بات کرنے کی بار بار ہمت کرتی مگر ہر بار ہمت ٹوٹ جاتی۔ ایک ہی برادری تھی۔ بے جی اور گھر

کے دیگر افراد کو یہ خبر تو مل چکی تھی کہ فراز کی شادی کی تیاری ہے۔ تہذیب، مروت اور حوصلہ ان لوگوں میں بھی تھا۔ بصیرہ کو کسی گلے شکوے کے بغیر مبارک باد دی گئی تھی۔ انہیں مدعو کرنا لازم تھا مگر بصیرہ جانتی تھی عثمان کو گوارا نہ ہوگا۔ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی کے اس موقع پر وہ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا چاہتی تھی۔ اس احتیاط میں فراز بھی اس کے ہم قدم تھا۔ شعور سنبھالتے ہی وہ بہت سی باتیں کسی کے بتائے بغیر خود ہی سمجھ چکا تھا۔ بصیرہ کی طرح اسے بھی احساس تھا کہ عثمان اس کا سوتیلا باپ ہوتے ہوئے بھی اسے سگے باپ کی طرح چاہتا تھا، اسے عزیز رکھتا تھا اور اس کی ہر خواہش کو مقدم جانتا تھا۔ بصیرہ کی طرح وہ یہ بھی جانتا تھا کہ عثمان اس کے مرحوم باپ کے گھر والوں سے اس کے ربط ضبط کو ناپسند کرتا تھا۔ یہ اس کا کوئی نفسیاتی مسئلہ تھا یا کچھ اور...... خدا ہی جانتا تھا۔

"تمہاری دادی اور چچاؤں کو میں تمہاری شادی میں کیسے انوائٹ کروں...... نہ کروں تو ان لوگوں کو گلہ ہوگا۔" فراز کی شادی کی تیاریوں کے دوران ایک روز بصیرہ نے فراز سے کہا۔

"نہ کریں ماما...... بابا ناراض ہوں گے۔" فراز نے کہا۔

"ہاں، یہ تو میں جانتی ہوں...... مگر وہ لوگ بھی تو خفا ہوں گے۔"

"میں ان سے معذرت کرلوں گا...... منالوں گا انہیں۔"

"اور باقی لوگ کیا کہیں گے...... کیا سوچیں گے؟"

"ہم سب کو تو خوش نہیں کرسکتے ماما...... باقی لوگوں کے مقابلے میں ہمارے لیے بابا کی خوشی لازم ہونی چاہیے۔ وہ ان لوگوں کا شریک ہونا پسند نہیں کریں گے۔"

بصیرہ چپ ہوگئی۔ اسے دل گرفتہ دیکھ کر فراز نے اسے تسلی دی۔

"آپ رنج نہ کریں۔ بابا نے مجھے اتنی محبت دی ہے کہ میں کبھی اس کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔ میں دادو، شان چاچو اور گل چاچو سے شادی سے پہلے بھی معذرت کرلوں گا اور بعد میں خود چلا جاؤں گا ان سے معذرت کرنے کے لیے۔"

بصیرہ کا دل بھاری ہو رہا تھا۔ فراز کی دی ہوئی تسلی بھی اس کے دل کا بھاری پن ہلکا نہ کرسکی تھی۔

شادی کے دعوت نامے چھپ کر آئے تو عثمان دعوت ناموں پر مدعوئین کے نام خود لکھنے بیٹھ گیا۔

"دیکھا تم نے۔ وہ کارڈز پہ نام خود لکھنے بیٹھ گئے ہیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ ہم کہیں تمہاری دادی اور چچاؤں کو بھی کارڈ نہ بھجوا دیں۔" بصیرہ نے فراز سے کہا۔

فراز سے عثمان کی تمام تر محبت کے باوجود بصیرہ اور فراز ناقابلِ شکست محبت اور باہم رازداری کے ایسے دائرے میں تھے کہ کوئی تیسرا فرد اس دائرے کی حدود میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔

"لکھنے دیں ماما! مہمانوں کی فہرست تو آپ ہی نے لکھ کر دی ہے نا انہیں اور اس فہرست میں ان لوگوں کا نام شامل نہیں۔"

بصیرہ نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ فراز نے اس کی رنجیدگی کا سبب جانتے ہوئے اسے گلے لگالیا۔

"کتنے افسوس کی بات ہے فراز کہ تمہاری شادی میں، میں ان لوگوں کو نہیں بلا سکتی جن سے تمہارا خون کا رشتہ ہے۔"

"کوئی خاص بات نہیں۔ ہمیں اس رشتے کی بھی تو حفاظت کرنی ہے جو آپ کے لیے اس دنیا کا اہم ترین رشتہ ہے۔"

بصیرہ نے فراز کے سینے سے اپنا سر ہٹا کر اسے دیکھا۔

"آئی ایم سوری بیٹا! میں نے حالات سے مجبور ہوکر غلط فیصلہ کیا۔ تم اور میں اس رشتے کے بغیر بھی زندگی گزار سکتے تھے۔"

"نہیں ماما! آپ نے بہت صحیح فیصلہ کیا۔ آپ کے اس فیصلے سے ہمیں اپنے گھر کی چھت ملی، تحفظ ملا، محبت ملی۔ آپ کے اس فیصلے سے ہماری زندگی میں ہمیں بہت سی آسانیاں ملیں۔ آئی لو یو ماما...... اور مجھے آپ کے اس فیصلے کا دل سے احترام ہے۔"

☆☆☆

بصیرہ، عثمان اور فراز کی باہم مشاورت سے ترتیب دی گئی فہرست کے مدعوئین کے نام دعوت ناموں پر لکھنے کا کام مکمل کرنے کے بعد عثمان نے دعوت ناموں کا پلندہ بصیرہ کو تھماتے ہوئے کہا۔ "دیکھ لو اگر کوئی نام رہ گیا ہو تو۔"

"فراز کے ساتھ بیٹھ کر دیکھ لوں گی۔ اسے اپنے دوستوں اور کولیگز کی فکر لگی ہوئی ہے کہ کوئی رہ نہ جائے۔"

بصیرہ اور فراز مہمانوں کی فہرست اور لکھے گئے دعوت نامے لے کر بیٹھے۔ بصیرہ نے قلم سنبھالا اور فراز نے دعوت نامے۔ فراز دعوت نامے پر لکھا نام پڑھتا اور بصیرہ فہرست میں اس نام کو نشان زدہ کرتی جاتی...... مگر ایک دعوت نامے پر فراز کی نظریں جمی کی جمی رہ گئیں۔

"ماما......!" اس کی آواز میں اچنبھا تھا۔

"ہاں...... اگلا نام بولو۔" بصیرہ کی نظریں فہرست پر گڑی تھیں۔

"کیا آپ نے ان کا نام بھی شامل کردیا تھا لسٹ

میں؟" فراز کے لہجے میں حیرت تھی۔

"کن کا؟" بصیرہ نے اسے دیکھا۔

"محترمہ...... مکرمہ...... و...... معظمہ...... بے جی......

مع...... اہلِ خانہ!" فراز دعوت نامے پر نظریں گاڑے تنویمی سی کیفیت میں ایک ایک لفظ پڑھتا چلا گیا۔

"نہیں...... نہیں تو......!" بصیرہ چونک کر بولی اور اس نے فہرست کو آگے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس میں تو کہیں نہیں ہے۔"

"پھر دیکھیں۔"

"نہیں بیٹا...... دور دور تک نہیں ہے۔"

"تو پھر یہ......!" فراز اپنے ہاتھ میں پکڑے کارڈ کو دیکھتے ہوئے گومگو کیفیت میں بولا۔

"میں ایسی غلطی کر سکتی تھی بھلا؟"

"تو پھر یہ...... یہ کہاں سے لکھا گیا؟"

"رائٹنگ بابا کی ہے؟"

"جی...... انہی کی ہے۔"

"مجھے دکھاؤ۔"

فراز نے کارڈ بصیرہ کی طرف بڑھا دیا۔

"ہاں...... خط تو انہی کا ہے۔"

"کیسے لکھ دیا انہوں نے؟"

"مجھے کیا معلوم۔"

"شاید غلطی سے لکھ گئے ہوں۔"

"ایسی فاش غلطی کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ تو ان لوگوں کا نام بھی اپنی زبان پر لانا پسند نہیں کرتے۔"

"خیر...... معلوم ہو جائے گا کہ یہ غلطی ہے یا......"

"یا......؟" بصیرہ نے فراز کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"انہوں نے ہمیں آزمانے کو ایسا کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"کہ اس غلطی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم کارڈ انہیں بھیجتے ہیں یا گول کر جاتے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔"

مگر ایسا نہیں تھا!

"پوسٹ کرنے والے کارڈز مجھے دے دو۔ آفس جاتے ہوئے پوسٹ کر دوں گا۔" عثمان نے بصیرہ سے جو بیٹے کی شادی کی تیاری میں مصروفیت کے باعث ان دنوں اسکول سے رخصت پر تھی، کہا۔

بصیرہ نے کارڈز اس کے حوالے کر دیے۔ عثمان نے کارڈز لیے، دیکھے اور گنے پھر بولا۔ "ایک کارڈ کم ہے۔"

"وہ شاید غلطی سے لکھا گیا تھا۔ میں نے علیحدہ کر لیا۔"

بصیرہ نظریں چرا کر بولی۔

"کیوں علیحدہ کر لیا؟" وہ اس کے روبرو آ کھڑا ہوا۔

"بھجوانا جو نہیں تھا۔" وہ نظریں جھکا کر بھاری دل سے بولی۔

"کیوں نہیں بھجوانا تھا؟"

وہ خاموش رہی۔

عثمان نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے۔ بصیرہ گھبرا کر اسے دیکھنے لگی۔

عثمان نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے بٹھا دیا۔

"ڈری ڈری کیوں رہتی ہو؟" وہ بولا۔

بصیرہ نے پہلے سے زیادہ گھبرا کر اسے دیکھا۔

"بولو...... ڈر کیوں جاتی ہو؟"

"عورت ہوں...... اس لیے۔" بصیرہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اور آواز بھرا گئی۔ "میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتی۔" اس نے لرزتی آواز میں کہا اور اچانک پھوٹ پھوٹ کر یوں رونے لگی جیسے ایاز کے بعد کی تمام تکلیف اور اذیت کو اپنی آنکھوں کے راستے بہا دینا چاہتی ہو۔

"میں تمہیں کب ناراض کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ رونا بھول گئی۔ چونک کر عثمان کو دیکھنے لگی۔

عثمان نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

"مجھے ظالم سمجھتی ہو؟"

بصیرہ نے روبوٹ کی طرح سر نفی میں ہلایا۔

"آج مجھے اعتراف کرنے دو۔" وہ سر جھکا کر بولا۔

بصیرہ کی آنکھوں میں حیرانی ڈولنے لگی...... دل میں خدشات سر اٹھانے لگے۔ کس بات کا اعتراف کرنا چاہتا تھا وہ؟ کیا اس بات کا کہ بصیرہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت نہیں تھی...... پہلی عورت سے اس کے بچے بھی تھے جو وہ اپنے ساتھ ہی لے گئی تھی...... تبھی تو اس نے اس سے شادی کے بعد کبھی اولاد کی چاہ ظاہر نہیں کی تھی...... شاید اپنی سگی اولاد کی یاد میں وہ اپنی محبت فراز پر نچھاور کرتا ہو۔ بصیرہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہی تھی۔

"مجھے تم سے محبت ہے بصیرہ...... اور فراز سے بھی میں دل سے پیار کرتا ہوں...... میں نہیں چاہتا تھا کہ ہمارے درمیان کوئی اور آئے۔ میں تمہیں اور فراز کو اون کرتا تھا...... کرتا ہوں...... غریب، معمولی سا آدمی ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تمہارے لائق نہیں تھا مگر غیاث صاحب اور ان کی بیگم کو دعا دیتا ہوں کہ انہوں نے مجھے اس لائق سمجھا۔ تم نے آج تک مجھ سے میرے ماضی، میرے رشتے داروں کے سلسلے میں کوئی

سوال نہیں کیا ہے...... مگر آج خود بتاتا ہوں۔ چھوٹا سا تھا تو باپ کے سائے سے محروم ہوگیا۔ میری ماں کی دوسری شادی کرادی گئی۔ دوسرے شوہر سے کئی بچے پیدا ہوئے۔ مجھے نہیں یاد کہ میرے سوتیلے باپ نے مجھے کبھی محبت کی نظر سے دیکھا ہو حالانکہ وہ مجھے اچھا لگتا تھا۔ میں اپنے دوسرے بہن بھائیوں کی طرح اس کی انگلی پکڑ کر چلنا چاہتا تھا مگر وہ ہمیشہ مجھے نظرانداز کرتا۔ ماں بے چاری بھی دوسرے شوہر اور اس کے بچوں میں گھر کر مجھے بھول ہی گئی تھی...... مر بھی جلدی گئی۔ ٹی بی ہوگئی تھی اسے۔ ماں کے بعد میرا اس گھر میں ٹھکانا نہ رہا۔ گاؤں چھوڑ کر پہلے لاہور پھر پنڈی آیا اور یہاں میں نے دھکے کھاتے، سختیاں اٹھاتے، محنت مزدوری کے ساتھ تعلیم بھی جاری رکھی۔ انٹر کے بعد سرکاری نوکری مل گئی۔ پرائیویٹ بی اے پھر ایم اے کیا۔ ملازمت کرتے ہوئے مری پوسٹنگ ہوئی تو مسلسل کئی سال مری میں رہا۔ غیاث صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ دوست اور مہربان بن گئے۔''

''بہن بھائی؟'' بصیرہ نے پوچھا۔

''کچھ پتا نہیں...... نہ میں نے جاننے کی ضرورت محسوس کی، نہ انہوں نے کبھی خبر لی۔ بہت اکیلا تھا۔ تم سے شادی ہوئی تو ماں کے بعد پہلی بار کسی کے اپنا ہونے کا احساس ہوا۔ فراز کے بچپن میں مجھے اپنا بچپن دکھائی دیا۔ میں نے سوچا جو محرومی مجھے سوتیلے باپ سے ملی، فراز کو میں اس کا شکار نہیں ہونے دوں گا...... مگر مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ اس کے مجھ سے زیادہ قریبی رشتے اس کے اور میرے درمیان نہ آجائیں۔''

''آپ سے بڑھ کر قریبی رشتہ فراز کے لیے اور کون ہوسکتا ہے عثمان؟'' بصیرہ بولی۔

''شکرگزار ہوں تمہارا کہ تم نے اس کے دل میں میری محبت ڈالی...... جو میری ماں اپنے شوہر کے دل میں میرے لیے پیدا نہ کرسکی۔ بے چاری گاؤں کی سیدھی سادی ان پڑھ عورت تھی۔''

''آپ نے تو میری امی والی بات کردی۔'' بصیرہ نے کہا۔

''کون سی بات؟''

''خدا امی کو کروٹ کروٹ جنت بخشے...... کہا کرتی تھیں...... اللہ کی محبت سے بندوں کی محبت تک ماں ہی بچے کے دل میں محبت پیدا کرتی ہے۔''

''بے شک۔'' عثمان نے تائید کی۔ ''خدانخواستہ میں اپنی والدہ کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا رہا...... ان کا ذہن ہی محدود تھا۔ شوہر کی خوشنودی اور بس...... اور اس چکر میں میری ذات، میرا وجود ماں کے لیے ثانوی بن گیا تھا۔''

''عورت بہت مجبور ہوتی ہے عثمان!''

وہ چپ رہا۔ قدرے توقف سے بولا۔ ''اپنے ایک جرم کی معافی چاہتا ہوں تم سے۔''

بصیرہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''جس پر میں خود کو آج بھی ملامت کرتا ہوں۔'' اس نے توقف کیا پھر بولا۔ ''البم میں نے اس لیے جلادی تھی کہ...... مجھے ڈر تھا ان تصویروں کی ہمارے گھر میں موجودگی میرے، تمہارے اور فراز کے درمیان ایک آڑ بنی رہے گی...... تم اپنی سابقہ زندگی کو یاد کرتی رہو گی...... اور فراز مجھے دوسرا آدمی سمجھے گا۔ میں تم دونوں کو اپنی زندگی تسلیم کرچکا ہوں بصیرہ...... تمہیں کھونا نہیں چاہتا...... نہ یہ چاہتا ہوں کہ کوئی چوتھا فرد میرے، تمہارے اور ہمارے بیٹے کے درمیان آئے۔''

عثمان بولتا گیا اور بصیرہ کا دل ہلکا ہوتا چلا گیا۔ البم جلادینے کی رنجش بھی جاتی رہی۔ ایاز کو بھلانا کارِگراں تھا مگر وہ تو اب خواب بن چکا تھا...... خواب کے ساتھ جینا کب ممکن ہوتا ہے...... جینے کے لیے زندہ انسان کو زندوں کی ضرورت ہوتی ہے...... عثمان اس کی زندگی میں آنے والا دوسرا آدمی سہی مگر خواب نہ تھا۔

''چوتھا فرد آرہا ہے...... آپ کی بہو۔'' بصیرہ نے مسکراتے ہوئے عثمان کو دیکھا۔

''وہ تو اس گھر کی شان اور ہم سب کا مان ہوگی۔''

''ان شاء اللہ!''

''اچھا وہ کارڈ تو دو۔''

''کون سا؟'' بصیرہ انجان بن گئی۔

''وہی جو تم نے نکال لیا۔''

''بھیجیں گے؟''

''تو اور کس لیے لکھا ہے؟''

''تھینک یو عثمان!''

''نو نیڈ!'' عثمان اسے محبت سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ ان کا حق ہے...... اور ہاں...... شادی کے بعد فراز اپنی دلہن کو ہنی مون پر جانے سے پہلے لاہور لے کر جائے گا۔''

بصیرہ چند ثانیے اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی پھر یکایک اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔

زندگی بھی عجیب ہے...... کہاں شروع ہوتی ہے...... کن پیچ وخم سے گزرتی ہے...... اور وہاں پہنچتی ہے جہاں ہمارا گمان بھی نہیں گزرتا۔

⌘⌘⌘